رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہو جاتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)
بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (سے) سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد (۳۱)	فہرست مضامین جنوری ۱۹۳۷ء	شمار (۱)

ڈراما اصحاب کہف ———— ۵

مسئلۂ خلافت و امامت ———— ۴۹

سائنس کے بعض دلچسپ معلومات ———— ۹۷

آسکر وائلڈ کے خطوط ———— ۱۲۱

نادرات ———— ۱۳۸

پانچ ایکٹ کا حزنیہ ڈراما

یہ ڈراما ایک مصری انشا پرداز "توفیق الحکیم" کی کتاب "اہل الکہف" سے اخذ و اقتباس کیا گیا ہے۔ جس میں فاضل مصنف نے نہایت لطیف انداز سے یہ ظاہر کیا ہے کہ "اصحاب کہف" کے متعلق جو روایت مذہبی صحایف میں پائی جاتی ہے وہ حقیقت نہیں ہے بلکہ صرف بیان و تمثیل ہے اور دنیا کی بعض صنم پرست اقوام کے اصنامی لٹریچر میں بھی اس قسم کی روایتیں پائی جاتی ہیں۔ موضوع محبت پر مصنف نے جس بلند تخیل کو صرف کیا ہے وہ مصنف کی بالکل ذاتی چیز ہے اور اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

یہ کتاب حاجی شیخ نبی احمد صاحب (بریلوی) کا ہدیہ تھا جو زیارت حرمین سے واپس آنے کے بعد انھوں نے مجھے مرحمت فرمایا تھا۔۔۔ حاجی صاحب شکریہ قبول فرمائیں۔۔

نیاز

ڈراما اصحاب کہف

پہلا ایکٹ

رقیم کا غار، جس کی تاریکی میں سوائے دو انسانی سایوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ دونوں اُکڑو بیٹھے ہوئے ہیں اور پاس ہی ایک کتا اپنے ہاتھ آگے کی طرف پھیلائے ہوئے لیٹا ہوا ہے

مشلینا:۔ مرنوشش، مرنوشش!

مرنوشش:۔ ہائیں، تم جاگ گئے، کیا کہتے ہو؟

مشلینا:۔ تم ہو کہاں؟ تمھاری آواز تو سنائی دیتی ہے لیکن تم نظر نہیں آتے ۔ آہ، میری پیٹھ بہت دُکھ رہی ہے۔

مرنوشش:۔ میری پسلیاں خود پھوڑا ہو کر رہ گئی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے برسوں سوتے ہوئے گزر گئے ہیں۔

مشلینا:۔ چرواہا کہاں ہے؟ ۔ وہی ہمارا تیسرا ساتھی

مرنوشش:۔ اس کے کتے کا سایہ تو نظر آ رہا ہے۔

مشلینا:۔ مگر وہ خود کہاں ہے؟

مرنوشش:۔ شاید غار کے دہانہ پر چرواہوں کی طرح طلوع آفتاب کو دیکھ رہا ہوگا

مشلینا:۔ آہ، میری پیٹھ بہت دُکھ رہی ہے ۔ اے مرنوشش ہم یہاں کب سے ہیں

مرنوشش:۔ اونہہ، ہوگا۔ تم اور اپنے سوالوں سے میرا سینہ پکائے دے رہے ہو

مشلینا:۔ اور تمھیں میرے سینہ کی خبر نہیں کہ اسکا کیا حال ہے۔ اے مرنوشش سچ بتا ہم یہاں کب سے ہیں؟

مرنوش :— یہی کوئی ڈیڑھ دو دن ہوئے ہوں گے
مشلینا :— یہ تمھیں کیونکر معلوم ہوا ؟
مرنوش :— کیونکر معلوم ہوا — اتو کیا اس سے زیادہ کوئی سوجھی سکتا ہے ؟
مشلینا :— سچ کہتے ہو (خاموش ہو جاتا ہے، پھر تھوڑی دیر بعد گھبرا کر) میں تو اب یہاں سے باہر نکلتا ہوں -
مرنوش :— اور جاؤ گے کہاں ؟
مشلینا :— کہاں ؟ خوب ، تو کیا تمھارا ارادہ ایک رات اور یہاں رہنے کا ہے -
مرنوش :— ایک رات ، دو رات ، تین رات — اور اس سے زیادہ جب تک دقیانوس کی طرف سے ہم کو اپنی جان کا اطمینان نہ ہو جائے -
مشلینا :— مجھ سے تو اب یہاں نہیں ٹھہرا جاتا -
مرنوش :— اور مجھ سے ٹھہرا جاتا ہے، جو اپنے بیوی بچوں پر دم دیتا ہے -
مشلینا :— بیشک ، ان کے لئے تمھیں اپنی زندگی عزیز ہونا چاہئے -
مرنوش :— اور تم — ؟ — کیا تمھیں کسی کے خاطر جینے کی تمنا نہیں ہے
مشلینا :— آہ ، یہی وہ چیز ہے جو مجھے یہاں اب ایک لمحہ نہیں ٹھہرنے دیتی ، اور اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ چلو ،
مرنوش :— مشلینا ، کچھ پاگل ہوگئے ہو ؟ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ سولی ابھی تک جوں کی توں قائم ہے -

(ایک اور سایہ بڑھتا ہوا نظر آتا ہے)

مشلینا :— یہ کون ہے
آنے والا :— اے آقا ، میں ہوں ، چرواہا
مشلینا :— تم کہاں تھے ؟
چرواہا :— تھا کہاں ، دروازہ سے باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈھ رہا تھا مگر وہ ملا ہی نہیں ،
مشلینا :— آؤ ہمارے پاس بیٹھ جاؤ اور بتاؤ کہ جب سے تم ہمیں یہاں غار میں لائے ہو ، تم نے ہم سے کوئی بات ہی نہیں کی اس کا کیا سبب ہے ؟
مرنوش :— اے چرواہے ، تیرا نام کیا ہے ؟
چرواہا :— اے آقا ، میرا نام یملیخا ہے
مشلینا :— تم کیوں ہمیشہ آقا کے لفظ سے ہم لوگوں کو مخاطب کرتے ہو
یملیخا :— سلطنت کے وزیروں کو اور کس لفظ سے مخاطب کروں -

مرنوش :۔ (حیرت سے) تم سے کس نے کہا کہ ہم لوگ وزیر ہیں

یملیخا :۔ کیا حکومت کے وزیروں کو بھی کوئی نہیں پہچان سکتا

مشلینا :۔ اس سے پہلے تم نے ہمیں کبھی دیکھا تھا ؟

یملیخا :۔ بارہا۔

مرنوش :۔ کہاں ؟

یملیخا :۔ شہر طرطوس میں اور اس میدان میں جہاں درندوں کی لڑائی کا کھیل ہوتا ہے، آپ دونوں بادشاہ کے پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے اور لوگ اشارہ سے کہہ رہے تھے کہ دیکھو یہ مشلینا ہے اور وہ مرنوش

مشلینا :۔ کیا تم نے ہم کو اس وقت پہچان لیا تھا جب ہم تم سے کوئی پناہ کی جگہ پوچھ رہے تھے۔

یملیخا :۔ نہیں، پہلے تو مجھے اس کا علم نہیں ہوا، لیکن جب میں نے آپ میں سے ایک کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "اے مرنوش جلدی جلدی بھاگ چلو وہ ہمارا تعاقب کر رہے ہیں" تو میں سمجھ گیا کہ آپ لوگ کون ہیں اور میں اپنی بھیڑ بکریاں چھوڑ کر آپ کو اس غار میں لے آیا

مشلینا :۔ "افسوس ہے کہ ہماری وجہ سے تم کو اپنی بھیڑ بکریاں چھوڑنا پڑیں"

یملیخا :۔ "نہیں، کوئی فکر کی بات نہیں، وہ مزہ سے چر رہی ہوں گی اور انکو کسی نے نہ چھیڑا ہوگا کیونکہ یہ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کسی مسیحی کی ہیں،

مرنوش :۔ تو کیا تم بھی اپنا دین چھپائے ہوئے ہو

یملیخا :۔ "ہاں، اے آقا

مشلینا :۔ یملیخا، یہ آقا کا لفظ میرے کانوں کو بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔ ہم سب مسیحی ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ آقا و غلام کیسا،

مرنوش :۔ یملیخا، کیا تمھارے بیوی بچے بھی ہیں ؟

یملیخا :۔ سوائے قطمیر کے میرا کوئی نہیں

مشلینا :۔ "قطمیر، کون ؟

یملیخا :۔ (کتے کی طرف اشارہ کرکے) ۔ یہ ۔ (کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد) میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں

مشلینا :۔ ہاں، ہاں پوچھو، ڈرو نہیں،

یملیخا :۔ "میں نے جب آپ لوگوں کو قتل گاہ سے بھاگتے ہوئے دیکھا تو مجھے تعجب ضرور ہوا، لیکن گھبراہٹ

میں پوچھنے کا موقعہ ہی نہ ملا اور جب یہاں غار میں پہونچے تو سب کے سب دفعۃً ایسا سوئے ایسا سوئے کہ ــــ"

مشلینا:ــ ہاں، تو تمھیں حیرت کس بات پر ہوئی

یملیخا:ــ اس بات پر کہ دقیانوس مسیحیت کا اتنا بڑا دشمن اور اُسے یہ بھی خبر نہیں کہ اسکے دونوں وزیر مسیحی ہیں

مرنوش:ــ اس سے زیادہ حیرت تمھیں اس بات پر ہونی چاہئے کہ اسکی بیٹی بھی مسیحی ہے اور وہ اس سے بے خبر ہے۔

یملیخا:ــ (تعجب سے)۔ اس کی بیٹی، شاہزادی پریسکا ــ !

مشلینا:ــ (ملامت وعتاب کی آواز سے)ــ مرنوشس !

مرنوش:ــ اونہہ، یملیخا سے کہنے میں کیا حرج ہے

یملیخا:ــ اے آقا، معاف فرمائیے، میں یہ پوچھتا ہوں کہ بادشاہ پر آخر یہ راز کھلا کیونکر ؟

مرنوش:ــ اے مشلینا، یہ بات اب تمھیں بتاؤ،

مشلینا:ــ مجھ سے تو اب یہاں نہیں ٹھہرا جاتا

مرنوش:ــ اور مجھ سے ٹھہرا جائے گا جو صرف تمھاری حماقت سے اس مصیبت میں مبتلا ہوا۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ شاہزادی کے نام خط لکھواو بغیر تحقیق کئے ہوئے ایک ایسی خادمہ کے ذریعہ سے پہونچاؤ جو بادشاہ کی جاسوس تھی۔ جس طرح پہلے ایک بار تم نے اس کو طلائی صلیب کا تحفہ دیا تھا،[1] اسی طرح یہ خط بھی موقعہ نکال کر خود ہی دیتے۔ اگر تم صلوٰۃ صبح ادا کرنے کو جارہے تھے تو اسکی اطلاع دینے کی ضرورت ہی کیا تھی اور اگر تھی بھی تو اس تحریر میں میرا ذکر تم نے کیوں کیا ؟

مشلینا:ــ بیشک، غلطی ہوئی، اور اگر میں یہ نہ لکھتا تو ــــ"

مرنوش:ــ مجھ پر کیوں یہ مصیبت آتی اور کیوں اپنی بیوی بچے چھوڑ کر یہاں غار میں چھپنا پڑتا۔

یملیخا:ــ اے آقا، کیا آپ کے اہل وعیال خطرہ میں ہیں

مرنوش:ــ نہیں خطرہ تو کوئی نہیں، کیونکہ اول تو ان کا قیام ایسی جگہ ہے جہاں کسی کو پتہ چل ہی نہیں سکتا، علاوہ اس کے اُن کے مسیحی ہونے کا بھی کسی کو علم نہیں ہے

یملیخا:ــ شکر ہے،

مرنوش:ــ "شکر ؟ یہ نہیں کہتے کہ انتہائی بدنصیبی تھی کہ ہمارا راز بادشاہ پر ظاہر ہوگیا اور دو دن نہ گزرے تھے کہ اس نے مسیحیوں کے قتل عام کا حکم دیدیا

---

[1] ایسٹر کی عبادت

یملیخا:— غضب کا غصہ تھا

مرنوش:— سنتے ہیں کہ جسوقت وہ تحریر بادشاہ کی نگاہ سے گزری تو وہ اس کو پڑھ کر آپے سے باہر ہوگیا اور حکم دیا کہ بھوکے شیروں کے پنجرے لائے جائیں۔ مگر وہ تو کہئے پریسکا نے ہم کو اطلاع دیدی اور ہم جان بچا کر نکل آئے — ورنہ —"

یملیخا:— شکر ہے مسیح نے آپ کو اس مصیبت سے نجات دلائی،"

مرنوش:— ہاں نجات تو لی مگر ایسی نجات کس کام کی کہ میں یہاں اور میرے بیوی بچے وہاں

یملیخا:— آپ کو اپنے اہل وعیال سے بڑی محبت ہے،

مرنوش:— محبت! میں جیتا ہی اُن کے لئے ہوں،

یملیخا:— صبر کیجئے، خدا کی رحمت قریب ہے،

مرنوش:— ہاں، اتنی ہی قریب ہے جتنا آسمان زمین سے

یملیخا:— اللہ کے ساتھ تمسخر نہ کیجئے

مرنوش:— اس میں اللہ کا کیا ہیچ — یہ مصیبت تو خود ہم نے اپنے ہاتھوں مول لی ہے۔

یملیخا:— اے آقا، جو کچھ ہوتا ہے اللہ ہی کے حکم سے ہوتا ہے

مرنوش:— ہوتا ہوگا، مگر یہ بات تو خالص ہماری حماقت سے ہوئی ہے

یملیخا:— توبہ توبہ کیجئے، ایک مسیحی کی زبان سے ایسے کلمے مناسب نہیں

(مشلینا کراہ کے اُٹھنا چاہتا ہے)

مرنوش:— کہاں کا ارادہ کیا؟

مشلینا:— جو غلطی مجھ سے ہوئی ہے اس کی تلافی کے لئے جاتا ہوں

مرنوش:— "وہ کیونکر؟"

مشلینا:— بادشاہ کے پاس جاکر کہوں گا کہ خط کے اندر مرنوش کا نام لکھنے میں میں نے غلطی کی ہے اور جو کچھ خطا ہے میری ہے،

مرنوش:— یہ کیوں نہیں کہتے کہ اپنی محبوبہ کے دیکھنے کے لئے بیتاب ہو

مشلینا:— (آہ سرد بھر کر) مرنوش میں تمھیں اسقدر سنگدل نہیں جانتا تھا۔ یا اللہ اب میں کیا کروں،

یملیخا:— صبر کیجئے اور مسیح پر بھروسہ کرکے خاموش بیٹھ جائیے

مشلینا:— مسیح کو کیا خبر کہ یہاں دل پہ کیا گزر رہی ہے،

یملیخا:- توبہ، توبہ، آپ کو اس میں شک ہے کہ مسیح سب حال سے خبردار ہے، مجھے تو یقین ہے کہ وہ ضرور اس مصیبت کو دور کرے گا۔

مشلینا:- "کب"

یملیخا:- کب؟ اس سوال کا ہم کو کیا حق حاصل ہے، ہمارا کام صرف اعتقاد و اعتماد ہے

مشلینا:- اے یملیخا، مجھے تیرے ایمان پر حیرت ہے کیا تو مسیحی پیدا ہوا تھا یا بڑے ہونے کے بعد یہ دین اختیار کیا۔

یملیخا:- میں مسیحی پیدا ہوا تھا، لیکن سچا ایمان اسوقت لایا جب طرسوس کی شہرپناہ کے نیچے میں نے ایک راہب کی گفتگو سنی،

مشلینا:- کونسا راہب؟

یملیخا:- پانچ سال اُس طرف کی بات ہے، میری عمر ۲۰ سال کی تھی اور دنیا میں سوائے بھیڑیں چرانے کے مجھے کوئی خبر نہ تھی، میں مسیحی ضرور تھا لیکن صرف اس لئے کہ مسیحی خاندان میں پیدا ہوا تھا خود کوئی شعور نہ رکھتا تھا۔ ایک دن میں طرسوس گیا تو دیکھا کہ ایک راہب شہر پناہ سے باہر پوشیدہ طور پر چند آدمیوں سے گفتگو کر رہا ہے، میں نہیں کہہ سکتا کہ اسکی باتیں سنکر میرا کیا عالم ہوا میرے دل نے کیا محسوس کیا اور میری آنکھوں نے کیا دیکھا

مشلینا:- راہب نے کیا کہا؟

یملیخا:- یہ تو مجھے کچھ یاد نہیں، لیکن جو کیفیت میری ہوئی اس کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ جسوقت میں غروب آفتاب کے وقت پہاڑ سے نیچے اُتر رہا تھا تو تمام وادی نور سے لبریز نظر آرہی تھی، میں رات بھر سوچتا رہا کہ یہ حُسن اس سے قبل میں نے کہاں دیکھا تھا۔ لڑکپن میں؟ خواب میں؟ پیدا ہونے سے پہلے؟ ۔ صبح کے وقت دفعتہً خیال ہوا کہ یہ حُسن تو ہمیشہ سے موجود ہے، آفرینش کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا ہے، اور اب سوائے اس احساس کے یہ بھی یاد نہیں کہ راہب نے کیا کہا تھا۔

مشلینا:- مرنوش، سنتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے۔

مرنوش:- ہاں سن رہا ہوں

مشلینا:- بولو، تمھارا کیا خیال ہے

مرنوش:- بولوں کیا، یونہی واہی تباہی بک رہا ہے

مشلینا:- ہاں تمھاری سمجھ میں تو سوائے اسکے کوئی بات آہی نہیں سکتی کہ تم تمام رات اپنی بیوی سے جدا رہے

مرنوش:- (طعن کے ساتھ) اور تم کیا سمجھے۔

مشلینا:— یہ کہ ہم دونوں خدا سے دور ہیں اور غیر خدا میں مشغول،
مرنوش:— لیکن اس میں حرج ہی کیا ہے؟
یملیخا:— (کانپ کر) اللہ آپ پر رحم کرے — (آگے کی طرف بڑھتا ہے)
مرنوش:— یملیخا، کہاں کا ارادہ ہے؟
یملیخا:— شہر جا رہا ہوں، ابھی کچھ کچھ اندھیرا ہے، کوئی چیز کھانے کی لے آؤں،
مرنوش:— لیکن تمھارے پاس دام بھی ہیں۔ ٹھہرو (اپنا ہاتھ جیب میں ڈالتا ہے) کل کچھ سکے میری جیب میں پڑے ہوئے تھے۔ (رک کر) ہاں، ہیں، یہ لو۔

(یملیخا سکے لیکر چلا جاتا ہے)

(تھوڑی دیر کے بعد)

مرنوش:— (دفعتہً گھبرا کر) کیا یملیخا چلا گیا؟
مشلینا:— کیوں خیر تو ہے، کیا کام یاد آیا؟
مرنوش:— کچھ نہیں، میں نے سوچا کہ وہ اُدھر ہی سے میرے بیوی بچوں کو بھی دیکھتا آتا
مشلینا:— مگر اُسے تمھارے مکان کا پتہ کیا معلوم، میں چلا جاؤں؟
مرنوش:— تم جاؤ گے تو پھر کوئی حماقت کر بیٹھو گے اور کوئی دوسری مصیبت نازل ہو جائے گی۔
مشلینا:— نہیں، تم کوئی اندیشہ نہ کرو،
مرنوش:— یہ ممکن نہیں کہ تم یہاں سے نکلکر اُس کو دیکھنے نہ جاؤ،
مشلینا:— پھر اس میں نقصان ہی کیا ہے۔ وہ بھی میری منتظر ہوگی۔ کیا تمھیں یاد نہیں کہ چلتے وقت اُسنے کہا تھا کہ تیسرے دن صبح کو میں محل کے جھروکہ میں بیٹھکر تمھارا انتظار کروں گی،
مرنوش:— تو کیا تین دن گزر گئے ہیں۔
مشلینا:— نہیں گزرے تو کیا ہوا — حالات معلوم کرنے میں کیا حرج ہے۔
مرنوش:— اور تمھیں کسی نے پہچان لیا تو —؟

(دفعتہً ایک آواز غار کے باہر سے سُنائی دیتی ہے)

مشلینا:— (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) یہ کیسی آواز ہے۔
آواز:— "اے وزیرو"
مرنوش:— کون ہے۔

آواز :- میں ہوں یملیخا

مرنوش :- یہ تو چیخ کیوں رہا ہے ؟

یملیخا :- آپ لوگ غار کی تاریکی میں صبح کے منتظر ہیں اور یہاں دوپہر ہونے کو آئی ہے

مرنوش :- کھانا بھی لایا یا نہیں ؟

یملیخا :- اب میں کیا بتاؤں کہ راستہ میں کیا ہوا ؟

مرنوش :- جلدی بتا ، کیا بات ہے ؟

یملیخا :- "میں غار سے باہر نکل کر دو قدم چلا ہوں گا کہ ایک سوار نظر پڑا جو عجیب قسم کے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور شکاری معلوم ہوتا تھا ، میں نے اس کو سکہ دیا اور کہا کہ کوئی شکار ہو تو مجھے بھی دیدو - اسنے سکہ لیا اور الٹ پلٹ کر دیکھا تو وہ حیران ہو گیا اور بولا کہ یہ دقیانوس کے وقت کا سکہ کہاں سے آگیا ، یہ تو نہایت پرانا سکہ ہے ، کیا کوئی دفینہ ہاتھ آگیا ہے " میں سمجھا کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے اور ڈر کے مارے یہاں بھاگ آیا '

مرنوش :- بیشک اس کا دماغ خراب ہے -

مشلینا :- (نہایت ہی سنجیدگی سے) اے مرنوش ، ایسا نہ کہو

مرنوش :- کیوں ، کیا اس میں بھی کوئی شک ہے ؟

مشلینا :- ہاں شک ہے

مرنوش :- کس بات کا ؟

مشلینا :- اس بات کا کہ ہم کب سے یہاں غار میں چھپے ہوئے ہیں - کیا تمھیں یاد نہیں کہ جب ہم یہاں آئے تھے تو سر منڈا ہوا تھا ، چہرہ صاف تھا اور اب دیکھو کہ داڑھی اور سر کے بالوں کا کیا حال ہے ، ابھی تھوڑی دیر ہوئی جب میں نے سر کھجایا تو مجھے خیال ہوا کہ اتنے بال کہاں سے آگئے ،

یملیخا :- ہاں جسوقت میں نے اس سوار کو سکہ دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنے ناخنوں کو دیکھا کہ وہ حد سے زیادہ لمبے ہیں - یہاں اندھیرے میں کچھ پتا چلا ہی نہیں کہ کسی کا کیا حال ہے -

مشلینا :- یقیناً ایک ہفتہ ضرور یہاں آئے ہوئے ہو گیا ہو گا - حیرت ہے کہ ہمیں اس کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا ،

مرنوش :- (اپنا سر چھوتے ہوئے) سچ کہتے ہو ، میں بھی جب یہاں آیا تھا تو میرا سر صاف تھا ، لیکن اب تو اُفوہ ، سر جنگل ہو کر رہ گیا ہے ، اور داڑھی تو بالکل بادریوں کی سی ہو گئی ہے ،

یملیخا :- میں سمجھتا ہوں کہ ایک مہینہ سے کم زمانہ نہیں ہوا -

مرنوش:۔ (تعجب سے) ایک مہینہ! اور اتنی مدت تک ہم رہے کہاں؟

یملیخا:۔ "سوتے رہے"

مرنوش:۔ "کیوں بیوقوفوں کی سی باتیں کر رہے ہو"

یملیخا:۔ اس میں بیوقوفی کی کیا بات ہے، جب میں چھوٹا تھا تو میں نے اپنی دادی سے سنا تھا کہ ایک مسیحی چرواہا سیلاب سے بچکر ایک غار میں چھپا اور ایک مہینہ تک وہاں پڑا سوتا رہا، جب سیلاب ختم ہوگیا تو وہ صحیح و سالم باہر نکلا اور اس کو بالکل پتہ نہیں چلا کہ وہ کب تک سوتا رہا،

مرنوش:۔ یہ بڑھیوں کے قصے کہانیاں ہیں،

یملیخا:۔ مجھے تو اس پر بالکل یقین ہے، خدا اور مسیح اگر چاہیں تو یہ کیا، اس سے بھی زیادہ ممکن ہے۔

مرنوش:۔ (تمسخر کے ساتھ) شکر ہے کہ یملیخا تم ہمارے ساتھ تھے ورنہ خدا اور مسیح کیوں ہمارے لئے یہ معجزہ دکھاتے۔

(ناگہاں غار سے باہر شور و غل کی آواز آتی ہے)

مرنوش:۔ "یہ کیا ہے"

یملیخا:۔ "یہ تو آدمیوں کا شور و غل معلوم ہوتا ہے۔

مرنوش:۔ "چلو قصہ ختم ہوگیا، اس سوار نے ضرور اس کی اطلاع دقیانوس کو کر دی ہے اور اب اس نے ہمارے گرفتار کرنے کے لئے سپاہی بھیجے ہیں۔

(آوازیں قریب تر آتی جاتی ہیں)

لوگ:۔ (باہر سے) اے خزانہ والو، اے دفینہ پانے والو، باہر نکلو، ڈرو نہیں۔

مرنوش:۔ (آہستہ آہستہ) خزانہ؟ خزانہ کیسا؟ یہ کہہ کیا رہے ہیں؟

لوگ:۔ (غار کے دروازہ کے قریب پہونچکر) یہ ہے غار کا دروازہ، چلو اندر چلیں،

بعض آوازیں:۔ "مگر اندر تو بہت اندھیرا ہے"

کچھ اور آوازیں:۔ "مشعلیں روشن کرو"

(تھوڑی دیر کے بعد غار کے اندر روشنی سی آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور پھر چند آدمی ہاتھوں میں مشعل لئے ہوئے نمودار ہوتے ہیں، لیکن جونہی ان لوگوں پر نگاہ پڑتی ہے گھبرا کر چیخ مارتے ہیں اور اُلٹے پاؤں واپس جانے ہیں)

آوازیں:۔ "بھوت ہیں، بھوت، بھاگو یہاں سے،

(سب آدمی مشعلیں چھوڑ چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں اور یہ تینوں بُت کی طرح ساکت و جامد اپنی اپنی جگہ سوچ رہے ہیں کہ کیا وہ واقعی مر چکے ہیں اور کیا وہ حقیقتاً بھوت ہو گئے ہیں)

دوسرا ایکٹ

(قصر شاہی کا کمرہ - شاہزادی پریسکا کنیزوں کے درمیان کھڑی ہے
اور ہاتھ میں ایک کتاب لئے ہوئے ہے)

پریسکا :- غالیاس کہاں ہے، آج صبح سے اس کا پتہ نہیں،
(آتالیق)

(غالیاس نمودار ہوتا ہے، بہت گھبرایا ہوا جلدی جلدی آرہا ہے - یہ
نہایت ضعیف العمر شخص ہے اور تمام بال سفید ہیں)

غالیاس :- (ہانپتے ہوئے) اے شاہزادی میں حاضر ہوگیا ہوں

پریسکا :- غالیاس، تم اسقدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو، پسینے پسینے ہورہے ہو، کیا بات ہے، خیر تو ہے ؟

غالیاس :- اے شاہزادی میں شہر میں تھا - اور - اور -

شاہزادی :- اور - کیا، شہر میں کوئی نئی بات دیکھی - بادشاہ سلامت دیر سے تمھیں یاد کر رہے ہیں -

غالیاس :- (جاتے ہوئے) کیا بادشاہ نے مجھے طلب کیا تھا ؟

پریسکا :- ذرا ٹھہرو - تم دیکھتے ہو میرے ہاتھ میں کیا ہے، یہ تعبیر نامہ ہے - اے غالیاس، رات میں نے عجیب و غریب خواب دیکھا ہے -

غالیاس :- اے شاہزادی خیر ہو، وہ خواب کیا ہے ؟

پریسکا :- میں نے یہ خواب دیکھا کہ میں زندہ دفن کر دی گئی ہوں

غالیاس :- (کچھ سوچکر) یا خدا، اس خواب کا تعلق اس واقعہ سے تو نہیں جو آج شہر میں مشہور ہے -

پریسکا :- وہ کیا واقعہ ہے ؟

غالیاس :- یہ کہ شاہ دقیانوس کے زمانہ کا خزانہ وادی رقیم کے غار میں مدفون ہے

پریسکا :- (سوچکر) - دقیانوس !

غالیاس :- ہاں، دقیانوس، اے شاہزادی میں نے تاریخ قدیم کے سلسلہ میں آپ کو اس بادشاہ کا حال سنایا ہے

پریسکا :- ہاں، ہاں مجھے یاد آگیا، وہی نا جس کی بیٹی کے نام پر میرا نام رکھا گیا ہے -

غالیاس :- بالکل ٹھیک، یہ وہی دقیانوس ہے جس کی لڑکی کی نسبت کاہنوں نے یہ بتایا تھا کہ آپ بالکل اسی کی صورت لیکر پیدا ہوئی ہیں اور اسی لئے آپ کا نام بھی وہی رکھا گیا جو اس کا تھا -

پرلیسکا :- کیا تمہارا بھی یہی خیال ہے کہ کاہنوں نے یہ بات سچ کہی تھی، کیا میں واقعی اس کی ہمشکل ہوں،
غالیاس میرا بہت جی چاہتا ہے کہ اپنی ہمشکل شاہزادی کا حال معلوم کروں، لیکن تم کچھ تفصیل سے بتاتے ہی نہیں

غالیاس :- اے شاہزادی، مجھے جو کچھ معلوم تھا عرض کر چکا ہوں کہ وہ مسیح کی معتقد تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب مسیح کا نام لینا بھی جرم سمجھا جاتا تھا۔ اس نے اپنا مذہب اپنے باپ سے پوشیدہ رکھا اور ہمیشہ راہبہ کی زندگی بسر کی، اس نے شادی بھی نہیں کی اور پچاس سال کی عمر میں مرگئی

پرلیسکا :- میں نے سنا ہے کہ جب اس سے شادی کے لئے اصرار کیا جاتا تھا تو وہ کہتی تھی کہ میں ایک پاک عہد کی پابند ہوں اور اس کو نہیں توڑ سکتی کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ عہد اس نے کس سے کیا تھا؟

غالیاس :- اے شاہزادی یہ عہد اس نے اللہ سے کیا تھا

پرلیسکا :- نہیں میں سمجھتی ہوں کہ یہ عہد اس نے اپنے کسی محبوب سے کیا تھا،

غالیاس :- (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) استغفر اللہ نہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ اس نے غیر اللہ سے عہد کیا ہو،

پرلیسکا :- کیوں اس میں حرج ہی کیا ہے۔ کیا عورت سوائے اللہ کے کسی سے مانوس ہی نہیں ہو سکتی اے غالیاس، تجھے عورت کے دل کا حال کیا معلوم۔

غالیاس :- نہیں شاہزادی، مجھے اس کے سارے حال کی اطلاع ہے

پرلیسکا :- ہاں، ایک ضعیف شخص کی اطلاع ایسی ہی ہوا کرتی ہے

غالیاس :- کل ہی میں نے ایک قدیم نسخہ میں پڑھا ہے کہ وہ ہمیشہ یہی کہا کرتی تھی کہ "میں روز انتظار کرتی ہوں اور برابر اسی طرح منتظر رہوں گی جب تک وہ واپس نہ آجائے۔

پرلیسکا :- یہ کس کا انتظار تھا، کس کی واپسی کی تمنا تھی؟

غالیاس :- مسیح کی واپسی کا انتظار تھا، اُن کے آسمان سے واپس آنے کی تمنا تھی۔

پرلیسکا :- تو وہ واقعی بڑی سچی راہبہ تھی

غالیاس :- اس میں کیا شک ہے، اے شاہزادی

پرلیسکا :- کیا یہ صحیح ہے کہ جو طلائی صلیب میری گردن میں پڑی ہوئی ہے یہ اُسی کی تھی؟

غالیاس :- بالکل صحیح ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ مسیح نے اس کی گردن میں صلیب پہنائی، صبح کو جب بیدار ہوئی تو صلیب موجود تھی اور پھر مرتے وقت تک اپنے پاس سے اس نے جدا نہیں کی،

پرسیکا :— کیا اس نے اسی کمرہ میں انتقال کیا تھا؟
غالیاس :— ہاں، وہ ہمیشہ اسی کمرہ میں تنہا رہا کرتی تھی، اور یہیں اب سے ۲۰۰ سال قبل اسنے جان دی۔
پرسیکا :— وہ کیوں اس حصئہ مکان کو اتنا زیادہ پسند کرتی تھی؟
غالیاس :— اے شاہزادی اس کا حال اب کیا معلوم ہو سکتا ہے۔
پرسیکا :— (کچھ دیر سکوت کے بعد) معلوم نہیں میں کیوں اس شہزادی کا حال معلوم کرنے کے لئے اس قدر بیتاب ہوں۔
غالیاس :— اے شہزادی کون کہہ سکتا ہے کہ آپ کا رجحان بھی ویسا ہی ہو جائے اور کاہنوں کی پیشین گوئی پوری ہو کر رہے
پرسیکا :— میں اور راہبہ کی زندگی - سب کچھ ممکن ہے سوائے اس کے؟
(باہر سے ایک آواز "غالیاس، غالیاس" پکارتی ہوئی سنائی دیتی ہے)
غالیاس :— (گھبرا کر) بادشاہ یاد فرما رہے ہیں
بادشاہ :— (اندر داخل ہوتے ہوئے) اے غالیاس، تم نے بھی کچھ سنا ہے
غالیاس :— ہاں، اے آقا، میں نے بھی دفینہ کی خبر سنی ہے
بادشاہ :— صرف دفینہ نہیں بلکہ بھوتوں کی بھی۔
غالیاس اور پرسکا— (دونوں ایک ساتھ گھبرا کر) — بھوت!
بادشاہ :— کیا تم لوگوں کے ساتھ غار تک نہیں گئے کہاں تھے؟
غالیاس :— میں لوگوں کے ساتھ شکاری کا بیان سُن رہا تھا اور غار کی طرف جانے ہی والا تھا کہ شہزادی کے درس کا خیال آگیا
بادشاہ :— وہ شکاری واپس آیا ہے اور عجیب عجیب باتیں بیان کرتا ہے کہتا ہے کہ غار کے اندر تین انسان عجیب وغریب ہیئت کے ہیں اور ان کے ساتھ ایک کتا بھی ہے
غالیاس :— (سوچتا ہوا) کیا یہ وہی لوگ تو نہیں ہیں؟
بادشاہ :— کون لوگ؟
غالیاس :— اے آقا، وہی تین جن کا چوتھا کتا ہے
بادشاہ :— اے غالیاس وہ کون ہیں صاف صاف کہو؟
غالیاس :— (آپ ہی آپ حد درجہ عالم تاثر میں) ہاں، ہاں وہی تین جن کا چوتھا رفیق کتا ہے

پرلیسکا :۔ اے غالیاس وہ کون ہیں ؟

غالیاس :۔ اے شہزادی کیا میں نے آپ سے تاریخ شہدا ، کا ذکر کرتے ہوئے نہیں بتایا تھا کہ اشراف روم میں سے بعض نے مسیحی مذہب اختیار کر لیا تھا اور دقیانوس کے خوف سے وہ بھاگ گئے تھے اس کے بعد وہ واپس نہیں آئے ۔ میں نے قدیم کتابوں میں پڑھا ہے کہ ایک دن وہ پھر ظاہر ہوں گے اور ۔۔۔

بادشاہ :۔ یہی اس بڈھے کا بھی بیان ہے جو لوگوں کے ساتھ غار تک گیا تھا

پرلیسکا :۔ (ڈر اور شوق کے جذبہ کے ساتھ) اس نے کیا کہا ، ابا جان ؟

بادشاہ :۔ " یہی کہ وہ بھوت نہیں ہیں اور ہمارے آبا و اجداد سے یہ روایت چلی آتی ہے کہ دقیانوس کے زمانہ میں دو سردار دین مسیحی اختیار کر کے چلے گئے تھے ، پھر ایک چرواہا معہ اپنے کتے کے ان سے ملگیا اور یہ کہ وہ عنقریب ظاہر ہونے والے ہیں "

پرلیسکا :۔ لیکن تعجب ہے کہ ہمارے زمانہ کے لوگوں نے اس کو بالکل فراموش کر دیا تھا ،

غالیاس :۔ ہاں ، اے شاہزادی ، اولیاء اللہ اسی زمانہ میں ظہور کرتے ہیں جب اُن کو بھلا دیا جاتا ہے ۔

بادشاہ :۔ اے غالیاس ، کیا تجھے یقین ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں ،

غالیاس :۔ مجھے بالکل یقین ہے اور اے آقا آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ وہ آپ کے عہد میں ظاہر ہوئے

بادشاہ :۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس میں شک نہیں کہ میں بڑا خوش قسمت ہوں

غالیاس :۔ یقیناً صحیح ہے اور یہ وہی اولیاء کرام ہیں جن کا نام راہبوں کی کتابوں میں مرنوش ، مشلینا ، یلیخا اور کتے کا نام قطمیر درج ہے ۔

پرلیسکا :۔ اے غالیاس ، مجھے ابتک یقین نہیں آیا اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا ہونا کیونکر ممکن ہے

غالیاس :۔ جسوقت شکاری نے مجھ سے اس عجیب و غریب آدمی اور عہد دقیانوس کے سکّہ کا ذکر کیا ، مجھے اسی وقت شبہ ہوا تھا لیکن جب بعد کو یہ معلوم ہوا کہ غار میں ایک نہیں بلکہ تین آدمی ہیں اور کتا بھی ان کے ساتھ ہے تو مجھے بالکل یقین آگیا کیونکہ تاریخ کی کتابوں میں یہی لکھا ہے اور اب شک کی کوئی گنجایش نہیں ،

پرلیسکا :۔ لیکن وہ اتنے زمانہ تک زندہ کیونکر رہے ؟

بادشاہ :۔ بیشک ۳۰۰ سال تک غار کے اندر زندہ رہنا سخت حیرتناک امر ہے ۔

غالیاس :۔ اے آقا اس میں حیرت کی کیا بات ہے ، ہندوستان کی قدیم کتابوں سے بھی ایسے واقعات کا پتہ چلتا ہے ۔

بادشاہ :- وہ کیا؟
غالیاس :- جاپان کی مذہبی کتابوں میں تحریر ہے کہ میکاڈو یوریاکو کے اکیسویں سال حکومت میں ایک نوجوان شکاری اوراشیما جو شہر یوشاکا رہنے والا تھا اپنی کشتی میں شکار کے لئے نکلا اور پھر نہ واپس آیا، نہ اسکا کوئی حال معلوم ہوسکا۔ اس کے چار سو سال کے بعد میکاڈو جونجوا کے زمانہ میں وہ پھر ظاہر ہوا،
پریسکا :- یہ نوجوان چار صدی تک کہاں رہا
غالیاس :- مجھے اس سے زیادہ اور کوئی حال معلوم نہیں
پریسکا :- اے غالیاس، تیرا ہر علم ناقص ہے اور تو جو کچھ کہتا ہے وہ بالکل سطحی ہوتا ہے
غالیاس :- اے شاہزادی، بات یہ ہے کہ آپ کی ذہانت کسی بات پر مطمئن نہیں ہوتی ورنہ جو کچھ میں نے کہا اس کے سمجھ میں نہ آنے کی کوئی وجہ نہیں
بادشاہ :- کیا واقعی اور ملکوں میں اس قسم کی روایات پائی جاتی ہیں
غالیاس :- اے آقا کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں اس نوع کی روایات نہ پائی جاتی ہوں اور اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا ہونا ناممکن نہیں ہے
بادشاہ :- پھر انتظار کیا ہے، تم جاکر ان کو یہاں کیوں نہیں لے آتے ؟

(باہر سے ہنگامہ کی آواز سنائی دیتی ہے)

بادشاہ :- غالیاس، جاؤ دیکھو یہ کیسا شور ہے،
پریسکا :- ابا جان، کیا یہ لوگ واقعی انسان ہیں
بادشاہ :- بیٹی، ڈرو نہیں، یہ واقعی انسان ہیں

(غالیاس گھبرایا ہوا واپس آتا ہے)

غالیاس :- "وہی ہیں وہی"
بادشاہ :- کون ؟
غالیاس :- وہی اصحاب کہف

(پریسکا کے منہ سے ہلکی چیخ کی آواز نکل جاتی ہے)

بادشاہ :- (گھبراکر) وہ یہاں کیونکر آگئے ؟
غالیاس :- لوگ انھیں پکڑ کر یہاں لے آئے ہیں اور اب شاید قصر کے اندر پہونچ گئے ہوں گے،
پریسکا :- (ڈرتی ہوئی) غالیاس، او غالیاس، ادھر آ، میرے پاس آکر کھڑا ہوجا، مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔

غالیاس :۔ (جوش کے ساتھ بادشاہ سے) اے آقا، چلئے ہم سب ان کا استقبال کریں
بادشاہ :۔ (کچھ سوچتا ہوا) ہاں آؤ چلیں
پریسکا :۔ ابا جان، آپ نہ جائیے، آپ کی آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ان سے کوئی خوف ہے۔
بادشاہ :۔ مجھے ؟
پریسکا :۔ ہاں، ابا جان، آپ کو، میں قسم کھاکر کہتی ہوں کہ آپ ڈر رہے ہیں
غالیاس :۔ اے شہزادی، ہمارا بادشاہ مومن و دیندار ہے، اسے کیا خوف ہو سکتا ہے۔
بادشاہ :۔ ٹھیک ہے اے غالیاس بالکل ٹھیک ہے،

(ہنگامہ کی آواز قریب تر ہوتی جاتی ہے)

غالیاس یہ کیا ہے
غالیاس :۔ وہی ہیں، آیئے جلدی قدم بڑھاکر انھیں لے آئیں
پریسکا :۔ (غالیاس کا ہاتھ پکڑ کر) نہیں غالیاس، تم نہ جاؤ میں تنہا نہیں رہ سکتی

(باہر سے مشلینا کی آواز کانوں میں آتی ہے)

مشلینا :۔ اے یملیخا، یہاں تو سب وہی ہے جو ہم کل چھوڑ گئے تھے۔ کوئی چیز بدلی ہی نہیں،
مرنوش :۔ واقعی، یہ کمرہ تو بالکل جوں کا توں ویسا ہی ہے

(تینوں کمرے میں داخل ہوتے ہیں اس حال میں کہ سر کے بال کھلے ہوئے پریشان ہیں، داڑھیاں سینوں پر لٹک رہی ہیں قدیم وضع کے کپڑے جسم پر ہیں اور لوگ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں پریسکا ان کو دیکھتے ہی چیخ اٹھتی ہے اور غالیاس کا دامن پکڑ لیتی ہے)

مشلینا :۔ (بے اختیارانہ انداز سے) آہ، اے پریسکا،
پریسکا :۔ (انتہائی اضطراب کے ساتھ غالیاس سے) اے غالیاس تو نے سنا یہ تو مجھے جانتا ہے میرا نام لیکر پکارتا ہے
غالیاس :۔ ہاں، ہاں کیوں نہیں، یہ لوگ ولی ہیں اور سب کچھ جانتے ہیں۔

(شکاری آگے بڑھکر بادشاہ سے مخاطب ہوتا ہے)

شکاری :۔ اے آقا، ہم لوگ ان کو غار سے یہاں لائے ہیں تاکہ بادشاہ خود اُن کے باب میں کوئی فیصلہ کرے
مرنوش :۔ (مشلینا کے کان میں) معلوم ہوتا ہے دقیانوس کا خلیفہ یہی ہے،

(مشلینا جو سوائے شاہزادی کے اور تمام دنیا کو محو سے کئے ہوئے ہو
پھر پریسکا کا نام لیکر پکار اٹھتا ہے)

پریسکا :- اسے غالیاس، خدا کے لئے مجھے یہاں سے لیچل۔ یہ شخص تو مجھے بری طرح گھور رہا ہے
(پریسکا جھجکتے سے دروازہ کھولکر اندر چلی جاتی ہے اور مشلینا اسکی
طرف دیکھتا رہتا ہے گویا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے)

بادشاہ :- (آگے بڑھکر) اسے مقدس بزرگو، میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں، اور اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ جو تمنا اس سے قبل میرے آباؤ اجداد کے زمانہ میں پوری نہ ہوسکتی تھی وہ آج میرے زمانہ میں پوری ہورہی ہے۔

یملیخا :- (بادشاہ کی طرف اشارہ کرکے مرنوش سے) ذرا اس کا لباس تو دیکھو، یہ ہم کس ملک میں آگئے ہیں

بادشاہ :- بیشک یہ میرے لئے فخر کی بات ہے کہ آپ میرے آباؤ اجداد کے زمانہ میں ظاہر نہیں ہوئے حالانکہ وہ بھی مسیحی تھے اور میں بھی مسیح کا ماننے والا ہوں۔

یملیخا :- (خوش ہوکر مرنوش سے) تو مسیحی ہے،

مرنوش :- (اس کو خاموش کرتے ہوئے) ہاں، ہاں مسیحی نہیں تو کیا کوئی اور ہے۔

بادشاہ :- (شکاری سے) اسے شکاری میں تجھے انعام دوں گا کہ تو نے ان بزرگوں کی آرامگاہ کا پتہ چلایا۔

مرنوش :- (آپ ہی آپ) کیا یہ بادشاہ دیوانہ ہوگیا ہے

بادشاہ :- اسے مقدس بزرگو یہ قصر آپ کا گھر ہے اور ہم لوگ سب آپ کے خادم، کوئی حکم دیجئے تاکہ ہم اس کی تعمیل کریں۔

مرنوش :- خدا کا شکر ہے کہ اس نے ایک ہی دن میں دقیانوس کو ہلاک کرکے اس کا جانشین ایسے دیندار و نیک دل شخص کو بنایا۔ اسے بادشاہ میں ضرور یہاں قیام کرتا لیکن میرے اہل و عیال متفکر ہونگے اس لئے مجبور ہوں اور جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔

یملیخا :- میں بھی نہیں ٹھہر سکتا معلوم نہیں میری بھیڑوں کا گلہ کس حال میں ہوگا۔

بادشاہ :- (گھبراکر) غالیاس - غالیاس۔

مرنوش :- نہیں اس کی ضرورت نہیں، میں اپنے گھر کا راستہ اچھی طرح جانتا ہوں، خود چلا جاؤں گا۔
(مرنوش اور یملیخا دونوں یکے بعد دیگرے باہر چلے جاتے ہیں)

مشلینا :- اسے بادشاہ میں اپنے حجرہ میں جانا چاہتا ہوں۔ وہاں کپڑے بدلوں گا، بال درست کرونگا اور نہاؤنگا

تاکہ شاہزادی مجھ سے نفرت نہ کرے۔

بادشاہ :- (گھبرایا ہوا) غالیاس . غالیاس

مشلینا :- نہیں اس کی حاجت نہیں، مجھے اپنا حجرہ معلوم ہے

بادشاہ :- (دروازہ کے پاس جاکر) غالیاس

غالیاس :- (باہر سے) حاضر ہوا اے آقا (سامنے آکر) کیا حکم ہوتا ہے۔ ارے یہ لوگ کہاں چلے گئے

(بادشاہ اشارہ سے لوگوں کو چلے جانے کا حکم دیتا ہے اور وہ سب چلے جاتے ہیں)

بادشاہ :- اے غالیاس، یہ اصحاب کہف کیا سب پاگل ہیں؟

غالیاس :- توبہ، توبہ، اے آقا یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ یہ آخر چلے کہاں گئے۔

بادشاہ :- ایک اپنے گھر گیا، دوسرا اپنی بھیڑوں کو دیکھنے چلا گیا اور تیسرا شہر گھومنے کیلئے بجوسترا میں داخل ہو گیا

(کمرہ سے باہر چیخ پکار کی آواز آتی ہے)

غالیاس :- "یہ کیا ہے"

(مرنوش پھر اندر داخل ہوتا ہے)

مرنوش :- اے بادشاہ مجھے ایک بات کہنا ہے وہ یہ کہ جب میں اپنے اہل وعیال کے پاس جاؤں گا تو کوئی تحفہ لیجانا ضروری ہے۔ میرے پاس کچھ سکے ضرور موجود تھے لیکن وہ دقیانوس کے وقت کے ہیں اور تمہاری حکومت میں ان کا چلن باقی نہیں رہا۔ اس لئے دیکھنا چاہوں کہ کیا کروں؟

(بادشاہ حیرت سے اسے دیکھتا ہے)

مرنوش :- اے بادشاہ تم نے اچھا کیا کہ دقیانوس کے زمانہ کی ہر چیز بدل دی تاکہ ایک کافر و دیندار بادشاہ کے زمانہ میں نمایاں فرق پیدا ہو جائے۔ لیکن حیرت ہے کہ ایک ہی ہفتہ میں لباس بھی بالکل بدل گیا، مکان کی حالت بھی اور ہو گئی، راستے بھی وہ نہ رہے اور شہر کا شہر دوسرا ہو گیا۔

بادشاہ :- (دروازہ کی طرف دیکھ کر) غالیاس، اے غالیاس۔

غالیاس :- (باہر سے) حاضر ہوا۔ (غالیاس داخل ہوتا ہے)

بادشاہ :- (مرنوش کی طرف اشارہ کرکے) دیکھو یہ کیا کہہ رہے ہیں، میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں

غالیاس :- (مرنوش کی طرف جھک کر) اے قدیس بزرگ آپ کو خبر نہیں کہ کتنی صدیاں آپ کے انتظار میں گزر چکی ہیں، اور حقیقتاً یہ ہمارے بادشاہ کی خوش بختی ہے کہ آپ نے اس عہد میں ظہور فرمایا۔

مرنوش :- (آپ ہی آپ) یہ شخص پاگل تو نہیں ہوگیا۔

بادشاہ :- (غالیاس سے) یہ تو میں سب کہہ چکا ہوں۔ اب یہ دریافت کرو کہ آیندہ کیا ارادہ ہے۔

غالیاس :- ارادہ ؟ سوائے خدا کی عبادت اور گوشہ نشینی کے اور کیا ارادہ ان کا ہوسکتا ہے۔ مہمانخانہ میں ان کو ٹھہرایئے اور خدام کو ان کی خدمت پر مامور کرکے ان کے احکام کی تعمیل کا اہتمام کیجئے۔ (مرنوش سے) اے قدیس محترم، آیئے تشریف لایئے۔

مرنوش :- (بغیر حرکت کئے ہوئے) کہاں ؟

غالیاس :- اپنی عبادتگاہ میں۔ (ہاتھ پکڑ کر لیجانا چاہتا ہے)

مرنوش :- (غصہ سے ہاتھ چھڑا کر بادشاہ سے) میں پوچھتا ہوں کہ مجھ پر اس دیوانہ کو کیوں مسلط کیا گیا ہے، میں تو اپنے گھر جانا چاہتا ہوں اور اسی کی اجازت چاہتا ہوں

بادشاہ :- (غالیاس) ۔ سنا تم نے یہ کیا کہہ رہے ہیں

غالیاس :- ہاں، ہاں میں جانتا ہوں آپ کا گھر کہاں ہے، آپ چلے جایئے گا، لیکن کچھ دیر تو ہم لوگوں کو اپنی صحبت سے مستفید ہونے دیجئے۔

مرنوش :- (حیرت سے) کیا تم میرا گھر جانتے ہو؟

غالیاس :- میں اور آپ کا مکان نہ جانوں

مرنوش :- میں نے تو سوائے چند خاص آدمیوں کے کسی اور کو بتایا ہی نہیں

غالیاس :- اے قدیس محترم، تو کیا میں ان مخصوص لوگوں میں سے نہیں ہوں، آپ کی یاد میں میرے بال تک سفید ہوگئے

مرنوش :- میں نے تو تمھیں آج سے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں

غالیاس :- میں تو آپ کو ز روز خواب میں دیکھتا تھا اور جانتا تھا کہ آپ کا مسکن کہاں ہے

مرنوش :- بالکل غلط ہے۔ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں تمھیں کس کس نے میرے مسکن کا پتہ دیا؟

غالیاس :- میرے ایمان نے

مرنوش :- خیر وہ تمھارے ایمان نے بتایا ہو یا کسی اور چیز نے، مجھے بتاؤ کہ میرا گھر کہاں ہے اور کس سمت میں ہے؟

غالیاس :- (اوپر کی طرف گردن اُٹھاکر) آسمان میں

مرنوش :- (بادشاہ سے) میں نہ کہتا تھا کہ یہ شخص دیوانہ ہے، اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے

بادشاہ :- (غالیاس سے) تم ٹھہرو، میں جاتا ہوں

غالیاس :- (گھبراکر) اے مولا، توکیا آپ مجھے یہاں تنہا چھوڑے جاتے ہیں۔

(بادشاہ جانے لگتا ہے لیکن دفعتہً یلیخا کے اندر آجانے سے رک جاتا ہے)

یلیخا :- (بادشاہ اور غالیاس کی طرف اشارہ کرکے۔ مرنوش سے) یہ آپ بھی کن لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں؟

(بادشاہ اور غالیاس خوفزدہ دروازہ کھولکر نکل جاتے ہیں)

مرنوش :- یلیخا، کیا بات ہے!

یلیخا :- کچھ نہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ آیئے غار میں واپس چلیں۔ یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں۔

مرنوش :- کیوں؟

یلیخا یہ دنیا ہی کچھ اور ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ کہاں آگیا۔

مرنوش :- میں سمجھا نہیں، صاف صاف کہو

یلیخا :- یہ بتایئے کہ ہم لوگ غار میں کتنے دن رہے،

مرنوش :- یہی کوئی ہفتہ عشرہ

یلیخا :- اے مرنوش، ہم لوگ سب مر چکے ہیں، پورے تین سو سال مرے ہوئے ہو چکے ہیں اور یہ ہم نہیں ہیں بلکہ ہمارے بھوت ہیں جو چل پھر رہے ہیں،

مرنوش :- یلیخا، کیا تو کچھ پی گیا ہے؟

یلیخا :- میں پی وی کچھ نہیں گیا ہوں۔ ذرا باہر شہر میں نکل کے تو دیکھئے کہ کیا رنگ ہے، وہاں پہونچکر سب سمجھ میں آجائے گا۔

مرنوش :- کیا؟

یلیخا :- یہی کہ اب اس شہر میں ہم ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہر سکتے۔

مرنوش :- کیوں، کیا یہاں انسان آباد نہیں ہیں، کیا، روم روم نہیں رہا آخر بات کیا ہے؟

یلیخا :- انسان تو ہیں لیکن نہ وہ ہماری بات سمجھ سکتے ہیں نہ ہم ان کی

مرنوش :- اچھا تو ان سے بات نہ کر اور اپنے گھر میں جاکر بیٹھ رہ۔ تیرے اہل وعیال تو ہیں نا؟

یلیخا :- اب تین سو سال کے بعد اہل وعیال کہاں

مرنوش :- اسے شقی، یہ تو کیا کہہ رہا ہے،

یلیخا :- تنہا میں ہی شقی نہیں، ہم تینوں شقی ہیں اور یہ قطمیر بھی ہمارے ساتھ شقی ہوگیا ہے۔ اب سوائے

غار کے اور کہیں ہم لوگوں کا ٹھکانا نہیں۔ میں اگر یہاں رہا بھی تو فوراً مر جاؤں گا۔

مرنوش :۔ کیا تو پاگل ہوگیا ہے؟

یملیخا :۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ آپ تو غار لوٹ چلئے۔ وہی ہماری کھوئی ہوئی دنیا ہے اور وہیں ہمارا ٹھکانا۔

مرنوش :۔ کیا کوئی انسان باور کرسکتا ہے جو تو کہہ رہا ہے، تیری نظریں دھوکا کھاتی ہیں، دھوکا!"

یملیخا :۔ خود باہر نکل کر دیکھئے تو معلوم ہو کہ میری نظر دھوکا کھا رہی ہے یا ساری دنیا کی۔ لوگوں کے لباس بدل گئے، مکان کی صورتیں اور ہوگئیں، شہر کچھ کا کچھ ہوگیا

(مشلینا داخل ہوتا ہے جس کی داڑھی مونچھ صاف ہے اور نئے قسم کا لباس پہنے ہوئے ہے)

دیکھو، آجکل کے لوگوں میں سے یہ بھی ایک ہے۔

مرنوش :۔ (مشلینا سے) تم کون ہو۔

مشلینا :۔ (مسکراتا ہوا) میں ہوں، مشلینا، تم نے پہچانا نہیں؟

مرنوش :۔ یہ تم بدل کیسے گئے

مشلینا :۔ میں نے استرا طلب کرکے داڑھی مونچھ صاف کی، کپڑے منگا کر پہنے لیکن یہ بھی تمہیں معلوم ہے کہ ہم لوگ غار میں کتنے دن رہے

مرنوش :۔ یملیخا کہتا ہے کہ تین سو سال سے زاید زمانہ گزرا۔

مشلینا :۔ ٹھیک کہتا ہے۔ لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں، جب تک پرلیکا زندہ ہے، میں وہی ہوں اور زمانہ وہی۔

مرنوش :۔ تو یوں کہو کہ یہ تمام بناؤ سنگھار اس لئے تھا۔ میں بھی اسی طرح بن سنور کر اپنے اہل وعیال کے پاس جاؤں گا۔

مشلینا :۔ اور یملیخا بھی؟

یملیخا :۔ اے نوجوانو، مجھے تو تم میرے حال پر چھوڑ دو۔ تین سو سال کے بڈھے پر رحم کرو۔

مرنوش :۔ یملیخا کو چھوڑ دو اس کا کون ہے جس کے لئے وہ بنے سنورے گا

(یملیخا چلا جاتا ہے اور مشلینا و مرنوش اسے دیکھتے رہتے ہیں)

تیسرا ایکٹ

(قصر شاہی کا کمرہ ہے اور وقت رات کا۔ روشنی سے مکان جگمگا رہا ہے اور مشلینا بیتابانہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے کہ غالیاس نمودار ہوتا ہے)

مشلینا:۔ (غالیاس کی طرف بڑھتے ہوئے)۔ شاہزادی کہاں ہے؟

غالیاس:۔ اے قدیس،

مشلینا:۔ کیا تو نے سنا نہیں جو میں نے کہا؟

غالیاس:۔ ہاں، سُنا

مشلینا:۔ پھر تو نے کیا جواب دیا؟

غالیاس:۔ کچھ نہیں، اے قدیس

مشلینا:۔ کچھ نہیں؟ کیا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ میں شاہزادی سے باتیں کرنا چاہتا ہوں اور آج رات کو اس سے ملنا ضروری ہے، چاہے کچھ ہو۔

غالیاس:۔ اے قدیس،

مشلینا:۔ قدیس، قدیس اپکے چلا جاتا ہے اور میری بات کا جواب نہیں دیتا، میں پوچھتا ہوں شاہزادی کہاں ہے، تو کہتا ہے۔ قدیس۔ خبردار جو اب مجھے قدیس کہا۔ میں قدیس نہیں ہوں۔

غالیاس:۔ ہاں، اے قدیس

مشلینا:۔ پھر وہی۔ تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ تو یہاں قصر میں کرتا کیا ہے؟

غالیاس:۔ شاہزادی کا اتالیق ہوں

مشلینا:۔ اتالیق، شاہزادی کا اتالیق! میں نے تو سوائے آج کے تجھے قصر میں کبھی دیکھا نہیں

غالیاس:۔ اے قدیس، میں، میں۔

مشلینا:۔ پھر وہی۔ میں پوچھتا ہوں کہ شاہزادی کہاں ہے اور تو پاگلوں کی طرح ایک ہی بات رٹتا چلا جا رہا ہے۔ چل دور ہو یہاں سے۔

(غالیاس جانے لگتا ہے اور مشلینا اس کو روک کر کہتا ہے)

مرنوش کی بھی کچھ خبر ملی یا نہیں۔ کل سے وہ گھر گیا ہوا ہے اور اب تک لوٹا نہیں۔

غالیاس :۔ اسے قدیس، مجھے نہیں معلوم
مشلینا :۔ اور وہ غلام جو اس کے ساتھ ہوا یا لیکر گیا تھا وہ بھی لوٹا یا نہیں ؟
غالیاس :۔ اے قدیس، مجھے معلوم نہیں
مشلینا :۔ ہاں، تجھے کیا معلوم، جاہل کہیں کا۔ کمبخت تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے
غالیاس :۔ کون، وہ، اے قدیس!
مشلینا :۔ شاہزادی اور کون ؟
غالیاس :۔ بادشاہ کے پاس ہے
مشلینا :۔ ایسے ناوقت بادشاہ کے پاس اس کا کیا کام ؟
غالیاس :۔ بادشاہ رات کو کبھی کبھی اس کو بلا لیتا ہے تاکہ وہ اسے کچھ پڑھکر سُنائے
مشلینا :۔ خوابگاہ میں ؟ کیا یہی عہد مقدس ہے
غالیاس :۔ بیشک شاہزادی مسیحی مذہب رکھتی ہے اور عہد مقدس کی پابند ہے
مشلینا :۔ یہ تجھے کیونکر معلوم ہوا۔ کیا اس نے تجھ سے کبھی کچھ ذکر کیا تھا
غالیاس :۔ ہاں
مشلینا :۔ (غالیاس کا ہاتھ پکڑکر) آؤ، تم بڑے اچھے آدمی ہو۔ مجھ سے چھپاؤ نہیں، صاف صاف بتاؤ کہ بادشاہ سے اس کے کیا تعلقات ہیں۔
غالیاس :۔ اسے قدیس، بادشاہ بڑا دیندار مسیحی ہے
مشلینا :۔ تو کیا یہ دقیانوس کے خاندان کا نہیں ہے،
غالیاس :۔ بت پرست دقیانوس کا خاندان اور ہمارا بادشاہ! توبہ، توبہ۔ یہ آپ نے کیا خیال فرمایا،
مشلینا :۔ ہاں، بیشک یہ بادشاہ، دقیانوس کے خاندان کا نہیں ہوسکتا، کیونکہ میں نے بھی اس سے قبل اُسے کبھی نہیں دیکھا، لیکن حیرت یہ ہے کہ دو دن کے اندر مسیحی افواج آئیں بھی، دقیانوس کی حکومت کا تختہ بھی اُلٹ دیا اور ان کا سردار شاہزادی پریسکا پر قابض بھی ہوگیا یہاں تک کہ وہ رات کو اپنی خوابگاہ میں اسے بلا کر افسانے سنتا ہے۔ لیکن اسے غالیاس کیا تم کہہ سکتے ہو کہ وہ مجبوراً اسکے پاس جاتی ہے یا اپنی خوشی سے، کیا اس نے اپنا عہد توڑ دیا ؟
غالیاس :۔ اسے قدیس، وہ اپنے عہد پر اسی طرح قائم ہے جس طرح اس کی دادی پابند تھی۔ کاہن سے پوچھو اگر وہ زندہ ہو کہ وہ ہر صورت و شکل، مزاج و طبیعت الغرض ہر چیز میں بالکل اپنی پردادی پر گئی ہے۔

مشلینا :- پردادی ؟ کونسی پردادی ؟

غالیاس :- پریسکا

مشلینا :- یہ آخر تو بک کیا رہا ہے، کچھ دماغ خراب ہوگیا ہے، یا شراب پی لی ہے

غالیاس :- اے قدیس، میں جو کچھ کہتا ہوں، سچ کہتا ہوں۔ کاہن نے اس کی پیدائش کے دن یہی کہا تھا

مشلینا :- اچھا اب تم جاؤ، میرا دماغ خراب نہ کرو،

(غالیاس جانے لگتا ہے۔ لیکن مشلینا اسے پھر روکتا ہے)

اے بڈھے، ادھر سُن، کیا شاہزادی بادشاہ کے پاس سے لوٹ کر اپنے کمرہ میں جائیگی یا نہیں؛

غالیاس :- ہاں، جائے گی

مشلینا :- اور وہ اسی کمرہ سے گزرے گی

غالیاس :- ہاں، اے قدیس،

مشلینا :- اچھا تو اب تم جاؤ، تمھاری ضرورت نہیں۔ میں اس کا یہیں انتظار کروں گا

(دفعتہً ایک آواز باہر سے آتی ہے)

مرنوش :- (باہر سے) مشلینا۔ مش ــــ لی ــــ نا،

مشلینا :- (آپ ہی آپ) مجھے کون پکارتا ہے،

مرنوش :- (اندر آتے ہوئے) مشلینا،

مشلینا :- "مرنوشش"

(مرنوش داڑھی مونچھ صاف کئے ہوئے نئے لباس میں کراہتا ہوا نمودار ہوتا ہے)

یہ تمھیں کیا ہوگیا ہے

مرنوش :- (روتے ہوئے) میرا لڑکا مرگیا

مشلینا :- "کب"

(مرنوش زار زار رونے لگتا ہے)

مشلینا :- مرنوش روؤ نہیں، صبر کرو، تمھاری بیوی موجود ہے تو اور اولاد ہو جائے گی

مرنوش :- (ڈھاڑیں مارتے ہوئے) وہ بھی مرگئی،

مشلینا :- (حیرت سے) ارے۔ کیا ان سب کو کسی نے قتل کردیا۔ گھر میں کسی سے کچھ پتہ چلا یا نہیں۔

مرنوش :- گھر کہاں ؟ جہاں گھر تھا وہاں اب ایک بازار آباد ہے
مشلینا :- یہ تمام حال تمھیں معلوم کیسے ہوا ؟
مرنوش :- وہیں بازار میں ایک نہایت ضعیف العمر شخص ہے اسی سے پتہ چلا
مشلینا :- کیا یہ تمام سانحے اس کے سامنے ہوئے ہیں
مرنوش :- نہیں۔ یہ بات نہیں، بلکہ جب میں نے اپنے بیٹے کا نام بتایا تو اس نے کہا کہ ہاں میرے اجداد میں سے ایک شخص ضرور اس نام کا تھا، لیکن جب رومی فوجیں یہاں فاتحانہ داخل ہوئیں تو اس وقت اس کا انتقال ہوگیا۔
مشلینا :- تو کیا تمھارا بھی خیال وہی ہے جو کل یملیخا نے ظاہر کیا تھا کہ ہم صدیوں تک سوتے رہے ہیں۔
مرنوش :- اب اس میں شک کی گنجائش بھی کیا ہے،
مشلینا :- افسوس ہے تمھارا دماغ بھی یملیخا کی طرح خراب ہوگیا ہے،
مرنوش :- ہاں ہوگیا ہوگا، لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ ہمارے لئے اب اس نئی دنیا میں کوئی جگہ باقی نہیں ہے۔ آؤ مشلینا چلیں، یہاں زندگی بسر کرنا دشوار ہے۔
مشلینا :- تم بیوقوف ہو۔ مانا کہ یہ سب کچھ صحیح ہے، لیکن ابھی تو تم جوان ہو، میں بھی جوان ہوں جبتک احساس نہ بدلے، زمانہ نہیں بدلتا، آؤ اس نئی دنیا میں اک نئی زندگی پھر شروع کریں،
مرنوش :- نئی زندگی ! آہ، وہ زندگی جو ماضی سے بالکل منقطع ہوجائے بالکل بیکار ہے۔ عدم محض ہے ہم لوگ زمانۂ حال کی چیز نہیں ہیں بلکہ ماضی کی ملکیت ہیں اور ہم کو اسی طرف لوٹ جانا ہے اے مشلینا الوداع (مرنوش باہر جاتا ہے اور مشلینا متفکرانہ حالت میں کھڑا ہوا ہے کہ پریسیکا اندر داخل ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب ہے)

پریسیکا :- (گھبرا کر) ہائیں، یہ کون ہے ؟
مشلینا :- (آگے بڑھتے ہوئے) اے پریسیکا آخرکار تم آ ہی گئیں۔
(پریسیکا مبہوت کھڑی ہوئی ہے)
میں تو بڑی دیر سے تمھارا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن تم ایسی بھیانک کیوں دیکھ رہی ہو، بولو، پریسیکا بولو
پریسیکا :- (خوفزدہ آواز سے) اے قدیس،
مشلینا :- میں قدیس تو نہیں ہوں
پریسیکا :- کیا تم وہ ڈراؤنی صورت والے قدیس نہیں ہو جس کو میں نے کل دیکھا تھا۔

مشلینا :- ہاں وہی ہوں،
پرلیسکا :- مگر آج تو تم بالکل بدل گئے، بڑھے سے جوان ہو گئے
مشلینا :- مگر پھر بھی تم نے مجھے نہیں پہچانا، حالانکہ میں تمھیں پہچانتا ہوں،
پرلیسکا :- تم مجھے پہچانتے ہو۔ حیرت ہے۔ تم کون ہو،
مشلینا :- اے پرلیسکا، تو کیوں اس عورت کی طرح کر رہی ہے جو بیوفائی کرتی ہے اور سب کچھ بھلا دیتی ہے۔ پھر ہو سکتا ہے کہ تو نے محبت کی خیانت کی ہو، لیکن میں یقین کرنے کے لئے طیار نہیں۔
پرلیسکا :- یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ مجھ سے آج تک کسی نے ایسی باتیں نہیں کیں،
مشلینا :- تو کیا واقعی تم اپنا عہد واپس لینا چاہتی ہو
پرلیسکا :- عہد! واپس!! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟
مشلینا :- کیا تم نے یہ عہد نہ کیا تھا کہ سوائے میرے کسی اور سے شادی نہ کروگی۔
پرلیسکا :- (حیرانی سے) اب مجھے بھی یقین آگیا کہ واقعی تم پاگل ہو
مشلینا :- (خشونت کے ساتھ) بیشک پاگل ہوں، لیکن پاگل ہونا خاین و بیوفا ہونے سے بہتر ہے۔
پرلیسکا :- تو میں بیوفا ہوں، میں نے خیانت کی ہے! بتاؤ کیا بیوفائی میں نے کی ہے میں کس خیانت کی مجرم ہوں،
مشلینا :- پرلیسکا! کیا تو پرلیسکا نہیں ہے؟
پرلیسکا :- ان فضول باتوں کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ میں نے کیا خیانت و بیوفائی کی ہے،
مشلینا :- جانے دو، تفریح ہو چکی (آگے ہاتھ بڑھاتے ہوئے) آؤ! ادھر میرے پاس آؤ"
پرلیسکا :- (پیچھے ہٹتے ہوئے) کیا دماغ خراب ہو گیا ہے، الگ ہٹ کے بات کرو، یہ کیا تمیز ہے؟
مشلینا :- پرلیسکا یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ وہ شرم و حیا تمھاری کیا ہو گئی، وہ تمھاری ملکوتی آواز کی نرمی کہاں چلی گئی؟ وہ عہد محبت جو تم نے مجھ سے کیا تھا کیوں بھول گئیں۔
پرلیسکا :- پھر وہی دیوانگی کی باتیں شروع کر دیں،
مشلینا :- اچھا اگر تم نے عہد شکنی نہیں کی تو بتاؤ تم ابھی کس کے پاس تھیں
پرلیسکا :- اپنے باپ کے پاس اور کس کے پاس؟
مشلینا :- پرلیسکا، نہیں میرا مدعا یہ دریافت کرنا ہے کہ رات کو تم جس کے کمرے میں کچھ پڑھ کر سنا رہی تھیں وہ کون ہے!

پریسکا :- میرا باپ ہے۔ اور جب تک میں کچھ پڑھکر اسے سُناتی نہیں اسے نیند نہیں آتی
مشلینا :- تو کیا یہ دقیانوس نہیں ہے
پریسکا :- دقیانوس کو مرے ہوئے ۳۰۰ سال ہو گئے، میں اس کی بیٹی کیونکر ہو سکتی ہوں۔
(تھوڑے تامل کے بعد دفعتہً بلند آواز سے)
اچھا اب میں سمجھی کہ تم کس خبط میں مبتلا ہو،
مشلینا :- کیا، جلدی بتاؤ تم کیا سمجھیں؟
پریسکا :- تم جس پریسکا کا خواب دیکھ رہے ہو وہ میں نہیں ہوں، کوئی اور تھی،
مشلینا :- یہ کیا؟
پریسکا :- وہ یہ کہ تمھاری عمر ۳۰۰ سال کی ہے اور اتنی مدت تک تم غار میں سوتے رہے۔ وہ پریسکا جس کا خیال تم دل میں لئے ہوئے ہو وہ دقیانوس بت پرست کی بیٹی تھی جس نے دینِ مسیحی اختیار کر لیا تھا،
مشلینا :- اور صرف میری وجہ سے
پریسکا :- ہاں، میرا اتالیق ثاڈایاس یہ بھی کہتا ہے (اپنی گردن کی طلائی صلیب چھوتے ہوئے) یہ صلیب خواب میں آکر مسیح نے اس کو دی تھی
مشلینا :- اے پریسکا، یہ صلیب میں نے ہی تجھکو دی تھی، کیا تجھے یاد نہیں
پریسکا :- (مسکراتے ہوئے) اے مقدس راہب، تیری پریسکا کو مرے ہوئے ۳۰۰ سال ہو گئے۔
مشلینا :- (حیرت سے) پریسکا کو مرے ہوئے ۳۰۰ سال ہو گئے --- یہ میں کیا سن رہا ہوں،
پریسکا :- لیکن تم کو خوش ہونا چاہئے کہ وہ آخر وقت تک اپنے عہد پر قایم رہی اور اسی کمرہ میں اس نے اپنی جان دی۔ کیا تم دونوں یہیں ملا کرتے تھے؟
مشلینا :- ہاں، ہاں، یہی کمرہ ہے اور یہی جگہ جہاں ہم اور وہ دونوں ایک دوسرے سے اپنا دُکھ درد کہا کرتے تھے۔
پریسکا :- تو جاؤ اور اس پر آنسو بہاؤ، کیونکہ اب وہ نہیں ہے، (جانے لگتی ہے)
مشلینا :- (پریسکا کا دامن پکڑ کر) اے پریسکا، خدا کے لئے میرے پاس سے نہ جاؤ
پریسکا :- (دامن جھٹک کر) میں نے ابھی تم سے کہا نہیں کہ میں وہ پریسکا نہیں ہوں؟
مشلینا :- میں کیسے مان لوں کہ تم وہ پریسکا نہیں ہو، وہی نام، وہی صورت و شکل، وہی عمر اور وہی۔۔۔"

پریسکا :- تم کو معلوم نہیں کہ جس وقت میں پیدا ہوئی تو کاہن نے مجھے دیکھ کر کہا تھا کہ میری صورت بالکل دقیانوس کی بیٹی کی سی ہے اور اس لئے میرا نام پریسکا رکھدیا گیا، تم یہاں سے جاؤ، تمھاری پریسکا یہاں نہیں ہے، (پریسکا واپس جانے لگتی ہے)

مشلینا :- (تنہا) یا اللہ، یہ وہ پریسکا نہیں ہے تو پھر کون ہے۔ کیا میں سو رہا ہوں، کوئی خواب دیکھ رہا ہوں کیا میں واقعی غار میں ۳۰۰ سال تک سوتا رہا۔ اے مرنوش تم کہاں ہو، اے یملیخا جواب دے۔ میں بھی تمھارے پاس آتا ہوں۔ تم نے سچ کہا تھا کہ ہمارا اس زمانہ سے کوئی واسطہ نہیں، ہم اسوقت زندہ رہنے کے اہل نہیں، اچھا تو میں آتا ہوں، گھبراؤ نہیں،

(چلا جاتا ہے اور غالیاس اندر داخل ہوتے ہوئے پریسکا سے ملتا ہے)

غالیاس :- (پریسکا سے) قدیس کہاں ہیں!

پریسکا :- گئے،

غالیاس :- اے شاہزادی اب اپنے کمرہ میں تشریف لیجائیے بہت دیر ہوگئی ہے،

پریسکا :- نہیں آج میں سونا نہیں چاہتی،

غالیاس :- یہ آپ یہاں کب اور کیونکر چلی آئیں، اتفاق سے میری آنکھ جھپک کر کھلی تو میں نے آپ کو نہ پایا۔

پریسکا :- غالیاس

غالیاس :- شاہزادی کیا ارشاد ہے

پریسکا :- غالیاس!

غالیاس :- کیا حکم ہے اے شاہزادی، فرمائیے

پریسکا :- نہیں کچھ نہیں، تم جاؤ سو جاؤ

غالیاس :- اور آپ یہاں تنہا رہیں گی

پریسکا :- ہاں

غالیاس :- اے شاہزادی یہ آپ کو کیا ہوگیا ہے خیر تو ہے، میں نے تو اس حال میں آپ کو کبھی نہیں دیکھا؟

پریسکا :- کیا میں تم سے ایک راز کی بات کہوں، سنو گے

غالیاس :- کیوں نہیں اے شاہزادی

پریسکا :- تو سنو کہ میں نے اسے پالیا اور پھر چشم زدن میں ہاتھ سے کھو دیا

غالیاس :- اے شاہزادی کیا پالیا؟

پرلیسکا :۔ پالیا، نہیں۔ کھو دیا اور ہمیشہ کے لئے۔ ہاں، مجھے کھو دینا چاہئے۔
غالیاس :۔ اے شاہزادی کچھ تو کہئے کہ آپ نے کیا چیز پائی تھی؟
پرلیسکا :۔ اپنے خواب کی تعبیر
غالیاس :۔ خواب، ہاں مجھے یاد آگیا کہ آپ نے ایک ڈراؤنے خواب کا ذکر کل مجھ سے کیا تھا، لیکن اے شاہزادی، خواب اور وہ بھی جوانی کے خواب قابل اعتبار نہیں ہوا کرتے، آپ کیوں اتنی پریشان ہیں
پرلیسکا :۔ (حسرت کے لہجہ میں ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے) جوانی کے خواب! قابل اعتبار نہیں ہوا کرتے اے غالیاس تو نے سچ کہا،
غالیاس :۔ آپ نے یہی خواب دیکھا تھا ناکہ خدانخواستہ، دشمنوں کو کسی نے زندہ دفن کر دیا ہے۔
پرلیسکا :۔ ہاں کل یہی خواب دیکھا تھا اور آج اس کی تصدیق بھی ہو گئی
غالیاس :۔ (گھبرا کر) یہ کیا، میں بالکل نہیں سمجھا اے شاہزادی
پرلیسکا :۔ کچھ نہیں، تم جاؤ،
غالیاس :۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں، آپ تو بالکل انھیں قدسیوں کی سی گفتگو کر رہی ہیں
پرلیسکا :۔ اے غالیاس تم کیوں اُن کی توہین کرتے ہو،
غالیاس :۔ حاشا، یہ آپ نے کیا فرمایا، میں اور قدسیوں کی توہین! میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ قدسیوں کے لئے بہتر جگہ آسمان ہے نہ یہ کہ وہ زمین پر اُتر آئیں
پرلیسکا :۔ ہاں وہ زمین پر اس لئے آئے ہیں کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ آسمان پر لیجائیں
غالیاس :۔ یہ بڑی سعادت ہے اگر کسی کو نصیب ہو جائے
پرلیسکا :۔ بیشک یہ بڑی سعادت ہے لیکن اس خواہش کا پورا ہونا بہت دشوار،
غالیاس :۔ لیکن اے شاہزادی، کسی کو معلوم ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ کیا کاہن نے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ پرلیسکا سے بہت زیادہ مشابہ ہیں، پھر کیا یہ مشابہت بغیر کسی سبب کے ہو سکتی ہے
پرلیسکا :۔ میں نہیں سمجھی اس سے تمھارا کیا مطلب ہے
غالیاس :۔ اے شاہزادی میں سمجھتا ہوں کہ آپ ان قدسیوں کی نائب و خلیفہ ہوں گی
پرلیسکا :۔ خلیفہ! اُن کی نائب و خلیفہ، اے غالیاس تو پاگل تو نہیں ہو گیا ہے۔ میں اس مصیبت سے موت کو ترجیح دوں گی
غالیاس :۔ مصیبت، یہ آپ کیا فرماتی ہیں، توبہ کیجئے، توبہ!

پریسکا :۔ غالیاس، تم بیوقوف ہو، بالکل نہیں سمجھتے، تمہیں کیا معلوم کہ اس نے مجھ سے کیا کیا باتیں کیں اور میرے دل کا کیا حال ہے۔ (رونے لگتی ہے)

غالیاس :۔ اے شاہزادی! خدا کے لئے مجھے بتائیے کہ اس نے کیا کہا اور آپ کیوں رو رہی ہیں؟

پریسکا :۔ اس نے کہا کہ دقیانوس کی بیٹی پریسکا وفادار تھی اور میں نہیں ہوں، اس کی آواز میں ملکوتی نرمی تھی اور میری آواز میں نہیں ہے، وہ حیا اور غیرت والی تھی، اور میں ایسی نہیں ہوں۔

غالیاس :۔ اے شاہزادی کیا یہ قدیس اُس سے واقف ہے

پریسکا :۔ (غضبناک ہوکر) عجیب احمق ہو، یہ قدیس اس سے محبت کرتا تھا اور وہ اس سے۔ اسی قدیس نے اس کو یہ طلائی صلیب دی تھی اور وہ آخر وقت تک اس کا انتظار کرتی رہی

غالیاس :۔ مشلینا قدیس بہت عجیب وغریب انسان ہے۔

پریسکا :۔ ہاں، مشلینا، یہ خوبصورت نوجوان میری پردادی پریسکا کا منگیتر ہے اور اب بھی اس کی محبت کا وہی عالم ہے۔ اچھا اب تم جاؤ اور مجھے تنہا چھوڑ دو

غالیاس :۔ ٹھیک ہے "کتاب راہبین" میں لکھا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی زمانہ میں پائے جاتے تھے،

پریسکا :۔ (بگڑکر) میں نے تم سے کہا نہیں کہ چلے جاؤ

(غالیاس چلا جاتا ہے، پریسکا ایک ستون پر سر رکھ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور مشلینا پھر داخل ہوتا ہے)

پریسکا :۔ (گھبراکر) ہائیں، تم پھر لوٹ آئے، میں نے تم سے کہا نہیں کہ میں وہ پریسکا نہیں ہوں

مشلینا :۔ (نہایت سنجیدگی سے) میں جانتا ہوں

پریسکا :۔ پھر کیوں واپس آئے

مشلینا :۔ میں اس جگہ سے دور نہیں رہ سکتا

پریسکا :۔ اس لئے کہ اس کی یادگار چیزیں تمھیں یہاں نظر آتی ہیں

مشلینا :۔ کسکی

پریسکا :۔ جس سے تم محبت کرتے تھے

مشلینا :۔ مگر وہ مر گئی کب ہے

پریسکا :۔ یہ کیا،

مشلینا :۔ مرا تو میں ہوں

پریسکا :- (ڈر کر) یہ تم مجھے کس طرح دیکھ رہے ہو کیا تم اس کی تمثال و شبیہہ سمجھ کر میرے پاس رہنا چاہتے ہو میں کبھی اس کو گوارا نہ کروں گی

مشلینا :- کاش تم تمثال ہوتیں - مگر تم تو زندہ ہو

پریسکا :- جاؤ، جاؤ، مجھ سے دور رہو، میرا دل الٹا جاتا ہے،

مشلینا :- ڈرو نہیں، میں جانتا ہوں کہ میرے تمھارے درمیان ۳۰۰ سال کا فاصلہ حایل ہے -

پریسکا :- اے قدیس میں خوب سمجھتی ہوں کہ تم میری شخصیت کو اس کی شخصیت سے ملانا چاہتے ہو، تم مجھے نہیں دیکھتے بلکہ اس کو میرے اندر دیکھ رہے ہو تمھارے نزدیک وہ نہیں مری ہے، بلکہ میں مر گئی ہوں، جاؤ یہاں سے نکل جاؤ، میں اب برداشت نہیں کر سکتی -

مشلینا :- پریسکا — پریسکا !

پریسکا :- تم میرا نام اس طرح نہ لو جس طرح اس کا لیا کرتے تھے، مجھ سے تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے،

مشلینا :- نہیں، بیشک نہیں ہے،

پریسکا :- پھر کیوں واپس آئے اور یہاں ٹھہرنے سے کیا فایدہ

مشلینا :- بیشک، کوئی فایدہ نہیں - (محبت آمیز عمیق نگاہوں سے پریسکا کو دیکھتا ہے)

پریسکا :- مجھے کیوں اس طرح گھور رہے ہو، ایسی نگاہوں سے مجھے کیوں دیکھ رہے ہو جبکہ میرے تمھارے درمیان کوئی علاقہ نہیں ہے -

مشلینا :- بیشک نہیں ہے، ۳۰۰ سال کا فاصلہ بہت ہوتا ہے - بڑا فرق ہے،

پریسکا :- یہ فرق ۳۰۰ سال ہی کا نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ ہے کہ تمھاری پریسکا کی آواز میں ملکوتی نرمی تھی اور مجھ میں نہیں ہے، وہ عمیق قلب رکھتی تھی اور میں نہیں رکھتی، وہ غیرت و حیا والی تھی اور میں نہیں ہوں - تم اسی زمانہ میں اسی کے پاس واپس جاؤ، اب اس زمانہ میں یہ سادی چیزیں تمھیں نہیں مل سکتیں -

مشلینا :- پریسکا — !

پریسکا :- میں نے ابھی تم سے کہا کہ مجھے اس طرح نہ پکارو، مجھے اس نام سے نفرت ہے

مشلینا :- لیکن یہ تو تمھارا ہی نام ہے -

پریسکا :- یہ بھی میری بدقسمتی ہے، کاش میرا نام کچھ اور ہوتا، میری صورت کچھ اور ہوتی -

مشلینا :- اگر ایسا ہوتا تو پھر میں تمھیں کہاں سے پاتا اور میرا ابھی وہی حشر ہوتا جو مرنوش اور یملیخا کا ہوا -

پریسکا :— پھر تم نے وہی کہا، یہ کہو کہ تم نے اس کو پایا، مجھے نہیں،

مشلینا :— ہاں، سچ کہتی ہو، اسی کو پایا (پریسکا رونے لگتی ہے)

مشلینا :— ہائیں، تم رو رہی ہو، میں نے تو تمھیں روتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا،

پریسکا :— بیشک نہ دیکھا ہوگا، کیونکہ فرشتے نہیں روتے، وہ اتنے نازک ہوتے ہیں کہ رونا برداشت نہیں کرسکتے، آنسو کا ایک قطرہ ان کی لطیف ساخت کو مٹا دینے کے لئے کافی ہے۔

مشلینا :— پھر تم کیوں روئیں

پریسکا :— (آنسو پونچھتے ہوئے) میں تو نہیں روئی

مشلینا :— اور یہ آنسو کیسے نکلے

پریسکا :— تمھاری بینائی زایل ہوگئی ہے

مشلینا :— سچ ہے، میں اندھا ہوں، لیکن تاریکی سے نہیں، روشنی کی زیادتی سے۔ میری بینائی نور کی کثرت سے زایل ہوئی ہے اور میرے سامنے اب آثار و حقایق کوئی چیز نہیں ہیں۔ ۳۰۰ سال کا زمانہ مجھے صرف ایک لمحہ نظر آتا ہے، میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ تمھارے سامنے ہوں، میرا دل کتنا مسرور ہے کہ تم میرے سامنے ہو۔

پریسکا :— (جاتے ہوئے) اچھا تو تم یہاں رہو، میں جاتی ہوں۔

مشلینا :— اور میں ؟

پریسکا :— یہ میں کیا جانوں۔ مجھے اس سے کیا واسطہ

مشلینا :— ابھی نہ جا، اے پریسکا رحم کر، اتنی جلدی نہ کر

پریسکا :— آخر تمھارا ارادہ کیا ہے، تم چاہتے کیا ہو ؟ کیا تمھارے آنکھوں پر یہ پردے پڑے ہوئے ہیں۔

مشلینا :— ہاں، یہ پردے میں اٹھانا نہیں چاہتا، کیونکہ ایسا کرنا موت کو بلانا ہے، پھر تم کیا چاہتی ہو کہ میں مر جاؤں

پریسکا :— اگر میں تمھاری جگہ ہوتی تو یقیناً میں سماوی دنیا میں اسکی رُوح سے ملنے کی کوشش کرتی۔

مشلینا :— میں اب بھی اُسی سماوی دُنیا میں ہوں اور تیرے ساتھ ہوں۔

(پریسکا بگڑ کر جانے لگتی ہے)

مشلینا :— پریسکا، خدا کے لئے مجھے یوں تنہا چھوڑ کر نہ جاؤ۔ میں جہنم میں گر جاؤں گا

پریسکا :— (اپنی گردن سے طلائی صلیب نکالکر) لو یہ میں تمکو ایک چیز دیتی ہو جو جہنم میں گرنے سے باز رکھے گی۔

مشلینا :— ہاں، یہی وہ صلیب ہے جو میں نے تجھے تحفتاً دی تھی۔

پریسکا :- (صلیب آگے بڑھاتے ہوئے) بلکہ میں بھی وہی ہوں جسکو یہ تحفہ دیا گیا تھا، لیکن اب میں اسے واپس کرتی ہوں

مشلینا :- یہ چیز تو تمھاری ہے

پریسکا :- ہوگی، لیکن میں اسے نہیں رکھ سکتی، اب یہ میرے جسم کو افعی کی طرح ڈستی ہے،
(اس کے ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)
کیا یہ ہات وہ نہیں ہیں جنھوں نے ۳۰۰ سال قبل اس صلیب کو اس کے گلے میں ڈالا تھا

مشلینا :- (حیرت سے) ۳۰۰ سال

پریسکا :- اور کیا یہ وہ بانہیں نہیں ہیں جو اس کی نازک کمر میں حمایل ہوئی تھیں

مشلینا :- پریسکا یہ تم کیا کہہ رہی ہو

پریسکا :- اور کیا یہ وہ لب نہیں ہیں جو ــــــ ؟

مشلینا :- چُپ رہو، خدا کے لئے چپ رہو

پریسکا :- اے میری پردادی کے منگیتر! کیوں ڈرتے ہو، خوف کی کیا بات ہے

مشلینا :- میں اب یہ باتیں نہیں سُن سکتا،

پریسکا :- لیکن انھیں ہاتھوں سے تم میرے جسم کو چھونا ضرور چاہتے ہو۔ (اپنے جسم کی طرف اشارہ کرکے)
اے میری پردادی کے محبوب کیا تجھے معلوم ہے کہ یہ جسم جس کے چھونے کے لئے تم اتنے بیتاب ہو اس کی کیا عمر ہے ؟ اس پر ابھی صرف بیس بہاریں گزری ہیں

مشلینا :- (آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے) پریسکا، چُپ رہو، یہ تم کیا کہہ رہی ہو

پریسکا :- یہ میں وہ کہہ رہی ہوں جس کا اس جسمانی و مادی دنیا میں کہنا ضروری ہے اور جس کے تلخ احساس کا انسان کو ہر وقت منتظر رہنا چاہیئے

مشلینا :- بیشک سچ ہے اے پریسکا، مرنوش اور یملیخا نے بھی یہی کہا تھا کہ ہم لوگ صرف زمانۂ ماضی کی ملکیت ہیں اور ہمارا حصہ اب اس دنیا میں کوئی نہیں، اچھا رخصت ـــ خدا حافظ

(مشلینا آہستہ آہستہ قدموں کے ساتھ باہر جانے لگتا ہے، پریسکا حسرت آلود نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے اور جب وہ چلا جاتا ہے تو آہستہ سے خود بھی "خدا حافظ" کہتی ہے)

چوتھا ایکٹ

(رقیم کا غار۔ چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی۔ یلیخا اور مرنوش مردوں کی طرح خاموش لیٹے ہوئے ہیں اور کتا بھی انھیں کے پاس بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے ـــ ہر طرف گہرا سکون ہے۔)

مشلینا: ـــ (کمزور آواز سے) مرنوشش، (کوئی جواب نہیں ملتا) یلیخا، (کوئی جواب نہیں) میں موت کے آثار محسوس کر رہا ہوں (پھر کوئی جواب نہیں)۔ اے مرنوش، ہم کہاں ہیں؟ غار میں ہیں، کیا اب کبھی اسکو نہ چھوڑیں گے، اے مرنوش ہم کتنے دن یہاں رہے۔ یہی کوئی ڈیڑھ دو دن (کوئی جواب نہیں) اے یلیخا وہ کھانا کہاں ہے جو تو لینے گیا تھا، مجھے بھوک لگی ہے میں مرا جا رہا ہوں (کوئی جواب نہیں) ۔ میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ ہم بہت سو گئے۔ اے نامعقولو اب اٹھو گے بھی یا نہیں۔ (مرنوش کو پکڑ کر جھنجھوڑتا ہے)

مرنوش: ـــ (نہایت کمزور آواز سے) اوہ ہ، کون ہے؟

مشلینا: ـــ میں ہوں مشلینا

مرنوش: ـــ مجھے چھوڑ دو ہاتھ نہ لگاؤ، آہ ـــ آہ،

مشلینا: ـــ کیوں کیا ہوا، بیمار ہو، کراہتے کیوں ہو؟ سنو تو سہی میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے؟

مرنوش: ـــ کیا؟

مشلینا: ـــ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ عجیب و غریب وضع کے غار کے اندر داخل ہوئے اور ہمیں قصر شاہی تک لے گئے وہاں پہونچکر ہم نے ہر چیز بدلی ہوئی پائی۔ میں نے وہاں پریسکا، اپنی پریسکا کو بھی دیکھا لیکن اسنے مجھے پہچانا نہیں، وہ کہتی ہے کہ پریسکا کو مرے ہوئے ۳۰۰ سال کا زمانہ گزر گیا۔ گویا ہم اتنی مدت تک سوتے ہی رہے۔

مرنوش: ـــ تم اسے خواب کہتے ہو؟ بیوقوف یہ حقیقت ہے۔

مشلینا: ـــ بیوقوف تم ہو جو اسے حقیقت کہتے ہو، یہ کیونکر ممکن ہے کہ ۳۰۰ سال تک سوتے رہنے کے بعد بھی جب اٹھوں تو اپنی پریسکا کو زندہ دیکھوں

مرنوش: ـــ ہاں میں نے بھی ایسا ہی ایک خواب دیکھا ہے۔

مشلینا :۔ وہ کیا ؟

مرنوش :۔ وہ یہ کہ میں بھی اپنے مکان پر پہونچا اور دیکھا کہ جہاں میرا گھر تھا اب وہاں بازار آباد ہے، اور ۲۰۰ سال ہوئے کہ میرا بیٹا ۶۰ سال کی عمر تک پہونچکر مر گیا، چنانچہ ان آنکھوں سے میں نے خود اس کی قبر دیکھی

مشلینا :۔ تمہارا بیٹا ۶۰ سال کا ہوکر مرا اور تم ابھی چالیس ہی سال کے ہو۔ یہ خواب نہیں تو کیا حقیقت ہے اچھا یملیخا سے پوچھو۔ یملیخا۔۔ اے یملیخا

یملیخا :۔ (کمزور آواز سے) یہ کون ہے ؟ مجھے کون پکار رہا ہے

مشلینا :۔ یملیخا، جاگو، ہم غار میں ہیں اور اب جاگے ہیں

یملیخا :۔ کیوں، کیا کہتے ہو۔ اب ہم جاگ کر کیا کریں گے، جو کچھ دیکھ چکے ہیں اس کے بعد اب زندہ رہنا بیکار ہے

مرنوش :۔ تم نے بھی کچھ دیکھا ہے، بتاؤ کیا دیکھا

یملیخا :۔ اب کیا بتاؤں، شہر طرسوس بدلگیا، ساری دنیا بدلگئی، نہ میں وہ رہا نہ میرا کتا قطمیر اب وہ کتا رہا

مشلینا :۔ عجیب بات ہے،

مرنوش :۔ کیا تمہاری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ ہم تینوں ایک ہی قسم کا خواب دیکھیں۔ اے عقلمند یہ سب حقیقت ہے۔ ہم لوگ واقعی غار سے باہر نکلے تھے اور پھر وہاں سے یہاں غار میں مرنے کے لئے واپس آگئے یہ آخر تم کیونکر کہتے ہو کہ یہ سب خواب تھا

مشلینا :۔ اچھا اگر وہ خواب نہیں تھا تو جو کچھ اسوقت دیکھ رہے ہیں، وہ خواب ہے۔

مرنوش :۔ یہ کوئی خواب نہیں ہے، خواب تو وہ تھا جس میں پورے ۳۰۰ سال ہم نے بسر کر دئے۔

مشلینا :۔ شکر ہے کہ یہ خواب تھا ورنہ اتنا زمانہ پریسکا کو دیکھے بغیر کیونکر بسر ہوتا

(دفعتاً یملیخا کے کراہنے کی آواز آتی ہے)

مرنوش :۔ یملیخا یہ کیا ہوا، خیر تو ہے،

مشلینا :۔ کیا کچھ بیمار ہو؟

یملیخا :۔ (کراہتے ہوئے) آہ، یا اللہ رحم کر

(دونوں اسے پکڑ کر اٹھاتے ہیں لیکن وہ پھر گر پڑتا ہے)

مشلینا :۔ یملیخا۔ یملیخا"

یملیخا :۔ میں اب مر رہا ہوں لیکن تم لوگ گواہ رہنا کہ میں دینِ مسیحی پر مر رہا ہوں۔ (تھوڑی دیر کے بعد)

مرنوش :— یملیخا، (کوئی جواب نہیں)

مشلینا :— (یملیخا کے جسم کو جنبش دیکر) یملیخا — (کوئی جواب نہیں)

مرنوش :— غریب مرگیا۔ ذرا اس کے منھ پر چادر ڈال دو۔

مشلینا :— چادر، چادر کہاں ہے؟

مرنوش :— میرے کپڑوں میں ڈھونڈھو

(مشلینا ادھر اُدھر ٹٹول کر ایک چادر لاتا ہے)

مشلینا :— ارے چادر گل گئی۔ یہ کیونکر ممکن ہے۔

مرنوش :— اے مشلینا، یہ کپڑے ہمارے خواب کے زمانہ کے ہیں

مشلینا :— سچ کہتے ہو اے مرنوش

مرنوش :— پھر تم خواب کیا کہتے ہو۔ اب بھی تمہیں شک ہے؟

مشلینا :— کس بات کا

مرنوش :— یہ کہ جو کچھ ہم نے دیکھا وہ خواب نہ تھا بلکہ حقیقت تھی۔

مشلینا :— (سہما ہوا) حقیقت! حقیقت!!

مرنوش :— تم اسی خواب و حقیقت کی فکر میں مبتلا رہو، مجھے تو اب موت کا کوئی ڈر نہیں رہا کیونکہ میرا دل پہلے ہی مرچکا ہے۔ تم مجھے دھوکا دے سکتے ہو کہ یہ حقیقت نہیں خواب ہے۔ عقل بھی دھوکا دے سکتی ہے کہ یہ سب کچھ سراب ہے، لیکن میرا دل مجھے کیونکر دھوکا دے سکتا ہے۔ وہ مرچکا ہے، ایک حقیقی موت اس پر طاری ہو چکی ہے اور اب میں بھی مرنا چاہتا ہوں،

مشلینا :— مرنوش، تمہاری مرضی، لیکن میرا دل تو ابھی تک زندہ ہے اور اس لئے میں مرنے کے لئے تیار نہیں۔

مرنوش :— سچ ہے دل جب تک زندہ ہے، امیدیں بھی ہیں، امید دل کے خواب بھی ہیں۔ لیکن اے مشلینا سچ بتاؤ، تم اب کس تمنا کے لئے زندہ رہنا چاہتے ہو۔

مشلینا :— تمنا تو کوئی نہیں ہے، لیکن اے مرنوش میں یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ مجھے کسی سے محبت ہے اور صرف محبت کرنے کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں،

مرنوش :— مشلینا، تم پاگل ہو گئے، تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے،

مشلینا :— ہوگا، لیکن میں جانتا ہوں کہ میں جوان ہوں، میرا دل جوان ہے، زندہ ہے۔ پھر میں کیونکر اپنے دل اور اپنے آپ کو زندہ دفن کر دوں جبکہ میرے اور اُس کے درمیان کوئی چیز حائل بھی نہیں ہے۔

مرنوش :— تمہارے اور اس کے درمیان سب سے بڑی وہ چیز حائل ہے جسے زمانہ کہتے ہیں اور زمانہ کا مقابلہ ممکن نہیں — میں نے زمانہ کا مقابلہ اپنے شباب سے کیا، لیکن زمانہ نے عین شباب ہی کے عالم میں اسے ہلاک کر کے رکھدیا۔ مشلینا، تم کیوں نہیں سمجھتے کہ تم اب مرگئے ہو۔ (سکوت)

مشلینا :— (آپ ہی آپ، آہستہ آہستہ) زمانہ — زمانہ!

مرنوش :— (نہایت دھیمی آواز سے) مشلینا اب میں مر رہا ہوں، میرا ہاتھ یملیخا کے ہاتھ میں دیدو، آہ غریب یملیخا مرگیا اور حقیقت کے علم سے بےخبر رہکر مرگیا۔ لیکن میں نے اس کو کیا سمجھا ہے کہ وہ سمجھتا۔

مشلینا :— مرنوش، یہ تم کیا کہہ رہے ہو

مرنوش :— میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ہم زمانہ کا خواب ہیں اور ہمیں خواب ہی کی طرح مٹ جانا ہے۔

مشلینا :— مٹ جانا ہے! بالکل مٹ جانا ہے؟ ہمارا کوئی نشان باقی رہنے والا نہیں،

مرنوش :— رہنے والا ہے مگر صرف تاریخ کی کتابوں میں،

مشلینا :— توکیا ہماری حیات اُخروی کوئی چیز نہیں

مرنوش :— کوئی چیز نہیں

مشلینا :— توکیا تم "بعث بعدالموت" کے قائل نہیں ہو

مرنوش :— احمق "بعث بعدالموت" کا حال تم ابھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ چکے

مشلینا :— توبہ کرو، توبہ، تم مسیحی ہو، اور اپنا ایمان کیوں چھوڑے دیتے ہو

مرنوش :— ہاں میں سب کچھ چھوڑ کر مرنا چاہتا ہوں۔ ایمان، عقیدہ، احساس، افکار سب سے علحدہ ہوکر جان دینا پسند کرتا ہوں۔ مشلینا لاؤ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔ میں اب جا رہا ہوں

مشلینا :— لاحول ولا۔ میں ایک کافر و بُت پرست کے ہاتھ میں ہاتھ دینا کبھی پسند نہیں کرتا۔

(مرنوش اسکی طرف آخری نگاہ ڈالتا ہے اور مرجاتا ہے)

پانچواں ایکٹ

(غار کی طرف پرلیسکا اور غالیاس دونوں آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں
اور قریب آکر دونوں ٹھہر جاتے ہیں)

پرلیسکا :- (گھبرا کر) غالیاس، کچھ تم نے سنا
غالیاس :- نہیں، میں نے تو کچھ نہیں سنا، شاہزادی
پرلیسکا :- اونہہ، تمھارے کان بھی اب کام نہیں دیتے۔ کیا غار کے اندر سے تمھیں کراہ کی آواز نہیں آئی وہ دیکھو پھر آئی!
غالیاس :- شہزادی، ایک مہینہ ہو گیا کہ یہ لوگ غار کے اندر بے آب و دانہ پڑے ہوئے ہیں۔ اب آواز کیسی؟
پرلیسکا :- نہیں میں نے ضرور غرغراہٹ کی سی آواز سنی ہے، جیسے کوئی شخص دم توڑ رہا ہو
غالیاس :- نہیں شاہزادی یہ ہمارے قدموں کی آواز ہو گی
پرلیسکا :- کیا تم نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ جو کچھ میں کہوں گی اس پر عمل کرو گے
غالیاس :- بیشک میں نے کہا تھا اور میں تعمیل کے لئے حاضر ہوں
پرلیسکا :- اچھا تو چلو میرے ساتھ غار کے اندر۔ میں معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ یہ آواز کس کی ہے
غالیاس :- لیکن اے شاہزادی آج عید کا دن ہے اور بادشاہ آپ کو ضرور یاد کریں گے
پرلیسکا :- میں بیماری کا بہانہ کر آئی ہوں اور بادشاہ مجھے طلب نہیں کرے گا۔

(غار کے اندر سے ایک آواز آتی ہے)

پرلیسکا :- غالیاس، تم نے سنا، پھر وہی آواز آئی

(پرلیسکا آگے بڑھتی ہے۔ غالیاس اس کا دامن پکڑتا ہے، اور وہ
جھٹکا دیکر آگے قدم بڑھاتی ہے۔ پھر آواز آتی ہے جیسے کوئی
"پرلیسکا" "پرلیسکا" کہکر پکار رہا ہے)

پرلیسکا :- کیا تم زندہ ہو، مشلینا بولو کیا تم زندہ ہو۔ اے غالیاس جلدی جاؤ اور پانی یا دودھ جو کچھ ملے فوراً لاؤ

(غالیاس باہر جاتا ہے)

مشلینا :- اے پرلیسکا اب یہ سب بیکار ہے

پرلیسکا :- بیکا نہیں ہے ، میں تمھیں مرنے نہ دوں گی ، میں تم سے محبت کرتی ہوں - اے مشلینا تمھیں زندہ رہنا ہوگا اپنے لئے نہیں تو میرے لئے -

مشلینا :- لیکن زمانہ میرے تمھارے درمیان حایل ہے

پریسکا :- زمانہ ! زمانہ کیسا ؟ دل زمانہ سے زیادہ قوی چیز ہے ،

مشلینا :- آہ ، کیا یہ میں کوئی دوسرا دلچسپ خواب دیکھ رہا ہوں ،

پریسکا :- یہ خواب نہیں حقیقت ہے ، اُٹھو جلدی اُٹھو ، میں پرلیسکا ہوں اور ممکن ہے کہ تمھاری پرلیسکا ہوں -

مشلینا :- یہ میں کیا سُن رہا ہوں

پرلیسکا :- مشلینا ، اُٹھو ، جلدی اُٹھو ،

(مشلینا اٹھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن پھر گر پڑتا ہے - پرلیسکا آگے بڑھ کر اس کا سر اپنے بازو پر رکھ لیتی ہے ،)

پرلیسکا :- (سر جھکا کر مشلینا کے چہرہ کو دیکھتے ہوئے) مشلینا ، بڑی تمھاری محبت کو تین سو سال کا زمانہ گزر چکا ہو اور رلا نہایت تاک اس محبت کو قایم رہنا ہے ، اٹھو ، اٹھو نہیں سکتے تو کچھ منھ سے کہو ، مجھے معلوم تو ہو کہ جو کچھ میں کہتی ہوں اس کا تمھیں یقین ہے

(مشلینا کے منھ سے ایک کراہ کی آواز پیدا ہوتی ہے)

پرلیسکا :- (غور سے اس کے چہرہ کو دیکھتے ہوئے) افسوس وقت گزر گیا - اچھا اے مشلینا ، اب سو ، آرام کرو ، انتظار کی گھڑیاں بہت سخت ہوتی ہیں ، لیکن میں انھیں خوشی سے کاٹ دوں گی کیونکہ اب مجھے تم سے جس دنیا میں ملنا ہے وہ وقت و زمانہ کی دسترس سے دور ہے ،

(پریسکا مشلینا کا سر آہستہ سے زمین پر رکھ دیتی ہے اور خاموش ایک کونہ میں کھڑی ہو کر رونے لگتی ہے - غالیاس گھبرایا ہوا ایک برتن ہاتھ میں لئے ہوئے داخل ہوتا ہے)

غالیاس :- اے شہزادی یہ تھوڑا سا دودھ ملگیا ہے - (پرلیسکا کو روتے ہوئے دیکھ کر گھبرا اُٹھتا ہے) ہائیں ، یہ کیا ہوا ، کیوں رو رہی ہو ، (پرلیسکا کوئی جواب نہیں دیتی)

غالیاس :- (مشلینا کی لاش کو دیکھ کر) افسوس ، جو ہونا تھا ہو چکا

پرلیسکا :- (گریہ آلود آواز میں) ہاں ، ہو چکا

غالیاس :- مگر اے شاہزادی ، مشلینا کی وفات کو تو کئی ہفتے ہو گئے ہوں گے

پرسیکا :- کاش ایسا ہی ہوتا

غالیاس :- پھر اے شہزادی اب رونے سے فایدہ

پرسیکا :- اے غالیاس، میں اپنے لئے نہیں رو رہی ہوں۔ تجھے معلوم ہے میں خود یہاں اس حال میں آنا پسند نہیں کرتی تھی کہ اسے زندہ پاؤں اور اسی لئے میں نے پورے ایک مہینہ تک انتظار کیا۔ میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ اس عالم میں، میری اس کی محبت کا اجتماع ناممکن ہے۔

غالیاس :- اسی سے تو کہتا ہوں کہ اب گریہ و زاری بیکار ہے،

پرسیکا :- آہ، اے غالیاس، کاش تم سمجھ سکتے، تم میں کوئی احساس محبت کا ہوتا۔ اے شقی، میں تو اس مسرور لمحہ کو رو رہی ہوں، جو مجھے نصیب تو ہوا، لیکن بجلی کی طرح آن کی آن میں ختم ہو گیا۔ میں یہاں آئی تو میں نے مشلینا کو زندہ پایا۔ اس نے مجھے پہچانا، لیکن میں اس کو سمجھا ہی رہی تھی کہ میں حقیقتاً وہی پرسیکا ہوں جس سے تین سو سال اس طرف اس نے محبت کی تھی۔ ہاں میں یہ سمجھا ہی رہی تھی کہ وقت آگیا اور ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے لیکن خیر، کوئی حرج نہیں میں اس سے اب ایک ایسے عالم میں ملوں گی جہاں نہ وقت کبھی ختم ہوتا ہے اور نہ محبت۔

غالیاس :- (گھبرا کر) دوسرے عالم میں

پرسیکا :- ہاں، ہاں، دوسرے عالم میں

غالیاس :- سچ ہے اے شہزادی، مجھے آپ کے ایمان سے ایسے ہی اعتقاد کی توقع ہے،

پرسیکا :- بیوقوف، اس کا تعلق ایمان سے نہیں بلکہ محبت سے ہے

غالیاس :- محبت ؛ محبت سے اس سے کیا واسطہ، اے شاہزادی یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی،

پرسیکا :- کاش تم نے اوراشیما ہی کا قصہ پڑھا ہوتا تو تم سمجھ سکتے کہ محبت کیا چیز ہے۔

غالیاس :- اے شاہزادی وہ قصہ کیا ہے۔

پرسیکا :- اوراشیما ایک ماہی گیر تھا جو روز اپنی کشتی میں بیٹھ کر سمندر میں جاتا اور جال سے مچھلیاں پکڑ کر لاتا۔ ایک مرتبہ سارا دن گزر گیا لیکن کوئی مچھلی اسے نہ ملی۔ آخری مرتبہ جب اس نے جال ڈالا تو ایک کچھوا ملا لیکن اس خیال سے کہ یہ بہت مقدس چیز ہے اور سمندر کا بادشاہ اسے بہت محبوب رکھتا ہے، اس کو چھوڑ دیا، اس کے بعد اس نے پھر جال پانی میں نہیں ڈالا اور خاموش بیٹھ گیا۔ لیکن فوراً ہی اس پر نیند کا غلبہ ہوا اور ہوا کے تھپیڑے کشتی کو کہیں سے کہیں لے گئے۔ کچھ دیر بعد دفعتہً اسے کسی نے شانہ پکڑ کر ہلایا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک نہایت ہی حسین و جمیل بنت البحر اس کے سرہانے کھڑی مسکرا رہی ہے

اس نے اوراشیما سے کہا کہ "میں سمندر کے بادشاہ کی بیٹی ہوں اور اس نے مجھے تمھارے پاس اس لئے بھیجا ہے کہ میں تمھارا شکریہ ادا کروں کیونکہ تم نے مقدس کچھوے کو ہلاک نہیں کیا۔ یہ کہکر بنت البحر اسے اپنے ساتھ اپنے باپ کے محل میں لے گئی جہاں ہر چیز لولو و مرجان کی تھی سمندر کے بادشاہ نے اس کی بڑی مدارات کی اور اپنی بیٹی سے اس کی شادی کردی۔ جب تین سال اسی لطف و مسرت میں بسر ہوچکے تو اوراشیما کو ایک دن خیال آیا کہ وہ تو شکار کرنے کیلئے آیا تھا اور پھر گھر واپس نہیں گیا۔ اس کے بیوی بچے کیا کہتے ہوں گے۔ یہ خیال آتے ہی وہ بیچین ہوگیا اور بنت البحر سے کہا کہ اگر اجازت دو تو ایک دن کے لئے وطن جاکر اپنے اہل عیال کو دیکھ آؤں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس مرتبہ واپس آنے کے بعد پھر کبھی نہیں جاؤں گا۔

بنت البحر آبدیدہ ہوگئی اور بولی کہ "جانے کو تم چلے جاؤ لیکن مجھے ڈر ہے کہ اب تم سے میں کبھی نہ مل سکوں گی۔ تاہم میں تمھیں ایک صندوقچہ دیتی ہوں جو واپسی میں تمھاری مدد کریگا لیکن تم اسے کھولنا نہیں چاہے کچھ ہو، ورنہ پھر ملنے کی کوئی صورت باقی نہ رہیگی۔"

اوراشیما نے وعدہ کیا کہ وہ کبھی اس کو نہ کھولےگا اور صندوقچہ لیکر اپنے وطن واپس آیا۔ یہاں آکر دیکھا تو ہر چیز بالکل بدلی ہوئی پائی، آدمی نئے، وضع و قطع نئی۔ وہ حیران رہگیا کہ کیا ماجرا ہے اس نے بہت کوشش کی کہ اپنا گھر ڈھونڈھ نکالے مگر کامیاب نہ ہوا۔ اتفاق سے اسے ایک نہایت ہی ضعیف شخص نظر آیا اور اس سے پوچھا کہ "اوراشیما کے گھر والوں کا بھی کچھ حال تمھیں معلوم ہے۔ بڈھا یہ سنکر حیران رہگیا اور بولا کہ "اے جوان تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ چار سو سال ہوئے کہ اوراشیما شکار کے لئے نکلا تھا اور پھر واپس نہیں آیا۔ قبرستان میں جاؤ ممکن ہے اس کی یادگار میں کوئی پتھر اس کے خاندان والوں نے نصب کردیا ہو۔"

یہ سنکر اوراشیما ہنسا اور سمجھا کہ بڈھا مذاق کر رہا ہے۔ کیونکہ اس کو گئے ہوئے صرف تین سال ہوئے تھے لیکن رفتہ رفتہ اس کو ہوش آیا کہ اگر اتنا زمانہ نہیں گزرا تو شہر کا شہر کیونکر بالکل بدل گیا دفعتاً اس کو صندوقچہ کا خیال آیا اور سوچا کہ ممکن ہے اس کے کھولنے سے اس راز کا پتہ چل سکے آخرکار اس نے بیتاب ہوکر اس صندوقچہ کو کھولا۔

نانیاس :- "کھول ڈالا"

پرلیکا :- "ہاں کھول ڈالا"

نانیاس :- "پھر اس نے کیا دیکھا"

پریسکا :- صرف سفید سا ٹھنڈا دھواں جو فضا میں بلند ہو کر جنوب کی طرف غائب ہو گیا۔
غالیاس :- پھر کیا ہوا
پریسکا :- ہوا یہ کہ جب اور اشیا کو معلوم ہوا وہ اب بنت البحر سے کبھی نہیں مل سکتا تو اس صدمہ سے آناً فاناً اس کے بال سفید ہو گئے، دانت گر گئے، اس کے جسم میں جھریاں پڑ گئیں اور وہ آن کی آن میں چار سو سال کا بڈھا بن گیا۔

(دفعتہً غار کے باہر سے قرنا وغیرہ کی آواز آتی ہے)

پریسکا :- اے غالیاس، کچھ سنا تم نے۔ لوگ یہاں آپہونچے،
غالیاس :- (گھبرا کر) بیشک بادشاہ آپہونچا اور مجھے اندیشہ ہے کہ غار بند کرنے سے قبل وہ اندر نہ آجائے اور ہمیں تمھیں یہاں دیکھ لے،
پریسکا :- پھر کیا کرنا چاہئے۔
غالیاس :- اے شاہزادی آپ یہیں کسی کونہ میں چھپ جایئے۔ میں باہر جاتا ہوں۔ اگر بادشاہ اندر آیا تو میں زور سے کوئی بات ایسی کہوں گا جس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ بادشاہ اندر آرہا ہے،

(غالیاس باہر چلا جاتا ہے)

پریسکا :- (مشلینا کے جسم پر جھک کر) اے مشلینا، تو نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ تیری محبت میں کبھی شک پیدا نہیں ہوا اور تو نے صندوقچہ کھولکر اپنا عہد نہیں توڑا، اس لئے اب تو اس سے جدا نہیں رہ سکتا جس سے تجھے محبت ہے۔

(دفعتہً غار کے دروازہ سے غالیاس کی آواز آتی ہے اور پریسکا چھپ جاتی ہے۔ بادشاہ آہستہ آہستہ اندر داخل ہوتا ہوا خاموش، سر جھکا کر سینہ پر صلیب کا نشان بناتا ہے)

بادشاہ :- (راہب اعظم سے) کیا مناسب نہ ہوگا کہ ان کے مقدس جسموں کو قیمتی تابوتوں میں رکھدیا جائے؟
راہب :- نہیں یہ مناسب نہیں ہے۔ غار کا دروازہ بند کر کے ان کو اسی حال میں چھوڑ دینا چاہئے۔

(صیاد۔ آگے بڑھتا ہے)

صیاد :- (بادشاہ سے) اے مولی، غار کا بند کرنا مناسب نہیں،
بادشاہ :- "کیوں"
صیاد :- اس لئے کہ وہ مرے نہیں ہیں بلکہ پھر سو گئے ہیں اور ممکن ہے کہ دوبارہ جاگیں،

دوسرا راہب :۔ بیشک وہ سو گئے ہیں۔ اور اگر غار بند کر دیا گیا تو پھر کیونکر نکلیں گے،
پہلا راہب :۔ اس مرتبہ وہ سوئے نہیں ہیں بلکہ مر گئے ہیں اور ان کی روحیں آسمان کی طرف صعود کر گئی ہیں
غالیاس :۔ بیشک، وہ مر گئے ہیں اور آسمان پر چلے گئے ہیں
بادشاہ :۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس کو صحیح باور کروں،
صیاد :۔ اے مولیٰ، وہ سوئے ہیں یا مر گئے ہیں، دونوں حال میں غار بند کرنے کی ضرورت نہیں
غالیاس :۔ غار اگر بند نہ کیا گیا تو لوگ یہاں آئیں گے اور فضول ہنگامہ مچایا کریں گے،
بادشاہ :۔ لیکن اگر وہ پھر جاگ پڑے تو اس صورت میں نکلیں گے کیونکر
غالیاس :۔ اس کے لئے یہ تدبیر مناسب ہے کہ غار کے اندر تین پھاوڑے رکھدئے جائیں۔ اگر وہ جاگے تو پتھر ہٹا کر نکل آئیں گے۔
بادشاہ :۔ ہاں، یہ تدبیر مناسب ہے
غالیاس :۔ (بلند آواز سے) پھاوڑے لاؤ

(لوگ دوڑ پڑتے ہیں اور تین پھاوڑے لے آتے ہیں)

بادشاہ :۔ (غالیاس سے) اے غالیاس، اب غار بند کرنے کی طیاری کرو اور اعلان کردو کہ شاہزادی اس رسم میں اپنی بیماری کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکتی۔

(اس رسم کی ادائی کے لئے طبل و قرنا بجنے لگتے ہیں اور غالیاس سب کی آنکھ بچا کر اندر داخل ہوتا ہے)

غالیاس :۔ (پریسکا سے) اے شاہزادی، وقت بہت تنگ ہے، بتائیے اب کیا حکم ہے
پریسکا :۔ اے غالیاس، میں تمھاری بڑی احسانمند ہوں کہ تم نے اپنی جان خطرہ میں ڈالدی لیکن میرا کہنا نہ ٹالا۔ اچھا اب تم جاؤ اور مجھ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہولو
غالیاس :۔ نہیں اے شاہزادی یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ کو یہاں تنہا چھوڑ دوں، مجھے بھی اپنے قدموں پر جان دینے کی اجازت دیجئے۔
پریسکا :۔ اے غالیاس، یہ ممکن نہیں۔ کیا تمھیں یاد نہیں کہ میں نے خواب میں صرف تنہا اپنا ہی زندہ دفن ہونا دیکھا تھا۔ اب تم جاؤ اور اگر دنیا میری بابت پوچھے تو وہی کہدینا جو میں تم سے کہہ چکی ہوں تمھیں یاد رہے؟
غالیاس :۔ ہاں یاد ہے،

پرسیکا :— "کیا"

غالیاس :— یہ کہ پرسیکا ایک عورت تھی جو محبت کے لئے زندہ رہی اور محبت ہی کے لئے اس نے جان دی۔

پرسیکا :— ہاں یہی۔

(غالیاس باہر نکلتا ہے۔ اور غار کا دروازہ پرسیکا پر ہمیشہ کیلئے بند کر دیا جاتا ہے)

سائنس کے بعض دلچسپ معلومات

کائنات ایک اعجوبہ زار ہے، بشرطیکہ آنکہ ہماری رگِ جستجو حرکت میں آئے، ورنہ وہ اس قدر بے نمک چیز ہی کہ ایک انسان کے رہنے اور بسنے کی چیز معلوم نہیں ہوتی — وہی ایک سی صبح و شام، وہی ایک انداز کا طلوع و غروب، وہی وقت مقررہ پر سمندر کا مد و جزر، وہی یکساں موسموں کی آمد و شد، وہی غرۂ و محاق، وہی تم وہی ہم — الغرض تصور سے جی گھبرانے لگتا ہے۔ لیکن دنیا میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جس نے اس یکسانیت کو اپنے لئے سراپا تجدد و تنوع بنا لیا ہے اور کائنات اس کے لئے یکسر رنگ و تماشا ہو کر رہ گئی ہے۔ اُس کے لئے "برلبِ پایۂ خود دفینہ" کا نظریہ کوئی معنی نہیں رکھتا، اس کا مسلک صرف یہ ہے کہ

قطرگی بگزار تا عمان شوی

اور اس لئے وہ "طارم اعلیٰ" سے اِدھر کی کوئی بات کرتی ہی نہیں، اور اسی کا نام اس نے زندگی رکھا ہے۔

انسان فطرتاً جستجو پسند پیدا ہوا ہے اور یہی اس کی حیات کا راز ہے — حیات سے مراد میری صرف سانس لیتے رہنا نہیں ہے بلکہ زندگانی جس کا دوسرا نام "زندہ دلی" بھی ہے — جستجو نام حرکت کا ہے جوارحِ ظاہری کی حرکت نہیں بلکہ حرکت ذہن و دماغ، اور جب تک یہ کیفیت کسی قوم میں پائی جاتی ہے زندہ رہتی ہے، اور جب یہ خصوصیت مفقود ہو جاتی ہے تو وہ مر جاتی ہے — ھو اللذی یحیی و یمیت!

آج اگر آپ "زندگی و موت" کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو "مغرب و مشرق" کا مطالعہ کیجئے کہ وہاں "دونوں جہاں" ملنے پر بھی بس نہیں اور یہاں احساس کی معراج کا یہ عالم کہ

القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

وہاں انسان سے مراد اس کا ہوش و گوش ہے، اس کی ذہنی بیداری ہے، اسکی دماغی آزادی ہے۔

اور اس کا ایک جگہ چین سے نہ بیٹھا رہنا۔ یہاں انسان وہ ہے جو دوسروں کے کان سے سُنے، دوسروں کی آنکھوں سے دیکھے، اور ایک غیر متحرک پارۂ سنگ کی طرح جہاں پڑا ہے وہیں پڑا رہے۔ وہاں زندگی نام ہے مستقبل کے پردوں کے اُٹھا دینے کا، یہاں صرف ماضی۔ تاریک ماضی کی پرستش ونمایش کا۔ وہاں انسانِ کامل ہنوز پردۂ خفا میں ہے اور اس کے پالینے کے لئے ہر دل بیتاب ہے، یہاں وہ ماضی بعید میں پیدا ہوکر مرچکا ہے اور اب دوبارہ اس کے احیا کی امید نہیں۔ الغرض یوں سمجھئے کہ ہم صرف خدا پر لو لگائے بیٹھے ہیں اور وہ یہ روشنی خود اپنے اندر ڈھونڈھ رہے ہیں۔

پھر ان دو مختلف و متضاد ذہنیتوں کی جو دو مختلف راہیں متعین ہوجانا چاہئے، ان کی صراحت کی ضرورت نہیں۔ یہاں ہنوز یہی نزاع باقی ہے کہ "کعبہ و ترکستان" کی راہ کونسی ہے اور وہاں

یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا

قوموں کا مستقبل اُن کے حال میں پوشیدہ ہوا کرتا ہے، یعنی دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ ہم نے کیا کیا کیونکہ کائنات و عمل دونوں غیر محدود ہیں بلکہ صرف یہ کہ ہماری جو نسلیں اب آنے والی ہیں، ان کے میدانِ عمل کو ہم نے کتنا وسیع بنا دیا اور ان کے ذہن میں ہم نے کتنی جرأتِ اقدام پیدا کردی۔ سو اس کا حال ہم کو اس اُصولِ تعلیم و تربیت سے معلوم ہو سکتا ہے جو ایک قوم اپنے بچوں کے لئے متعین کرتی ہو میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں اپنے یہاں کی مشہور قومی و مذہبی درسگاہوں کی کہنگی و فرسودگی کا رونا لیکر بیٹھ جاؤں اور نہ غالباً اس کی ضرورت۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ زندہ قوموں کے بچوں کو جن اُصول پر تعلیم دیجاتی ہے اس کے تیور کیا ہوتے ہیں اور اس کا مستقبل کتنا شاندار ہوتا ہے۔

میں یہ پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کہ اصل چیز انسان کو ترقی کی راہ پر لگانے والی اس کی جستجو ہے اور چونکہ اس کا اولین تعلق فرایض الاعضاء سے ہے اس لئے آئیے دیکھیں کہ خود اپنی ذات کے متعلق جتنا علم مغرب کے بچوں کو حاصل ہے، اس سے ہم کس حد تک آگاہ ہیں۔

ہم روتے کیوں ہیں

اس سوال کا جواب دیتے وقت سب سے پہلا خیال جو ہمارے دل میں آئے گا وہ یہ ہوگا کہ جب ہم رنجیدہ ہوتے ہیں تو رونے لگتے ہیں مگر رونے کی صرف یہی وجہ نہیں ہے کیونکہ ہم کسی جسمانی یا روحی تکلیف سے بھی

رونے لگتے ہیں، کسی خاص جذبہ سے متاثر ہوکر بھی رونا ہم کو آجاتا ہے اور بعض اسباب تو بالکل مادی وجسمانی ہوتے ہیں، مثلاً پیاز سے آنسو نکلنے لگتے ہیں۔ اگر آنکھ میں کوئی کیڑا یا خاک کا ذرہ پڑ جائے تو بھی آنسو بہنے لگیں گے۔ زیادہ کھانسنے، استفراغ کرنے اور کسی چیز میں بہت قوت صرف کرنے سے بھی آنکھوں سے پانی بہنے لگیگا۔ مگر در اصل رونے کا باعث نفسیاتی تحریک ہوا کرتی ہے۔ "رونا" دراصل آنسوؤں کے غدود کی ایک تحریک ہے یہ غدود بالکل آنکھوں کے اوپر ہوتے ہیں جن کا کام یہ ہے کہ وہ آنکھوں کو تر رکھا کریں۔ ان غدود میں جب تحریک زیادہ ہو جاتی ہے تو پانی کے چھوٹے چھوٹے قطرے آنکھ اور ناک سے بہنے لگتے ہیں اور جب یہ پانی بہت زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ آنکھوں سے نکل کر رخسار تک آنے لگتا ہے اور اسی کو "رونا" کہتے ہیں۔ غدود کے تحریک کی یہ زیادتی منحصر ہے خون کے دباؤ کی زیادتی پر۔ اور خون کا دباؤ جذبات کی فراوانی سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں آنسوؤں کا بہنا بالکل قدرتی امر ہے۔ آنسو اس اجتماع خون کو کم کرکے سکون پہونچاتے ہیں گویا وہ قدرتی محافظ ہیں یعنی رونے سے دماغ کا اجتماع خون دور ہو جاتا ہے۔

خون کیوں جم جاتا ہے؟

بعض دفعہ جب انگلی یا بدن کے کسی حصہ کی کھال کٹ جاتی ہے تو کسی رگ کو بھی کچھ نقصان پہونچ جاتا ہے اور خون بہنے لگتا ہے پھر اگر زخم یا چوٹ معمولی ہے تو تھوڑی دیر کے بعد یہ خون بند ہو جاتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

یوں تو خون بند ہونے کے کئی اسباب ہیں مگر سب سے اہم وجہ خون کا جم جانا ہے۔ یعنی جب خون کا رقیق حصہ جسے (PLASMA) کہتے ہیں جم جاتا ہے تو خون بند ہو جاتا ہے۔

یہ مادہ چھوٹے چھوٹے تاگوں کی شکل کا ہوتا ہے اور اس واسطے اس کا نام (FIBRIN) رکھا گیا ہے۔ یہ تاگے خون میں ہر طرف دوڑتے پھرتے ہیں اور حلقہ سا بنائے ہوئے خون کے تمام اجزا اپنے اندر لئے ہوتے ہیں۔ پھر جب وہ بدن سے باہر ہوتے ہیں تو سکڑنے لگتے ہیں اور ایک جال سا بنا کر انھیں اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں اور یہی انجماد خون ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد اس انجماد سے ایک زرد قسم کا رقیق مادہ پیدا ہوتا ہے اسے (SERUM) کہتے ہیں۔

ہم مسکراتے کیوں ہیں؟

جب کسی اجنبی یا کسی پرانے دوست سے ملاقات ہوتی ہے اور اُس سے ملنے کے لئے ہم بڑھتے ہیں تو مصافحہ کرتے وقت مسکرانے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ مسکراہٹ، ایک محبت اور ایک قسم کے تعارف کا نشان ہے۔ ایسے موقعوں پر بے اختیارانہ چہرہ پر مُسکراہٹ آجاتی ہے۔ لیکن اس عادت کی کوئی نہ کوئی فطرتی وجہ بھی ہونا چاہئے۔

چارلس ڈاروِن نے سب سے پہلے دُنیا کو یہ بتایا کہ مسکرانے اور غرانے میں جو پٹھے استعمال ہوتے ہیں وہ ایک ہی ہیں۔ تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ جب دو اجنبی کتے ملتے ہیں تو کچھ دیر تک غراتے رہتے ہیں۔ اس غرانے کا مطلب یہ ہے کہ اگر ضرورت ہو تو ان میں سے ہر کتا دوسرے سے جنگ کے لئے طیار رہے۔

اسی طرح جب کوئی مسکراتا ہے تو گویا وہ مسکراہٹ، غراہٹ کا ایک ارتقا ہے جو دراصل حفاظت کی ایک علامت تھی۔ چنانچہ ہم اجنبیوں سے مل کر اس وجہ سے مسکراتے ہیں کہ ہمارے آبا و اجداد جو جانور تھے پہلے اجنبیوں کو دیکھ کر غراتے تھے۔ اس کی ایک مثال بندر میں مل سکتی ہے جو اجنبی کو اپنے قریب آتا دیکھ کر غرّاتا ہے۔

شرما جانے کی وجہ

یہ کیفیت زیادہ تر نوجوان یا کنواری لڑکیوں میں پائی جاتی ہے۔ اگر ان کے سامنے ان کی تعریف کیجائے تو چہرہ سے شرمیلا پن ظاہر ہونے لگیگا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خون جلدی سے چہرہ اور گردن کی طرف دوڑ جاتا ہے اور شرائین کو خون سے بھر دیتا ہے۔ اگر یہ خون عروق کا ہوا تو چہرہ کا رُخ اودا ہو جائے گا۔

(ہیک ٹک) HACK TUCK لکھتا ہے کہ شرم کی سُرخی گردن اور کان سے شروع ہوتی ہے، غصہ کی سرخی آنکھوں سے نمایاں ہوتی ہے اور محبت کی سرخی پیشانی سے شروع ہوتی ہے۔

ڈاروِن کا اس بارہ میں یہ خیال ہے کہ جب کسی آدمی کو یہ خیال آتا ہے کہ دوسرے اُس کی طرف دیکھ رہے ہیں تو وہ اپنی توجہ خود اپنے چہرہ کی طرف مبذول کر لیتا ہے۔ اور اسی لئے اُس طرف خون کی روانی منتقل ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ نظریہ اب تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ماسو (MOSSO) اور ونٹ (WUNDT) وغیرہ

کے نظریہ کے مطابق شرم یا غصہ کی وجہ سے وہ رگیں جو چہرہ میں دوران خون کی ذمہ دار ہیں عارضی طور سے معطل ہوجاتی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس حصہ میں زیادہ خون آجاتا ہے۔

تم زرد کیوں ہوجاتے ہو؟

بعض وقت کسی غیر متوقع خوفناک چیز کو دیکھ کر آدمی کا چہرہ زرد پڑجاتا ہے اس کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور کبھی کبھی وہ بے ہوش بھی ہوجاتا ہے۔ رونگٹے کھڑے ہوجانے کی وجہ یہ ہے کہ ہر بال سے متعلق ایک چھوٹا سا پٹھا بھی ہوتا ہے جو خوف کا جذبہ غالب آجانے کی وجہ سے اور چھوٹا ہوجاتا ہے اور جس طرح کسی رسی کو باندھ کر کھینچنے سے ایک لکڑی کا لٹھا سیدھا کھڑا ہوسکتا ہے اسی طرح جب وہ پٹھا چھوٹا ہوتا ہے تو بال بھی کھڑا ہوجاتا ہے۔

چہرہ اسواسطے خوف سے زرد ہوجاتا ہے کہ جلد کے نیچے جو رگیں ہوتی ہیں وہ یکایک خون سے خالی ہوجاتی ہیں۔ یہ خون جسم کی بڑی نالیوں میں پہونچ جاتا ہے اور اب خون کا دوران نئے سرے سے شروع ہوتا ہے جس میں جسم کی سطح پر تو خون ہوتا نہیں، البتہ اس کی جگہ پر اندرونی جسم خون سے بھر جاتا ہے۔

لیکن چہرہ کی یہ حالت خوف کی ہی حالت میں نہیں ہوجاتی بلکہ فوری غصہ سے بھی یہی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ علاوہ بریں صرف چہرہ ہی سے خون نہیں ہٹ جاتا بلکہ تھوڑی دیر کے لئے بدن کی تمام بالائی سطح خون سے خالی ہوجاتی ہے۔ اور جب یہ خون دماغ سے بھی نکل جاتا ہے تو آدمی بیہوش ہوجاتا ہے۔

گورے رنگ کے آدمی شمال میں اور سانولے رنگ کے جنوب میں کیوں پائے جاتے ہیں؟

یہ عجیب بات ہے کہ گورے رنگ اور ہلکے رنگ کے بالوں والے آدمی زیادہ تر شمال میں پائے جاتے ہیں جہاں کی آب وہوا سرد یا معتدل ہوتی ہے اور سانولے رنگ اور سیاہ بالوں والے گرم ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً انگریز، جرمن، اہل سوئڈن، اہل ناروے، اہل ہالینڈ وغیرہ (جو بالکل شمال میں رہتے ہیں) عموماً بہت گورے رنگ کے ہوتے ہیں۔ ان کے برخلاف فرانسیسی، اطالوی، اسپینی، پرتگالی، یونانی، اور ترک وغیرہ اتنے صاف رنگ کے نہیں ہوتے۔ اسی طرح جیسے جیسے نیچے جنوب کی طرف بڑھتے جائیں گے، اتنا ہی زیادہ وہاں کے باشندوں کا رنگ سیاہ نظر آئے گا — اگر کوئی قوم جنوبی آب وہوا میں جاکر رہنے لگے تو خواہ وہ کتنی ہی

صاف رنگ کی کیوں نہ ہو مگر اُس کا رنگ پھیکا پڑتا جائے گا اور وہ سانولی ہو جائے گی۔ اس کی مثال یونانی ہیں جو کبھی بہت حسین گورے رنگ اور سنہرے بالوں والے ہوتے تھے مگر اب ان کا رنگ سانولا ہو گیا ہے اور بال کالے پڑ گئے ہیں ــــــ اس کی کیا وجہ ہے ؟ ــــــ سبب یہ ہے کہ سورج کی تمازت جنوب میں رہنے والوں کو سانولا اور سیاہ کر دیتی ہے۔ سورج کی گرم شعاعوں سے محافظت کے لئے قدرت انسان کی کھال میں ایک روغنی مادہ پیدا کر دیتی ہے جو گرم شعاعوں کو روکتا اور حدت آفتاب کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ مادہ ایک رنگ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جو چہرہ اور بالوں سے نمایاں ہو جاتا ہے

چوٹ کا احساس کیونکر ہوتا ہے ؟

اگر لڑائی میں یا کسی اور طریقہ سے چوٹ لگ جائے تو اُسوقت تکلیف نہیں معلوم ہوتی بلکہ کچھ دیر کے بعد اُس کا احساس ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہماری اُنگلی یا بدن کے کسی حصہ میں معمولی سی چوٹ آ جاتی ہے مگر جب تک ہم خون نہیں دیکھتے اُسوقت تک ہم کو چوٹ کا خیال بھی نہیں آتا لیکن جیسے ہی خون نظر پڑتا ہے یا ہماری توجہ ہماری چوٹ کی طرف (جو ہم کو لگتے وقت نہیں محسوس ہوئی تھی) منعطف کرائی جاتی ہے تو ہمیں یکایک تھوڑی سی تکلیف یا درد معلوم ہونے لگتا ہے ــــ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی صورتوں میں رگوں کے کرنٹ (CURRENT) مرکز سے باہر سطح جسم کی طرف دوڑتے ہیں اور درد کے کرنٹ اندر آنے والے کرنٹ ہوتے ہیں اور اگر اُس وقت یہ کرنٹ، آنے کی جگہ نہ پائیں تو درد نہ محسوس ہو۔ اس کی مثال یوں دیجا سکتی ہے کہ ایک اسٹیشن پر کئی ریل کی پٹریاں ہیں اور کوئی پٹری خالی نہیں بلکہ ہر پٹری سے کوئی نہ کوئی ٹرین جاری ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اور کوئی ٹرین اُسوقت تک اس اسٹیشن پر نہ آ سکیگی جب تک کہ اُسے جگہ نہ خالی ملیگی اور چونکہ فی الحال کوئی جگہ خالی نہیں لہذا کوئی دوسری گاڑی آ نہیں سکتی۔ اب چوٹ لگتے وقت درد کی گاڑی گویا آنے والی گاڑی ہے جس کے ساتھ درد بھی آ رہا ہے لیکن رگوں کے دوسرے کرنٹ باہر جا رہے ہیں اس لئے مقدم الذکر کو آنے کی جگہ نہیں ملتی اور اسی وجہ سے درد بھی نہیں محسوس ہوتا۔ جیسے ہی باہر جانے والے کرنٹ ختم ہو جاتے ہیں اور درد والے کرنٹ اندر آتے ہیں درد محسوس ہونے لگتا ہے۔

تم بہ نسبت رات کے دن میں کیوں زیادہ لمبے ہو جاتے ہو

اگر کسی شخص سے یہ سوال کیا جائے تو وہ یہ جواب دیگا کہ جتنے لمبے ہم رات کو تھے اتنے ہی دن میں بھی تھے

اور وہ اس سوال کو مذاق سمجھ کر بجائے جواب دینے کے ہنس کر ٹال جائے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص بیدار ہوتے ہی صبح کے وقت اپنے آپ کو ناپے اور پھر سوتے وقت ناپے تو اُسے پتہ چلیگا کہ صبح کے وقت اس کا قد کچھ تھوڑا سا بڑھ گیا تھا۔

اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کا جسم ڈھانچے اور پٹھوں کی وجہ سے سیدھا رہتا ہے اور اس میں سب سے زیادہ حصہ ریڑھ کی ہڈی کا ہے۔ یہ ہڈی کوئی ٹھوس ہڈی نہیں ہوتی کیونکہ اگر یہ ٹھوس ہوتو آدمی اپنے آپ کو ہر طرف جھکا نہیں سکتا۔ بلکہ یہ بہت سی چھوٹی چھوٹی ہڈیوں سے مل کر بنتی ہے جن کو فقرات یا گریاں کہتے ہیں اور جو خود ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ پھر اگر یہ ہڈیاں ایک دوسرے پر ہوتیں تو ان سے دماغ اور جسم کو بہت تکلیف پہونچتی کیونکہ وہ ہڈیاں ایک دوسرے سے رگڑ کھایا کرتیں، اس لئے اس تکلیف سے بچانے کے لئے قدرت نے ان چھوٹی ہڈیوں کے درمیان نرم نرم تکیہ یا گدے سے پیدا کر دئے ہیں۔ رات کو جب ریڑھ کی ہڈی پر وزن نہیں رہتا تو یہ گدے پھول جاتے ہیں اور جسم میں نسبتاً زیادہ درازی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن دن کے وقت یہ پھر پچک جاتے ہیں اور جسم کی درازی کم ہو جاتی ہے۔

چیزوں کے رنگ مختلف کیوں ہوتے ہیں؟

ہر چیز کا کوئی نہ کوئی رنگ ہوتا ہے۔ کوئی چیز سرخ ہوتی ہے، کوئی سبز، کوئی سیاہ، کوئی نیلی، مگر سائنس یہ بتاتی ہے کہ دنیا میں کوئی شے "رنگ" کی قسم سے ہوتی ہی نہیں "رنگ" صرف انسانی دماغ میں ہوتا ہے، اور ہم کو مختلف چیزیں مختلف "رنگ" کی صرف دکھائی پڑتی ہیں ورنہ دراصل رنگ کسی قسم کا نہیں ہوتا پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مختلف رنگ نظر کیوں آتے ہیں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر چیز کی سطح اس طرح کی بنی ہوئی ہے کہ نظر آنے والے چیز کی بعض شعاعیں مٹ جاتی ہیں۔ اور بعض منعکس ہو جاتی ہیں۔ جو شعاعیں منعکس ہو جاتی ہیں وہ اُس شئے کا رنگ ظاہر کرتی ہیں۔ اگر روشنی کی تمام شعاعیں جذب ہو جائیں تو کوئی چیز ہی نہ دکھائی پڑے۔ گویا کسی چیز کا کوئی خاص رنگ نہیں ہوتا بلکہ صرف اُس شئے کی ایک صفت ہوتی ہے۔ اور مختلف چیزوں کے مختلف رنگ ہم کو اسواسطے نظر آتے ہیں کہ ان میں شعاعیں منعکس کرتے اور مختلف صفات پائی جاتی ہیں۔

اسی طرح دنیا میں "آواز" کا بھی وجود نہیں ہے۔ اگر دنیا میں کوئی جاندار نہ پایا جائے تو آواز بھی نہ سنائی پڑے۔ خواہ کسی پل پر سے کوئی ریل گاڑی کسی دوسری گاڑی سے ٹکرا کر نیچے گر پڑے مگر پھر بھی

کوئی آواز نہ معلوم ہوگی۔
آواز در اصل مشتمل ہے ہوا کے تموجات پر، جو بذات خود بے آواز ہیں جب یہ ہمارے کانوں میں پڑتے ہیں تو دماغ تک پہونچ جاتے ہیں اور وہاں آوازمیں بدل جاتے ہیں۔ اُس وقت ہم کو احساس ہوتا ہے کہ ہم کچھ سن رہے ہیں، مگر جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے چونکہ یہ تموجات خود ہی بے آواز ہیں اس لئے اگر فضا میں کان اُن کو نہ روکے تو کبھی کوئی آواز ہی نہ سنائی دے۔ آواز کا در اصل رنگ کی طرح کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

صابن کے حباب

صابن کا بلبلہ جو کسی نلکی سے اُڑایا جاتا ہے اپنے اندر کاربن ڈیاکسائڈ گیس (CORBON DIOX-IDE GAS) رکھتا ہے جو پھیپھڑوں سے نکلتی ہے۔ اس طرح سے جو بلبلہ بنتا ہے وہ صابن اور پانی سے مخلوط اور لچک دار ہوتا ہے یعنی بغیر توڑے ہوئے اُسے مختلف سمتوں کی طرف کھینچا جا سکتا ہے اس قسم کے بلبلوں میں زیادہ لچک پیدا کرنے کے لئے صابن، پانی اور گلیسرین کا مرکب استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور معمولی زرد صابن، اکثر بیش قیمت خوشبودار صابنوں سے اس معاملہ میں زیادہ بہتر ہوتے ہیں۔
اگر اس بلبلہ کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُس کی سطح پر کئی رنگ ہیں یہ رنگ عموماً ہلکے ہوتے ہیں اور زیادہ تر پیازی، گلابی، ہرے یا نیلے ہوتے ہیں۔ چند سکنڈ کے بعد بلبلہ کی سطح پر ایک سیاہ سا دھبہ دکھائی پڑنا شروع ہوتا ہے۔ یہ دھبہ بالکل سیاہ ہو جاتا ہے حتّی کہ چند لمحوں میں بالکل ہی کالا ہو جاتا ہے اور پھر بلبلہ پھٹ جاتا ہے۔ یہ سیاہ دھبہ در اصل حباب کا باریک ترین حصہ ہوتا ہے اور اسی لئے سب سے پہلے حباب اسی جگہ سے پھٹتا ہے۔ یہاں پر حباب کی سطح (کھال) اتنی باریک ہو جاتی ہے کہ وہ روشنی کی شعاعوں کو منعکس نہیں کر سکتی۔
صابن کے بلبلوں کی مدد سے ذرات مادہ کا سائز بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ ایک خاص سائز کا بلبلہ بنانے کے لئے پانی اور صابن کے کتنے مقدار کی ضرورت ہے، جب کوئی حباب طیار ہوتا ہے تو اُسے ناپا جا سکتا ہے اور اسی طرح اس کی سطح میں صابن اور پانی کے ذرات کی تعداد معلوم ہو سکتی ہے۔ غلم (حباب) کی موٹائی اُس کے رنگ سے معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے جب بلبلہ کی موٹائی اور اُس کا رقبہ معلوم ہو تو ذرات کی تعداد کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ایک پتھر کے ٹکڑے نے تاریخ پر کیا اثر ڈالا

سو برس سے کچھ زیادہ زمانہ ہوا جب مصر میں ایک چپٹا سا پتھر دستیاب ہوا تھا جس نے دنیا کی قدیم ترین تہذیب پر غیر معمولی روشنی ڈالی۔

مصر کے نقوش (جو جانوروں کی مختلف تصویریں ہوا کرتے تھے) صدیوں تک معمہ بنے رہے اور چونکہ ان میں سے کسی ایک علامت کا حل بھی کسی شخص کو معلوم نہیں تھا اس لئے ان معموں کا حل ناممکن نظر آتا تھا مگر ساتھ ہی یہ خیال بھی تھا کہ ان کا حل اگر معلوم کر لیا گیا تو گویا مصر قدیم کی تہذیب و تمدن اور تاریخ بھی روشنی میں آجائے گی۔ ایک مرتبہ مسٹر جین چیمبرلین (JEAN CHAMBERLAIN) ایک ماہر آثار قدیمہ کو شمالی مصر کی طرف زمین کھدوانے کے سلسلے میں ایک چپٹا سا پتھر دستیاب ہوا جواب "سنگ روزیٹا" کے نام سے مشہور ہے کیونکہ وہ مصری بندرگاہ روزیٹا (ROSETTA) کے قریب ملا تھا۔ اس پتھر پر دو زبانوں میں ایک کتبہ لکھا تھا یعنی مصری اور یونانی زبان میں مصری زبان کا کتبہ دونوں طرح کی مصری تحریر میں تھا یعنی جانوروں کی شکلوں میں بھی تھا اور "عوام الناس کی تحریر" میں بھی۔ اس پتھر سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تینوں تحریریں در اصل ایک ہی عبارت ہیں۔

اب اتنا پتہ پانے کے بعد مصری ماہرین تحریر نے ان شکلوں کو پڑھنا اور یونانی عبارت سے مقابلہ کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے یہ تسلیم کر لیا گیا کہ بعض شکلوں کے واسطے جو مسلسل لکیر کھینچی گئی ہے وہ کوئی شاہی نام ظاہر کرتی ہے۔ اسے (CARTOUCHE) کہتے ہیں۔ یہ بھی مانا گیا کہ اگر یہ (PTOLEMY)(CARTOUCHE) کا نام ظاہر کرتا ہے تو اس کے الفاظ یونانی الفاظ کے ہم وزن ہوں گے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ ترجمہ یونانی زبان میں شروع کیا جائے۔ اس سے قبل ایک اور پتھر مل چکا تھا جس میں لفظ کلوپٹرا (CLEOPATRA) پرانے طرز تحریر میں کندہ تھا اور یہ پتہ چل گیا تھا کہ یہ لفظ واقعی "کلوپٹرا" ہی ہے۔ اب اس کلوپٹرا والے پتھر کو تازہ پتھر سے ملایا گیا تو معلوم ہوا کہ PTOLEMY اور CLEOPATRA کے ناموں کے اکثر حروف دونوں پتھروں میں ملتے ہیں مثلاً حرف L کلوپٹرا کے لفظ میں دوسرا حرف ہے اور پٹولمی کے لفظ میں چوتھا۔ اسی طرح حرف P کلوپٹرا کے لفظ میں پانچواں حرف ہے اور پٹولمی کے لفظ میں پہلا، وقس علی ہذا

اسی طرح دونوں پتھروں کا معائنہ کرنے سے اس کا پتہ چلا کہ دونوں کی بعض شکلیں بالکل ملتی ہیں مثلاً کسی نام میں کوئی چڑیا بنی ہوئی تھی، وہی چڑیا دوسرے نام میں بھی اسی جگہ بطور حرف کے استعمال ہوئی

جہاں واقعی اُس حرف کو استعمال کرنا چاہیئے تھا۔ چنانچہ اس چڑیا کا ترجمہ انگریزی حرف اے " A " سے کیا گیا ایک اور شکل کا ترجمہ "آر" " R " کیا گیا۔ غرضیکہ رفتہ رفتہ اسی طرح ہر شکل کا ترجمہ کرلیا گیا اور معمہ حل ہوگیا۔

اب اس حل کی بدولت مصر کی تمام پرانی تحریریں نہایت آسانی سے پڑھی جاسکتی ہیں اور ان کو پڑھنے کے بعد ہم کو مصر کی قدیم تاریخ اور اُس کے طرز معاشرت و تہذیب و تمدن کا وہ حال معلوم ہوگیا ہے جس کا ابھی تک کسی کو پتہ بھی نہ تھا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اگر وہ سنگ روزیٹا، دستیاب نہ ہوتا تو قدیم مصری تہذیب سے ہم اب بھی بالکل ناآشنا ہوتے۔

زمین کے بننے کے متعلق جدید نظریات

اگر ہم دنیا کے نقشہ یا کرہ پر نظر ڈالیں تو ہمیں چند خصوصیتیں نظر آئیں گی مثلاً تقریباً ہر جزیرہ نما کی جنوب کیطرف نوک ہوتی ہے بلکہ اکثر براعظم اور بڑے ممالک کا بھی یہی نقشہ ہوتا ہے جیسے (افریقہ، جنوبی امریکہ اور ہندوستان) دوسرے یہ کہ خشکی کا تقریباً تمام حصہ کرہ کے شمالی نصف کرہ میں واقع ہے اور تقریباً تمام بحری حصہ، جنوبی نصف کرہ میں۔ اسی طرح اگر شمالی نصف کرہ کی خشکی کے رقبہ کا نقشہ ایک کرہ کو دیکھ کر قطب شمالی کے نقطہ سے کھینچا جائے اور جنوبی نصف کرہ کی خشکی کے رقبہ کا نقشہ کرہ کو دیکھ کر قطب جنوبی کے نقطہ سے کھینچا جائے اور دونوں نقشوں کو ایک دوسرے پر منطبق کردیا جائے تو خشکی کا حصہ سمندر پر پڑے گا صرف جنوبی امریکہ کا ایک حصہ ایسا قابل تذکرہ ہے جو شمالی چین کے ایک حصہ پر پڑیگا۔ آخر ایسا کیوں ہے ــــ ؟

زمین بننے کے جدید نظریات نے اس کو اس طرح سمجھایا ہے کہ کوئی گول چیز پر بہت دباؤ پڑتا ہے تو وہ TET RA HED RON (چار مساوی مثلث نما شکل رکھنے والی ٹھوس چیز) کی طرح بن جاتی ہے۔

TET RA HED RON اس طرح بن سکتا ہے کہ چار مساوی مثلث کسی دفتی سے کاٹے جائیں اور ان کو کناروں پر ایک ساتھ چپکا دیا جائے اس طرح سے ایک لٹو کی ایسی شکل بن جائے گی جس کے سرے پر چوڑی چوڑی سطح ہوگی اور تہ پر ایک نوک۔

جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ہماری زمین بھی تھوڑی سی لٹو کی شکل کی طرح ہے یہ اسوجہ سے بھی ہے کہ زمین جب ٹھنڈی ہوتی ہے اور سکڑتی ہے تو TET RA HED RON کی سی ہوجاتی ہے اور اسوجہ سے بھی کہ وہ اپنی گولہ کی ایسی شکل اپنے دورہ کی وجہ سے قائم رکھنا چاہتی ہے۔

اب اگر دفتی کے بنے ہوئے اس TET RA HED RON کا معائنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کنارے

مرکز کشش کے زیادہ قریب ہیں بہ نسبت ان نقطوں کے۔ اور اگر اس شکل کی سطح پر پانی ٹھہرانے کی کوشش کی جائے تو وہ قدرتاً کناروں کی طرف بہیگا اور یہ نقطے بھی پانی میں آجائیں گے چنانچہ یہ نقطے، کرۂ ارض میں براعظموں یا زمین کے قطعات کی جگہ پر ہیں اور سطح سمندری حصہ کے لئے۔

سورج کیوں گرم رہتا ہے ؟

سورج کی گرمی کا سوال ہمارے لئے نہایت اہم ہے کیونکہ سورج ہی کی شعاعوں پر زندگی کا انحصار ہے تقریباً ایک صدی پہلے لوگ یہی خیال کرتے تھے کہ سورج آگ کا ایک عظیم الشان گولہ ہے اور اُس میں سے اُسی طرح گرمی نکلتی ہے جس طرح جلتے ہوئے کوئلے کے ڈھیر سے چنانچہ ایک جلتی ہوئی بھٹی کی طرح سورج کو بھی سمجھا جاتا تھا۔

لیکن اس نظریہ کی اُسوقت تردید کرنا پڑی جب یہ ثابت کیا گیا کہ دوسری چیزوں کے جلنے کی طرح، سورج ایسے زبردست گولے سے بھی جو گرمی نکلتی ہے اُسے چند ہزار سال میں ختم ہو جانا چاہئے لیکن یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ دنیا میں زندگی کا وجود لاکھوں برس سے پایا جاتا ہے اور سطح زمین پر گرمی کی حدت میں کبھی کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ سورج کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ ایک زبردست جلتی ہوئی بھٹی کی طرح ہے غلط ہے۔ چنانچہ سورج کی گرمی کو تشریح کرنے کے لئے مختلف دیگر نظرئے پیش کئے گئے۔

سب سے پہلے یہ کہا گیا کہ جب سورج ٹھنڈا ہوتا ہے تو وہ سکڑتا ہے جس کی وجہ سے گرمی بھی بڑھ جاتی ہے جو کافی عرصہ تک قائم رہتی ہے لیکن پھر یہ کہا گیا کہ اگر یہ نظریہ صحیح ہوتا تو سورج کی گرمی کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی۔ اس کے بعد یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ ٹوٹے ہوئے تارے اور دوسرے چھوٹے چھوٹے اجرام فلکی، آفتاب کی زبردست قوت کشش کی وجہ سے اس سے جاکر ٹکراتے ہیں اور اسی ٹکر کی وجہ سے گرمی پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ رگڑ یا کسی تیز ٹکر سے گرمی پیدا ہوتی ہے چنانچہ اس نظریہ کو پیش کرکے یہ کہا گیا کہ اسی طرح سورج میں گرمی پیدا ہوتی ہے جو بہت عرصہ تک رہیگی۔ لیکن یہ نظریہ بھی حساب سے غلط ثابت کیا گیا۔

اب جدید ترین نظریہ یہ ہے کہ سورج کی گرمی، ریڈیم، کی وجہ سے قائم ہے اور اُس میں اسوقت تک جو گرمی قائم ہے وہ ریڈیم کے ذرات (ATOMS) کی وجہ سے ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ریڈیم کا زور ہزاروں برس تک قائم رہتا ہے اور اُس کی ایک ادنیٰ چنگاری بھی بہت زندگی رکھتی ہے (یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زمین کی گرمی اُس ریڈیم کی وجہ سے ایک حد تک قائم ہے جو اُس کی سطح کے نیچے اُس کی تہوں میں ہے)

آج کل اس نظریہ کو بھی مشکوک نگاہوں سے دیکھا جانے لگا ہے اور اُس پر بھی کئی اعتراضات وارد ہوگئے ہیں لہذا یہ کہنا پڑے گا کہ سورج کی گرمی کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا ہے۔

تم گرم کیوں رہتے ہو؟

دنیا میں دو قسم کی مخلوق ہیں۔ سرد خون والی اور گرم خون والی۔ مینڈک، سانپ، چھپکلی، گھونگھا اور مچھلی سرد خون رکھتی ہیں اور شیر، چیتے، گھوڑے، بلی، کتے وغیرہ گرم خون کے ہیں۔ انسان بھی گرم خون والا جانور ہے۔

ان دونوں قسموں کے جانوروں میں فرق یہ ہے کہ سرد خون رکھنے والے جانوروں پر ان کے ماحول کے ٹمپریچر کا بھی اثر پڑتا ہے مگر گرم خون والے جانوروں کا ٹمپریچر وہی رہتا ہے خواہ ان کے ماحول میں کتنی ہی سردی یا گرمی کیوں نہ ہو۔ گویا اگر کسی مینڈک کو ۴۰ ڈگری حرارت میں رکھدیا جائے تو مینڈک کی حرارت بھی اتنی ہی ہوجائے گی۔ سرد خون رکھنے والے جانور سردی کے مارے منجمد بھی ہو سکتے ہیں اور اگر ایک مقررہ درجۂ حرارت سے زیادہ کی گرمی میں انھیں رکھا جائے تو وہ مر بھی جائیں۔

گرم خون رکھنے والے جانوروں کی حالت جداگانہ ہے۔ مثلاً تندرستی کی حالت میں ایک انسان کا درجۂ حرارت تقریباً ایک ہی رہتا ہے۔ اب خواہ وہ قطب شمالی میں جاکر رہے یا خطِ استوا کے ممالک میں، اُس کا جسمانی درجۂ حرارت یہی رہیگا۔ البتہ جب وہ مر جائے گا تو اُس کی لاش کی حرارت ماحول کی حرارت کے مطابق ہوگی۔ گویا انسان کا ٹمپریچر زندگی پر منحصر ہے، قدرت نے اُس کے لئے کئی ایسے سامان مہیا کر دئے ہیں جو اس کا درجۂ حرارت معتدل رکھتے ہیں۔ بہت سردی میں کھال سکڑتی ہے اور خون کی ایک کثیر مقدار کو سطح پر جانے اور ٹھنڈا ہوجانے سے روکتی ہے۔ گرمیوں میں جسم کے مساوات کھل جاتے ہیں، پسینہ باہر نکلتا ہے، بخارات اُٹھتے ہیں اور ان چیزوں سے بدن میں ٹھنڈک پہونچتی ہے۔ ہمارے بدن میں جو گرمی ہے وہ جلنے (COMBUSTION) کی وجہ سے قایم رہتی ہے مگر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ فطرت نے گرمی کی جو اوسط مقدار ہمارے بدن میں رکھی ہے وہ کس لحاظ سے ہے۔ غالباً اس کے جواب میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ اتنی ہی گرمی مناسب تھی۔

کیا تم اپنا دماغ خود دیکھ سکتے ہو؟

اگر کوئی آدمی اپنا دماغ دیکھنا چاہے تو وہ ایک بند کمرہ میں ایک سیاہ کپڑے اور ایک موم بتی کی

مدد سے عملی تجربہ کرکے دیکھ سکتا ہے۔

تجربہ شروع کرنے والے کو سب سے پہلے ۳ مربع فٹ سیاہ کپڑا لینا چاہئے جو بالکل صاف، چکنا ہو اور اُس میں لکیریں نہ پڑی ہوں۔ کمرہ میں بالکل اندھیرا ہو اور ایک موم بتی بھی موجود رہے۔ اس کپڑے کو دیوار پر اس طرح لٹکانا چاہئے کہ اس کا نیچے والا کنارہ تجربہ کرنے والے کی آنکھوں کے برابر ہو (خواہ وہ کھڑا ہو یا بیٹھا) اس کے بعد اُس شخص کو سیاہ کپڑے سے ۳ فٹ کے فاصلہ پر آجانا چاہئے اور پھر اپنا سر متوازی رکھتے ہوئے اور ٹھوڑی نیچے کرکے اُسے اپنی آنکھوں کو ۴۵ ڈگری اوپر اُٹھانا چاہئے تاکہ اُسکی نظریں سیاہ کپڑے کے بالکل وسط پر پڑیں۔ ٹھیک اسی حالت میں ایک روشن شمع اُس کی ناک سے ۶ اِنچ کے فاصلہ پر رکھی جائے اس کے بعد شمع کو اُس کے چہرہ کے دونوں رخوں کی طرف (دائیں بائیں) آہستہ آہستہ حرکت دیجائے اور ہر حرکت میں ۲ سکنڈ صرف کئے جائیں۔ اور اس حرکت کا طول آٹھ اِنچ کے قریب ہونا چاہئے۔ اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ اس حرکت کے دوران میں شمع کے شعلہ میں نہ ہوا لگنے پائے اور نہ سانس، بلکہ اُس شعلہ کو برابر جلنا چاہئے۔

اگر یہ تجربہ بہت ہوشیاری سے کیا جائے اور سر اپنی جگہ پر نیچے اور نظریں اُٹھی رہیں تو تجربہ کرنے والے کو نظر آنا شروع ہوگا کہ اُس کے سامنے فضا میں اُس کے دماغ کا نقشہ کھنچ رہا ہے۔ اُسے درخت کی پتی کی طرح اُس شکل میں لاتعداد چھوٹی چھوٹی رگیں دکھائی پڑے گی۔ یہ رگیں عام طور سے کالی ہوتی ہیں اور غیر مساوی طور پر ہر طرف پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ بہرحال جب آنکھوں کے سامنے یہ شکل بننے لگے تو تجربہ کرنے والے کو چاہئے کہ وہ اپنی نظریں اُسی پر جمائے رہے اور نظر ہلنے نہ پائے یہ سیاہ منتشر جال دراصل مشتمل ہوتا ہے ان کی نالیوں پر، یہ خیال رہے کہ اس شکل کو صرف تجربہ کرنے والا ہی دیکھ سکتا ہے۔ کمرہ میں جو لوگ اور رہونگے وہ نہ دیکھ پائیں گے البتہ اگر کوئی دوسرا یہی کام کرے تو وہ بھی اس شکل کو دیکھ سکتا ہے۔

دراصل یہ محض فریب نظر ہے۔ فضا میں کسی چیز کا وجود نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف ایک واہمہ اور تخیل ہوتا ہے یہ واقعہ ہے کہ اس کی شکل آنکھوں اور دماغ کے اندرونی شکل کی طرح ہوتی ہے۔ یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ شکل دیکھی جاتی ہے وہ دماغ نہیں ہے بلکہ آنکھوں کا اندرونی پردہ ہے، بہرحال یہ کچھ بھی ہو اس میں شک نہیں کہ دماغ کی تہوں کی طرح ایک شکل ضرور سامنے آجاتی ہے۔

طیارچیوں پر کیا گزرتی ہے؟

قدرت نے انسان کو مثل چڑیوں کے قوت پرواز نہیں عطا کی ہے اسی لئے جب انسان یکایک

بلندی پر پہونچ جاتا ہے تو اُسے عجیب وغریب باتیں پیش آتی ہیں شدید سردی کی وجہ سے وہ بے حس ہوجاتا ہے اور بلندی پر ہوا کے ہلکے ہوجانے کی وجہ سے وہ مجبور ہوتا ہے کہ خارجی آکسیجن حاصل کرے قصہ مختصر یہ کہ ایسے مقامات پر پہونچکر اکثر انسان کی عقل گم ہوجاتی ہے، اعصابی حس معطل ہوجاتا ہے، سر میں چکر معلوم ہوتا ہے اور بعض اوقات انسان بے ہوش بھی ہوجاتا ہے۔ بہر حال ہوا میں پرواز کرنے والے کے جسم اور دماغ میں جو تغیرات ہوتے ہیں ان کا حال ہی میں تجربہ کیا گیا ہے اور اس کے بہت دلچسپ نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

خون کے اندر معمولی حالت میں فی مکعب سرخ قسم کے پچاس ہزار ذرات ہوتے ہیں۔ زیادہ بلندی پر یہ تعداد بہت زاید ہوجاتی ہے اور سفید ذرات کی تعداد زیادہ نہیں بڑھتی۔ پرواز کے دوران میں سانس لیتے وقت جو تغیرات پیدا ہوتے ہیں وہ زیادہ قابل توجہ ہیں۔ سانس کے لئے آکسیجن کی ضرورت ہے اور بہت بلندی پر جاکر یہ ناکافی ثابت ہوتی ہے اور دم گھٹنے لگتا ہے۔ رگوں کی قوت کم ہوجاتی ہے اور زیادہ بلندی پر کام کرنے سے عموماً تھکن پیدا ہوجاتی ہے اور کاہلی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ کام کرنا بہت تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے قوت سامعہ میں فرق آجاتا ہے، کانوں میں کھٹ کھٹ کی آواز سُنائی دیتی ہے، قوت باصرہ میں اضافہ ہوجاتا ہے، اور قوت احساس میں کمی آجاتی ہے۔

کوہ ایورسٹ کی چوٹی پر پہونچنے کی سعی کے دوران میں ان تغیرات کا مزید تجربہ کیا گیا تھا اور ہر صورت میں یہ معلوم کیا گیا کہ ان رگوں میں جن سے خون جاتا ہے آکسیجن کی مقدار بہ مقابلہ سطح سمندر کے کم ہوجاتی ہے سمندری سطح پر خون کی نالیوں میں ۹۵ سے ۱۰۰ فیصدی تک آکسیجن کا اجتماع ہوتا ہے لیکن ۴۰۰۰ فٹ کی بلندی پر ۸۰ سے لیکر ۹۰ فیصدی تک رہجاتا ہے۔

یہ مختلف اثرات، اکثر لوگوں میں وہ بیماریاں پیدا کرتے ہیں جن کو ہوائی جہاز یا غبارہ کی بیماریاں کہا جاتا ہے اور جو پہاڑی بیماریوں کی ہم پلہ شمار کی جاسکتی ہیں۔ ان بیماریوں میں سانس لینا دشوار ہوجاتا ہے زبان کا مزہ بگڑجاتا ہے اور رگوں میں جمود پیدا ہوجاتا ہے۔ اور دردسر وغنودگی طاری رہتی ہے۔

ہوائی جہازوں کی تازہ ترین ساخت میں ان باتوں کا خیال رکھا گیا ہے کہ پرواز کے دوران میں جو سخت امراض لاحق ہوجاتے ہیں وہ نہ ہونے پائیں چنانچہ معمولی پرواز میں جہاز کو بہت زیادہ بلندی پر نہیں لیجایا جاتا پھر بھی زیادہ بلندی پر پہونچکر جو تغیرات پیدا ہوتے ہیں وہ طبی روسے یقیناً دلچسپ ہیں۔

دُمدار ستارہ

دنیائے سائنس کے لئے کسی جدید دمدار ستارہ کا انکشاف ہمیشہ باعث دلچسپی رہتا ہے۔ حال ہی میں پروفیسر باڈی (PROF. BADDE) آف ہمبرگ نے اعلان کیا تھا کہ انھوں نے (CYGNUS) ستاروں کے جھنڈ میں ایک نیا دمدار ستارہ کا وجود دریافت کیا ہے۔ یہ ستارہ بہت دھندلا ہے اور دوربین کی مدد کے بغیر نہیں دکھائی دیتا مگر اس کی روشنی میں ترقی ہورہی ہے اور وہ جب سے دریافت ہوا ہے اُس وقت سے لیکر اسوقت تک اُس کے قد وقامت میں برابر ترقی ہورہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ستارہ بھی نظام شمسی کے قریب جلد پہونچ جائے گا۔

دُمدار ستاروں کی تیزی رفتار کا سوال قابل توجہ ہے۔ ان میں سے اکثر ستارے فی گھنٹہ دس لاکھ میل کی رفتار سے چلتے ہیں بعض صدہا برس کے بعد ایک مرتبہ دکھائی پڑجاتے ہیں مگر موجودہ سائنس اتنی ترقی کرچکی ہے کہ وہ صدیوں برس پہلے سے یہ بتا سکتی ہے کہ ایک خاص دمدار ستارہ اب کب، کس دن اور کس گھنٹہ میں نمودار ہوگا۔

دمدار ستارہ کے عموماً تین حصہ ہوتے ہیں :- (۱) سر (NUCLEUS) (۲) جو (COMA ، کے گرد رہتا ہے (۳) دُم (TAIL)۔ (NUCLEUS) اس کا خاص روشن حصہ (COMA) غلاف کی طرح ہوتا ہے جس سے (NUCLEUS) ڈھک جاتا ہے۔ دُم مشتمل ہے چمکتی ہوئی گیس پر جو بعض اوقات کروروں میل تک چمک دکھاتی ہے۔

سویڈن کے پروفیسر ارہنیس (ARRHENIUS) نے دُمدار ستاروں کی بابت ایک دلچسپ حقیقت دریافت کی ہے۔ عرصہ ہوا یہ دیکھا گیا تھا کہ دُمدار ستارہ کی دُم بالعموم آفتاب کے رخ کی طرف سے ہٹ جاتی ہے یعنی جب ستارہ آسمان پر چلتا ہوتا ہے تو اُس کی دُم اس طرح گھومتی ہے کہ وہ ستارہ ہمیشہ آفتاب کی سمت سے الگ رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آفتاب سے جو شعاعیں نکلتی رہتی ہیں وہ ایک خاص دباؤ ڈالتی ہیں اور یہ دباؤ دمدار ستارہ کی دم کے گیس والے اجزا کو اُس سے دور ہٹا دیتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیشہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ ستارہ کی دم سورج سے الگ جارہی ہے۔

دُمدار ستارے بیضاوی طریقہ سے سفر کرتے ہیں۔ وہ خلا کی گہرائیوں سے آفتاب تک آتے ہیں اور اس دوران میں ان کی رفتار بہت تیز رہتی ہے، پھر جب وہ آفتاب کے قریب پہونچتے ہیں تو اپنی دُم

پھیر دیتے ہیں اور جہاں سے وہ نکلے تھے وہیں پھر چلے جاتے ہیں۔ دُمدار ستارہ کے راستہ کا خم معلوم کرکے پتہ لگایا جاتا ہے کہ ستارہ کی رفتار کیا رہی ہے اور اسی حساب سے وہ اُن کی آیندہ آمد کی تاریخ بھی بتا دیتے ہیں۔

ان دُمدار ستاروں سے ہم کو عمر انسانی کی کوتاہی کا بھی اندازہ لگ جاتا ہے بعض دُمدار ستارے کئی ہزار برس کے بعد واپس آتے ہیں۔ چند برس گزرے اسی قسم کا ایک ستارہ دکھائی پڑا تھا۔ اس سے قبل روم و یونان کی تہذیب سے پہلے، اور اہرام مصر بننے کے قبل وہ نظر آیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ طویل مدت ہزاروں قوموں کا عروج و زوال، کروروں لڑائیاں، عجیب و غریب انقلابات زمانہ دیکھ چکی ہوگی مگر فضائے بسیط میں یہ عرصہ دراز دُمدار ستارہ کا محض ایک چکر ہے!

کیا مریخ پر کوئی آبادی ہے؟

'چاند' کے بعد 'مریخ' ہمارا سب سے قریبی ہمسایہ ہے اور یہ جاننا ہمارے لئے یقیناً باعث دلچسپی ہوگا کہ اُس میں کوئی آبادی ہے یا نہیں۔ کیونکہ اگر اُس میں کوئی آبادی ہوئی تو بہت ممکن ہے کہ لاسلکی ایجاد کے بعد ہم مریخ کے بسنے والوں سے گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رکھ سکیں۔

مریخ کی "نہروں" پر کافی عرصہ تک مباحثہ رہا ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہاں موسم سرما کے دوران میں قطبین پر برف کے کھیت جم جاتے ہیں۔ اور گرمی میں پگھلتے ہیں چونکہ مریخ میں پانی کی قلت بتائی جاتی ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ آبپاشی کرنے کے لئے مریخ والوں نے بڑی بڑی نہریں بنائی ہیں جو برفاب کے اس ذخیرہ کو ان کی دنیا کی سطح تک پہونچا دیتی ہیں۔ اور اس طرح مریخ والے اس پانی سے اپنے آپ کو فائدہ پہونچاتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ جو چیز دکھائی پڑتی ہے وہ نہریں نہیں ہیں بلکہ ترکاریوں کے بڑے بڑے قطعات ہیں جو ان نہروں کے دونوں طرف واقع ہیں لیکن اکثر ماہرین فلکیات اس نقطہ سے اختلاف رکھتے ہیں۔ بعض تو کہتے ہیں کہ ہم یہ سب چیزیں مطلق دیکھ ہی نہیں سکے ہیں۔

بہر حال یہ سوال کہ آیا ہماری طرح جاندار لوگ مریخ کی سطح پر رہتے ہیں اس جستجو کا محرک ہوا ہے کہ وہاں پر کسی قسم کی زندگی ممکن بھی ہے یا نہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ زندگی کے لئے پانی، حرارت، اور ایک خاص قسم کی فضا کی ضرورت ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ چیزیں مریخ میں موجود ہیں یا نہیں۔

سب سے پہلے حرارت، کا مسئلہ لیجئے۔ زندگی صرف چند حدود کے درمیان منحصر ہے اور یہ حدود

کے نقطۂ انجماد و نقطۂ حارہ ہیں۔ زمین کا اوسط درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بہت زیادہ اوپر ہے۔ اور مریخ میں اس سے بہت کم۔ نیز گرمی کے زمانہ میں بھی سب سے زیادہ حرارت جو ہوتی ہے وہ بھی نقطۂ انجماد (FREEZING POINT) سے کچھ ہی اوپر ہوتی ہے۔ اس لئے اگر مریخ کے باشندے اپنی طویل سردی کی مدت میں اپنے آپ کو گرم رکھنا جانتے ہیں تو وہ اس کی سطح پر ضرور رہ سکتے ہیں۔

مریخ پر پانی بہت ہی کم ہے۔ اور چونکہ وہ ہماری زمین کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہے اس لئے وہ زیادہ خشک ہو گیا ہے اور اسی لئے یہ "نہریں" (اگر واقعی ان کا کوئی وجود ہے) بنائی گئی ہیں۔ مریخ کی سطح پر بہت بڑے بڑے ریگستانی صحرا ہیں جن کی وجہ سے مریخ کا رنگ سُرخ نظر آتا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ اگر پانی کے استعمال میں وہاں کفایت کی جائے تو زندگی کے لئے کافی ہو۔

بہر حال مریخ میں زندگی کا امکان ضرور ہے اور چونکہ قدرت ہر امکان کو بیکار جانے نہیں دیتی اس لئے وہاں آبادی ہونا چاہئے۔

زلزلہ کیا ہے

تمام مظاہر فطرت میں، زلزلہ ہی وہ چیز ہے جس سے انسان کی حد درجہ لاچاری اور بے بسی ظاہر ہوتی ہے۔ عام طور پر کہا جا سکتا ہے کہ زمین کے سخت چھلکے میں کچھ خفیف تغیرات ہونے کی وجہ سے زلزلہ آجاتا ہے زمین برابر سکڑ رہی ہے اور جب وہ سکڑتی ہے تو کرۂ ارض کے پانی اور خشکی کے قطعات میں تغیرات ہوتے ہیں جب سمندر میں زلزلہ آتا ہے تو ہم کو بہت کم معلوم ہوتا ہے لیکن خشکی کے زلزلے چونکہ بہت زیادہ تباہی اور بربادی اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ اس لئے ان کا علم ہم کو حاصل ہو جاتا ہے۔

کرۂ ارض کے بعض حصے اکثر زلزلہ کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً جاپان اور مغربی و جنوبی امریکہ میں زلزلے کے جھٹکے زمین پر مختلف رفتار سے پڑتے ہیں اور اس رفتار کو ایک آلہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے جسکو "سیسموگراف" (SIESMOGRAPH) کہتے ہیں۔ بعض وقت یہ جھٹکے ہلکے ہوتے ہیں اور ایک محدود رقبہ تک محسوس کئے جاتے ہیں اور بعض وقت وہ بہت سخت ہوتے ہیں اور تمام زمین کی سطح سے گزرتے ہیں۔

خشکی کے زلزلے جو ساحل سمندر کے کنارے آتے ہیں یا سمندری زلزلہ جو ساحل کے قریب آتے ہیں سب سے زیادہ تباہ کن ہوتے ہیں اور ان زلزلوں کے بعد نہایت زبردست جوار بھاٹے کی لہریں اُٹھتی ہیں ۱۸۹۹ء میں الاسکا میں ایک زلزلہ آیا جس میں ہر چند منٹ کے بعد لہریں ۸۰ — ۸۰ فٹ تک چڑھ جاتی تھیں

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سطح سمند رسے ۰ ۴ فٹ اوپر تک تباہکاریوں کا سلسلہ پہونچگیا۔
۱۸۳۵ء میں ساحل چیلین (CHILEAN) میں ایسا زبردست زلزلہ آیا کہ سمندر خلیج سے ہٹ گیا اور سطح سمندر کے تقریباً ۵ فٹ تک کے بالو کے کنارے دکھائی پڑنے لگے۔ اس کے بعد ایک لہر پانی کی سب سے اونچے نشان سے بھی ۳۰ فٹ زیادہ اونچی آئی اور اپنے ساتھ سب کچھ بہالے گئی۔ اس کے بعد اسی طرح برابر لہریں اٹھتی رہیں جو ایک دوسرے سے زیادہ اونچی ہوتی تھیں اور یہ حالت تین دن تک قائم رہی، یہ جھٹکے ۶ ہزار میل کے فاصلہ تک معلوم ہوئے تھے، وسط بحر الکاہل میں ان کی وجہ سے زبردست سیلاب آگئے تھے اور تمام سمندر اپنی تہ میں تھرا رہا تھا۔
واشنگٹن کے ادارۂ کارنیگی (CARNEGIE INSTITUTION) نے ساحل چیلین میں اس طرح کے زلزلہ آنے کے وجوہات دریافت کرنے کے لئے باقاعدہ تحقیقات شروع کی تھی اور مغربی ساحل امریکہ کے سمندر کی تہ کا نقشہ مرتب کرنے کے لئے دو جہازوں کو تازہ ترین آلات مہیا کرکے اس کام پر مامور کیا تھا۔

کیا قوت کشش کا راز منکشف ہوگیا ہے؟

قوت کشش، تمام قوتوں سے زیادہ پراسرار سمجھی گئی ہے۔ وہ خلا کے کرد ڑ ول میل کے رقبہ میں اپنا اثر دکھاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان مادی ذرات کو مجتمع کئے ہوئے ہے جو اتنے چھوٹے ہیں کہ ایک سوئی کی نوک پر اربوں کی تعداد میں جمع ہوسکتے ہیں۔
ابھی تک ایسا کوئی مادہ دریافت نہیں ہوا ہے جو قوت کشش کو روک سکے۔ بیچ میں ایک پردہ حائل کردینے سے انسان گرمی یا روشنی کو روک سکتا ہے مگر قوت کشش کو کوئی پردہ نہیں روک سکتا۔ مثلاً شیشہ سے روشنی گزر سکتی ہے مگر بجلی نہیں جاسکتی۔ لوہے کی ایک چادر روشنی کو روک سکتی ہے مگر بجلی اس سے گزر سکتی ہے، لیکن قوت کشش کو روکنے کے لئے کوئی پردہ کام نہیں دے سکتا۔
قوت کشش کا اصلی راز ابھی تک نہیں ظاہر ہوسکا ہے، اس کے بارہ میں مختلف نظریات پیش کئے جاچکے ہیں مگر سب پر اعتراض کئے گئے۔ کچھ عرصہ ہوا کلیفورنیا کے پروفیسر ٹی۔ جے۔ جے سی J.J.SEE نے ایک جدید نظریہ پیش کرکے دعوی کیا تھا کہ انھوں نے قوت کشش کا راز معلوم کرلیا ہے۔
وہ نظریہ یہ ہے کہ قوت کشش مشتمل ہے بجلی اور مقناطیسی لہروں کے ایک خاص سلسلہ پر۔ یہ لہریں گرمی اور روشنی کی لہروں سے زیادہ بڑی ہوتی ہیں مگر مقناطیس سے ان کا نزدیکی تعلق ہے۔ خلا میں ان

لہروں کی رفتار بھی، روشنی کی لہروں کی رفتار کے برابر ہے یعنی فی سکنڈ ۱۸۶۰۰۰ میل فی گھنٹہ۔ یہ لہریں ایک مادی شے کے چاروں طرف سے نکلتی رہتی ہیں۔

اب پروفیسر موصوف کا نظریہ یہ ہے کہ یہ لہریں ایک دوسرے میں ملی ہوئی ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کو کھینچتی ہیں۔ اس طرح اجرام فلکی، ان ملی ہوئی لہروں کی بدولت ایک دوسرے کی طرف کھنچ جاتے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ہماری زمین پر شمالی اور جنوبی قطب میں مقناطیسی طاقت برابر کی نہیں ہے۔ یعنی نصف کرۂ جنوبی میں قوت مقناطیسی بہ نسبت نصف کرۂ شمالی کے بہت زیادہ ہے۔

بغیر گرمی کی روشنی

یہ چیز ہر شخص کو معلوم ہے کہ آدمی کی پیدا کی ہوئی کوئی روشنی ہو، وہ اپنے جوہر کی ایک کافی مقدار گرمی پیدا کرنے میں خرچ کر دیتی ہے۔ یہ حال بجلی کی روشنی میں بھی پایا جاتا ہے یعنی یہ کہ جب کرنٹ جاری رہتا ہے تو بلب بھی گرم ہو جاتا ہے مگر فطرت ایسی روشنی پیدا کرتی ہے جو تمام روشنیوں کے برابر ہوتی ہے مگر پھر بھی اسمیں گرمی نہیں پائی جاتی۔ سائنس میں اس روشنی کو "سرد روشنی" کہتے ہیں اور یہ روشنی جگنو اور بعض مچھلیوں سے نکلتی ہے۔

حال میں اس سرد روشنی کے متعلق تحقیقات ہونا شروع ہوئی ہے کیونکہ اگر اس کا راز معلوم ہو جائے تو تجارتی نقطۂ نظر سے بہت فایدہ ہو۔ چنانچہ اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے سائنس دانوں نے ان کیڑوں کی تحقیقات بھی شروع کی ہے جو سرد روشنی پہونچاتے ہیں اور اس تحقیقات سے بہت کچھ نتایج برآمد ہوئے ہیں۔۔۔ فلاڈلفیا کے ایک پروفیسر ڈاکٹر ای نیوٹن ہاروے نے ایک کانفرنس میں یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ جگنو کی سرد روشنی، ہوا کی آکسیجن اور ایک خاص مادہ سے ملکر پیدا ہوتی ہے۔ یہ مادہ بعض خاص غدود سے پیدا ہوتا ہے جنھیں فطرت نے اسی کام کے لئے بنایا ہے۔ یہ درحقیقت چھوٹی چھوٹی لالٹینیں ہیں جن میں خاص قسم کے شعاعیں پھینکنے والے شیشے ہوتے ہیں مگر جگنو میں درحقیقت اس قسم کا کوئی ایسا شیشہ نہیں ہے جو شعاعیں پھینک سکے۔

جگنو کی روشنی چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے پیدا ہوتی ہے جن کے آگے ECTOPLASM (ایک قسم کا زندہ مادہ) پایا جاتا ہے۔ اس روشنی کے لئے ہوا اور پانی کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔

کیڑوں کی یہ روشنی خطرہ کا نشان بھی ہے تاکہ دوسرے کیڑے اُس کو آکر کھا نہ جائیں، نیز ایک فایدہ یہ ہے

کہ ان کیڑوں کے جوڑے ایک دوسرے کو پہچان کر قریب آجاتے ہیں اور دوسرا یہ کہ اس روشنی سے کیڑوں کی راہ پرواز متعین ہوجاتی ہے۔ بہرحال اگر اس سر روشنی کا راز منکشف ہوجائے تو سال میں کروروں روپیہ کا فایدہ ہر ملک کو ہوسکتا ہے۔

نظریہ "اضافیت" (RELATIVITY)

پروفیسر انشٹین (PROF. EINSTEIN) کا نظریہ "اضافیت" (RELATIVITY) بہت مشہور چیز ہوچکی ہے لیکن چونکہ اس کی حقیقت کم لوگ جانتے ہیں اس لئے اس کی تشریح دلچسپ ہوگی۔
اگر تم کسی بچہ کو امرود یا کسی پھل وغیرہ کی ایک قاش دو تو ممکن ہے کہ وہ اُس قاش کو ایک "بڑی" قاش سمجھے لیکن جب کسی دوسرے بچہ کو اُسی کے سامنے پہلی قاش سے زیادہ بڑی قاش دیدوگے تو وہ فوراً سمجھ لیگا کہ میری قاش چھوٹی ہے یعنی "نسبتاً" دوسری قاش کے مقابلہ میں پہلی چھوٹی معلوم ہوگی۔
پروفیسر انشٹین نے یہ بتایا ہے کہ ہماری دنیا میں "حرکت" کا احساس بالکل اضافی و نسبتی چیز ہے یعنی اُس کی رفتار کسی قائم نقطہ سے نہیں ناپی جاسکتی کیونکہ دنیا میں ایسا کوئی مستقل نقطہ ہی نہیں جہاں سے اُسے ناپا جاسکے۔ ہماری زمین جس پر ہم رہتے ہیں خود اپنے محور پر گھومتی ہے اور یہ "محور" ارتعاش کرتا رہتا ہے۔ علاوہ بریں زمین سورج کے گرد بھی تقریباً ۱۸ میل فی سکنڈ کے حساب سے چکر لگاتی رہتی ہے اور یہ تمام نظام شمسی خلا میں ایک لامعلوم رفتار سے چکر لگاتا ہے۔
فرض کرو ایک آدمی ہے جو ایک متحرک جہاز پر تختہ کے اوپر نیچے چڑھ رہا ہے، پھر وہ ایک ایسے آدمی کے پاس سے گزرتا ہے جو ایک دوسرے جہاز پر (جو مخالف سمت جارہا ہے) اسی طرح اوپر نیچے اُترتا چڑھتا ہو تو ظاہر ہے کہ ہم کو اس حالت میں ایسا کوئی مستقل نقطہ نہ ملیگا جہاں سے کچھ ناپا جاسکے۔
اس لئے پہلی بات یہ ہوئی کہ تمام حرکت صرف حرکت نسبتی ہے۔ انشٹین نے یہ بھی ثابت کیا کہ مختلف اجسام پر جو مختلف رفتار سے حرکت کررہے ہیں وقت یکساں نہیں گزرتا یعنی کسی ایسی چیز پر جو بہت تیزی سے حرکت کررہی ہو ایک گھنٹہ کا اتنا ہی وقت نہیں ہوتا جتنا ایک سست رفتار چیز کے گھنٹہ کا۔ گویا وقت بھی حرکت کی طرح صرف "نسبتی" چیز ہے۔
اس نظریہ کی وجہ سے فلکیات کے بعض ایسے مسائل بھی حل ہوگئے ہیں جو پہلے سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ کئی برس ہوئے ایک تجربہ کیا گیا تھا جس میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ ایک ستارہ سے آتی ہوئی روشنی

کی شعاع سورج کی قوت کشش کی وجہ سے دب گئی ہے۔

وہ تجربہ یوں ہوا تھا۔ جب سورج آسمان پر موجود نہ تھا تو آسمان کا ایک نقشہ اُتارا گیا اور یہ معلوم کیا گیا کہ بعض ستاروں کی بعض خاص جگہیں ہیں۔ اس کے بعد جب ایک مرتبہ سورج گرہن پڑا تو پھر آسمان کی تصویر کھینچی گئی اور دونوں نقوش کو ملایا گیا ان سے معلوم ہوا کہ پہلے نقشہ میں جن ستاروں کی تصاویر لی گئی تھیں ان کی جگہیں دوسرے نقشہ کی جگہوں سے مطابقت نہیں کرتیں۔ اس سے یہ ثابت کیا گیا کہ جو روشنی ان ستاروں سے آرہی تھی وہ سورج کی کشش کی وجہ سے دب گئی تھی۔

چوتھا بُعد کیا ہے؟

دُنیا میں تین ابعاد ہیں یعنی طول، عرض اور اونچائی۔ کسی دئے ہوئے نقطہ سے ایک لکیر کھینچی جائے تو وہ "طول" ہوگا۔ کسی چپٹی سطح پر اس لکیر کے زاویہ قائمہ بنائے جائیں تو مربع بن جائے گا یعنی طول کے ساتھ عرض بھی ہوجائے گا۔ اس مربع کے زاویہ قائمہ بنائے جائیں تو مکعب کی شکل ہوجائے گی جس میں اونچائی بھی علاوہ طول و عرض کے ہوگی۔ اصولاً اب اس مکعب کے بھی زاویہ قائمہ بنائے جاسکتے ہیں اور نئی شکل چوتھا بعد رکھنے والی شکل ہوسکتی ہے۔

کوئی نقطہ لو تو ایک دوسرے پر زاویہ قائمہ بناتی ہوئی دو لکیریں اس نقطہ سے کھینچی جاسکتی ہیں لیکن اگر اسی نقطہ پر ایک تیسری لکیر کھینچنا ہو جو پہلی دونوں لکیروں پر زاویہ قائمہ بناتی ہو تو اُسے خود کاغذ پر زاویہ قائمہ بناتے ہوئے کھینچنا پڑے گا گویا وہ ہوا میں کھڑا ہوا ہے۔ اب اسی نقطہ پر اور ان تینوں لکیروں پر زاویہ قائمہ بناتے ہوئے چوتھی لکیر کیسے کھینچی جاسکتی ہے۔ یہ چیز چوتھا بُعد ہوگی۔

ایک نظریہ کی حیثیت سے یہ بُعد ممکن ہے اور اقلیدس کی چار جسامتیں رکھنے والی شکلوں کے متعلق بہت کچھ لوگوں کو علم ہے۔ ڈاکٹر ماننگ (DR. MANNING) نے اس موضوع پر ایک پوری کتاب لکھی ہے۔ لیکن ہمارے لئے اپنے دماغ میں اس بُعد کی شکل متعین کرنا تقریباً ناممکن ہے البتہ اسے ثابت کیا جاسکتا ہے۔

مثلاً داہنے ہاتھ کا دستانہ بائیں ہاتھ میں نہیں آسکتا لیکن اگر اُسے اندر سے اُلٹ دیا جائے تو آجائیگا اسی طرح یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ربڑ کا گیند اندر سے الٹ کر چوتھا بُعد بنایا جاسکتا ہے۔

کسی دھاگے میں دو رخ سے گرہ نہیں بندھ سکتی۔ ایک سرے کو دوسرے سرے پر تیسرے رخ

میں اُٹھانا پڑے گا۔ اور ہمارے سہ رخی خلا میں یہ ناممکن ہے کہ ایسے تاگے میں گرہ باندھی جائے جس کے دونوں سرے پکڑ لئے گئے ہوں۔ لیکن پروفیسر زولنر (ZOLLNER) نے ایسی گرہیں لگائیں اور اسی وجہ سے اُن کو چوتھے بعُد کا یقین آگیا تھا۔

انشٹین کی رائے ہے کہ وقت، چوتھا بعُد ہے مگر حقیقتاً وقت کوئی جسامت نہیں رکھتا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "غیب دانی" اسی چوتھے بعُد سے متعلق ہے۔ مثلاً ایک صندوقچہ ہے جس میں انگوٹھیاں رکھی ہیں۔ اب جب تک تمھاری آنکھوں کی سطح کے برابر صندوقچہ رکھا رہے تم ان انگوٹھیوں کو نہیں دیکھ سکتے ہو لیکن اگر تم آنکھیں اُٹھاؤ یا صندوقچہ کو نیچا کرکے اوپر سے اُسے دیکھو تو اندر کی انگوٹھیاں تم کو نظر آئیں گی یعنی تیسرے بعُد کی مدد سے تم وہ چیز دیکھ سکے جو اس سے قبل تم نہ دیکھ سکتے تھے۔ اسی طرح چوتھے بعُد کی مدد سے "بند" کمرہ یا "بند" صندوقچہ کی چیز بھی ہم دیکھ سکتے ہیں، اور اسی کا نام لوگوں نے "غیب دانی" رکھا۔

برف کا پانی کس طرح گرم کیا جائے کہ برف نہ پگھلے

بظاہر یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت یہ حقیقت ہے اور ایسا ہوسکتا ہے۔ اگر مل سکے تو بازار سے ایک (BUNSEN BURNER) اور چند فٹ ربڑ کا ٹیوب لاؤ۔ (BUNSEN BURNER) ایک قسم کی گیس آلود ٹونٹی ہوتی ہے جس میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ سے ہوا کی ایک خاص مقدار اندر آکر گیس سے مل جاتی ہے جب کہ وہ جلتی ہوتی ہے۔ اس طرح سے گیس کے چولھے کی طرح ایک چھوٹا، نیلا سا گیس کا شعلہ بن جاتا ہے جو گرم اور نیلا ہوتا ہے۔ اب اُس گیس کے ٹیوب کو اس گیس سے لگا کر جلاؤ۔

ایک (TEST TUBEO) (امتحانی ٹیوب) تقریباً آٹھ انچ لانبا اور نصف انچ چوڑا بھی تمھارے پاس ہونا چاہئے۔ برف کا ایک ٹکڑا نصف انچ چوڑا اور ٹیوب میں آجانے کے قابل لانبا بھی لاؤ۔ کچھ چھوٹی چھوٹی گولیاں بھی ہوں اور (TEST TUBES) کو پکڑنے کے لئے ایک ہینڈل بھی رکھ لو۔

اب اس برف کو ٹیوب میں رکھ دو اور گولیوں کو اُس پر چھوڑ دو۔ پھر اُسے ٹھنڈے پانی سے بھر دو۔ یہ گولیاں برف کو ٹیوب کی تہ میں ہی رکھیں گی اور اُسے پانی کے اوپر نہ آنے دیں گی۔ اس کے بعد (T. TUBES) کو ۴۵ ڈگری زاویہ سے گیس کے شعلہ پر ہینڈل کے ذریعہ سے اس طرح رکھو کہ شعلہ پانی کی سطح سے ایک انچ نیچے ٹیوب کے کنارے پر لگے۔ ٹیوب کی تہ کو جہاں برف رکھی ہے نہ گرم کرو۔ بہتر

کہ شیشہ کو ٹوٹ جانے سے بچانے کے لئے ٹیوب کو شعلہ کے پاس کئی مرتبہ آہستہ آہستہ لیجاؤ۔
اگر اس طرح سے عمل کیا جائے تو تم دیکھوگے کہ پانی کا اوپری حصہ بالکل گرم ہوگیا ہے حتیٰ کہ اُس میں سے بھاپ نکل رہی ہے اور نیچے کا حصہ اُسی طرح ہے اور اگر پانی ٹھنڈا ہو تو برف اُسی طرح صحیح سالم نکل آئیگا۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹھوس چیزیں (CONDUCTION) کی وجہ سے گرم ہوجاتی ہیں اور رقیق چیزیں (CONVECTION) سے گرم ہوتی ہیں۔ (CONDUCTION یعنی ایک چیز کا دوسری چیز کو اپنی گرمی منتقل کرنا۔ CONVECTION یعنی رقیق چیزوں کا دورہ) اس صورت میں اُس جگہ سے نیچے جہاں گرمی پہونچائی گئی تھی کوئی دورہ ہوتا ہی نہیں اور اس لئے ٹیوب کے نیچے کا حصہ ٹھنڈے کا ٹھنڈا رہتا ہے۔

زندگی معلوم کرنے کا ایک نیا امتحان

ایک نئی ترکیب کی ایجاد سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ ایک درخت، پودہ، پتی یا بیج میں جان ہے یا نہیں زندگی کی دو علامتیں ہیں۔ ایک ہنگامۂ برقی (ELECTRIC DISTURBANCE) اور دوسری علامت کیمیائی (CHEMICAL SIGN) موخرالذکر کی ایجاد پروفیسر لٹشیر ونے کی ہے۔ پروفیسر موصوف کے مطابق یہ علامت، CARBON DIOXIDE (کاربن ڈائکسائڈ) کا نتیجہ ہے جو ہر جانور میں پایا جاتا ہے۔ پروفیسر موصوف نے ایک آلہ بھی ایجاد کیا ہے جس سے یہ کاربن ڈائکسائڈ معلوم ہوسکتا ہے۔ اس آلہ کا نام انھوں نے بایومیٹر BIOMETER رکھا ہے کیونکہ اُس سے مختلف چیزوں کی زندگی کی مقدار معلوم ہوسکتی ہے۔ اس آلہ کی مدد سے یہ دریافت کیا گیا کہ رگیں سانس لیتی ہیں یعنی وہ ہماری طرح آکسیجن لیتی ہیں اور کاربن ڈائکسائڈ پھینکتی ہیں۔ اسی طرح بیج وغیرہ بھی کرتے ہیں لیکن جب کوئی چیز مردہ ہوجاتی ہے تو پھر کاربن ڈائکسائڈ نہیں پھینک سکتی۔

انسانی ہالہ کیا چیز ہے؟

ہر شخص کے چاروں طرف ایک خاص فضا یا "ہالہ" ہوتا ہے جس سے کچھ دور تک شعاعیں نکلتی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ چیز سر کے چاروں طرف زیادہ دکھائی پڑتی ہے۔

بیرن رشن بیخ (BARON REICHENBACH) نے گزشتہ صدی کے وسط میں اس موضوع پر تحقیقات کی تھی اور ایک کتاب بھی لکھی تھی مگر اس نے شرف قبولیت نہ پایا۔ اُس کے بعد ڈاکٹر کلنر (DR.KILNER) نے اسے اچھی طرح ثابت کیا کہ ہر آدمی کے گرد ہالہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر کلنر نے سلائڈ یا پردوں کا ایک سلسلہ تیار کیا جن کی مدد سے یہ ہالہ ہر شخص کے گرد دکھائی دے سکتا ہے۔ تارکول کی قسم کی ایک چیز جسے (DICYANIN) کہتے ہیں آنکھوں کو ایسی تیلی رگیں دکھا سکتی ہے جو عام طور سے نظر نہیں آسکتیں۔ اگر ان سلائڈ کے ذریعہ سے کوئی آدمی دیکھا جائے تو اُس کا ہالہ دکھائی پڑ سکتا ہے بشرطیکہ ایک نصف اندھیرے کمرے میں سیاہ دیوار کے پیچھے اُسے کھڑا کر دیا جائے۔

اس دھندلی فضا کی تین تہیں دکھائی پڑیں۔ پہلی تہ ایک سیاہ خاکہ ہوتی ہے جسے ڈاکٹر موصوف نے 'ہمزاد آسمانی' ETHERIC DOUBLE کا نام رکھا۔ اس سے دو تین انچ کے فاصلہ پر دوسری زیادہ گہری تہ ہوتی ہے جسے " اندرونی ہالہ" کہتے ہیں۔ اس کے بعد ایک اور تہ ہوتی ہے جسے 'بیرونی ہالہ' کہا جاتا ہے۔

یہ ہالہ، مردوں کے مقابلہ میں عورتوں میں زیادہ بڑھتا ہے اور انسان کے وقتی تاثرات قلبی، دماغی و جسمانی کے مطابق اُس میں کمی بیشی ہوا کرتی ہے۔ بدن کے کسی بیمار حصہ پر جب ہالہ آتا ہے تو اس کا رنگ بدل جاتا ہے۔ اس ہالہ کی اصلیت ابھی تک پوری طرح نہیں ہو سکی ہے۔

مردہ آدمیوں کے جسم کے چاروں طرف ہالہ نہیں ہوتا جس کے معنی یہ ہیں کہ ہالہ زندگی پر منحصر ہے، جتنی زیادہ قوت انسانی ہوگی اتنا ہی ہالہ جسم سے دور پھیلے گا۔ تجربات نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ دونوں مقناطیسی قطب، ہالہ کو کھینچ سکتے ہیں۔ جب آدمی کے بدن میں بجلی لگائی جائے تو ہالہ غائب ہو جائے گا مگر جب کرنٹ ہٹا لیا جائے تو پہلے سے بڑا ہالہ نمودار ہوگا۔ بہرحال اس کے متعلق مزید تحقیقات جاری ہیں۔

آسکر وائلڈ کے خطوط

سارہ کے نام

یورپ کے مشہور ادیب آسکر وائلڈ نے جس کی زندگی کا انجام بہت المناک ہوا ہے، سارہ برنہارٹ (مشہور ایکٹریس) کو جو خطوط لکھے تھے وہ اپنی انشا و ادبیت کے لحاظ سے خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ اکٹویو مربونے اس برطانوی شاعر اور دنیا کی اس مشہور ترین عورت کی ملاقات کا اسطرح ذکر کیا ہے کہ ایک مرتبہ تھیٹر میں پہلے ایکٹ کے اختتام کے بعد وہ ایک (قہوہ خانہ) میں آئی، اُسوقت وہ اپنے تھیٹر کے لباس پر ایک لانبا لبادہ پہنے ہوئے تھی۔ جس قہوہ خانہ میں وہ داخل ہوئی وہاں اتفاق سے میں اور آسکر وائلڈ پہلے ہی سے موجود تھے۔ ایک کرسی پر بیٹھ کر سارہ نے خادم سے کچھ طلب کیا، اُس کی آواز اتنی شیریں تھی کہ ہم دونوں بے اختیار اُسی طرف متوجہ ہوگئے جب میں نے یہ دیکھا کہ بولنے والی سارہ ہے تو میں نے اُس کا آسکر وائلڈ سے اس طرح تعارف کرایا:۔ "سارہ! میں تم سے مشہور برطانوی شاعر آسکر وائلڈ کا تعارف کرانا چاہتا ہوں"۔ مجھے یاد ہے کہ اس موقعہ پر وائلڈ نے اُس سے یہ کہا تھا۔" اے خاتون، آپ کی آواز میں کتنا سادی لحن پوشیدہ ہے"۔ اس کے بعد ہم لوگ اپنی اپنی جگہ چلے گئے، یعنی سارہ تھیٹر کے اسٹیج پر اور ہم دونوں تھیٹر ہال میں اپنی اپنی کرسیوں پر۔

دو برس اس کے بعد جب ان دونوں میں کافی دوستی پیدا ہوگئی تو سارہ نے مجھ سے وائلڈ کی بابت اتنے اشتیاق سے باتیں کیں کہ میں نے اُس سے کہا پھر تم اُس سے شادی ہی کیوں نہیں کرلیتیں۔ اس نے جواب دیا کہ " یہ نہیں ہوسکتا۔ مجھے اُس سے اس قدر محبت ہے کہ شادی کا ذکر بیکار ہے۔ جب دو محبت کرنے والوں میں شادی ہوجاتی ہے تو محبت ختم ہوجاتی ہے۔ محبت سے زیادہ دوستی پائدار رشتہ ہے، اور محبت کرنے سے زیادہ مشکل چیز دوستی کرنا ہے۔

سارہ کے مشیر قانونی نے لکھا ہے کہ جیسے ایک اسفنج پتھر نہیں ہوسکتا، اسی طرح آسکر وائلڈ کا دل محبت کرنے کا اہل نہ تھا۔ جیسا کہ اُس کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے وہ دنیاوی مسایل کے متعلق جو کچھ لکھتا بالکل

سارہ کی حسب منشا ہوتا تھا اور در حقیقت زندگی کے بارہ میں ان دونوں کے نظریئے تقریباً بالکل ایک تھے۔
کئی برس کے بعد سارہ نے پیری برٹن کو ایک خط لکھا کہ میں "جب بھی لندن میں ہوتی ہوں آسکر وائلڈ مجھ پر بہت مہربانی کرتا ہے، وہ اتنی زبردست شخصیت کا مالک ہے کہ اگر وہ کسی سے کہدے کہ میں "آپ سے مل کر بہت خوش ہوا" تو اُس آدمی کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا خود ملکہ نے اُس سے یہ کہا ہے کہ آپ میرے مہمان ہیں۔ جن باتوں پر اُس کا اعتقاد نہیں ہوتا انھیں نہایت خوبصورتی سے کہنے کا اُسے اسقدر ملکہ حاصل ہے کہ مجھے یہ یقین کرنے میں دقت محسوس ہوتی ہے کہ وہ میرے ملک کا باشندہ نہیں ہے۔"

وائلڈ اور سارہ میں عرصہ تک خط وکتابت ہوتی رہی اور سارہ نے اُس کے ہر خط کو محفوظ رکھا۔ وائلڈ کے خطوط کے بعض حصے بالکل ترجمہ کرنے کے قابل نہیں ہیں مگر جو خط وکتابت ہوئی ہے وہ عجیب وغریب انشا کا نمونہ ہے۔

وائلڈ لکھتا ہے :-

"ہمارے خیالات بھی ہم سے کس قدر مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ خوشبو کا ایک جھونکا، سڑک پر کسی پرانے دُھن کا گانا، کسی دور کی پہاڑی پر سے ہوا کا جھونکا جو اپنے دامن میں بکاین یا پکے امرودوں کی بو لئے ہوئے ہو یا ماہ اپریل کی بارش بغیر کسی اطلاع کے بھی ان میں وحشیانہ رنگ پیدا کردیگی۔"

"ایک نیک آدمی (وہ جو دنیا میں "نیک" کہلایا جاتا چاہتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے خصوصاً مذہبی آدمی) وہ ہے جو ہر اُس بات پر دھیان دھرتا ہے جسے عام آدمی کہیں اور ہر اُس چیز میں مداخلت کرتا ہے جسے خوبصورت آدمی کریں۔"

"خوبصورتی کو محض سطحی چیز کہا جاتا ہے۔ مگر درحقیقت ایسا ہے نہیں۔ حُسن، دنیا میں سب سے زیادہ لازوال شے ہے، یہی صرف ایک ایسی چیز ہے جس کو زمانہ کوئی ضرر نہیں پہونچا سکتا۔ فلسفے کے اُصول ریگ کے ذرات کی طرح منتشر ہوجاتے ہیں، عقائد تبدیل ہوجاتے ہیں لیکن جسے حُسن کہتے ہیں وہ ایک ابدی مسرت اور غیر فانی ملوکیت ہے۔"

وائلڈ نے سارہ کی ملاقات سے قبل DIVINE SARAH "قدسی سارہ" کا فقرہ اختراع کیا تھا۔ اُس نے اس فقرہ کو مشہور نقاد جولیس لمیٹر کے ایک خط میں اس طرح استعمال کیا تھا۔

"اگر میں بادشاہ ہوتا تو میں اپنی نصف سلطنت، اپنا نصف عصائے شاہی اور اپنا نصف تاج محض "قدسی سارہ" کو جاننے کے لئے بخش دیتا اور اُسے تمام دنیا سے روشناس کرادیتا۔"

"اگر لوگ واقعی کبھی محبت کرتے ہیں تو ان میں عورتیں تو کانوں سے محبت کرتی ہیں اور مرد نظروں سے اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ عورتیں جو کچھ سنتی ہیں اُس سے مسحور ہو جاتی ہیں اور مرد جو کچھ دیکھتے ہیں اُس سے۔"

آسکر وائلڈ نے اپنی نظموں کی ایک نئی کتاب کے ایک صفحہ میں یہ لکھا تھا:۔

"ان میں سے ایک نظم تمہارے نام معنون کی گئی ہے ۔ تمہارا نام آج اس کو زینت دے رہا ہے اور مجھے امید ہے کہ ایک دن تمہاری ملکوتی آواز کے نغموں میں ان اشعار کو سنوں گا۔"

"تا وقتیکہ ایک مصنف، نقاش بھی نہیں ہوتا، نقاشی کی صناعیوں کے پراسرار قوانین اُس کی فہم سے بالاتر ہوتے ہیں۔ کیونکہ اگرچہ بظاہر متعدد آرٹ ہیں مگر در اصل۔ آرٹ صرف ایک ہی ہے۔ نظم، تصویر، مجسمہ اور ڈرامہ، ان سب کی روح ایک ہے، جس کو ان میں سے ایک فن معلوم ہے وہ سب سے واقف ہے۔"

جب سارہ برنہارٹ کی شادی اُسی کے تھیٹر کے ایک ساتھی جیکوئس ڈیمالا سے ہونے لگی جو ایک یونانی دیوتا کی طرح خوبصورت تھا تو سارہ نے وائلڈ کو ایک خط لکھا کہ اس تقریب پر صرف چند ہی آدمی آنے والے ہیں اور ان میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ وائلڈ نے لکھا:۔

"کیا یہ صحیح واقعہ ہے کہ تم شادی کر رہی ہو۔ میرے لئے ایک ناممکن چیز پر یقین کر لینا بالکل قدرتی بات معلوم ہوتی ہے مگر ایک بعید از امکان چیز پر مجھ کو کبھی یقین نہیں آتا میں نے سنا ہے کہ "وہ" بہت خوبصورت ہے۔ اکثر عورتیں اس لئے شادی کرتی ہیں کہ دوسری عورتیں حسد کریں مگر تم ایسا کبھی نہیں کر سکتیں۔ تم معمولی عورت سے کہیں زیادہ بلند چیز ہو۔ تھورو کہتا ہے کہ سچ کے لئے دو آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک وہ جو سچی بات کہے اور دوسرا وہ جو اُسے سنے۔

میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی روح تنہا کوئی وجود نہیں رکھتی۔ روح کی تمام پاکیزگیاں مثلاً مختلف قسم کی قدرتیں اور زبردست جذبات وغیرہ، زندگی میں اسی وقت پیدا ہوتی ہیں جب دو روحیں ملتی ہیں ان کا اتحاد ہی زندہ طاقت پیدا کرتا ہے۔ اس لئے جس طرح ہر افتراق میں کوئی برائی ہوتی ہے اُسی طرح ہر حقیقی اتحاد میں ایک خوبی ہوتی ہے۔

مختصر یہ کہ عورت کو شادی کرنے میں مرد سے کم خطرہ ہوتا ہے۔ شادی کے بعد وہ زندگی کو زیادہ سمجھ سکتی ہے۔ شادی اسے زیادہ آزادی بخش دیتی ہے اور خواہ وہ کسی بیمار یا تندرست یا امیر یا غریب سے شادی کرے اُسے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور حاصل ہوگا۔"

عورتیں تصویر ہوتی ہیں اور مرد معمہ، اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ عورت کا واقعی کیا مطلب ہے تو اُس کی طرف دیکھو، اُس کی سنو نہیں۔

عورتیں بغیر خوبصورت ہوئے بھی دلکش ہو سکتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ کی مشہور ترین عورتوں میں کوئی نہ کوئی جسمانی نقص رہا ہے۔ میڈم رولینڈ اور میڈم اینٹونٹ دونوں کے دانت نہیں تھے۔

گفتگو کا آرٹ یہ ہے کہ وہ چیز نہایت خوبصورتی سے کہی جائے جسے نہ کہنا چاہئے۔

اپنے آپ کو عورتوں میں ہردلعزیز بنانے کا آرٹ یہ ہے کہ غیر فطری باتوں کو نہایت فطری طریقہ سے کہا جائے یعنی معمولی باتیں غیر معمولی انداز میں کہی جائیں۔ عورت کو اپنی شہزادی ادائیں دکھانے کا موقع جتنا خوش کرتا ہے اُس سے زیادہ اور کوئی چیز اُسے خوش نہیں کرتی۔

نیک آدمی عموماً غیر دلچسپ ہوتے ہیں اور اگر وہ نیک نہیں ہوتے تو عموماً دلچسپ ہوتے ہیں انسان یا تو غیر دلچسپ ہوتے ہیں یا دلچسپ۔ دنیا میں یہی دو قسمیں ہیں۔

اگر عورت میں مرد سے زیادہ تکلیف برداشت کرنے کی اہلیت پائی جاتی ہے تو اسی طرح اس میں اظہار مسرت کی بھی اہلیت ہے۔ وہ مسرت جو زیادہ پائدار اور زندگی میں زیادہ مستقل درجہ رکھتی ہے صرف عورت کے لئے مخصوص ہے۔ یہی وہ مسرت ہے جو سب سے زیادہ غیر فانی تصاویر کے چہروں پر دکھائی پڑتی ہے اور یہی وہ راز ہے جس کا کبھی انکشاف نہیں ہوا۔ یہ وہی مسکراہٹ ہے جو پرانے اطالوی مجسموں کے چہروں پر کھیلتی ہے۔ اور یہ مسرت اکثر اُس عورت کے چہرہ پر بھی دکھائی پڑتی ہے جو اُس آدمی کی اولاد کو گود میں لئے ہوتی ہے جس سے وہ محبت کرتی ہے۔ ایک مفکر کے نزدیک موت بجائے خود شادی سے کم اہم ہوتی ہے۔ پرانا پودا اس لئے کاٹ دیا جاتا ہے کہ نئے کو پھولنے پھلنے کا موقعہ ملے زمین پر آنسوؤں کے چند قطرے گرتے ہیں اور اُس میں کلیاں نکل آتی ہیں۔ اس لحاظ سے موت صرف ایک وقفہ ہے۔ لیکن شادی، آنے والی پشتوں کی ایک طویل فہرست کھول دیتی ہے۔ بعض میں تندرستی ذکاوت اور عزت کے الفاظ لکھے ہوتے اور بعض میں بیماری، بدنامی اور حماقت کے۔“

جب ڈاما لا سے سارہ برنہارٹ کی شادی ناکامیاب ثابت ہوئی تو آسکر وائلڈ نے اُسے لکھا:-

”تم نے شاید دنیا میں سب سے زیادہ فیاضانہ جذبات سے کام لیا ہے۔ اکثر عورتیں جب شادی کرتی ہیں تو ایسا ہی کرتی ہیں۔ وہ شادی کو ایک ایسے آدمی کی امداد کے لئے بطور ایک آلہ کے استعمال کرتی

ہیں - جو اُن کے نزدیک اتفاق سے کسی مصیبت کا شکار ہوگیا ہے - لیکن مری سمجھ میں یہ کبھی نہیں آیا کہ
بجائے اُن سے شادی کرنے کے اُنھوں نے اُس کے نام ایک گرانقدر رقم کا چک کیوں نہ بھیج دیا یا کسی
نگراں کو کیوں نہ مقرر کر دیا - جب میں نیویارک آیا تو مجھے رپورٹروں کی بدولت بڑی پریشانی اُٹھانا پڑی
معلوم ہوتا ہے - کہ بعض خیالی گھوڑا دوڑانے والوں نے جو مجھے مشہور کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں
یہ خبر پھیلا دی کہ میں نہایت نفیس (شب خوابی کا لباس) پہن کر سوتا ہوں - اسی لئے جب کسٹم افسروں
نے میرے بکس کھولنے کا حکم دیا - تو مجھے اُن کے چہروں پر غیر معمولی قسم کا استعجاب معلوم ہوا - جب
اُن کو کوئی خاص خبر نہ ملی تو اُن میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم کسی اور چیز کا نام لینا چاہتے ہو؟
میں نے اس پر یہ جواب دیا - "اپنی ذکاوت کے علاوہ اور کسی چیز کا نہیں" - اس واقعہ کے بعد اخباروں
میں خوب خوب لکھا گیا -

سارہ برنہارٹ نے دوسرے خط پر یہ تحریر لکھی تھی کہ آسکر وائلڈ کے پچھلے خط اور اس خط میں تقریباً ساڑھے چار
برس کا وقفہ گزرا تھا میرے امریکن دورہ کی طرح اُس کا دورہ بھی نہایت کامیاب رہا - مگر جب میں یہاں تھی
تو وہ وہاں تھا اور جب میں وہاں تھی تو وہ یہاں تھا - اُس کے بعد ایک دن مجھ سے اور اُس سے لندن کی
ایک سڑک پر ملاقات ہوگئی، پہلے اُسی نے مجھے دیکھا اور کہا خدا کی قسم یہ تو قدسی سارہ ہے، مجھے اُس سے ملکر
بڑی خوشی ہوئی اور ہم دونوں دو گھنٹہ تک ساتھ رہے اور دوسرے دن اُس نے مجھے یہ خط لکھا:-

"میں یہ نہیں چاہتا کہ تم اُس رشتہ کو بھول جاؤ جو ہم دونوں کو منسلک کئے ہوئے ہے یا یہ کہ اُس کے
معنی اور اُس کی قیمت کا احساس نہ رکھو - صرف تمھاری ہی وہ ہستی ہے - جس کے ساتھ دوستی قائم
رکھنے کے لئے میں ہمیشہ کوشش کرتا رہوں گا، جدائی کے اتنے برس کے بعد تمھاری ملاقات سے مجھے
بیحد مسرت ہے -

ہمارے محور انفرادی اور متعدد ہیں، ہم ستاروں کی طرح ایک دوسرے کی زندگی کے افق سے غائب
ہو جاتے ہیں مگر خدا کی قدرت اور اُس کی مرضی سے ہم کو کوئی چیز مثل اُن دو چشموں کے جو الگ الگ ہوکر
بہتے ہیں - ایک تو سرسبز و شاداب جنگل سے اور دوسرا ایک کھیت سے - اور پھر دونوں ایک بلند قہقہہ
کے بعد آکر ملجاتے ہیں، ایک دوسرے کے گلے لگتے ہیں، ایک دوسرے کی تکالیف میں حصہ لیتے ہیں
اور پھر ایک ابدی سمندر تک ساتھ ساتھ بہتے ہیں - یا مثل اُن دو ستاروں کے جو مخملی رات میں ایک
ہی بستر پر سوتے ہیں، اور اپنی سنہری زلفوں کو سپیدۂ صبح سے ملاتے ہیں اور جدا ہو جاتے ہیں - پھر ملا دیتی ہے -

اس طرح سے دو مسرور ہستیوں کو کسی جگہ ساتھ چلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اور پھر سڑک کے گھومنے پر اُن میں کا تیز چلنے والا نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک چاند یا سات چاند یا ستر چاند چمکتے ہیں اور پیلے پڑ جاتے ہیں اور ایک روشن گھنٹہ تک خوب روشنی دکھاتے ہیں۔ حتٰی کہ کسی غیر منضبط نظام کے ماتحت وہ پھر مل جاتے ہیں۔"

آسکر وائلڈ نے ایک پارٹی کا بھی نہایت تفصیل سے تذکرہ لکھا ہے جس میں بعض مشہور شخصیتوں کے عادات وخصائل تفصیل سے لکھنے کے بعد وہ لکھتا ہے:۔

"کل گرینڈ بلوارڈ میں مجھ سے ایک حبشی شاہزادہ سے ملاقات ہوئی اور پھر آج ایک فیشن ایبل ہوٹل میں جہاں میں مدعو تھا یہاں مانٹی کارلو میں اُس سے پھر ملا۔ وہ دلکش آدمی تھا، اس کا تبسم چہرہ ایک نہایت خوبصورت ہاتھی دانت کے زیور کے مانند تھا جو موتیوں سے مرصع ہو۔ اور تمہاری آواز کے بعد تمام دنیا میں میں جن لوگوں سے ملا ہوں اُن سب سے زیادہ بہتر اُسکی آواز تھی تمہیں اُس سے ملاقات کرنے کے لئے وہاں ہونا چاہئے تھا۔ اور مجھے یہ تصور ہوا تھا۔ کہ جیسے میں تمکو اُسکے قوی بازوؤں پر وہاں کے بڑے ہال کے اندر ہوا میں دو اجنبی پھولوں کی طرح جھکے ہوئے اور رقص کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

ایک مرد عورت کو یہی سکھاتا ہے کہ اُسے ایک بیوی کیسے بننا چاہئے۔ اور ایک عورت مرد کو یہ سکھاتی ہے کہ اُسے ایک اچھا شوہر کیسے بننا چاہئے۔"

آسکر وائلڈ کی زندگی کا ایک راز تھا جو اُس نے سارہ برنہارٹ کے سوا کسی کو نہیں بتایا اور وہ راز یہ تھا کہ آسکر وائلڈ ایک عورت ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ برنہارٹ کو لکھتا ہے۔

"تم اسے سمجھ جاؤ گی کیونکہ تم میں عورتوں کی ایک خاص صفت، یعنی سمجھ موجود ہے۔ اور جس طرح میں سونے کی صراحی سے شراب اُنڈیلتا ہوں اُسی طرح تم پر اپنا راز عیاں کرتا ہوں۔"

چنانچہ اُس نے اُس راز کا اُس پر انکشاف کیا اور ایک خط میں لکھتا ہے:۔

"جب میں بہت چھوٹا تھا اُسی وقت میں اپنی بہن کا لباس پہن کر ہاتھ میں پنکھا لئے ہوئے، ایک طویل آئینہ میں اپنی صورت دیکھا کرتا۔ میں نے اپنے خوابوں میں اپنے آپ کو اکثر جولیٹ کا پارٹ کرتے ہوئے اور کوٹھے پر تاروں کی روپہلی روشنی اور چاند کی کرنوں میں جو میرے دل میں چمک اور مسرت پیدا کرتی

تھیں اپنے آپ کو رومیو کے آغوش میں دیکھا ہے۔ میری یہ ہمیشہ تمنا رہی کہ کاش میں عورت پیدا ہوا ہوتا
عورتوں کو اس دنیا میں مردوں سے زیادہ آرام ہے"۔

آسکر وائلڈ کی نسبت ابھی تک کوئی صحیح بات نہیں لکھی گئی ہے۔ اُس کے جتنی سوانح حیات ہیں وہ سب اُسکی زندگی کے اہم واقعات پر متفق نہیں ہیں اور جن لوگوں کو اُس سے کماحقہ واقف ہونے کا دعوےٰ تھا وہ بھی اُسکے رازوں اور اُس کی فطرت کو نہیں سمجھ سکے۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں آسکر وائلڈ امریکہ گیا۔ اُس زمانہ میں اُس نے برنہارٹ کو ایک خط میں لکھا کہ:-

"مجھے شہر کے میر نے آبشار نیاگرہ دیکھنے کی دعوت دی۔ جس طرح ایک ملکہ اپنے محل کی چھت پر سے کسی چیز کا معائنہ کرے، اور نیچے سڑک پر اُس کی غریب رعایا کھڑی ہوئی ہو اُسی طرح میں نے اُس عظیم الشان آبشار کو دیکھا، بیس یا اُس سے زیادہ رپورٹر میرا فیصلہ سننے کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ میں نے یہ کہا کہ حضرات یہ نہایت شاندار منظر ہے مگر ذرا خیال کیجئے کہ اگر پانی مخالف سمت سے بہتا ہوتا تو یہ منظر کتنا زیادہ موثر اور خوبصورت ہو جاتا۔ میر کو اس پر سخت استعجاب ہوا"

ایک اور خط میں امریکہ کے بارہ میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"وہاں آبشار نیاگرا ہی صرف ایک قدرتی منظر ہے، ورنہ وہاں جو کچھ بھی ہے وہ اسٹیج کی سینری ہے پھر ظاہر ہے جہاں عمدہ ایکٹنگ ہو وہاں دلکش سینری کی ضرورت نہیں ہے۔ جب ایکٹنگ اچھی نہ ہو تو البتہ سینری کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایکٹنگ کبھی خراب نہ ہونا چاہئے۔ میں جانتا ہوں کہ تمھیں اس کا اتنا ہی احساس ہوگا جتنا مجھے ہے۔

امریکہ کی عورتوں کے بارہ میں وہ لکھتا ہے:-

"..... امریکہ کی عورتیں نہایت شوخ، چالاک اور دنیا پرست ہوتی ہیں۔ ان میں حاضر جوابی، پسندیدہ خودداری اور اپنی شخصیت کا احساس پایا جاتا ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے۔ ہمارے طبقۂ امرا کو اتنا پسند کرتی ہیں کہ جمہوریت کے اُصولوں کو بھی نظرانداز کر جاتی ہیں۔

مردوں کو مسرور بنانے میں وہ فطرتاً اور تعلیماً دونوں حیثیتوں سے بہت ہوشیار ہیں۔ ایک امرکین عورت ایک افسانہ، مطلب کی بات بھولے بغیر سنا سکتی ہے اور یہ ترکیب انگریز عورتوں کو ابھی تک اچھی طرح نہیں معلوم ہو سکی۔

یہ صحیح ہے کہ ان میں دلچسپی کی کمی ہے اور ان کی آوازیں سخت ہوتی ہیں ـــ خصوصاً جب وہ پہلے پہل انگلستان آتی ہیں ـــ مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد ان سایہ پوش حیلاووں سے جو ہماری اعلیٰ سوسائیٹوں

میں آزادی سے گھومنے لگتی ہیں اور لوگ ان سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ہر چیز کے لئے موزوں بنا لیتی ہیں۔ ان میں سے بعض نے تو چند ہی ماہ میں فیشن ایبل انگریزی کا نا بھی سیکھ لیا ہے۔
یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک زمانہ میں کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا اور پھر اُسے امن و امان کی حالت میں چھوڑ آیا، مگر امریکنوں نے یورپ کو دریافت کرنے کے بعد اُسے اپنی حرکات سے عالم اضطراب ہی میں رکھا۔"

فڈورا (FEDORA) کے مصنف اور سارہ کی محبت کے بعد سارہ کی دوسری محبت کا مشہور واقعہ پری برٹن (PIERRE BERTON) کے ساتھ اُس کا افسانۂ عشق ہے۔ سارہ کو اُس سے اتنی محبت ہوگئی تھی کہ ایک مرتبہ اُس نے برٹن کو یہ لکھا تھا کہ اور لوگ تو میری زندگی میں ماہ اپریل کی بارش کے ایک چھینٹے کی طرح رہے ہیں لیکن تم میرے لئے ساتوں سمندر رہو۔ سارہ نے برٹن کی کئی کتابیں اور ڈرامہ شائع کرائے اور پھر اُس نے برٹن کی ایک کتاب کی نقل آسکر وائلڈ کے پاس اس امید میں بھیجی کہ اگر ادب کے لحاظ سے نہیں تو کم از کم سارہ کی دوستی کی خاطر وہ اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کردیگا۔ برٹن کے ڈرامہ کے بارہ میں آسکر وائلڈ نے برنہارٹ کو یہ خط لکھا:-

"ستاروں کی سی آواز رکھنے والی حیرت انگیز ہستی! تم نے پیرس میں جو کاغذات مجھے دئے تھے انکو میں واپس کر رہا ہوں۔ میں نے ان کو نہایت مسرت سے پڑھا ہے، محض اس لئے کہ تم نے اُس پر سانس لی ہوگی، محض اس لئے کہ تمھارے ہاتھوں نے ان کو مس کیا ہوگا اور ان پر تمھاری ملکوتی آواز کی صدائے بازگشت باقی رہ گئی ہوگی، ٹھیک اُسی طرح جیسے تاروں کی روشنی سمندر کے تاریک پانی پر رات کی عظمت کا کچھ نشان چھوڑ جاتی ہے۔
میرے خیال میں لوگوں نے ڈو ماریر (DU MAURIER) کی تصانیف پڑھی ہوں گی اور اس بیان کو بھی پڑھا ہوگا کہ "جو شخص حسن اور عقل دونوں کے ساتھ شادی کرتا ہے وہ گویا عقدِ ثانی کا مجرم ہے۔" انھوں نے وہ صفحہ بھی پڑھا ہوگا جس میں ڈرامہ کی خاتون اُس آدمی سے جسے وہ پسند کرتی ہے یہ دریافت کرتی ہے کہ تمھارے نزدیک میری کیا عمر ہے؟ اور اس کے جواب میں وہ اُسکے غازہ اور پوڈر کو دیکھ کر کہتا ہے کہ محترمہ مجھے معلوم نہیں مگر اتنا مجھے یقین ہے کہ جتنی آپ کی عمر ہے اتنی معلوم نہیں ہوتی۔ اس مسودہ میں جسے میں واپس کر رہا ہوں، یہ باتیں نہیں ہیں مگر اُس میں ڈو ماریر کا یہ خیال البتہ پایا جاتا ہے کہ دوشیزگی عقل کی ایک جزو یا اُسکی ایک حلیف ہے۔" تمھارا آسکر وائلڈ۔

وائلڈ کا دوسرا خط حسب ذیل ہے:۔

"مائی ڈیر سارہ برنہارٹ،

میں نے اپنی نظموں کے پروف کے آخری صفحات کو ابھی ابھی صحیح کیا ہے۔ ان نظموں کو یہاں ڈیوڈ بریوگ شائع کر رہے ہیں۔ اور جس طرح میرے ایک ڈرامہ کی طرح ان میں سے ایک نظم کے عنوان کو تمھارا نام زینت دے رہا ہے اسی طرح مجھے اُمید ہے کہ تمھاری آواز بھی اپنے ملکوتی نغموں سے اُسے عزت بخشے گی۔ میں نے ناشر کو ہدایت کر دی ہے کہ پریس سے نکلتے ہی کتاب کی ایک کاپی تمھارے پاس بھیج دے اور وہ تم کو اب ایک یا دو ہفتوں میں مل جائے گی۔ تمھارا نام، تمھارا اعلیٰ اور تمھارا پراثر نام ایک نظم کے مطلع پر اُسی طرح لکھا ہوا ہے۔ جیسے ایک صحرا میں اہرام یا کسی معبد کے دروازہ پر ایک نگہبانی کرنے والا ایک شیر! دنیا کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ یہ اشعار تمھاری وجہ سے دماغ سے نکلے ہیں مگر دنیا یہ نہیں جانتی جو میں اب تم سے بتا رہا ہوں یعنی یہ کہ تمھاری ہستی ہی نے کتاب کی تقریباً نصف نظموں کو مجھ سے کہلایا ہے اور یہ کہ ان میں کی بہترین نظمیں تمھارے نغمہ ہی کی صدائے بازگشت ہیں۔

مجھے اس خیال سے مسرت ہوتی ہے کہ میرے گانوں میں جو درحقیقت گانے نہیں بلکہ تصاویر ہیں تم سے زیادہ کسی اور کو ہمدردی نہ ہو گی۔ میری تصنیف پر تمھاری تنقید میرے دلی شکریہ کو الفاظ کی صورت میں ابھاریگا۔ ہمارے کام اور ہمارے مقاصد تقریباً ایک ہی ہیں۔ میں نے اس فیصلہ کو کبھی تسلیم نہیں کیا کہ صرف ایک شاعر ہی شعر کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ البتہ میرا یہ خیال ضرور ہے کہ صرف ایک مصور ہی آرٹ کا بہترین نقاد ہو سکتا ہے۔ یہ اس سے بہت مختلف چیز ہے۔ اگر کوئی شاعر صرف شاعر ہے تو اُسے قافیہ اور ردیف کے متعلق ہی گفتگو کرنے کی اجازت دینی چاہئے۔ مصورانہ تخلیق کے پراسرار قانون اُس پر اُسی وقت عیاں ہو سکتے ہیں جب وہ مصور بھی ہو کیونکہ آرٹ متعدد نہیں ہیں بلکہ صرف ایک ہے۔ نظم، تصویر، قطعہ وغیرہ سب ایک چیز ہیں اور جس کو یہ ایک چیز معلوم ہے وہ سب کچھ جانتا ہے۔ میں اپنی غزل کا دستخطی مسودہ مع متعدد ترمیمات کے تمھارے پاس بھیج رہا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ تم اپنی کاپی میں اس کو لکھ لوگی اور وہ اشعار جن جذبات کا اظہار کر رہے ہیں اُسے نہ بھولو گی۔ تمھارا دوست آسکر وائلڈ"

"مکرر آنکہ جب میں پیرس آؤں گا تو ہم دونوں جلد ساز کے پاس چلکر غزل کے مسودہ کو کتاب کے ساتھ سرخ رنگ میں مجلد کرا دیں گے"

سارہ برنہارٹ نے ۱۸۸۲ء میں جیکوئس ڈمالا سے شادی کر لی، اُس نے وائلڈ کو لندن میں شادی کے موقع

پر شرکت کے لئے لکھا تھا مگر وائلڈ نے شریک ہونے سے مجبوری کا اظہار کیا تھا مگر جب نیویارک پہونچ کر وائلڈ کو اس شادی کی تصدیق ہوگئی تو اس نے ایک خط پھر لکھا:-

"مائی ڈیر لیڈی۔

چونکہ موجودہ قانون نے شادی کی حیثیت کو اسقدر بدل دیا ہے کہ ایک آدمی کو اپنی بیوی کے متعلق یقین کرنا کہ وہ اُس کی ہے اتنا ہی مشکل ہے جتنا اپنے لڑکے کے باپ ہونے کے متعلق، اس لئے اب جبکہ تمہارے جلد بازارادے حقیقت کا جامہ پہن چکے ہیں میں یہ سوچ کر اپنے کو تسلی دے لیا کرتا ہوں کہ تم نے اپنی آزادی نہ کھوئی ہوگی۔ شاید تم نے دنیا میں سب سے زیادہ فیاضانہ جذبات کی وجہ سے یہ کام کیا ہے کیونکہ اکثر عورتیں جب شادی کرتی ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ شوہر کی امداد کرتی ہیں۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شادی کرنے کے بجائے وہ اس کے نام ایک گرانقدر رقم کا چک کیوں نہیں بھیج دیتیں۔ بغیر شادی کئے ہوئے بھی ایک آدمی کی امداد ممکن ہے۔ اگر مرد عورت کی آمدنی میں حصہ بٹاتا ہو تو یہ کیا ضرور ہے کہ عورت مرد کے نام میں بھی حصہ بٹائے۔ یہ وحشیوں کا جنگلی پن ہے۔ امریکن (جیساکہ وہ کہے جاتے ہیں) فطرتاً غیر مہذب نہیں ہیں بلکہ غیر مہذب ہوگئے ہیں اور یہ امتیاز غور کرنے کی چیز ہے۔ اس براعظم میں ہر انگریز قوم غیر مہذب ہوگئی ہے۔ کناڈا کے رہنے والے فرانسیسی "غیر مہذب" ہیں، اس لئے کہ یہاں آنے سے قبل وہ ہمیشہ کسان ہی رہے تھے۔۔۔

جب میں، بندرگاہ پہونچا تو رپورٹروں نے خود میرا ناطقہ بند کردیا ایک یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں انڈا ایک طرف سے نیم برشت کرکے کھاتا ہوں یا دونوں طرف سے! ایک نے یہ دریافت کیا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ میں اپنے ناخنوں کو اسی طرح رنگتا ہوں جس طرح ملکۂ جاپان رنگتی ہیں؟۔ ایک دوسرے نے پوچھا "آپ صبح کے بجے سوکر بیدار ہوتے ہیں؟" ایک اور نے سوال کیا کہ آپ اپنے غسل خانہ میں کس حد تک گرم پانی پسند کرتے ہیں، اُس نے مجھ سے یہ بھی بتایا کہ اُسے یہ اطلاع ملی تھی کہ میں نہانے سے قبل رنگین عطریات سے پانی کو رنگین کرلیتا ہوں۔ یہ خبر بھی اُڑادی تھی کہ میں نہایت بیش قیمت لیس دار گاؤن پہن کر سوتا ہوں چنانچہ جب کسٹم افسر میرا سامان دیکھ رہے تھے تو ہزاروں متجسسانہ نگاہیں میرے اوپر پڑ رہی تھیں۔

مگر یہ کہ ایک مفکر کے لئے موت شادی سے بھی کم اہم چیز ہے۔ پُرانا پودا اس لئے کاٹ دیا جاتا ہے کہ نئے کو پروان چڑھنے کی جگہ ملے۔ موت کوئی صدمہ کی چیز نہیں ہے حتیٰ کہ اُسے اختلاج قلب بھی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ صرف ایک وقفہ ہے لیکن شادی آنے والی شپتوں کی ایک طویل فہرست

ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتی ہے۔ جن میں سے بعض میں تندرستی، ذکاوت اور عزت کے الفاظ لکھے ہیں اور بعض میں بیماری، حماقت اور بدنامی کے۔"

دوسرے سال وائلڈ نے مانٹی کارلو سے دو خط اور لکھے۔ اس اثنا میں وائلڈ اور سارہ دونوں عرصہ تک پیرس میں رہ چکے تھے۔

"مائی ڈیر سارہ -

تمھارے دو خط آج مجھے ملے کیونکہ میں تقریباً ایک ہفتہ سے سینٹ سبسٹین میں تھا اور چونکہ امید یہ تھی کہ ہر روز آ جایا کروں گا اس لئے ہوٹل میں اپنے خطوط بھیجنے کا پتہ نہیں دے گیا تھا۔ تمھارے یہاں ملنے کا خیال میرے لئے بہت مسرت کن ہے۔ لیکن اگر تم نے مجھے اپنے آنے کی اطلاع نہ بھی کی ہوتی تب بھی مجھے اس سے آگاہی ہو جاتی کیونکہ میں یہ دیکھ رہا ہوں تم نے ہر اخبار کو اس معاملہ میں اپنا رازدار بنا لیا ہے۔ کل ایک اخبار نے تمھاری ایک بڑی تصویر شائع کی تھی اور اسی اخبار میں آج "گسمنڈہ" کے ڈرامہ کی "اور لیڈی آف دی پام" کی حیثیت سے تمھاری جو تصویر مسیحا نے بنائی ہے وہ چھپی ہے میں اس تصویر کو دیکھ کر ہنستا ہوں اور مجھے کنویدارڈ کے اس جملہ کا خیال آجاتا ہے کہ "کسی صوبجاتی اخبار کے پہلے صفحہ پر ایک ہی ایکٹریس کی تصویر دو دن متواتر شایع ہوتے دیکھ کر تو مجھے اڈیٹر کی بیوی کا خیال آجاتا ہے کیونکہ مجھے بھی شوہر کی بے وفائی کا تجربہ اور اس کی تکلیف کا اندازہ ہو چکا ہے۔"
مسز نجبن کو یہاں آئے ہوئے تقریباً دو ہفتہ ہو چکے ہیں۔ امریکن کالونی کے تمام لوگ بھی پیرس سے یہاں چلے آئے ہیں۔ وہ غالباً تمھاری دعوت کرے، میرے سینٹ سبسٹین جانے سے ایک روز قبل اس نے میرے اعزاز میں ایک ڈنر دیا تھا اور اس موقع پر ہر غیر مہذب ملک کا کم از کم ایک نمایندہ ضرور موجود تھا۔ امریکہ کے ایک سے زیادہ تھے اور اسپین کے چار یا پانچ۔ اب کی سال یہاں بہت سے سپینی آئے ہوئے ہیں۔ بڈھا بیرن — اپنے چینی کے برتن کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ جب اس نے ہنسنے کے لئے منھ کھولا تو ہم سب کو اس کی کائنات معلوم ہو گئی۔ پادریوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ ان کے علاوہ ایک بے تاج کا بادشاہ، چند بے بچوں کی مائیں، چند بے شوہر کی بیویاں، چند طوطے کی سی ناک والی بیوائیں اور ایک ماہر فراست الید یا ماہر امراض الید بھی تھا۔
آج اس حبشی شاہزادہ سے جس سے میں کل گرینڈ بولوارڈ میں مل چکا تھا پھر ملاقات ہوئی۔ ایک انگریزی بولنے والے شخص کی زبان سے میں نے اس سے قبل ایسا ترنم ریز لہجہ نہیں سنا تھا۔ ہم لوگ تھوڑی دیر تک

گفتگو کرتے رہے۔ اُس کا وطن افریقہ کے مغربی ساحل تیجز میں ہے۔ اُس نے مجھے وہاں آنے کے لئے
مدعو کیا ہے اور درحقیقت وہ نہایت پراسرار ہستی ہے۔ اُس کی بندش الفاظ بہت مکمل اور اُس کا لہجہ
نہایت دلچسپ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اُس سے تم بھی مل لو۔ اُسے فرانسیسی نہیں آتی مگر جو چیز
وہ فرانسیسی زبان میں سوچتا ہے اُسے نہایت حسن وخوبی سے انگریزی میں ادا کرتا ہے۔ ایسے
موقع پر جب دو شیریں آواز رکھنے والے مجتمع ہوں مجھے ترجمان بننے میں خاص مسرت ہوگی۔ اُس کی
گفتگو کا درجہ (CLASSIC) کلاسک کے بعد ہی ہے اور میرے اس پرانے قول کی تائید کرتا ہے
کہ اگر "زندگی" شاعرانہ نہیں ہے تو "نحوی" ضرور ہے۔ مثلاً بغیر محبت کی زندگی بغیر "اسما صفت" رکھنے
والی زبان کے ہے اور محبت کے ساتھ زندگی اُس زبان کے مشابہ ہے جس میں بہت سے ضمائر ہوں۔
مردِ مجرد کی زندگی اُس زبان کی طرح ہے جس میں "علت" بہت ہی کم ہوں۔ جب کوئی بڈھی دوشیزہ
شادی کرتی ہے تو اُس کی زندگی سوالیہ اور ندائیہ نکات کا ایک مجموعہ بن جاتی ہے۔ بے شک! اگر زندگی
شاعرانہ نہیں ہے تو نحوی ضرور ہے اور اس چیز کو ایک حبشی سے سیکھنا یقیناً ایک اہم چیز ہے۔ "حقیقت"
اکثر بے واسطہ ذرائع سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک کسان ایک شاہزادہ کو نہایت اچھی طرح سے اخلاق
سکھا سکتا ہے۔ اسپینی، بلجیم میں پہلے فرانسیسی زبان کو لے گئے اور ہالینڈ والوں نے اپنی نیولی جا سکنے
والی گلے سے نکلی ہوئی آوازوں سے انگریزی زبان کو وہ الفاظ دئے جو اُس کی خوبی کا باعث ہیں،
کسی شہر کے پادری وہاں کے عیوب اور بدکاریوں کے متعلق بہترین اسناد ہیں اور جب کسی گرجے
کے متعلق کوئی بدنام کن بات مشہور ہو تو اُس کی صحیح اور مکمل تفصیلات ایک طوائف کے ذریعہ سے
معلوم ہو سکتی ہیں۔　　　　آسکر وائلڈ"

وائلڈ نے دوسرے دن حسب ذیل خط لکھا:۔

" مائی ڈیر سارہ - یہاں کے ہوٹل کے منیجر کی بدتہذیبی پر مجھے پھر وہ چیز یاد آگئی جو میرے کل کے خط
کا خاص منشا تھا اور اب مجھے یاد آیا ہے کہ تمھارے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا گیا تھا۔
مائی ڈیر! یہ ہوٹل نہایت ناقابل اطمینان جگہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم اسے کبھی نہ پسند کروگی۔ تم نے
جیسا لکھا ہے میں نہایت خوشی سے کمروں کو تمھارے لئے مخصوص کرالوں گا لیکن اگر تم کو آخر میں آرام
نہ پہونچے تو میں اس کی ذمہ داری نہیں لیتا۔ اگر ہم اِدھر اُدھر تلاش کریں تو باوجودیکہ ہر مقام پر آدمیوں
کی کثرت ہے لیکن پھر بھی اس سے زیادہ اچھی جگہ مل سکتی ہے۔ یہ نہایت بیہودہ جگہ ہے اور مجھے

یہ خیال کر کے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ تم یہاں آجاؤ اور ہم دونوں ایک ساتھ دیکھ لئے جائیں کیونکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ ہمیں یہ سمجھنے لگیں کہ ہم بھی اسی غرض سے یہاں آئے ہوئے ہیں جس مطلب سے وہ سب آئے ہیں۔ مجھے اپنے آنے سے اطلاع دو۔ میں پلیٹ فارم پر تم سے ملنے اور حتی الامکان تمہاری مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ تم اکیلی آ رہی ہو۔ تمہارا۔ وائلڈ"

وائلڈ کو اپنے ڈراموں سے کافی آمدنی ہوتی تھی اور وہ اپنی زندگی نہایت عیش و عشرت سے گزارتا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی حقیقی بدنامی سے پہلے ہی لوگ اُس کو بدنام کرنے لگے تھے اسی زمانہ میں اُس نے سارہ کو حسب ذیل خط لکھا تھا:-

"میں حال میں خیرات دینے کے لئے لوگوں کے گھروں کو جانے لگا تھا تم اسے غیر ضروری بات تصور کرو گی مگر میں یہ کہوں گا کہ یہ بھی بے معاوضہ نہیں ہوتی ہے۔ میری جو بدنامی ہوئی اُس کو دیکھتے ہوئے یہ بات بالکل حق بجانب ہے کہ میں گلیوں میں خیرات بانٹ کر کفارہ ادا کروں۔ چنانچہ کل میں ایک ویران مکان کی طرف گیا جو رہنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا اور دروازہ کو کھٹکھٹا کر اس کا انتظار کرنے لگا کہ کوئی شخص باہر نکلے اور جو روپیہ میرے پاس ہے اُسے قبول کرے۔ کچھ دیر تک کسی نے مجھے جواب نہیں دیا مگر فوراً میری توجہ اوپر کی کھڑکی کی طرف منتقل ہو گئی جہاں سے ایک بڑھی عورت جس کے صرف ایک دانت رہ گیا تھا کہہ رہی تھی "نہیں۔ جناب۔ یہاں اپنی روح میری اوپر مسلط کرنے نہ آئیے۔ میں سمجھتی ہوں کہ جب آپ آئندہ ہفتہ یہاں آئیں گے تو ایک اخبار آپ سے یہ دریافت کرے گا کہ آپ سَو بہترین تماشوں کی ایک فہرست تیار کر دیجئے۔ مجھے امید ہے کہ آپ یہ جواب ضرور دیں گے کہ سَو تماشوں کا نام بتانا ناممکن ہے کیونکہ اس وقت تک آپ نے صرف ۸۰ ڈراموں ہی میں کام کیا ہے۔

مائی ڈیر سارہ! کچھ "ہو جانا" معمولی بات ہے مگر کچھ "رہنے" کے لئے سلیمان کی عقل کی ضرورت ہے۔ تمہارا آسکر وائلڈ"

آسکر وائلڈ کے ہر خط میں اُس کی زندگی کے بارہ میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا تھا مگر کسی شخص کو اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنے نام کے خطوط اشاعت کے لئے دیدیتا کیونکہ اُسے یہ خوف تھا کہ کہیں وہ خود نہ بدنام ہو جائے چنانچہ آسکر وائلڈ کے خطوط عرصہ تک پوشیدہ رہے۔ اُس کے خطوط کا بھی اُس کے مکالموں اور اُس کی نثر کی

ایک طرح ایک خاص اسلوب بیان تھا۔ وائلڈ کے خطوط اُس کے خیالات کا آئینہ تھے اور ایک مرتبہ اُس کی اِک ال نے ان خطوں کے بارے میں کہا تھا کہ میں نے وائلڈ کے خطوط پڑھنے کے بعد اُس کے مزاج کو زیادہ اچھی طرح سمجھا وائلڈ نے امریکن مصنف کلائڈ فچ کو جو خطوط لکھے اُس میں ڈرامہ کے ہر پہلو پر بحث کی ہے مگر سارہ برنہارٹ کے نام جو خط ہیں ان میں اُس نے اپنی زندگی پر بحث کی ہے۔ ان خطوں سے اس کے اصلی خط و خال ظاہر ہوتے ہیں۔ سارہ کے نام کے جو خطوط ہیں وہ بہت شاعرانہ ہیں اور اُس کی زبردست شخصیت اور تنوع زندگی پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب سے زیادہ اس کے یہ خطوط اُس پر روشنی ڈالتے ہیں۔

۱۸۸۹ء میں وائلڈ ایک ماہوار رسالہ "عالم نسواں" (دی وومنس ورلڈ) کا جو لندن سے نکلنا شروع ہوا تھا اڈیٹر ہوگیا۔ اس رسالہ کے بارہ میں خود آسکر وائلڈ نے یہ لکھا تھا کہ "یہ رسالہ آج کل کی تعلیم یافتہ خواتین کے اظہار خیال کے لئے نکالا گیا ہے"۔ اس سلسلہ میں اُس نے سارہ کو بھی ایک خط لکھا کہ وہ بھی رسالہ میں اپنا مضمون بھیجے، وہ خط یہ ہے:۔

"مائی ڈیر سارہ — تم اسوقت تک اُس رسالہ کے جس کی میں ادارت کر رہا ہوں دو نمبر دیکھ چکی ہوگی۔ میں نے حکم دیدیا تھا کہ اڈیٹر کا سلام لکھ کر انھیں تمھارے پاس بھیجدیا جائے اور اب وہی اڈیٹر یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ تم نے رسالہ کو کیسا پایا۔ جب تک میں اس رسالہ کا اڈیٹر ہوں یہ پرچہ دور حاضر کی تعلیم یافتہ خواتین کے اظہار خیال کے لئے وقف ہے اور رہیگا۔ مگر ابھی تک بدقسمتی سے یہ گویا تقریباً خانگی معاملہ ہی رہا ہے کیونکہ اُس کے کالم بھرنے کے لئے اپنے ذاتی دوستوں ہی پر بھروسہ کئے بیٹھا رہا۔ لیکن یہ ہمیشہ نہیں ہوسکتا اور میں تم سے کئی مضامین کی درخواست کروں گا۔ تم ڈرامہ کے متعلق جو کچھ بھی لکھوگی اُسے اشاعت کے لئے قبول کرلیا جائے گا۔ اسی طرح تمھاری رنگین داستان کے بھی دو ایک باب نہایت خوشی سے قبول کئے جائیں گے۔ کیا تم میرے لئے سفر امریکہ اور امریکہ کے باشندوں کی نسبت اپنے تاثرات کو ایک مضمون میں قلمبند کرسکتی ہو۔ میری خواہش تو یہی ہے کہ یہ مضمون تمھارے ہی قلم سے ہو لیکن اگر تم اُسے نہ لکھو تو کیا تمھیں اس پر اعتراض ہوگا کہ میں اُسے لکھوں اور تمھارے نام سے شائع کردوں؟ بہرحال رسالہ کو اُس کے نام کے مطابق شائع ہونا ہے اور اُس کے مضامین نگاروں میں بھی خواتین ہی کو ہونا چاہئے۔ اور مجھے اُمید ہے کہ تم یہ مضمون ضرور لکھدوگی۔ میرا خیال ہے کہ میرے ناظرین کو امریکنوں کی تعریف پسند نہ ہوگی اس لئے انھیں بالکل مہذب بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اہل برطانیہ کو اہل امریکہ کی تہذیب سے زیادہ ان کی بدتہذیبی میں دلچسپی ہے۔ تم ان کی فرانسیسی زبان کے بارہ میں مجھ سے زیادہ جانتی ہو۔ اُسکو بھی لکھدو

تم مضمون کا اس طرح افتتاح کر سکتی ہو" کولمبس نے امریکہ کو ایک دفعہ دریافت کیا اور پھر اُسے امن کی حالت میں چھوڑ کر چلا آیا۔ مگر امریکہ والوں نے فرانس ایک مرتبہ دریافت کیا اور اُس وقت سے ابھی تک اُسے دریافت کیا کرتے ہیں انھوں نے انگریزی تو سیکھی نہیں اور فرانسیسی سیکھنا شروع کر دی۔ وہ ہمارے ملک میں اپنے کبھی نہ ختم ہونے والی آمد کی تشریح یہ کہکر کرتے ہیں کہ وہ یہاں اپنی تعلیم کے تکملہ کیلئے آتے ہیں۔ اور ہمیں ان کی باتوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے جو اتنے دلچسپ غیر منطقی ہیں کہ جس چیز کے شروع کرنے کی ہمت انھیں اپنے ملک میں نہ پڑی وہ غیر ملک میں جاکر اُس کی تکمیل کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ مجھے چند روز میں اس کا جواب مل جائے گا میں اس معاملہ میں تمھارے اوپر بھروسہ کر رہا ہوں — تمھارا سچا دوست آسکر وائلڈ

وائلڈ نے ۱۸۹۶ء میں حسب ذیل خط لکھا تھا جس ڈرامہ کا اس میں تذکرہ ہے وہ "سالومی" ہے۔

" مائی ڈیر سارہ میں تمھارے خط کا باوجود اس کے کہ وہ کچھ نہ ہونے کی حد تک مختصر ہے۔ ممنون ہوں تم لکھتی ہو" غالباً آپ کارنیوال دیکھنے کے لئے نیس آئیں" میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ جہاں گرامر کی رو سے ایک وقفہ کی ضرورت ہے وہاں تم سوالیہ نشان کیوں بناتی ہو۔ واللہ تم بالکل فرانسیسی ہو۔ ہمیشہ اُس چیز کو پیش کرتی ہو جہاں دوسری ہونا چاہئے۔ میں بھی عادتاً فرانسیسی ہوں مگر چونکہ میں فرانس میں نہیں پیدا ہوا اس لئے شاید مجھے اور بھی داد ملنی چاہئے۔ ہم لوگوں کا یہ بے تکا پن اُس سنہری زنجیر کی کڑی ہے جو ہم دونوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کئے ہوئے ہے۔ میری اندرونی زندگی کا پردہ اکثر لوگوں نے اُٹھانا چاہا اور پھر یہ معلوم کرکے کہ اُس میں صفات سبعہ نہیں پائے جاتے اپنے ارادہ سے باز آگئے ہیں۔ مگر تم ان چند میں سے ایک ہو جو اُس مقدس جگہ میں داخل ہوئے اور میری روح کے موتی کو ایک جام شراب میں بہتے ہوئے دیکھا۔ یہاں میرے دن سست گھونگھے کی طرح رینگ رینگ کر آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں۔ میں فرانسیسی زبان میں ایک تماشہ لکھ رہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ جب ہماری پھر ملاقات ہوئی تو تمھارے سنانے کے لئے اُسے مکمل کر چکا ہوں گا۔ افسانہ زمانۂ قدیم کا ہے مگر جس چوکھٹے میں میں یہ تصویر لگاؤں گا وہ بالکل نیا ہوگا — وہ درحقیقت اس قدر جدید ہوگا کہ اگر اُس پر احتساب نہ کیا جائے تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھوں گا۔

ایک مصور کے لئے ماضی بہت کچھ ہے۔ وہ مستقبل کو سائنس کے لئے چھوڑ سکتا ہے۔ اور نقاشوں میں ایک مصور ماضی کی قدر سب سے زیادہ جانتا ہے۔ یہ کہ تخیل کے اگلے سہرے کو حاصل کرنے کے لئے

شاعری کو ماضی کی طرف اشارہ کرنا چاہئے ایک ایسی حقیقت ہے جسے لوگ بہت قیمتی سمجھتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ہماری گزشتہ شاعری وعدہ، پیشین گوئی اور تفکر کی شاعری ہے اور ہر معاملہ میں مستقبل کا اشارہ کرتی ہے۔ نیز یہ بھی سمجھتے ہوئے کہ ایک شخص نے جس نے ایک مرتبہ کے علاوہ کبھی غلطی نہیں کی یہ کہا تھا کہ انگریزی شاعری خاصکر مستقبل کے لئے پیدا ہوئی۔

میں نے بیسیوں دواوین اُلٹ ڈالے ہیں۔ انھیں پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ ماضی سے انھیں کتنا تعلق ہے۔ میرے ذوق کے لحاظ سے وہ نظمیں جس کا تعلق ماضی یا مٹی ہوئی سلطنتوں یا شکستہ محلوں یا ختم شدہ محبت سے ہو دوسری نظموں سے زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔

اسی طرح نثر میں بھی میرا ذوق یہی ہے۔ مجھے تو "کسی زمانہ میں" کے پرانے فقرے میں تازگی کا ایک ابدی چشمہ نظر آتا ہے اور جب کوئی کتاب الہامی میں یہ پڑھتا ہے کہ "ایک زمانہ میں یہ ہوگا"، تو اس تلخ فرمان میں اُسے جملہ کا بقیہ حصہ دیکھنے سے قبل ہی ایک ایسی مکروہ آواز سنائی پڑتی ہے، جیسے تلواروں کی چمک یا دانتوں کی کٹکٹاہٹ ہو۔

ٹینی سن نے زمانۂ "حاضر" میں بعض نہایت عمدہ تشبیہات کھینچی ہیں۔ زمانۂ "حاضر" میں تخیل بہت آسانی سے دکھائی جا سکتی ہے۔ پرشوکت آبشاریں نظر آتی ہیں، صحرائی چشمہ ابل رہے ہیں، ناہموار پہاڑوں کی وادیوں میں پھول اُگ رہے ہیں۔ غرض اس قسم کی تشبیہات اُس کی تحریر میں بہت زیادہ ہیں۔ مگر یہ سب فطرت کی تصویریں ہیں اور ٹینی سن کی خصوصیت اسی میں ہے۔ یہ تصویر دوسرے کنارہ کو نہیں چھوتی۔ شاعری کا دوسرا کنارہ ایک غیر مرئی چیز ہے۔ جب ٹینی سن کو تخیل کا دوسرا سرا مل گیا تو پھر زمانۂ "ماضی" ہی کے پروں پر اس نے پرواز کی۔

شاعری کے طلباء کو، اُس کے پیغام کا آخری مقصد معلوم کرنے کے لئے ایک ایسے تخیل کی ضرورت ہے جو استوار، مکمل، وسیع، پرزور، حساس، لچکدار اور ہر موقع کے لئے مناسب ہو۔ یہ بات صاف ہے کہ مستقبل کی ان چیزوں کی شاعری جو ابھی تک ہمارے ذہن میں نہیں آئی ہیں یا اگر آئی بھی ہیں تو اچھی طرح سے نہیں، ان جذبات کے ظاہر ہونے کا زیادہ موقع دیتی ہیں بہ نسبت ان چیزوں کے جو بن چکی ہیں یا جن کی تشریح ہو چکی ہے کوئی سمجھدار آدمی اس کی تردید نہ کرے گا اور نہ وہ شاعری میں ماضی کیلئے اس غیر مشرح دلچسپی رکھنے کے لئے انکار کرے گا۔

آج کل یونان اور روما میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس کے متعلق کچھ سننا تکلیف دہ چیز ہے۔ ان کے مستقبل کو سوچ کر بھی ہم میں کوئی اضطراب پیدا نہیں ہوتا مگر جب ہم شاعری کے زمانۂ "ماضی" میں ان کی نسبت

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہو جاتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)

بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (سے) سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد (۳۱)	فہرست مضامین فروری سنہ ۱۹۳۷ء	شمارہ (۲)

ملاحظات ——— ۲

مذہب کی شکست علم کے مقابلہ میں ——— امام اکبر آبادی ——— ۹

انقلابی ——— ۱۶

سوئٹزرلینڈ کا آئینِ وفاق ——— ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری بار ایٹ لا ——— ۲۵

بنارس کی بیوہ (فسانہ) ——— ظہیر الدین حیدر نیر آروی ——— ۳۴

لامذہبیات ——— ۵۱

سائنس کے اکتشافات جدیدہ ——— ۶۰

مکتوبات نیاز ——— ۶۴

باب المراسلۃ والمناظرہ ——— ۶۸

باب الاستفسار ——— ۷۳

مفلس کی دنیا (نظم) ——— تمکین سرمست ——— ۷۷

محبت کے دو باغی (نظم) ——— فطرت واسطی ——— ۷۸

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری   معاون:- جلیل الرحمان اعظمی

جلد (۳۱)	فروری سنہ ۳۷ء	شمار (۲)

ملاحظات

حال و مستقبل

کوہ آتش فشاں کا اندرونی پگھلا ہوا آتشیں مادہ جوش میں آکر دفعتًا باہر نہیں نکلتا۔ جو آبادیاں اس کے دامن میں بستی ہیں وہ جانتی ہیں کہ فطرت کی اس قہرمانی قوت کے ظہور سے قبل کیا کیا علامات رونما ہوتی ہیں۔ پہلے شب کی تنہائیوں میں انھیں گرج کی سی آوازیں سنائی دیتی ہیں، اس کے بعد پہاڑ کی چوٹی سے ہلکا ہلکا دھواں نکلنا شروع ہوتا ہے، پھر وہ زیادہ کثیف ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک سینہ دہلا دینے والی آواز کے ساتھ جابجا زمین شق ہونے لگتی ہے اور آتشیں مادہ ایک عفریت کی طرح بل کھاتا ہوا باہر ابل پڑتا ہے اور چاروں طرف تباہیاں و بربادیاں پھیلا جاتا ہے۔

اس وقت دنیا جس دور سے گزر رہی ہے وہ سیاسی نقطۂ نظر سے بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی جوالا مکھی آتش فشانی کے لئے طیار ہو اور اس کی علامتیں روز بروز زیادہ نمایاں ہوتی جا رہی ہوں۔

اس وقت کوئی ملک ایسا نہیں جو امن و سکون کے اعلان میں انتہائی بلند آہنگی سے کام نہ لے رہا ہو لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ پکار جن سینوں سے نکل رہی ہے ان کے اندر کیسا ہیجان برپا ہے اور وہ مایوسی کس قسم کی ہے جو منزل مقصود کے ذکر کے سوا اور کوئی سہارا اپنے پاس نہیں رکھتی۔ گویا پانی نایاب ہے اور صرف اس کا نام لے لیکر پیاس بجھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

دنیا میں جب امن و سکون کی اشاعت کا دعویٰ نہیں کیا جاتا تھا۔ تو وہ بغیر کوشش کے ہمیں حاصل ہوجاتی تھی اور اب کہ زمانہ کو ہر ہر منطق سے اس کا یقین دلایا جارہا ہے۔ اس کا وجود کہیں نظر نہیں آتا۔

اس سے قبل دسمبر کے نگار میں، مسئلۂ فلسطین پر بحث کرتے ہوئے سیاسیات یوروپ میں برطانیہ کے پوزیشن کو میں نے واضح کیا تھا اور بتایا تھا کہ جنگ حبش نے یوروپ کے سیاسی توازن کو جو غیر معمولی صدمہ پہونچایا ہے اس سے نہایت سخت۔ بے چینی دول مغرب میں پیدا ہوگئی ہے اور اس نے مستقبل کی جنگ کو ہم سے اسقدر قریب تر کردیا ہے کہ اس کی زہر آلود گیس کی بو ہم کو محسوس ہونے لگی ہے۔

آج کی صحبت میں، مختصراً یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ مغرب کی قومیں ایک دوسری کی طرف دست محبت دراز کرتی ہوئی نظر آتی ہیں، ان کے دل کی دھڑکن کا کیا عالم ہے اور جنگ کے لئے وہ اندرونی طور پر کیا کیا طیاریاں کررہی ہیں۔

اس وقت یوروپ میں جتنی سلطنتیں پائی جاتی ہیں، ان میں سوائے انگلستان کے سب کے متعلق ہمیں یہ علم حاصل ہے کہ وہ کن اصول پر حکمرانی کرنا چاہتی ہیں اور ان کا حقیقی مقصود کیا ہے۔ روس ملوکیت و سرمایہ داری دونوں کا دشمن اور (NIHLISM) کا حامی ہے اور فرانس کی اشتراکیت پسندی بھی چھپی ہوئی چیز نہیں اسی طرح جرمنی اور اطالیہ کے متعلق یہ حقیقت کسی سے مخفی نہیں کہ وہ سرمایہ داری کے حامی اور ڈکٹیٹر شپ کے قائل ہیں۔ لیکن برطانیۂ عظمیٰ ہی ایک ایسی سلطنت ہے جس کے متعلق ہم کو آجتک نہیں معلوم ہوسکا کہ اسکی حکومت کس نوع کی حکومت ہے اور اس کا منتہائے نظر کیا ہے۔ بادشاہ کا وجود وہاں ضروری، لیکن ملوکیت کا پتہ نہیں، پارلیمنٹ اور نیابت و انتخاب وغیرہ سبھی کچھ موجود مگر جمہوریت کا کہیں نشان نہیں، کابینہ میں صرف وزیر اعظم ایک ایسی ہستی ہے جو تمام نظم و نسق پر حاوی ہے مگر ڈکٹیٹر شپ سے اظہار بیزاری۔ سرمایہ داری پر اسکی تمام عمارت قائم، لیکن مزدور جماعت کے ساتھ اظہار ہمدردی کے لئے ہروقت طیار۔

الغرض حکومت برطانیہ اس وقت تمام دنیا کی سلطنتوں میں بالکل وہی حیثیت رکھتی ہے جو مذہبی دنیا میں "لاادریت" والوں کی ہے اور اسی لئے یوروپ میں جب کوئی جدید سیاسی ہلچل پیدا ہوتی ہے تو برطانیہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ وہ کس کا ساتھ دے اور کس کو چھوڑ دے اور اس کو اپنی اس پالیسی کا نباہنا دشوار ہے

جنگ حبش کے دوران میں اس نے چاہا کہ اطالیہ اور حبش دونوں کو خوش رکھ سکے اور نتیجہ اسکے بالکل برعکس یہ نکلا کہ حبش اور بحیرۂ روم دونوں جگہ سے اس کا اقتدار اُٹھ گیا۔

جرمن کے مقابلہ میں برطانیہ بظاہر ہمیشہ فرانس کی طرف مایل رہا لیکن جس وقت جرمنی نے حدودِ فرانس پر ارضِ ممنوعہ کی طرف قدم بڑھایا تو فرانس کا کوئی احتجاج برطانیہ کی رگ اخوت میں حرکت نہ پیدا کر سکا۔ بالشیوک اُصول سے جو نفرت برطانیہ کو ہے، کسی سے مخفی نہیں لیکن اس سے تجارتی بھائی چارہ قایم کرنے میں اس نے مطلق پس و پیش نہیں کیا۔ الغرض دولِ یوروپ میں برطانیہ کا پوزیشن سب سے نرالا واقع ہوا ہے اور اسی لئے اس سے زیادہ امن و سکون کا خواہاں کسی اور ملک کو نہ ہونا چاہئے، لیکن جب اس کی کوئی توقع باقی نہ رہے تو پھر اس کی مشکلات کا اندازہ بھی مشکل ہے۔

گزشتہ جنگ عظیم کے بعد آیندہ خطرہ جنگ کو ضعیف کرنے کے لئے دو چیزیں پیدا کی گئی تھیں۔ ایک لیگ اقوام اور دوسرے اسلحہ بندی کی روک تھام۔ یعنی خاص خاص ملکوں کو ایک خاص حد تک اسلحہ و سامان حرب رکھنے کی اجازت دیجائے اور اگر کوئی نزاع باہم گر پیدا ہو جائے تو اس کا تصفیہ لیگ کے ذریعہ سے چاہا جائے۔ اگر ان تحریکوں میں تمام سلطنتیں واقعی نیک نیتی سے حصہ لیتیں تو اس میں شک نہیں کہ دنیا کا کھویا ہوا امن و سکون بڑی حد تک دوبارہ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ لیکن چونکہ ہر سلطنت اپنے ذاتی مفاد کو پورا کرنا چاہتی تھی اور ٹھیک اسی وقت جبکہ وہ ہاتھ میں "نشترِ فصاد" کی نمایش کر رہی تھی، آستین میں دشنہ سلئے ہوئی تھی، اس لئے یہ تحریک مطلق کامیاب نہیں ہوئی۔ پہلی ضرب اس کو جاپان نے پہونچائی اور رہا سہا اقتدار اس کا مسولینی نے مٹا دیا۔

بالکل یہی حال (DISARMAMENT) کی تحریک کا ہوا کسی قوم نے بھی اس کے قایم کردہ حدود کا احترام نہ کیا اور ہر سال طیاری اسلحہ کا بجٹ بڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ اب دنیا کی تقریباً وہی حالت ہو گئی ہے جو ۱۹۱۴ء کے جنگ عظیم سے قبل پائی جاتی تھی[1] اور آہستہ آہستہ تمام ممالک اسی نقطہ سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں

---

[1] روس کی سرخ افواج کی تعداد ڈیڑہ لاکھ تک پہونچگئی ہے کیونکہ بھرتی ہونے کی عمر اکیس سے اُنیس سال کر دی گئی ہے۔ اسوقت کم از کم ۵۰۰۰ ہوائی جہاز اس کے پاس ہیں اور دس ہزار ٹینک (دبابہ)۔ جرمنی کی عسکری قوت سات لاکھ سپاہ تک پہونچگئی ہے اور ایک ہزار سے زیادہ جنگی ہوائی جہاز اس کے پاس موجود ہیں اور ۸۰ کرور پونڈ سالانہ اس کا فوجی خرچ ہے۔

فرانس نے چند ماہ کا عرصہ ہوا اپنے فوجی مصارف ۸۱ کرور تک بڑھا دئے ہیں ۔۔ اطالیہ کی فوجی قوت کا صحیح علم نہیں ہے لیکن ایک سال قبل مسولینی نے بیان کیا تھا کہ دس لاکھ مسلح سپاہ اس کے پاس موجود ہے۔

جاپان کا فوجی بجٹ ۱۹۳۲ء کے مقابلہ میں اب دوچند ہے اور امریکہ نے اس سال سات کرور بیس لاکھ پونڈ اور زیادہ اپنے فوجی بجٹ میں منظور کئے ہیں ۔۔ اسی طرح برطانیہ کے فوجی مصارف میں پانچ کرور اسّی لاکھ پونڈ کا اضافہ ہوا ہے۔ الغرض اس وقت بہ نسبت ۱۹۱۴ء کے تمام ممالک کا فوجی خرچ پانچ گنا زیادہ ہو گیا ہے۔

جہاں پہونچکر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جانا ناگزیر ہے۔

اسلحہ و سامان حرب کے متعلق سب سے زیادہ پابندی جرمنی پر عاید کی گئی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی نے سب سے زیادہ اس کی خلاف ورزی کی اور اب نوبت یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ یا تو کھلم کھلا اس سے دوستی کے تعلقات قایم کئے جائیں یا پھر "ہمیں میداں، ہمیں چوگاں، ہمیں گوے" پر عمل کیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ گزشتہ جنگ میں جرمنی کے بہت سے مستعمرات اس کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں، لیکن یہ بھی جرمن قوم کی جرأت و ہمت کا اعجاز ہے کہ نُچے ہوئے پر و بال کی جگہ پھر نئی کلیاں پھوٹ آئیں اور اس میں پہلے سے زیادہ قوتِ پرواز عود کر آئی۔

نہ صرف اندرونِ ملک میں بلکہ ہر جگہ جہاں اس کا قبضہ ہے غیر معمولی حرکت و عمل نظر آتی ہے اور اس نے سب سے زیادہ جس قوم کو مشوش بنا رکھا ہے وہ برطانیہ ہے۔

بحر شمال کے سواحل پر (ساحل انگلستان سے صرف ۲۵۰ میل کے فاصلہ سے) جرمنی کے متعدد جزائر پائے جاتے ہیں اور ان میں ہر جگہ ایک بحرانی کیفیت کے ساتھ فوجی طیاریاں عمل میں آرہی ہیں — جزائر JUIST، NORDERNEY اور WANGEROOG میں استحکاماتِ قلعہ بندی اور ہوائی جہازوں کی فرودگاہ بنانے کے لئے لاکھوں ٹن کنکریٹ بچھائی جا رہی ہے۔ اسی طرح جزیرۂ SYLT میں ڈنمارک کی سرحد تک قلعہ بندیوں کا کام نہایت وسیع پیمانہ پر تکمیل کو پہونچ رہا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ مقام یوروپ کا سب سے زیادہ وسیع و مستحکم مرکز بحری و ہوائی قوت کا بننے والا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اندرونی طیاریاں تمام آبادی کو اسلحہ بند فوج بنانے کے لئے جاری ہیں اور جس دیوانگی و بیدردی کے ساتھ سامانِ حرب، زہریلی گیس اور ہوائی جہازوں کی طیاری پر روپیہ صرف کیا جا رہا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس تاریک و ہولناک مستقبل نے دنیا کو لرزہ براندام بنا رکھا تھا وہ اب دور نہیں ہے اور کسے خبر ہے کہ وہ اچانک کس وقت سامنے آجائے۔

جرمنی کے علاوہ یوروپ کے اور ممالک بھی اس آنے والی "قیامت" کا مقابلہ کرنے کے لئے تمام ممکن ذرایع سے کام لے رہے ہیں، چنانچہ روس، فرانس اور اطالیہ کی آمدنی کا سب سے بڑا حصہ جنگ کی طیاریوں ہی میں صرف ہو رہا ہے اور یہی حال مشرق میں جاپان کا ہے۔

دول یوروپ میں برطانیہ ہی ایک ایسا ملک ہے جس نے بجائے اسلحہ کے ہمیشہ اپنی ڈپلومیسی پر زیادہ اعتماد رکھا، لیکن کب تک؟ آخرکار وہ بھی مجبور ہو گیا کہ سیلاب کا رُخ دیکھ کر اپنی رفتار بدل دے، چنانچہ وہاں بھی بحری و ہوائی طاقت کو بڑھانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور زہریلی گیس سے بچنے کے لئے نئے نئے انداز [illegible]

و مکانات طیار کئے جا رہے ہیں۔

یقیناً برطانیہ جنگ مستقبل کے اندیشہ کی طرف سے کبھی بے خبر نہیں رہا لیکن اپنے آپ کو بھاری بھرکم ظاہر کرنے کے لئے وہ کبھی اس کا ذکر زبان پر نہیں لایا۔ لیکن اب کہ تلوار کی دھار ہڈی تک پہونچتی نظر آرہی ہے، منہ سے چیخ کا نکل جانا ناگزیر ہے اور ہاتھ پاؤں ہلانا لازم۔

مسٹر لائیڈ جارج نے جو تقریر حال ہی میں بہ مقام ناٹنگھم کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت کس خطرۂ عظیم کے مقابلہ کا سوال انگلستان کے سامنے ہے۔

مسٹر لائیڈ جارج نے دوران تقریر میں ظاہر کیا کہ :۔ "حالت بہت نازک ہے اور نازک تر ہوتی جا رہی ہے اور اسی لئے باوجود ضعف و انحطاط کے مجھے باہر نکل آنا پڑا تاکہ اپنی رہی سہی قوت ملک کی خدمت کے لئے وقف کر دوں۔ اب وقت صاف صاف کہنے کا ہے اور اس لئے مجھے کہدینا چاہئے کہ جن تلخ حقیقتوں سے اٹلی اور جرمنی کو دوچار ہونا پڑا ہے، انھیں کا مقابلہ ہمیں بھی کرنا ہے اور اگر ہم نے غیر معمولی ہمت و جرأت سے کام نہ لیا تو کامیابی کی کوئی توقع نہیں۔"

اسوقت دول یورپ میں ایک دوسرے کے ساتھ جو معاہدے ہو رہے ہیں وہ امن و سکون سے زیادہ بدامنی کے امکانات اپنے اندر رکھے ہوئے ہیں۔ ایک طرف جرمنی اور آسٹریا کا باہمی معاہدہ (جس میں یقیناً اطالیہ بھی شریک ہوگا)، دوسری طرف روس اور زیکوسلوکیا کا۔ تیسری طرف برطانیہ کی یہ کوشش کہ وہ یورپ کے مختلف سیاسی عناصر سے ساز باز بھی رکھے اور کسی کا ساتھ بھی نہ دے۔ ان سب نے ایسی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا آیندہ نقشۂ جنگ کی صورت کیا ہوگی۔ آسٹریا، جرمنی اور اطالیہ اگر خود اپنے ذاتی اغراض کی بنا پر ایک دوسرے سے برسر پیکار نہ ہوئے تو اس میں شک نہیں کہ اشتراکی حکومتوں کے لئے اس میں سخت خطرہ پنہاں ہے اور فرانس مجبور ہوگا کہ وہ روس کے دامن میں پناہ لے۔ لیکن، روس کی معیت جس نے زیکوسلوکیا سے صرف اس لئے معاہدہ کیا ہے کہ جنگ کے وقت، اسے اپنی ہوائی طاقت کا مرکز قرار دے، کبھی برطانیہ کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بلقان کی تمام ریاستوں کے اندر بھی اختلاف پیدا ہوگا اور بالکل وہی نقشہ سامنے آجائے گا جو گزشتہ جنگ عظیم کے وقت پیش آیا تھا۔ الغرض یورپ کا کوئی ملک ایسا باقی نہ رہیگا جو جنگ میں حصہ لینے پر مجبور نہ ہو اور اس طرح عالمگیر ہلاکت و خونریزی بالکل یقینی ہے۔

پھر چونکہ کسی ملک کی آبادی اس کے لئے تو آمادہ نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالے، اس لئے ہر سلطنت اندرونی انقلاب کی طرف سے بھی خائف ہے، اور بالکل ممکن ہے کہ اس طرح تمام دنیا میں اشتراکی لہر دوڑ جائے۔

یہ تو ہوئے وہ حقایق و واقعات جن کی بنا پر آیندہ جنگ کا واقع ہونا لازم خیال کیا جاتا ہے اور جسکی طیاری میں ہر ملک مصروف ہے، لیکن اسی کے ساتھ بعض جماعتیں ایسی بھی ہیں جو رد بلا کے امکانات پر غور کر رہی ہیں اور موجودہ سیاسی اُلجھنوں کے اسباب کو سمجھکر ان کے دفع کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ان جماعتوں میں سب سے زیادہ اہم اہل مذہب کی جماعت ہے اور جس نتیجہ پر وہ پہونچی ہے نہایت عجیب و غریب ہے۔

اس کے نزدیک موجودہ اضطراب کا سبب نہ اقتصادی دشواری ہے، نہ تجارتی حرص وطمع، نہ ضرورت سے زیادہ صنعتی پیداوار سے بے چینی پیدا ہوئی ہے نہ اس بات سے کہ آدمیوں کی جگہ مشینوں نے لیکر انھیں بیکار بنا دیا ہے، بلکہ اس کا تنہا سبب ان کی رائے میں دہریت و الحاد ہے اور انجیل مقدس کی پیشین گوئی کی بنا پر وہ اس جنگ کو ضروری خیال کرتے ہیں کیونکہ نزولِ مسیح کی یہی علامت انھیں بتائی گئی ہے۔

بہرحال آیندہ جنگ کا سبب مادی ہو یا روحانی، دہریت و الحاد ہو یا نزولِ مسیح، ہے بالکل اٹل اور اس بلا کا ایک بار اور دنیا میں نازل ہونا ضروری ہے، کیونکہ جب تک دنیا سے بلند و پست اور نشیب و فراز کے دھبے نہ مٹیں گے امن و سکون کا دور کبھی نہ آئے گا۔

ایک خاص اطلاع

نگار کے اجراء کو پندرہ سال کا زمانہ گزر چکا ہے اور اس سال سے سولھواں سال شروع ہوتا ہے۔ اس دوران میں تقریباً پندرہ ہزار صفحات قارئین نگار کے سامنے پیش کئے گئے اور اگر آپ پورے فایل کو دیکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں نصف سے زاید صفحات میرے دماغ و قلم کا نتیجہ ہیں۔ یقیناً یہ کوئی معجزۂ ادب و انشا نہیں ہے اور دنیا میں متعدد ہستیاں ایسی موجود ہیں جو اس سے زیادہ طویل فردِ عمل اپنے پاس رکھتی ہیں، لیکن شاید اس سے انکار ممکن نہ ہو کہ عمر و زمانہ کے مقابلہ میں کبھی نہ کبھی انسان کو سپر ڈالدینا ہی پڑتی ہے اور قواء کا اضمحلال نسبتاً زیادہ آرام و سکون چاہتا ہے۔

ہر چند بحمد اللہ ابھی تک نہ مجھے اپنے قواء ظاہری سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہے، نہ دل و دماغ ادائے فرض سے قاصر نظر آتے ہیں، لیکن بہرحال اسوقت کا آنا ناگزیر ہے جب یہ سب کچھ ہوکر رہیگا اور ایک ایسے شخص کی ضرورت نگار کو ہوگی جو اس کی قایم کردہ روایات کو پیش نظر رکھ کر اُسے کامیابی کے ساتھ چلا سکے۔

چنانچہ کچھ عرصہ ہوا میں نے اعلان کیا تھا کہ اگر کوئی صاحب میرے ساتھ کام کرنے کے لئے آمادہ ہوں تو اطلاع دیں۔ اس کے جواب میں متعدد حضرات نے اپنی خدمات پیش کیں، لیکن جو خصوصیات میں چاہتا تھا وہ کسی ایک میں بھی نہ تھیں۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں مولوی جلیل الرحمان صاحب اعظمی سے ملاقات ہوئی اور ان کے اکتسابات علمیہ و رجحانات ذہنی میں بہت سے "امکانات" مجھے نظر آئے۔

اعظمی صاحب عربی و فارسی کے فاضل ہیں اور ان دونوں زبانوں میں ماہرانہ و ادیبانہ نظر رکھتے ہیں ۔ اسی کے ساتھ صحافت کے لئے جس خاص ذوق کی ضرورت ہے وہ بھی ان میں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ اس لئے میں اسے فال نیک سمجھتا ہوں کہ نگار کو ان کی خدمات حاصل ہو گئی ہیں اور اس طرح اب میں بعض ان اہم تصانیف کی طرف متوجہ ہو سکوں گا، جو عرصہ سے میرے پیش نظر ہیں اور جن کی تکمیل کی فرصت مجھے نصیب نہ تھی۔

ہر چند اعظمی صاحب "مذہبیات" کے باب میں میرے ہمنوا نہیں ہیں تاہم آزادی کے ساتھ سوچنے کا میلان ان میں پایا جاتا ہے اور ممکن ہے کہ کسی وقت وہ بھی اسی نتیجہ پر پہونچیں جو میرے سامنے ہے ۔ بہر حال جب تک وہ میرے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے طیار نہ ہوں نگار کے اس حصہ سے انھیں کوئی واسطہ نہ ہوگا اور تمام اس نوع کے مباحث خواہ وہ ملاحظات میں درج کئے جائیں یا باب المراسلہ و باب الاستفسار میں میرے ہی قلم سے ہوا کریں گے ۔

باب الانتقاد کو میں زیادہ وسیع کرنا چاہتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ اس مقصد کی تکمیل میں مجھے ان سے زیادہ مدد ملیگی ۔ اسی کے ساتھ وہ علمی و ادبی مضامین بھی لکھیں گے اور بہت سے چھوٹے چھوٹے کاموں میں میرا ہاتھ بٹائیں گے ۔

اعظمی صاحب کے جتنے مقالے ہوں گے وہ انھیں کے نام سے شایع ہوں گے، اور جو میرے قلم سے ہوں گے ان پر حسب دستور سابق کسی کا نام نہ ہوگا۔

آیندہ ماہ میں شواعر العرب کے عنوان سے ان کا ایک ادبی مقالہ شایع ہوگا اور اس کے بعد بھی ہر مہینے ان کے مفید و دلچسپ مضامین نگار میں درج ہوتے رہیں گے ۔

سُنّی علماء کرام سے

جنوری ۱۹۳۶ء کے نگار میں جو مقالہ مسئلۂ خلافت و امامت پر شایع ہوا ہے وہ شیعی نقطۂ نظر سے ایسا صاف و روشن مقالہ ہے کہ اگر اسکو سامنے رکھکر جواب دینے کی کوشش کی جائے تو بہت سی الجھنیں دور ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ اس بحث کو میں نے جس پہلو سے اٹھایا ہے اور جس مخصوص انداز کے دلایل پیش کرنیکی پابندی میں نے عاید کی ہے اس نے گفتگو کی نوعیت کو بالکل بدلدیا ہے۔

اب نتیجہ تک پہونچنے کے لئے صرف ایک منزل درمیان کی اور باقی رہگئی ہے یعنی یہ کہ سنی علماء کرام جنوری کے مضمون کو سامنے رکھکر اپنی تحقیقات پیش کریں ــــ میں خود اسوقت تک کچھ نہیں لکھنا چاہتا جب تک فریق ثانی کو اظہار خیال کا موقعہ نہ دیا جائے، اس لئے امید ہے کہ جن حضرات کو اس مقالہ کی موافقت یا مخالفت کرنا ہے وہ جلد توجہ فرمائیں تاکہ جولائی تک مجھے بھی اظہار خیال کا موقعہ مل سکے ۔

مذہب کی شکست علم کے مقابلہ میں

تاریخ مذہب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذاہب کا وجود بہت کچھ احول اور اقوام عالم کے امیال و عواطف سے متعلق رہا ہے، کوئی چاند سورج کو پوجنے لگا کوئی آب و آتش کو۔ کوئی دیوتاؤں کے روبرو سربسجود ہوا اور کوئی سنگین مجسموں کے روبرو۔ کوئی مافوق الفطرت شئے کے روبرو جھک گیا، اور کوئی غیر معمولی شخصیت کے روبرو۔

پھر چونکہ ہر گروہ کا یہ عقیدہ تھا کہ صرف میری ہی عبادت کا طریقہ صحیح ہے، اس لئے ہر مذہب کا پیرو اپنی اپنی طرف مختلف طریقوں سے انسانوں کو کھینچنے لگا۔ لالچ کے ذریعہ، قید و بند کے ذریعہ، قتل و خونریزی کے ذریعہ، غرضکہ دھوکے و فریب کا کوئی پہلو، جہالت و قساوت کا کوئی طریقہ ایسا نہ تھا جس کے ذریعہ اپنے اپنے حلقۂ عقیدت کی توسیع اشاعت میں بقدر ہمت حصہ نہ لیا ہو۔ یہاں تک کہ اسی حیلے سے انسانوں نے اپنی اپنی وسیع سلطنتیں قایم کر لیں، فریب عقیدت کے اس خیال میں کہ جس قدر انسانوں کو ہم اپنے مذہب کا پیرو بنا لیں گے، اسی قدر ہمارا دیوتا یا خدا ہم سے خوش ہوگا۔ بے شمار انسانوں کا خون بہایا گیا اور بہایا جاتا ہے۔ اور دنیا اور اہل دنیا ہزارہا سال سے انھیں آلام و مصائب میں مبتلا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اسی کا نام حق و صداقت ہے۔

اس اختلاف شدید نے ایسا گروہ پیدا کر دیا، جو کہنے لگا کہ دنیا میں بذات خود نہ تو کوئی حق ہے نہ باطل نہ نیکی کا کوئی وجود ہے، نہ بدی کا، بلکہ یہ سب انسانوں کے قایم کردہ حدود ہیں، جو قابل اعتنا و لایق وثوق نہیں۔ نیز یہ کہ یہ تمام باتیں اعتبارات کے تحت میں ہیں۔

چنانچہ ارسطو نے ایک کلیہ قایم کیا جو نہایت پُرشکوہ معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ:-

"تماشہ گاہ فطرت میں جو مختلف صورتیں نظر آتی ہیں، یہ حالات و کیفیات موجودہ کی تابع ہیں۔ اگر حالات و کیفیات بدل جائیں تو صورت و شکل میں بھی تبدیلی ہو جائے، یعنی ہستی کا ایک غیر منقطع سلسلہ ہے جو نباتات و حیوانات سے ہوتا ہوا انسان تک پہونچتا ہے۔ اور مو الید کی مختلف حالتیں ایک دوسرے میں بتدریج اس طرح ضم ہوتی چلی جاتی ہیں کہ انضمام تک محسوس نہیں ہوتا۔"

اس کے اس فلسفہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کائنات کا جو یہ غیر منقطع سلسلہ قایم ہے، اس پر کوئی قادر نہیں بلکہ

یہ از خود پایا جاتا ہے، اور اس لئے مذہب کا وجود توہم پرستی کے سوا اور کچھ نہیں۔
زینو ایتھنز کا ایک نامور حکیم جو قبرس یا فینشیا سے یونان کے پایۂ تخت میں آکر رہنے لگا تھا، اسکا فلسفہ یہ تھا:-

"جس طرح ہمیشہ آبشار کی ایک ہی صورت رہتی ہے، لیکن جس پانی سے یہ مرکب ہے وہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اسی طرح قدرت کی نمود سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہ مادہ کا ایک سیل ہے جو ہر وقت و ہر لحظہ بہتا رہتا ہے، اور اسی لئے کائنات بحیثیت مجموعی ناقابل تغیر ہے۔ ہمیں یقین کر لینا چاہئے کہ ایک غیر مرئی جوہر کے وجود میں کلام نہیں مگر اس میں کلام ہے کہ ایک ایسا شخصی یا ذاتی خدا موجود ہے جو انسانی صورت رکھتا ہے، اور جو جذبات سے لبریز ہے وحی و الہام کی وقعت ایک ڈھکوسلے سے زیادہ نہیں۔ جس شے کو انسان اتفاق یا حادثہ سے تعبیر کرتا ہے، اسے ایک غیر معلومہ علت کا معلول سمجھنا چاہئے۔ کائنات ایک بہت بڑی کل ہے جو خود بخود چل رہی ہے اور نظام کی رگ و پے میں جو طاقت جاری و ساری ہے جہلا اسے خدا کہتے ہیں۔"

امپیڈاکلیز کی رائے ہے کہ ممکن ہے کہ تمام فلسفہ اور مذاہب ناقابل اعتبار ہوں کیونکہ ہمارے پاس کوئی ایسا معیار نہیں جس سے ہم ان کی جانچ کر سکیں۔

دی مقراطیس کہتا ہے کہ "حقایق کی ہمارے ذہن میں تیقن کا القا نہیں کر سکتے۔"

فیرو کی رائے ہے کہ "چونکہ ہمارے پاس حق و باطل کا کوئی معیار نہیں، اس لئے ہمیں ہر شے کی نسبت کے اظہار رائے میں تامل کرنا چاہئے۔"

زنوفینز کا دعویٰ ہے کہ "ناممکن ہے کہ ہم حق بات کا بھی یقینی تصور کر سکیں۔"

پارمنائیڈیز کا قول ہے کہ "انسان کی دماغی ساخت ہی ایسی نہیں کہ وہ حق مطلق کی تحقیق کر سکے۔ چنانچہ اس فلسفہ سے جماعت تشکیکین کی بنا پڑ گئی، اور خیال کیا جانے لگا کہ ہم کوئی دعوے نہیں کرتے۔ بلکہ یہ دعویٰ بھی نہیں کرتے کہ ہم کوئی دعوے کر سکتے ہیں۔

پیکورس اپنے شاگردوں کو یہ سبق دیا کرتا تھا کہ حق کا انکشاف ہرگز عقل کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔

آرسیسلیس کو معلومات حسیہ و عقلیہ دونوں سے انکار تھا۔

ارسطو نے اپنے شاگردوں کو یہ تعلیم دی کہ "ادراک اور شے مدرکہ میں ایک قسم کا باہمی تعلق ہے، جس کا اثر انسان کے نظام عصبی پر مترتب ہوتا ہے۔"

انکساغورث فرط حسرت و تاسف سے کہتا ہے کہ کوئی چیز یقینی نہیں ہو سکتی، کسی حقیقت کے چہرے سے پردہ نہیں اٹھ سکتا، کوئی امر یقینی نہیں ہو سکتا، قوائے حسیہ محدود ہیں، قوائے عقلیہ کمزور ہیں، اور حیات مستعار قلیل ہے۔

غرضکہ یونانی فلسفہ جس نتیجہ پر پہونچا وہ یہ تھا کہ انسانی حواس کی شہادت ناقابل اعتبار ہے، اس لئے ہم حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتے۔ ان خیالات کی نشر و اشاعت نے ملک میں آگ لگا دی، اور تشکیکین کا ایک علحدہ مذہب قایم ہوگیا۔

برخلاف اسکے مذہبی فلاسفروں کی ایک جماعت نے جو مسیحی علم کلام کی بانی تھی۔ ایک جدید مذہب، فلسفہ اشراقیہ جدیدہ کے نام سے اسکندریہ میں قایم کیا۔ اس مذہب کا مدعا یہ تھا کہ ایمان و عقل میں توافق پیدا کیا جائے۔ خدا کی ہستی کا تعقل چونکہ افلاطون کے کلیات عقلی کی وساطت سے ناممکن تھا، لہذا فلسفہ اشراقیہ جدیدہ کے بانیوں نے مکاشفے کے مسئلہ کو رواج دیا۔ یعنی حصول علم خارجی اشیاء کے ادراک سے ناممکن ہے، البتہ یہ بات انجلاء نفس و تزکیۂ باطن سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس زمانہ میں مسیحی دنیا کے بڑے بڑے حکما و فلاسفہ اس نکتے کے حل کرنے میں منہمک تھے کہ نظم عالم کس طرح اور کیونکر چل رہا ہے؟

غرضکہ ایک طرف مذہب عیسوی میں توہم پرستی کا زور تھا، اور دوسری طرف فلسفیانہ عقائد کی نشر و اشاعت کا غلبہ۔ قسیسی مورخین کا بیان ہے کہ دوسری صدی عیسوی کے آغاز کے ساتھ ایمان و عقل اور مذہب و فلسفے میں جنگ چھڑ گئی۔ ان اختلافات کے اندفاع اور احقاق حق کی غرض سے مجالس مشاورت کا انعقاد ہونے لگا، جنہوں نے بالآخر مجالس عمومیہ کی شکل اختیار کر لی۔

چوتھی صدی عیسوی میں جب مسیحیت مسند شہنشاہی پر جلوہ افروز ہوئی تو ان مجالس کے احکام کی تعمیل لازمی و ضروری ہوگئی، اور احکام کا نفاذ بزور شمشیر ہونے لگا۔ اس سے کلیسا کا زور بڑھ گیا۔ مشیم مشہور مورخ لکھتا ہے کہ اس زمانے میں قسیسی عہدوں پر جاہلوں اور عامیوں کے مامور ہونے میں کوئی چیز مانع نہ ہوتی تھی۔ وحشی و بے علم جماعت جو علم و فلسفے کی دشمن تھی مجالس مندرجۂ صدر کی گویا مالک تھی، اور جو چاہتی تھی وہ کر گزرتی تھی۔ یہاں تک کہ اگر مذہب کو جھوٹ بولنے سے یا دغا و فریب کرنے سے کوئی فائدہ ہو سکتا تھا تو اس حال میں بھی سب کچھ جایز تھا۔

اسی کے ساتھ ایسی عدالتیں بھی قایم ہو چکی تھیں جو ملزم کے خطاوار یا بے خطا ہونے کا فیصلہ انواع و اقسام کی جسمانی ایذاؤں کے ذریعہ سے کرتی تھیں، اور اس فیصلہ کو منجانب اللہ سمجھا جاتا تھا۔ چھ سو سال تک ان عدالتوں کے معیار حق سمجھنے کا یہ طریقہ رہا کہ ملزم کو آگ میں ڈالکر تحقیق کیا جاتا تھا کہ یہ گنہگار ہے یا بیگناہ؟ - یا پھر اس کو تالاب میں ڈالدیا جاتا تھا کہ اگر یہ قصوروار ہے تو ڈوب جائے گا ورنہ بچ رہیگا۔ یا پھر لوہے کی سرخ دہکتی ہوئی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں دیجاتی تھی کہ وہ اس سے پکتا ہے یا نہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیرھویں صدی عیسوی سے چاروں طرف بداعتقادی کی ہوا چلنے لگی۔ یہاں تک کہ

صرف ایک کثیر گروہ اس امر پر متفق ہوگیا کہ جس چیز کا نام مذہب ہے وہ صرف اغلاط و اوہام کا مجموعہ ہے۔ جب اس محکمہ نے ہوا کا رُخ پھر بدلتے دیکھا۔ اس نے ملاحدہ و زنادقہ کی چپے چپے اور گوشہ گوشہ میں سراغ رسانی کرا کے ایسی وحشیانہ مستعدی ظاہر کی کہ چند سال کے اندر تین لاکھ چالیس ہزار اشخاص کو مختلف سزائیں دیں، جن میں سے بتیس ہزار نفوس کو زندہ جلا دیا۔ اس مجلس تعذیب نے یہ سب کچھ حکومت برقرار رکھنے کے لئے کیا تھا۔

چوتھی لٹران کونسل منعقدہ ۱۲۱۵ء کے فیصلہ نے اس محکمے کے اقتدار میں ایک اور خوفناک اضافہ کر دیا۔ وہ یہ کہ ہر شخص اپنی پوشیدہ سے پوشیدہ بات اور اپنے تمام افعال و اعمال کا اعتراف اپنے حلقے کے پادری کے روبرو کیا کرے۔ چنانچہ حلقے کے پادری کو اب یہ قدرت حاصل ہوگئی کہ خاوند و بیوی آقا و ملازم کے خانگی راز بھی معلوم کر لیتا تھا۔ اس سے جاسوسی کا ایک اچھا خاصا محکمہ قایم ہوگیا۔ اور اس آڑ میں معصوم و خاطی ہر شخص کو طرح طرح کی ایذا پہونچائی جانے لگی۔ اس سے عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ قانون جو نافذ ہے، مذہبی قانون نہیں ہوسکتا۔ اور یقیناً کلیسا پاکیزگی و تقدس سے منزلوں دور ہوگیا ہے۔ اس گروہ نے تذکرۂ غفران کی فروخت کے خلاف بھی اپنی آواز بلند کی اور تذکرۃ الغفران سے مراد یہ عقیدہ تھا کہ مسیح کے خون کا ایک قطرہ کل بنی نوع انسان کی نجات کے لئے کافی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ کہ جس قدر خون باغ میں اور صلیب پر گرا تھا وہ پاپائے روما کو ترکہ میں ملا ہے۔ تاکہ اس نجات کی روشنائی سے تذکرۃ الغفران لکھے۔ معصیت پر خطِ عفو کھینچنے کے لئے مغفرت کا یہ نسخہ فروخت کیا جاتا تھا۔ بعض ان تبرکات کو لوگوں کے سامنے پیش کرکے لوگوں کو بوسہ دینے پر مجبور کرتے۔ تھے اور پھر ان سے روپیہ وصول کیا کرتے تھے بعض اشتہاری پروپیگنڈا کرکے زر کثیر حاصل کرتے تھے۔ غرضکہ طرح طرح سے لوگوں کو اس واہمہ پرستی کی طرف مایل کیا جاتا تھا اور جو کوئی اس کے خلاف آواز اُٹھاتا تھا تو اس کا سر کچل دیا جاتا تھا چنانچہ یہ یک وقت دو دو ہزار اشخاص کو زندہ جلا دیا گیا۔ حبس دوام کی سزاؤں اور شکنجے کی ایذاؤں کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا۔

لورنٹ جو انکوئزیشن کا مورخ تھا، لکھتا ہے کہ ٹار کوئی میڈا اور اس کے نشر کار نے اٹھارہ سال کی مدت میں دس ہزار دو سو بیس اشخاص کو زندہ جلایا۔ چھ ہزار آٹھ سو ساٹھ اشخاص کی مورتیں بنا کر جلائیں۔ اور ستانوے ہزار تین سو اکیس اشخاص کو مختلف سزائیں دیں۔ نیز چھ ہزار قیمتی و کار آمد کتابوں میں آگ لگا دی۔ اکثروں کو ملک بدر کر دیا۔ اور بہتوں کو جبراً عیسائی بنایا گیا جنھوں نے انکار کیا ان کو سزائے موت دی گئی۔ یہودیوں پر طرح طرح مظالم ڈھائے گئے۔ ان کو جلاوطن کیا گیا۔ بہت سے یہودی اٹلی، افریقہ، اور ٹرکی چلے گئے۔ اور اکثر بے یار و مددگار غربت کی وجہ سے ادھر اُدھر مارے مارے پھرنے لگے۔ غرضکہ نوع انسانی پر وہ وہ بلائیں نازل کی گئیں جن کا بیان کلیجوں کے ٹکڑے اُڑا دیتا ہے۔

حضرت مسیح کی ولادت سے چار سو سال قبل یونان علم و حکمت کی طرف مایل تھا۔ اور قدیم مذہب کے خیالات ان کے دلوں سے محو ہو رہے تھے۔ فلاسفہ نے جب ماہیت کائنات پر غور کیا تو قوانین فطرت کے مقابلہ میں اولمپس کے دیوتا انھیں حقیر و ذلیل نظر آنے لگے۔

قدیم روایات جو قرنہا قرن سے رائج چلی آتی تھیں اور جن کی صداقت خوش عقیدہ لوگوں کے لئے اصول موضوعہ کا حکم رکھتی تھی، عجیب و غریب تھیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ جزائر بحر روم عجائبات سے آباد ہیں۔ یعنی وہاں جادوگر جادوگرنیاں، دیو، بھوت، چڑیلیں، پردار سانپ، نصف انسان اور نصف گھوڑے کا دھڑ رکھنے والی بلائیں۔ اور یک چشم عفریت آباد ہیں۔ آسمان کی لاجوردی محراب کے متعلق عام خیال تھا کہ یہ بہشت کا صحن ہے۔ جس میں سب سے بڑا دیوتا جوپیٹر دوسرے دیوتاؤں اور ان کی بیویوں کے حلقے میں دربار کرتا ہے۔ اور آسمانی آبادی جذبات بہیمہ و اعمال سئیہ میں انسانوں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ جب یونانیوں کو جہاز رانی، جغرافی انکشافات اور ممالک غیر میں نئی آبادیاں قایم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور ان کے جہاز بحیرۂ اسود اور بحیرۂ روم نیز ان کے قرب و جوار کے سمندروں کا گشت کرنے لگے۔ تو انھیں معلوم ہوا کہ یہاں تو کوئی عجیب الخلقت چیز موجود نہیں ہے، اور جب زیادہ تجسس سے کام لیا گیا تو اولمپس کا سرے سے وجود ہی نہ ملا۔ مگر محکمۂ احتساب عقاید نے ان تشکیکین کے شبہات پر لامذہبیت کا فتویٰ لگایا۔ ان کا مال ضبط کر لیا، اور ان کو جلا وطن کر دیا۔ کیونکہ مذہبی گروہ کا یہ دعویٰ تھا کہ جن باتوں کو لوگ ہزارہا برس سے مانتے چلے آتے ہیں وہ غلط نہیں ہو سکتیں۔ لیکن جب مخالف شہادت اس قدر زبردست ہوگئی کہ جس کا جواب مذہبی لوگوں کے پاس نہ تھا تو ان کے خیالات میں بھی تزلزل پیدا ہونے لگا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان جس عقیدے کا پابند ہوتا ہے، تو اول اول اس کو حرمت کی نظر سے دیکھتا ہے، مگر اس کے بعد جب انسانی دماغ کچھ ترقی پذیر ہوتا ہے تو اس میں شبہات و شکوک پیدا ہونے لگتے ہیں اس کے بعد تاویل کا دور آتا ہے، اور پھر انکار کا۔ چنانچہ فلاسفہ و مورخین کے ساتھ ساتھ شعرا و انشاپردازوں کے خیالات بھی تبدیل ہونے لگے۔ یوریپیڈیز پر فاسد العقیدہ ہونے کا الزام لگایا گیا۔ یہ ڈرامہ نویس تھا اور ہر مضمون کا خاتمہ حسرت و یاس پر کیا کرتا تھا۔ یہ فلسفہ و طبیعیات میں کافی مہارت رکھتا تھا۔ اسے شاعری سے بھی کافی دلچسپی تھی اور یہ ارسطو کے زمرۂ احباب میں سمجھا جاتا تھا۔

اسقلس کفر بکنے کی پاداش میں سنگسار ہوتے ہوتے بچ گیا۔ یہ بھی ایک مشہور و معروف ڈرامانویس تھا یہ بعض جنگوں میں بھی شریک کیا گیا تھا، اور اغلباً اس کی شرکت اس لئے ضروری سمجھی جاتی تھی کہ اس کی طرز نگارش نہایت زود اثر تھی۔ الغرض اس عقلی ہلچل کے آثار ادب و انشاء کے ہر شعبے میں نظر آنے لگے۔ اور اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ محسوس کرنے لگے کہ انسانوں کے پاس حق و صداقت اور نیکی و بدی کا کوئی معیار نہیں۔ ایک بات

جو ایک ملک میں اچھی سمجھی جاتی ہے وہی بات دوسرے ملک میں بُری خیال کی جاتی ہے گویا اچھائی برائی محض اعتباری چیز ہے۔ اب یونان کی حالت بالکل بدل گئی، اور ان کی آزادخیالی پولیٹکل معاملات میں بھی حصہ لینے اور آئے دن کی خانہ جنگیوں سے یونان تباہ ہونے لگا۔ ایرانی رشوت کی قربان گاہ پر یونانی مقاصد کی قربانی کی جانے لگی۔ یونان کا جو حصہ یورپ میں واقع تھا اس نے تو ایران کا باجگزار بننے سے انکار کردیا لیکن ایشائی یونان اس کا حلقہ بگوش ہوگیا۔ ایران یوربین یونان کو ہمیشہ ذلت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ لیکن جب کبھی ایران نے یونان پر فوج کشی کی ہمیشہ شکست ہوئی۔ اس لئے کہ یونان کا یوربین حصہ نہایت جنگجو و بہادر تھا۔ اس لئے ہر چند ایران اپنی دولت کے ذریعہ سے ایشائی یونان کو گرویدہ کرچکا تھا، لیکن سکندر یونانی کی جرأت کا وہ حریف نہ ہوا یہاں تک کہ کل ایشیائے کوچک مع بے شمار خزانوں کے سکندر کے قبضہ میں آگیا اور اس طرح یونانیوں کی دماغی ترقی میں ایک اور اضافہ ہوگیا۔ انھوں نے بابل کی شہر پناہ کو دیکھا جس کا دور ساٹھ میل سے زیادہ تھا اور جو باوجود تین صدیاں گزر جانے کے ابھی تک قایم تھی۔ بعل بک کے سربفلک مندر کے کھنڈر دیکھے جو زبان حال سے پکار پکار کر اپنی گزشتہ شان و عظمت کا حال بیان کر رہے تھے۔ وہ رصد گاہ دیکھی جس میں کالدیہ کے اختر شمار ہیئت داں راتوں کو بیٹھ کر عالم بالا کی روشن و تابناک ہستیوں سے ہمکلام ہوا کرتے تھے معلق باغات کو دیکھا۔ اور ان کلوں کو دیکھا جن کے ذریعہ ان میں پانی پہونچایا جاتا تھا غرضکہ دنیائے ایشیا کے یہ عجائبات دیکھ کر یونانی سائنس کو بہت تقویت پہونچی، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اسکندر نے جو شہر اپنے نام سے بسایا وہ آگے چلکر علوم و فنون کا مرکز بن گیا اور علمی تحقیق کا سمندر موجیں مارنے لگا۔

ارشمیدس نے کرہ اور استوانہ کی ماہیت پر کتابیں لکھیں۔ زینو نے حقیقتِ مطلق کے ادراک کی تشکیک پر بہت کچھ لکھا۔ اقلیدس نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف سے، دنیا میں ہنگامہ بپا کردیا اس نے نہ صرف ریاضی کی شاخوں پر لکھا، بلکہ علم الاصوات، اور علمِ مناظر و سراپا پر بھی بعض رسائل لکھے۔ پانی پر تیرتی ہوئی اشیا کے توازن سے مرکز ثقل پر بحث کی۔ ایک آتشی شیشہ ایجاد کیا جس سے سایراکیوز کے محاصرے میں اس نے اہل روم کے جہازوں کا بیڑہ جلا دیا۔

ان تمام علمی ترقیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کے عقائد کافور ہونے لگے۔ اولمپس کی پراسرار چوٹیوں سے دیوتا غائب ہوگئے۔ ہیڈیز کے خوفناک نظاروں کا نقش پردۂ تصور سے محو ہونے لگا۔ ایشیائے کوچک کے سبز صحراؤں، سایہ دار نشیمنوں، اور بہتے ہوئے دریاؤں سے دیوتا اور دیویاں رخصت ہونے لگے۔ روایات الہامی کا اثر مٹ گیا۔ یوربین علم الاصنام کے افسانے۔ ایشیائی الہامات کی روایتیں، مصری کاہنوں کے قدیم عقائد ایک ایک کرکے مٹ گئے۔ اسوقت تک مذہب کے ذریعہ سے جو معلومات انسان کو حاصل ہوئیں یہ تھیں کہ خدا ایک

یک نہایت شاندار قوی الجثہ انسان کے مشابہ ہے۔ زمین مسطح ہے، جس پر آسمان ایک شاندار گنبد کی طرح ایم ہے، یا بقول سینٹ اگسٹائن جھلی کی طرح کھنچا ہوا ہے۔ آسمان پر چاند، سورج اور ستارے اس غرض سے نہرک ہیں کہ انسانوں کو شبانہ روز روشنی پہونچتی رہے۔ زمین اس مادہ سے جسے خدا نے عدم سے پیدا کیا، مع ن تمام حیوانات و نباتات کے جو اس پر آباد ہیں چھ دن میں تیار ہوئی۔ بہشت آسمان کے اوپر ہے۔ اور دوزخ زمین کے نیچے ہے۔ زمین مرکز کائنات ہے۔ اور باقی تمام اجسام فلکی وغیر فلکی اس کے تابع ہیں۔ انسان کو زمین کی خاک سے بنایا گیا ہے۔ اول اول وہ تنہا تھا، مگر بعد میں اس کی ایک پسلی سے عورت کو بنایا۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ مگر فردوس میں شجر ممنوعہ کھا کر اس نے خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ اس بنا پر اسے محنت و مشقت اور ... کی سزا دی۔ مگر آدم کی اولاد کو اس سے کچھ عبرت نہ ہوئی، اس لئے خدا نے مجبوراً اس کے تباہ کر دینے کا ارادہ ... اور پانی کے ایک طوفان عظیم کے ذریعہ سے جس میں پہاڑ تک غرق ہو گئے انسانوں کو ڈبو دیا۔ جب یہ طوفان ... کو غارت کر چکا تو ایک ہوا کے تند چلی جس سے پانی خشک ہو گیا۔ اس آفت سے حضرت نوح اور ان کے ... بیٹے حام سام اور یافث مع اپنی بیویوں کے کشتی میں سوار ہو کر بچ گئے۔ ان میں سے سام نے ایشیا کو ... کیا، حام نے افریقیہ کو اور یافث نے یورپ کو۔ چونکہ امریکہ کی حقیقت پادری صاحبان کے الہام ربانی میں کچھ ... اس لئے وہاں کے متعلق کچھ نہ کہہ سکے۔ ظاہر ہے کہ مشاہدات علمی کے مقابلہ میں ان روایات کو دنیا ... طرح تسلیم کر سکتی تھی، آخر کار مذہب کو علم کے سامنے شکست کھانا پڑی اور رفتہ رفتہ اسکی جگہ عقل نے لیلی۔

امام اکبر آبادی

انقلابی

مترجمہ نیاز فتحپوری

ماسٹر گبرائیل اینڈرسن اسکول کے باغ کے کنارہ تک گیا اور وہاں پہونچکر سوچنے لگا کہ اب اُسے کیا کرنا چاہئے۔ دور، فاصلہ پر، دو میل کے قریب، خالص برفیلے کھیت پر درختوں کی شاخیں اس طرح لٹک رہی تھیں جیسے کسی سفید چادر میں نیلی لیس ٹانک دی گئی ہو۔ دن بہت خوشگوار تھا۔ سفید زمین، اور باغ کے لوہے کے جنگلہ کی سلاخوں پر ہر جگہ رنگ ہی رنگ نظر آتا تھا۔ ہوا میں وہ ہلکا پن تھا جو صرف موسم بہار میں پایا جاتا ہے۔ اینڈرسن نے جنگل میں چہل قدمی کے لئے اپنے قدم اُس نیلی لیس کی طرف موڑ دئے۔

"میری زندگی میں دوسری بہار" ۔ اُس نے گہری سانس لیتے ہوئے اور اپنے چشمہ کے شیشوں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اینڈرسن کی طبیعت میں جذباتی شاعری پائی جاتی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ پشت پر کئے ہوئے اور چھڑی کو ہلاتے ہوئے چلا جا رہا تھا۔

وہ چند ہی قدم چلا ہوگا کہ اُسے باغ کے دوسری طرف سڑک پر سواروں کی ایک جماعت دکھائی پڑی۔ ان کی بھوری سیاہی مایل وردی سفید برف میں بالکل الگ نظر آ رہی تھی۔ اینڈرسن بہت متعجب تھا کہ یہ لوگ وہاں کیا کر رہے ہیں کہ یکایک ان کا مقصد اُس کی سمجھ میں آگیا۔ وہ کسی مکروہ کام کے لئے نکلے ہیں، یہ خیال کسی خاص بنا پر نہیں بلکہ ایک اندرونی تحریک سے اُس کے دل میں آیا۔ کوئی غیر معمولی اور اہم واقعہ ہونے والا ہے اور اسی تحریک نے اُسے مجبور کیا کہ وہ سپاہیوں سے پوشیدہ ہو جائے۔ وہ جلدی سے بائیں طرف گھوما، گھٹنوں کے بل جھکا اور برف پر رینگتا ہوا ایک گھاس کے گٹھے تک پہونچ گیا جس کے پیچھے سے وہ اپنی گردن اُٹھا اُٹھا کر یہ دیکھ سکتا تھا کہ سپاہی کیا کر رہے ہیں۔

سپاہی تعداد میں بارہ تھے۔ ان کا افسر ایک جوان آدمی تھا جو خاکی لبادہ پہنے ہوئے تھا اور کمر میں ایک ردیلی پیٹی لگی تھی۔ اُس کا منھ اتنا سرخ تھا کہ اینڈرسن نے دور سے اُس کی آگے نکلی ہوئی مونچھوں اور ابروؤں کی سفیدی مائل چمک کو اُس کے جلد کے رنگ کے مقابلہ میں دیکھ لیا۔ اُس کی بھاری آواز کا شکستہ لہجہ اُس جگہ صاف سنائی پڑ رہا تھا جہاں ماسٹر چھپا ہوا لیٹا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ میں کس کام کے لئے آیا ہوں۔ مجھے کسی کے مشورہ کی ضرورت نہیں ہے۔" افسر نے چلاکر کہا اُس نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر ادھر سپاہیوں میں کسی کی طرف دیکھا۔ "رہ تو سہی بتاؤں گا تجھے کہ باغی ہونے کا کیا مزہ ملتا ہے۔ سور کہیں کا!"

اینڈرسن کا دل اچھلنے لگا۔ "اللہ توبہ!" اس نے خیال کیا۔ "کیا یہ ممکن ہے؟" وہ اپنے سر میں سردی محسوس کرنے لگا، گویا ٹھنڈک کی ایک لہر آکر ٹکرا گئی ہو۔

"افسر صاحب!" ایک خاموش، تھمی ہوئی مگر صاف آواز سپاہیوں کے حلقہ سے آئی "آپ کو کوئی حق نہیں ہے ـــ عدالت یہ فیصلہ کر سکتی ہے ـــ آپ جج نہیں ہیں ـــ یہ صاف قتل ہے۔ نہ کہ ـــ"

"چپ!" افسر گرج کر بولا۔ اُس کی آواز غصہ کے مارے بیٹھی جا رہی تھی۔ "میں تمہارے لئے عدالت قایم کئے دیتا ہوں۔" "آؤ لو! آگے جاؤ۔"

اس نے اپنے گھوڑے کو مہمیز کیا اور آگے بڑھ گیا۔ اینڈرسن نے یہ بھی دیکھا کہ گھوڑا اپنے راستہ پر کیسی ہوشیاری سے چل رہا تھا اور اس کے قدم ایسی نزاکت سے اُٹھ رہے تھے گویا ناچ کے لئے اُٹھائے جاتے ہوں اور اُس کے کان ہر آواز سننے کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ سپاہیوں میں اُس وقت تھوڑی دیر کے لئے ایک ہاہی پیدا ہو گئی اور پھر وہ مختلف سمتوں میں منتشر ہوئے۔ ان کے پیچھے تین آدمی کالے کپڑے پہنے رہ گئے جن میں دو لانبے تھے اور ایک بہت پستہ قد اور دبلا۔ اینڈرسن چھوٹے قد والے آدمی کے سر کے بال دیکھ سکتا تھا۔ یہ بہت ہلکے تھے۔ انڈرسن نے اُس کے کان بھی دیکھ لئے۔

اب وہ اچھی طرح سمجھ گیا کہ کیا ہونے والا ہے۔ لیکن یہ بات اس قدر غیر معمولی اور خوفناک تھی کہ اُسے یہی خیال ہوا کہ وہ شاید خواب دیکھ رہا ہے۔

"کتنا صاف مطلع ہے! کتنا خوبصورت ـــ برف، کھیت، جنگل آسمان۔ ہر چیز پر بہار چھائی ہوئی ہے۔ مگر پھر بھی لوگ قتل ہونے والے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ناممکن!" اس کے خیالات پریشان ہوگئے اور وہ اپنے آپ کو ایسا محسوس کرنے لگا گویا یکایک اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

یہ تینوں آدمی جنگلے کے پاس ایک، دوسرے سے ملے ہوئے کھڑے تھے، دو تو بالکل ہی قریب تھے اور ایک کچھ دور تھا۔

"افسر!" ان میں سے ایک شخص ناامیدی کے لہجہ میں بولا۔ اینڈرسن یہ نہ دیکھ پایا کہ وہ کون تھا "خدا ہم سب کو دیکھ رہا ہے ـــ افسر!"

آٹھ سپاہی، اپنی تلواریں بھدے طریقہ سے پکڑے فوراً گھوڑوں سے اترے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت جلدی میں ہیں اور چوری سے کوئی کام کر رہے ہیں۔

کئی سکنڈ خاموشی میں گزر گئے جس کے بعد سپاہی، ان سیاہ پوشوں سے چند فٹ کے فاصلہ پر قطار باندھکر کھڑے ہو گئے اور ران کی طرف نشانہ باندھا۔ مگر اسوقت ایک سپاہی کی ٹوپی سر سے گر پڑی۔ اس نے اسے اٹھاکر برف صاف کی اور پھر اسے پہن لیا۔

افسر کا گھوڑا ابھی تک ایک جگہ ناچ رہا تھا۔ اس کے کان اسی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ دوسرے گھوڑے بھی جن کے تیز کان ہر آواز کو سننے کے لئے اٹھے ہوئے تھے، اپنی جگہ پر خاموش کھڑے انھیں سیاہ پوشوں کو دیکھ رہے تھے۔

"کم ازکم بچے کو تو چھوڑ دو" ایک دوسری آواز یکایک فضا میں گونجی۔ "سپاہی۔ بچہ کو کیوں مار رہا ہے۔ اس نے کیا قصور کیا ہے؟"

"آگ لو! جو کچھ میں نے تمھیں حکم دیا ہے وہ کرو" افسر نے اس طرح چلاکر کہا کہ دوسری آواز اسمیں گم ہو گئی، اس کا چہرہ سرخ فلالین کی طرح لال بھبوکا ہو گیا۔

اس کے بعد ایک ایسا منظر دکھائی پڑا جو اپنی شقاوت میں انتہائی وحشیانہ اور نفرت انگیز تھا، اپنہ قد۔ سیاہ پوش نے بچوں کی طرح ایک چیخ نکالی اور ایک طرف گر پڑا۔ مگر فوراً ہی دو یا تین سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا۔ لڑکا ہاتھ پاؤں مارنے لگا اور دوسرے سپاہی دوڑ پڑے۔

"اُو۔ اُو۔ اُو۔ اُوۓ لڑکا چیخنے لگا" مجھے جانے دو۔ مجھے جانے دو۔ او۔ او" اس کی چیخ ہوا میں اس طرح گونجنے لگی جیسے کسی ذبیحہ کی چیخ جو پوری طور سے ہلاک نہ کیا گیا ہو۔ یکایک وہ خاموش ہو گیا۔ یقیناً کسی شخص نے اس کا خاتمہ کر دیا ہوگا۔ ایک خلاف توقع اور ڈراؤنی خاموشی چھا گئی۔ لڑکا آگے کو ڈھکیلا جا رہا تھا۔ اس کے بعد ایک کان پھاڑ دینے والی آواز آئی۔ اینڈرسن کانپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے صاف طور سے۔ گو ایک خواب کی طرح ــــ دونوں آدمیوں کو زرد چنگاریوں کی چمک، اور ایک صاف، چمکیلی فضا میں گرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ سپاہی ان لاشوں کی طرف دیکھے بغیر جلدی سے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو رہے ہیں۔ اس نے ان کو کیچڑ سے بھری سڑک پر گھوڑے سرپٹ دوڑاتے دیکھا۔ ان کے ہتھیار بج رہے تھے اور ان کے گھوڑے کے سم سے کٹا کٹ کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔

اس نے یہ سب بیچ سڑک پر کھڑے ہوکر دیکھا۔ وہ یہ خود نہ سمجھ سکا کہ وہ گھاس کے گٹھے کے پیچھے سے کب اور کیوں کود کر باہر نکل آیا تھا۔ اس کا چہرہ پسینہ سے تر تھا اور اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ ایک عجیب قسم

کی جسمانی تکلیف اُس کو ستا رہی تھی۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اُس کی یہ حالت کیوں ہے۔ اُس کی حالت ایک سخت بیمار کی طرح تھی بلکہ اُس سے بھی زیادہ تکلیف دہ

جب سپاہی جنگل میں غائب ہو گئے تو گولی چلنے کی جگہ پر لوگ جلدی جلدی پہونچنے لگے اگرچہ گولی چلنے تک ایک آدمی بھی نہیں دکھائی پڑا تھا۔

لاشیں، جنگلے کے دوسری طرف سڑک پر پڑی ہوئی تھیں۔ برف بھُربھُری تھی اور صاف فضا میں چمک رہی تھی۔ یہ لاشیں تین انسانوں کی تھیں۔ دو آدمیوں کی اور ایک بچہ کی۔ لڑکے کی لانبی نرم گردن برف پر پڑی ہوئی تھی۔ لڑکے کے قریب جو آدمی تھا اُس کا چہرہ چھپا ہوا تھا وہ اوندھے منھ خون کے ایک تالاب میں پڑا ہوا تھا۔ مقتول اچھے قد و قامت کا آدمی تھا اُس کی داڑھی سیاہ اور بازو مردانہ تھے وہ لمبا لمبا پڑا ہوا تھا اور اُس کے ہاتھ خون آلود برف پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس تیلی سڑک کے کنارہ جہاں آدمیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی ان کے اس طرح خاموش پڑے رہنے میں جو خوف معلوم ہوتا تھا اُس کو کوئی بیان نہیں کر سکتا!

اُس رات کو اینڈرسن نے اپنے اسکول کے کمرے میں حسبِ معمول اشعار نہیں کہے۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑا کہر آلود نیلے آسمان پر اپنے سے دور چاند کے زرد ہالہ کی طرف دیکھتا اور سوچتا رہا۔ اُس کے خیالات منتشر ڈراؤنے اور ایسے خوفناک ہو گئے تھے کہ اُس کا سر چکر کھا رہا تھا۔ وہ ایسا محسوس کر رہا تھا گویا وہ اب بھی انھیں تینوں آدمیوں کو جن کو گولی ماردی گئی تھی۔ دیکھ رہا ہے۔ جو کھیت میں پڑے ہوئے ٹھنڈے ٹھنڈے چاند کو اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

"کبھی وہ زمانہ آئے گا" اُس نے خیال کیا "جب دوسروں کے ہاتھوں سے لوگوں کا قتل بالکل ناممکن چیز ہو جائے گا۔ وقت آئیگا جب ان سپاہیوں اور افسروں کو جنھوں نے ان تینوں آدمیوں کو مارا ہے پتہ چل جائے گا کہ انھوں نے کیا کیا ہے اور انھیں معلوم ہو جائے گا کہ جس چیز کے لئے انھوں نے ان کو قتل کیا ہے وہ ان کے لئے بھی ایسی ہی ضروری، اہم اور عزیز ہے جتنی ان کے لئے جنھیں انھوں نے مار ڈالا ہے۔

"ہاں" اس نے زور سے اور سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ اس کی آنکھیں پُر آب تھیں، "وہ وقت آئیگا"۔ چاند کا زرد ہالہ اُس کی آنکھوں کی رطوبت کی وجہ سے داغدار معلوم ہونے لگا۔

ان تینوں مظلوموں کے لئے اُس کا دل رنج سے بھر آیا۔ اُس کے دل میں غصہ کی ایک لہر موجزن ہو گئی۔ مگر پھر اُس نے اپنے دل پر قابو حاصل کیا اور آہستہ سے کہا:-

"وہ جو کچھ کر رہے ہیں جانتے ہیں"۔ اس پرانے فقرہ نے اُسے اپنے غصہ پر قابو رکھنے کی قدرت دیدی۔

(۲)

مطلع اُسی طرح صاف اور خوشگوار تھا مگر بہار کے دن زیادہ گزر چکے تھے۔ بھیگی ہوئی زمین سے بہار کی خوشبو آرہی تھی۔ برف کے نیچے سے صاف اور ٹھنڈا پانی ہر جگہ بہتا تھا۔ درختوں کی شاخیں بہار کا نقشہ پیش کر رہی تھیں اور لچکدار ہوگئی تھیں۔ میلوں تک زمین کے صاف اور نیلگوں قطعات پھیلتے چلے گئے تھے لیکن گاؤں میں بہار کی صفائی اور خوشی نہ تھی۔ یہ چیزیں گاؤں کے باہر جہاں کوئی بھی نہ رہتا تھا پائی جاتی تھیں — یعنی کھیتوں۔ جنگلوں اور کہساروں میں۔ گاؤں میں ہوا۔ دم بند، بھاری اور ڈراؤنی تھی جیسے کسی خواب میں ہو۔

اینڈرسن سڑک پر ایک پریشان دماغ لوگوں کے مجمع کے قریب کھڑا ہوا تھا اور سات کاشتکاروں کو گولی مارنے کیلئے جو انتظامات کئے جا رہے تھے ان کو گردن آگے بڑھا بڑھا کر دیکھ رہا تھا۔

وہ برف میں کھڑے ہوئے تھے۔ اینڈرسن کو معلوم ہوگیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو وہ عرصہ سے جانتا اور سمجھتا ہے۔ اس خوفناک اور شرمناک چیز کی بدولت جو ان پر گزرنے والی تھی، وہ لوگ تمام دنیا سے جدا کردئے گئے تھے اور اسی لئے وہ اس چیز کا احساس نہیں کرسکتے تھے جس کا اینڈرسن کرتا تھا اور اسی طرح اینڈرسن وہ چیز نہیں سمجھ سکتا تھا جو ان کے دلوں میں تھی۔ ان کے چاروں طرف سپاہی بڑے بڑے گھوڑوں پر نہایت خوبصورتی سے کھڑے ہوئے تھے۔ یہ گھوڑے اپنے سر ہلا رہے تھے۔ اپنے چہرے ادھر اُدھر گھماتے تھے اور اینڈرسن کو نظر حقارت سے دیکھ رہے تھے کہ وہ عنقریب اس ظلم و ستم کو دیکھیگا مگر کچھ نہ کرسکیگا اینڈرسن کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا اور اس کے آتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ گویا ندامت اور شرمساری نے برف کے دو ٹکڑوں میں اُسے دبوچ لیا ہے۔

سپاہیوں نے ایک کاشتکار کو پکڑا۔ اینڈرسن نے اُس کی مترحم نظریں دیکھیں۔ اُس کے لب سے کوئی لفظ نہیں سنائی دیا اور اُس کی آنکھیں ادھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ ان میں اس قسم کی چمک پائی جاتی تھی، جیسی پاگل کی آنکھ میں ہوتی ہے اور یہ صاف ظاہر تھا کہ اُس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔

اس کے چہرہ سے فراست اور پاگل پن دونوں اس قدر عیاں تھے کہ جب سپاہیوں نے اُسے برف پر اُلٹا لٹا دیا اور بجائے ان آتشیں آنکھوں کے اُس نے اس کی ننگی پیٹھ چمکتی ہوئی دیکھی (جو ایک نہایت خوفناک اور شرمناک منظر تھا) تب جاکر کہیں اُسے اطمینان ہوا۔

ایک سپاہی جس کا چہرہ سرخ اور بڑا سا تھا اور جو ایک سرخ ٹوپی پہنے ہوئے تھا اُس کی طرف بڑھا اور اُس کے بدن کی طرف بہت خوش خوش دیکھنے کے بعد پکار کر صاف آواز میں کہا!

"اچھا۔ خدا کی مہربانی سے اُسے جانے دو۔"

انڈرسن کو ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا وہ نہ سپاہی کو دیکھ رہا ہے، نہ گھوڑے کو اور نہ مجمع کو۔ اُسے نہ سردی معلوم ہو رہی تھی، نہ خوف اور نہ شرم، نہ وہ فضا میں کوڑے کی آواز سُن سکا اور نہ درد و رنج کی تکلیف وہ کراہ۔ اُس نے صرف ایک آدمی کی ننگی پیٹھ کو پھولتے اور اُس پر کوڑوں کے سفید اور زرد نشان دیکھے۔ رفتہ رفتہ اس ننگی پیٹھ کی صورت بدل گئی خون جسم سے اُچھل رہا تھا اور سفید برف کو رنگیں بنا رہا تھا۔

انڈرسن کی روح خوف سے کانپنے لگی، اُس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ جب اُس نے انکھیں پھر کھولا تو دیکھا کہ چار اور سپاہی جو سرخ لباس میں ملبوس ہیں ایک دوسرے آدمی کو برف پر پٹک رہے ہیں اس کے بعد انھوں نے پھر اُسی بے شرمی، بدتمیزی اور بہیمیت سے اُس کی پیٹھ کو عریاں کیا۔۔۔۔۔ کس قدر پُر درد نظارہ تھا!

اس کے بعد تیسرے کی باری آئی، پھر چوتھے کی اور یوں ہی ساتوں کی۔

اینڈرسن بھیگے ہوئے برف پر یوں ہی کانپتا، تھرتھراتا اور اپنی گردن بلند کرتا کھڑا رہا اور اس تمام اثنا میں ایک لفظ بھی نہ بولا۔ اُس کے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ نکل رہا تھا۔ وہ اسوقت شرم سے کٹا جا رہا تھا۔ اُسکے لئے یہ چیز نہایت شرمناک تھی کہ وہ اس ڈر سے سامنے نہیں آیا کہ کہیں وہ لوگ اُسے بھی نہ پکڑ لیں اور برف پر لٹا کر اُسے ننگا کردیں۔

سپاہی بڑھتے گئے، گھوڑے اپنا سر اِدھر اُدھر جھٹکتے رہے، کوڑے کی آواز فضا میں اسی طرح گونجتی رہی اور عریاں انسانی گوشت ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا رہا، اُس کا خون بہایا اور اُس کا بدن سانپ کی طرح اینٹھایا جاتا رہا۔

اینڈرسن نے پھر پانچ آدمیوں کے چہرے ٹاؤن ہال کے زینوں پر دیکھے۔ یہ چہرے ان آدمیوں کے تھے جن کو اُس شرمناک حالت سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اُس نے جلدی سے اپنی نظریں پھیر لیں، یہ دیکھنے کے بعد ایک آدمی کو مرجانا چاہئے، اُس نے خیال کیا۔

(۳)

وہ لوگ سترہ تھے۔ ۱۵ سپاہی، ایک نائب اور ایک بے ریش افسر۔ یہ افسر آگ کے سامنے لیٹا ہوا ماؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سپاہی ہتھیاروں کو ٹھیک کر رہے تھے۔

یہ لوگ سیاہ پگھلنے والی زمین پر خاموشی سے اِدھر اُدھر آجا رہے تھے اور کبھی کبھی دہکتی ہوئی آگ میں سے جو لٹھے نکلے ہوئے تھے ان سے لڑجاتے تھے۔

اینڈرسن اپنا اوورکوٹ پہنے اور اپنی چھتری اپنی پشت پر لئے اُن کے قریب آیا ماتحت، (ایک موٹا تازہ مونچھوں دار آدمی) اُٹھ بیٹھا اور آگ کی طرف سے اپنا منہ ہٹا کر اُس کی طرف دیکھنے لگا!

"تم کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟" اُس نے بڑی جلدی جلدی دریافت کیا۔ اُس کے لہجے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس ضلع میں جہاں وہ ہلاکت، تباہی، اور بربادی پھیلاتے جاتے ہیں، سپاہی ہر ایک سے خوف کھاتے ہیں۔

"افسر!" اُس نے کہا۔ "یہاں ایک آدمی ہے جسے میں نہیں جانتا۔"

افسر نے اینڈرسن کی طرف بغیر کچھ بات کئے دیکھا۔

"افسر صاحب!" ایک باریک آواز میں کہا "میرا نام نکلسن ہے۔ میں یہاں کا تاجر ہوں اور تجارت ہی کے سلسلہ میں جا رہا ہوں۔ مجھے یہ خوف تھا کہ شاید مجھے کوئی اور نہ سمجھ لیا جائے۔ سمجھے آپ!"

"تو تم یہاں کیا بکواس لگائے ہوئے ہو؟" افسر نے غصہ ہوکر کہا اور منہ پھیر لیا۔

"ہوں۔ تاجر ہیں!" ایک سپاہی نے نہایت حقارت سے کہا۔ "اُس کی تلاشی لینا چاہئے، اس تاجر کی جو آدھی رات کو اِدھر اُدھر پھرتا رہے۔ اُسے شاید اس کی ضرورت ہے کہ اُس کے جبڑے پر ایک مُکا دیا جائے۔"

"یہ مشکوک آدمی ہے، افسر!" نائب نے کہا۔ "آپ کی کیا رائے ہے، ہم اسے گرفتار کرلیں۔ جی؟"

"نہیں۔" افسر نے سستی سے جواب دیا۔ "میں ان لوگوں سے عاجز آگیا ہوں۔ مار دو گولی۔"

اینڈرسن، بغیر کچھ اور کہے وہیں کھڑا رہا۔ اُس کی آنکھیں اندھیرے میں آگ کے پاس عجیب طرح سے چمک رہی تھیں۔ اور اس پستہ قد، صاف اور مضبوط جسم والے انسان کو رات کے وقت سپاہیوں میں اپنا اوورکوٹ اور بید لئے اور آگ کی روشنی میں اُس کی عینک کے شیشے چمکتے ہوئے دیکھنا عجیب منظر تھا۔

سپاہیوں نے اُسے یونہیں رہنے دیا اور آگے بڑھ گئے۔ اینڈرسن تھوڑی دیر وہیں کھڑا رہا اُسکے وہاں سے ہٹ آیا اور جلدی سے اندھیرے میں غائب ہوگیا۔

رات ختم ہو رہی تھی۔ ہوا سرد ہونے لگی تھی اور جھاڑیوں کی نوکیں زیادہ صاف دکھائی دے رہی تھیں اینڈرسن پھر فوجی چوکی گیا۔ لیکن اس مرتبہ وہ چھپ گیا اور جھاڑیوں میں ہوتے ہوئے جھکے جھکے آگے

جانے لگا۔ اس کے پیچھے آہستہ آہستہ اور خاموشی سے جھاڑیوں کو چھانتے اور سایہ کی طرح خاموشی سے چلے آرہے تھے۔ گرائیل کے قریب اُسکی داہنے طرف ایک طویل آدمی اپنے ہاتھ میں ریوالور لئے ٹہل رہا تھا۔ پہاڑی پر سپاہی کی ایک شکل عجیب طرح سے کھڑی دکھائی پڑی اور بالکل غیر متوقع طور پر وہ سپاہی اُس جگہ نہ تھا جہاں وہ اُسے دیکھ رہے تھے۔ بجھتی ہوئی آگ کی روشنی میں اس کی شکل دھندلی دھندلی دکھائی پڑتی تھی۔ اینڈرسن سپاہی کو پہچان گیا۔ یہ وہی تھا جس نے یہ تجویز کی تھی کہ اس کی باقاعدہ تلاشی لی جائے اُسے دیکھ کر اینڈرسن کے دل میں کوئی تلاطم نہیں برپا ہوا۔ اس کا چہرہ ایک سوتے ہوئے آدمی کی طرح سرد اور بے حرکت تھا۔ آگ کے چاروں طرف بجز نائب کے جو اپنے گھٹنوں پر سر جھکائے بیٹھا تھا اور تمام سپاہی سو رہے تھے۔

اینڈرسن کے داہنے پر جو لانبا دبلا سا آدمی تھا اُس نے ریوالور اُٹھایا اور لبلبی دبا دی۔ ایک عارضی اندھا بنا دینے والا شعلہ۔ ایک زوردار کان کے پردہ پھاڑ دینے والی آواز!

اینڈرسن نے دیکھا کہ گارڈ نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور پھر زمین پر اپنا پیٹ پکڑ کے بیٹھ گیا۔ چاروں طرف سے چنگاریاں چمکیں اور ایک زبردست دھماکا پیدا ہوا نائب کھڑا ہو گیا اور آگ میں گر پڑا۔

بھورے سپاہی بھوت کی طرح ہر طرف دوڑنے لگے، اپنے ہاتھ پٹکنے لگے اور سیاہ زمین پر گر کر لوٹنے لگے۔ نوجوان افسر اینڈرسن کے پاس دوڑا۔ وہ اپنے ہاتھ ایک اجنبی اور خوفزدہ چڑیا کی طرح ہلا رہا تھا۔ ینڈرسن نے اپنا بید اُٹھایا اور اپنی پوری قوت سے اس نے افسر کے سر پر مارنا شروع کیا۔ ہر ضرب پر "پھٹ" سے آواز ہوتی تھی۔ افسر دوسرے وار کے بعد چکر کھا کر گھوما اور جھاڑی سے ٹکرا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا جیسے بچے کرتے ہیں۔ کوئی اس طرف دوڑا اور گولی چلادی جو ایسا معلوم ہوا گویا اینڈرسن کے ہاتھوں سے چلی ہے۔ افسر لڑکھڑایا اور زمین پر سر کے بل گر پڑا۔ اسکے پاؤں کچھ دیر تک جھٹکا کھاتے رہے اور پھر وہ خاموش ہو گیا۔

گولیاں چلنی بند ہو گئیں۔ کالے آدمی جن کے چہرے سفید تھے سپاہیوں کی مردہ لاشوں کے درمیان چل رہے تھے اور کارتوس وغیرہ لے رہے تھے۔ اینڈرسن یہ سب ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا جب سب ختم ہو گیا ذرہ اوپر گیا، نائب کے پیر پکڑے اور کوشش کی کہ جسم کو آگ سے نکال لے مگر وہ اس کے لئے بہت بھاری تھا چنانچہ اسے اُس نے وہیں چھوڑ دیا۔

(۴)

اینڈرسن، ٹاؤن ہال کے زینہ پر خاموشی سے بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔ اُس نے خیال کیا کہ اس نے

بہت بری بات کی، مگر پھر بھی اُس کے دل میں نہ رحم تھا، نہ شرم اور نہ افسوس۔ اگر اُسے آزاد کر دیا جائے تو وہ سمجھتا تھا کہ وہ پھر وہی کرے گا۔ اس نے کوشش کی کہ اپنا معائنہ کرے، اور دیکھے کہ اُس کی روح کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ مگر اس کے خیالات بہت منتشر تھے۔ بعض وجوہ کی بناء پر اُس کے لئے ان تینوں آدمیوں کے متعلق سوچنا جو برف پر پڑے ہوئے اپنی مردہ اور بے نور آنکھوں سے دور دراز چاند کے زرد ہالہ کو دیکھ رہے تھے اُس مردہ افسر کے متعلق سوچنے سے زیادہ تکلیف دہ تھا جس کے سر پر اس نے دو بھدے وار کئے تھے۔ اپنی موت کا وہ خیال نہیں کر رہا تھا اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اسنے ہر چیز کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اُسے بہت عرصہ ہو گیا ہے۔ کوئی شے مر گئی ہے، چلی گئی ہے اور اُسے خالی چھوڑ گئی ہے اور اسے اس کی نسبت خیال ہی نہ کرنا چاہیئے۔

پھر جب وہ اُسے گھسیٹ کر لیجانے لگے تو وہ کھڑا ہو گیا لوگ جلدی سے اُسے باغ سے لیجانے لگے جہاں کے لئے اپنے خشک سر اُٹھائے ہوئے تھے تو اس کے دل میں ایک خیال بھی نہ آیا۔

اُسے سڑک پر لیجایا گیا اور جنگلہ کے پاس ایک سلاخ سے پشت لگا کر کھڑا کر دیا گیا اُس نے اپنی عینک لگا لی ہاتھ پیچھے کر لئے اور کھڑا ہو گیا۔ اس کا سر تھوڑا سا ایک طرف جھکا ہوا تھا۔ آخری لمحہ میں اس نے اپنے سامنے نظر کی اور دیکھا کہ رائفلوں کی نالیاں اس کے سر، سینہ اور پیٹ کی طرف ہیں، اس کے بعد اُس نے یہ بھی صاف صاف دیکھا کہ ایک رائفل جو اس کی پیشانی کے مقابلہ میں تھی یکایک جھک گئی۔

اینڈرسن کے دماغ میں ایک پُر اسرار خیال جو دنیاوی نہ تھا یکایک آیا۔ اُس نے اپنے چھوٹے قد کو پوری طرح سے تان دیا اور فخر کے ساتھ اپنا سر سیدھا کر دیا۔ طاقت اور فخر کا ایک پر اسرار خیال اس کی روح میں موجزن ہو گیا اور اُس کے نزدیک ہر چیز — سورج، آسمان، زمین، انسان اور موت — معمولی، رازکار اور بیکار نظر آنے لگی — گولیاں اُس کے سینہ، اُس کی بائیں آنکھ، اُس کے پیٹ اور صاف کوٹ پر پڑیں، اُس کی عینک ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اُس کے منہ سے ایک چیخ نکلی، اُس نے ایک مرتبہ چکر کھایا اور گر پڑا۔ اُس کی ایک آنکھ اب بھی بالکل کھلی ہوئی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے زمین کو پکڑنے لگا جیسے وہ کسی چیز کا سہارا لے رہا ہو— افسر اُس کی طرف دوڑا اور اُس کی گردن پر ریوالور رکھ کر دو فائر اور کئے۔۔

اینڈرسن زمین پر لمبا لمبا لیٹ گیا۔

سپاہی اُسے چھوڑ کر جلدی سے چلے گئے مگر اینڈرسن زمین پر پڑا رہا۔ اُس کے بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی دس سکنڈ تک تڑپتی رہی۔

(ماٹھکیل - پی - آرٹزبشو)

بنارس کی بیوہ

(فسانہ)

تجرد کی زندگی پُرامن ہو تو ہو، لیکن پُرکیف کبھی نہیں ہوتی۔ ابتدا میں بیوی بچوں کا جنجال بُرا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں یہی چیزیں سرمایۂ نشاط بن جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ازدواجی زندگی میں قدم رکھتے ہی انسان اپنے آپ کو ہر سمت سے گھرا ہوا پاتا ہے۔ اُس کی آزادیاں اُس سے چھین لیجاتی ہیں اُسکے مصارف بڑھ جاتے ہیں۔ اُس کی پریشانیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ یہ تمام تکلیفیں اپنے اندر ایک خاص لذت بھی رکھتی ہیں اور سچ پوچھئے تو زندگی نام ہی "کشمکش حیات" کا ہے اگر یہ نہ ہو تو زندگی، زندگی نہیں، موت ہے۔ تجرد کی زندگی بسر کرنے والے دوسروں کی نظر میں خواہ کتنے ہی مسرور و شادماں نظر آتے ہوں لیکن خود انھیں سے پوچھئے کہ اُن کی زندگی کتنی بے کیف بسر ہوتی ہے۔ شروع میں تجرد کی زندگی گزارنے والوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو کم، لیکن بعد میں اُنکی زندگی ایسی تلخ ہو جاتی ہے کہ وہ زندگی کے نام ہی سے گھبرانے لگتے ہیں۔ جمود و تعطل کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ امن و سکون جس کے حصول کے لئے خدا معلوم کتنی روحیں بے چین و مضطرب ہیں کیا اُن کا کوئی مفہوم بھی ہے؟ آفتاب کا طلوع و غروب کتنا پُرکیف ہوتا ہے۔ شب ماہ کی خنک راتیں کس قدر نشاط انگیز ہوتی ہیں۔ چڑیوں کا ترنم کس طرح روح کی گہرائیوں کو متاثر کرتا ہے۔ دریا کی روانی کیسی حیات پرور ہوتی ہے۔ لیکن فطرت کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ یہی چیزیں اگر دوامی شکل اختیار کر لیں اور ان میں کوئی تغیر و تبدل نہ ہو، تو پھر ان میں کوئی کشش باقی نہ رہے۔ یہی حال انسانی زندگی کا ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ آزاد رہے۔ اُسے امن و سکون کی دنیا میسر آئے۔ دنیاوی کلفتوں سے اُسے دوچار نہ ہونا پڑے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض افراد تجرد کی زندگی کو ازدواجی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن بہت جلد انھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن کا فیصلہ قوانین قدرت کے خلاف ہے۔ اور جس موہوم شئے کی اُنھیں تلاش و جستجو ہے، وہ چیز اُن سے بہت دور ہے۔

یہی چیز تھی جس نے بالآخر سرت چندر کو ازدواجی زندگی میں آنے کے لئے مجبور کیا۔ تعلیمی مشاغل کے

دوران ہی میں اُنھوں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ تجرد کی زندگی گزاریں گے۔ اب اُنھیں ریلوے میں ملازمت بھی مل گئی تھی۔ تنخواہ معقول تھی۔ پورے اطمینان اور کافی لطف کے ساتھ زندگی بسر ہورہی تھی۔ تنخواہ معقول تھی۔ پورے اطمینان اور کافی لطف کے ساتھ زندگی بسر ہو رہی تھی۔ ایسا شخص سوسائٹی میں بھی مقبول ہوتا ہے۔ دوستوں کی کمی نہ تھی۔ شام ہوئی۔ یہ دفتر سے لوٹے اور دوستوں کی آمد شروع ہوئی۔ دس، ساڑھے دس بجے تک ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر سب اپنے اپنے گھر واپس ہوئے کیسا اطمینان کتنی فارغ البالی اور کس قدر امن وسکون کی زندگی تھی۔ پورے دس سال اسی طرح گزر گئے لیکن اب سرت چندر کے لئے اس زندگی میں کوئی لطف نہ تھا۔ وہی صبح، وہی شام، وہی دفتر، وہی دوستوں کا جمگھٹا، وہی بے سروپا باتیں، وہی بزم نشاط، وہی کیف وسرور۔ اُن کی زندگی تلخ تھی۔ دوستوں سے انھیں کلفت ہونے لگی۔ لوگ انھیں بد اخلاق کہنے لگے۔ لیکن سرت چندر کی زندگی اب انقلابی صورت اختیار کر رہی تھی۔ فطرت سے جنگ اب اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ اُن کا "آخری اور قطعی فیصلہ" اب متزلزل ہوچکا تھا۔ اُنھیں اب اچھی طرح احساس ہوگیا تھا کہ زندگی اُس وقت تک زندگی نہیں ہے جب تک انسان ازدواجی زندگی میں قدم نہ رکھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ملازمت میں آنے کے کامل دس سال کے بعد اُنھوں نے بنگال کے ایک غیر معروف گاؤں میں اپنی شادی کرلی۔

(۲)

مالتی شکل وصورت کے لحاظ سے کوئی خوبصورت لڑکی تو نہ تھی۔ لیکن اُسے بدصورت بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ اُس کی عمر اُس وقت سولہ سال کی تھی۔ اُس کا رنگ سانولا نہیں بلکہ سیاہی مایل تھا۔ لیکن اُس کے چہرہ میں ایک کشش تھی، بلا کی کشش۔ وہ ایک پیکر معصوم تھی۔ دنیا کی آلودگیوں سے یکسر بے خبر، اُس کے ذہن میں گناہ ومعصیت کا کوئی تخیل بھی نہ تھا۔ یہ اثر تھا دیہات کی سادہ معاشرت کا۔ وہ صرف یہ جانتی تھی کہ اپنے شوہر کو خوش رکھے۔ اُس کی مرضی کو اپنی مرضی پر مقدم سمجھے۔ سرت چندر کو اب معلوم ہوا کہ مالتی کی ایک محبت بھری نظر اُس کی گزشتہ زندگی کی تمام مسرتوں سے کہیں زیادہ پر کیف ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ ایک تلخ حقیقت بھی تھی وہ یہ کہ کامل دس سال کی مجرد زندگی نے سرت چندر کو بعض ایسی باتوں کا بھی عادی بنا دیا تھا کہ جن کا ترک کرنا اب محال نظر آتا تھا۔ اور یہ اُن کی زندگی کا ایک بہت ہی پردرد افسانہ تھا۔ مالتی بھی اسے دیکھتی لیکن وہ غریب اس معاملہ میں بالکل بے بس تھی۔ سرت چندر کی تنخواہ کا ایک تہائی حصہ تو ضرور ہر ماہ کلب کمپنی کے نذر ہو جایا کرتا تھا۔ وہ خود بھی اپنی اس کمزوری کو محسوس کرتے تھے اُنھیں اس کا بھی پورا احساس تھا کہ مالتی اُن کی اِس روش کو پسند نہیں کرتی۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ

مالتی کو خوش رکھیں اور اُس کے جذبات کو پامال نہ ہونے دیں۔ لیکن شام کو جب تھکے ماندے وہ دفتر سے واپس ہوتے تو دن کا یہ تمام قول و قرار آیندہ کل کے لئے ملتوی ہو جاتا۔

(۳)

داناپور اسٹیشن کے بالکل ہی قریب سرت چندر نے ایک کرایہ کا مکان لے لیا تھا۔ مکان چھوٹا تھا لیکن پختہ اور صاف۔ کل دو آدمی تھے۔ ایک سرت چندر دوسرے مالتی۔ یہ بڑی دقت تھی۔ سرت چندر باہر کے آدمی، تمام دن اُنھیں اپنے "مال گودام" سے کہاں فرصت تھی۔ مالتی کی تنہائی کا خیال رکھتے ہوئے اُنھوں نے ایک بوڑھی ملازمہ کی خدمت حاصل کر لی تھی جسے ایک روپیہ زاید وہ صرف اس بات کے لئے دیتے تھے کہ وہ تمام دن گھر میں موجود رہے۔ مالتی کے لئے سوائے "بھجوا کی مائی" کے (وہ اسی نام سے پکاری جاتی تھی) کوئی دوسرا رفیق نہ تھا۔ "بھجوا کی مائی" بنگلہ زبان سے قطعی ناواقف تھی اور مالتی کو ہندوستانی زبان میں گفتگو کرنے کی بہت ہی کم مہارت تھی۔ اس لئے مالتی کیلئے بھجوا کی مائی کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر تھا۔ مالتی کے لئے تمام دن کی تنہائی ناقابل برداشت تھی۔

(۴)

جاڑے کا دن اور سہ پہر کا وقت تھا۔ کوئی تین بجے ہوں گے۔ مالتی کمرہ میں بیٹھی بیٹھی اُکتا گئی تھی۔ وہ سائبان میں آئی، بھجوا کی مائی اپنی عادت کے بموجب کمبل میں لپٹی خراٹے لے رہی تھی۔ مالتی نے آپ ہی آپ کہا:-

"اس کے سونے کی بھی کوئی حد ہے، خدا معلوم اس کی نیند کو کیا ہو گیا ہے۔"

اتنے میں باہر سے کسی نے آواز دی ــ "بابو جی ..... اے جی بابو جی"

مالتی لپک کر دروازہ کے قریب گئی۔ ایک نووارد عورت دروازہ پر کھڑی تھی جس کا سامان قلی لئے تھا اور قلی آواز دے رہا تھا۔

مالتی دوڑ کر سائبان میں آئی اور اُس نے بھجوا کی مائی کو زور زور سے پکارنا شروع کیا۔ آخر کار وہ اُٹھی باہر گئی اور نووارد کو لئے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

نووارد ادھیڑ عمر کی ایک بنگالی عورت تھی۔ اور ملبوس سے یہ بات ظاہر تھی کہ وہ بیوہ ہے۔

اُس نے مالتی کو غور سے دیکھا۔ مالتی نے خیال کیا کہ شاید وہ اُسکے شوہر کی کوئی عزیز ہو۔ لیکن پھر کسی کے آنے کی پہلے سے کوئی اطلاع تو نہ تھی۔ مالتی سوچتی رہی اور اس بات کا بھی فیصلہ نہ کر سکی کہ وہ اُسے پرنام کرے یا نہ کرے۔

"یہ سرت بابو کا مکان ہے؟" نووارد نے دریافت کیا۔

"ہاں"

"تم اُن کی بیوی ہو ؟"

مالتی نے اثبات میں گردن ہلائی اور اُس سے پوچھا۔ "آپ کہاں سے آرہی ہیں ؟"

"میں بنارس سے آرہی ہوں" نووارد عورت نے کہا "میں اپنے وطن جارہی تھی۔ لیکن میرا ٹکٹ کہیں گم ہوگیا۔ اور ریلوے کے ملازموں نے مجھے یہیں اُتار دیا۔ اب مجھے یہاں سے دوسرا ٹکٹ خریدنا ہوگا۔ اُس گاڑی سے میں جا نہیں سکتی تھی اور دوسری گاڑی شب کو ساڑھے بارہ بجے جاتی ہے۔ اتنی دیر میں کیا کرتی۔ میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہاں نزدیک ہی ایک بنگالی خاندان ہے اور میں وقت گزارنے کے لئے یہاں چلی آئی۔ میرا آنا تمھارے لئے کوئی تکلیف کا باعث تو نہیں ہے ؟"

"بالکل نہیں" مالتی نے خندہ پیشانی کے ساتھ جواب دیا۔ "مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ یہاں تشریف لائیں۔ بیٹھئے"

مالتی کے اشارہ پر بھجو اکی مائی نے زمین پر دری بچھا دی۔ مالتی نے بھجو اکی مائی کو فوراً ایک روپیہ دیا اور کہا کہ جلد بازار سے جاکر ناشتہ کی چیزیں لے آئے۔

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے" نووارد عورت نے کہا "میرے پاس ٹوکری میں پھل موجود ہیں لیکن اگر تمھیں زحمت نہ ہو تو مجھے تھوڑا چاول کھلا دو۔ میں نے کل شام سے چاول نہیں کھایا ہے"

"ٹھیک ٹھیک۔ میں تو بالکل ہی بھول گئی" مالتی نے لجاجت کے ساتھ کہا۔ "وائی فوراً آگ جلاؤ جلدی کرو"

ملازمہ نے مالتی کو روپیہ ~~واپس دیا اور~~ باورچی خانہ میں جاکر اپنے کام میں مصروف ہوگئی"

نووارد اور مالتی دونوں دری پر بیٹھکر باتیں کرنے لگیں۔

"تمھارا نام کیا ہے بیٹی ؟" نووارد نے پوچھا

"مالتی"

"تمھاری دادھیال کہاں ہے ؟"

"اُتر پارا"

"تمھارے ماں باپ زندہ ہیں ؟"

"میرے باپ تو میرے پیدا ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد انتقال کرگئے۔ اور ابھی میں بالکل کمسن ہی تھی کہ ماں بھی مرگئیں"

یہ کہتی ہوئی مالتی خود باورچی خانہ میں چلی گئی۔ بھجو اکی مائی ابھی آہستہ آہستہ چیزوں کو اِدھر سے اُدھر رکھ رہی

تھی۔ مالتی نے اُسے اس کی سستی پر ملامت کی اور خود ہی جلد جلد کاموں کو انجام دینے لگی۔
اس کے تھوڑی دیر بعد مالتی اپنے مہمان کے لئے کھانا پکا رہی تھی اور نووارد اُس کے بغل میں بیٹھی اُس سے باتیں کر رہی تھی۔

"تمہاری شادی کب ہوئی" بنارس کی بیوہ نے دریافت کیا

"اسی بیساکھ کے مہینہ میں"

"صرف! تم یہاں کب سے ہو؟"

"تقریباً دو ماہ سے"

"تمہارے شوہر دفتر کب جاتے ہیں؟"

شوہر کا نام سن کر مالتی کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔

"نو بجے صبح کو" اُس نے شرم سے نظر کو نیچی کرتے ہوئے کہا

"اور وہ واپس کب آتے ہیں؟"

"چھ بجے اور کبھی سات بجے بھی"

(۵)

سرت چندر آج خلاف معمول دفتر سے کچھ سویرے لوٹے۔ مالتی نے مسکراتے ہوئے اُن کا خیر مقدم کیا "آج بہت سویرے آئے"

سرت چندر مسکرا دئے۔ بولے۔ "میں نے خیال کیا تم تنہا گھبراتی ہو گی اور اس لئے میں نے جلدی کی"
مالتی کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ بولی "لیکن آج میں تنہا نہیں ہوں۔ سوچو کون آیا ہے؟"
سرت چندر نے تعجب سے پوچھا۔ "کون ہے"
"ایک بنارس کی بیوہ خاتون۔ بنارس سے وہ اپنے مکان جا رہی تھیں کہ راستہ میں اُن کا ٹکٹ کہیں گم ہو گیا اور ریلوے والوں نے انھیں یہیں اُتار دیا"

"بنارس سے آ رہی ہیں وہ؟ تنہا ہیں یا اُن کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟ اُن کی عمر کیا ہوگی"

"تنہا ہیں، اُن کی عمر ۴۰ - ۵۰ کے لگ بھگ ہو گی"۔

سرت چندر کو مالتی کے تخمینہ پر ہنسی آ گئی۔ "تمھیں چالیس پچاس میں اُس وقت تک فرق نہ معلوم ہوگا جب تک تم خود چالیس کی نہ ہو جاؤ" اُنھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ جس کی عمر سولہ سال کی ہے، اُس کے نزدیک چالیس اور پچاس میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن جس کی عمر چالیس سال کی ہے اگر اُسے پچاس سال کا کہا جائے تو یہ اُس کی کھلی ہوئی توہین ہے۔"

لیکن سرت چندر کی ہنسی دیرپا نہ تھی۔ اُنھوں نے تشویش کے ساتھ کہا۔

"اس جگہ تو بنگالی خاندان کئی ایک ہیں۔ وہ خاصکر یہیں کیوں تشریف لائیں"

"تمھیں کوئی عذر ہے؟" مالتی کا چہرہ افسردہ ہوگیا

"یقیناً۔ کیا وہ حسین بھی ہیں؟"

مالتی کو سرت چندر کا یہ سوال ناگوار گزرا۔ اُس نے منھ بناتے ہوئے کہا "تمھیں اس سے کیا مطلب؟"

"کیوں نہیں؟ مجھے بہت شبہ ہے۔ معلوم نہیں وہ کیسی عورت ہیں۔ بنارس سے آرہی ہیں اور پھر بالکل تنہا"

مالتی اپنے شوہر کے مفہوم کو سمجھ گئی۔ بولی۔ "نہیں نہیں تمھارا خیال غلط ہے۔ وہ ایک شریف عورت ہیں"

"جیسے تم جانتی ہی ہو" سرت چندر نے طعن آمیز لہجہ میں کہا۔ "اور وہ جائیں گی کب؟"

"میں نے نہیں پوچھا"

"دوسری گاڑی رات کو ساڑھے بارہ بجے جاتی ہے"

"لیکن وہ رات کو اکیلی جائیں گی کیسے؟"

"تمھیں اس کی کیا فکر ہے؟ میں خود اسٹیشن پر جاکر انھیں سوار کرادوں گا۔ جس قدر جلد وہ یہاں سے جائیں اُسی قدر بہتر ہے"

مالتی بیٹھ گئی۔ اُس کا چہرہ اُتر گیا۔ سرت چندر نے مالتی کی یہ کیفیت دیکھی تو پوچھا

"لیکن تم آخر ملول کیوں ہوئی جاتی ہو؟"

"بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی واپسی کی نسبت کچھ کہا نہیں۔ پھر میں کس طرح اُنھیں گھر سے نکالدوں"

سرت چندر بولے "تم اگر دقت محسوس کرتی ہو تو میں خود اس کا انتظام کرلوں گا۔ اُن کا یہاں زیادہ قیام مناسب نہیں ہے"

یہ کہکر سرت چندر اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ شغل کا سامان موجود تھا۔ تھوڑی دیر میں سرت چندر بالکل دوسرے تھے۔ دن کی تمام کلفتیں دور ہوچکی تھیں۔ مالتی سے اب وہ انتہائی خوش طبعی کے ساتھ باتیں کررہے تھے۔

اسی دوران میں بنارس کی خاتون باہر سے آئیں اور کمرہ کے دروازہ پر آکر کھڑی ہوگئیں۔ سرت چندر جلدی سے باہر آئے اور اُنھوں نے بہت ہی مودبانہ طریقہ سے خاتون کو "پرنام" کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے یہاں آنے کی زحمت گوارا کی" بنارس کی بیوہ چپ رہیں سرت چندر پھر لجاجت کے ساتھ بولے "آپ کہاں رہتی ہیں؟"

"آجکل میں بنارس میں رہتی ہوں"

"آپ کہاں جا رہی تھیں؟"

"میں اپنے وطن واپس جا رہی تھی۔ لیکن راستہ میں میرا ٹکٹ کہیں کھو گیا"

"ہاں، ہاں" سرت چندر نے بات کاٹتے ہوئے کہا "میں نے سنا ہے۔ آپ بالکل اطمینان سے رہیں۔ یہ آپ کا گھر ہے۔ جس گاڑی سے آپ آئی ہیں کل اُسی گاڑی سے آپ جائیں تو زیادہ بہتر ہے"

"تمھارا بہت شکریہ۔ لیکن ایک گاڑی رات کے ساڑھے بارہ بجے بھی تو روانہ ہوتی ہے"

"جاتی تو ہے۔ لیکن جانے کی آخر جلدی کیا ہے۔ سردی سخت ہے۔ آپ کو بہت تکلیف ہوگی۔ رات کی گاڑی سے جانا تو کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ اور پھر میں آپ کو جانے کب دیتا ہوں" اور یہ کہکر انھوں نے ایک فرمایشی قہقہہ لگایا۔

سرت چندر شال اوڑھ کر دوستوں سے ملنے چلے گئے۔ شب کو وہ واپس ہوئے تو رات کافی ہو چکی تھی نشہ میں مخمور تھے۔ مالتی نے پوچھا۔

"اتنی دیر کیوں ہوئی؟" انھوں نے مالتی کے ایک چٹکی لی۔ بولے۔ "آج بہت ہی اچھی خبر ہے؟"

"کیا؟" مالتی نے جواب کا انتظار کرتے ہوئے کہا

"میرا تبادلہ تاری گھاٹ ہو گیا"

"اور تنخواہ میں بھی کچھ اضافہ ہوا؟"

"ہاں"

مالتی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اُس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔

سرت چندر بولے۔ "تین چار دن میں ہم لوگوں کو وہاں چلا جانا ہوگا"

(۶)

صبح کو سرت چندر اُٹھے تو بنارس کی بیوہ موجود تھیں۔ اُنھوں نے مالتی کو کنارے لیجا کر پوچھا۔ "رات کی گاڑی سے گئی نہیں؟"

"عجب آدمی ہو۔ وہ تو جانے کے لئے تیار ہی تھیں۔ تمھیں نے تو زبردستی اُنھیں روکا"

"ہاں؟" سرت چندر نے آزردہ ہو کر کہا۔ "اچھا، میں دوپہر کے وقت خلاصی بھیجدوں گا تاکہ وہ

اُنھیں اسٹیشن پہونچا دے۔ اور ہاں دیکھو۔ برتنوں سے ذرا ہشیار رہنا۔"

مالتی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے صرف اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے شوہر کو دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ شوہر کے اس شبہ کو وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتی۔

ناشتہ کے بعد مالتی اور بنارس کی بیوہ دھوپ میں دری بچھائے گفتگو میں منہمک تھیں۔ زمانہ کے بعد مالتی کو ایسی صحبت میسر آئی تھی۔ بجھوا کی مائی سے ہندوستانی میں گفتگو کرتے کرتے وہ عاجز ہو گئی تھی۔ دو بج چکے تھے، خلاصی کا انتظار تھا۔ بنارس کی بیوہ نے اپنی چیزوں کو یکجا کر لیا تھا اور جانے کے لئے تیار تھیں۔"

ڈھائی بج گئے۔ خلاصی نہ آیا۔ مالتی نے کہا "فرض کیجئے اگر آج آپ نہ جائیں اور دو ایک دن یہاں اور قیام کریں تو کوئی مضائقہ ہے؟ آپ کے آجانے سے میری طبیعت بہت بہل گئی ہے۔ تنہائی میرے لئے مصیبت ہے۔ میں آپ سے سچ کہتی ہوں بعض وقت میری طبیعت تو ایسی چاہتی ہے کہ زور زور سے رونے لگوں۔"

بنارس کی بیوہ نے کچھ تامل کے بعد کہا۔۔۔ "مجھے تو کوئی عذر نہیں۔ لیکن تمھارے شوہر کو شاید میرا زیادہ قیام پسند نہ آئے۔"

"نہیں نہیں،" مالتی نے جواب دیا، ہر چند اُسے اس کا پورا احساس تھا کہ اُن کا شبہ بالکل ہی ٹھیک تھا۔ اُس نے سوچنا شروع کیا۔۔۔ "وہ تو تمام دن دفتر میں رہتے ہیں۔ لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ شام کو دوست احباب کے ہاں بھی اُن کا جانا ضرور۔ اُن کی طبیعت تو ہر وقت بہلتی رہتی ہے۔ اُنھیں کیا معلوم کہ میں تمام دن کیسے کاٹتی ہوں۔ اب تو تنہائی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ بجھوا کی مائی! کمبخت تمام دن پڑی سوتی رہتی ہے۔ اُس کا رہنا نہ رہنا، دونوں میرے لئے مساوی ہے۔ اتفاق سے یہ آگئی ہیں، دو چار دن انھیں میں ضرور ٹھہراؤں گی۔ بگڑیں چاہے کچھ کریں۔ میں اُن سے صاف صاف کہہ دوں گی! تمھیں میری خوشی کا کچھ بھی خیال نہیں۔۔۔۔۔۔"

مالتی سوچتی رہی۔ اُسے سرت چندر سے بڑی محبت تھی۔ لیکن اسوقت وہ جذبات سے مغلوب ہو کر ایسا خیال کر رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مالتی کی جگہ کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو وہ بھی اس تنہائی سے اکتا جاتی۔ ایک دو دن کی یہ مصیبت نہ تھی۔ صبح سے شام تک نہ کسی سے بات چیت، نہ ہنسنا نہ بولنا۔ شام کو سرت چندر آئے بھی تو ناشتہ پانی کرنے کے بعد ٹہلنے چلے گئے۔ اب مالتی دس گیارہ بجے رات تک شوہر کا انتظار کر رہی ہے۔ مالتی کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔

تین بجے گئے۔ نظر بھان آیا۔ گاڑی آئی اور چلی گئی۔ گاڑی کے جانے کی آواز دیر تک کانوں میں آتی رہی۔ مالتی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اُسے اس وقت کتنا سکون تھا۔ مہمان سے اب وہ خوش خوش باتیں کر رہی تھی۔

شام کے وقت مالتی نے سرت چندر کے لئے بازار سے ناشتہ منگانا چاہا۔ بنارس کی بیوہ نے کہا:—

"تم یہ تمام چیزیں بازار سے کیوں منگاتی ہو۔ خود ہی گھر پر کیوں نہیں بنالیتیں"

مالتی نے کہا۔ "کون یہ جھگڑا کرے۔"

"جھگڑا کیا ہے؟" بیوہ عورت نے کہا۔ "اگر میں تمھاری جگہ ہوتی تو یہ تمام چیزیں خود ہی پکا لیا کرتی۔"

مالتی خاموش رہی۔ عورت نے کہا۔ "آؤ آج ہم تم مل کر پکائیں۔ دیکھو گھر کی چیز کتنی اچھی اور پھر کس قدر کم دام میں تیار ہوتی ہے۔

(۷)

سرت چندر آج دفتر سے کچھ دیر میں واپس ہوئے۔ جب اُن کی نظر بنارس کی بیوہ پر پڑی تو وہ چلائے "مجھ سے کیا بھول ہوئی۔ بالکل ہی خیال نہ رہا کہ مجھے گاڑی کے وقت خلاصی ہو جانا ہے۔" "مجھے آپ سے مدورہ شرمندگی ہے" اُنھوں نے بنارس کی بیوہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بہرحال بیٹھئے آپ نے دو دن یہاں تکلیف کی ہے ایک دن ہم لوگوں کے خیال سے اور سہی۔ مجھے کل کام پر جانا نہیں ہے۔ میں خود ہی کل آپ کو گاڑی میں سوار کرادوں گا"

وہ کمرہ میں گئے۔ مالتی نے دیکھا کہ اُن کے منھ سے شراب کی بہت زیادہ بو آرہی ہے۔ اس سے نہ رہا گیا، بولی۔ "تمھاری حالت دن بدن خراب ہوئی جاتی ہے۔ تاری گھاٹ میں جب تم زیادہ کماؤ گے تو اور اپنی حالت خراب کرلو گے۔

سرت چندر نے لاپرواہی کے ساتھ ہنستے ہوئے کہا۔ "پاگل ہوئی ہو۔ وہاں کیا کوئی کلب کمپنی ہے۔ تاری گھاٹ، شہر سے باہر ایک چھوٹا سا اسٹیشن ہے۔ وہاں یہ چیزیں کہاں میسر۔ وہاں پہونچتے ہی میں اشنان کروں گا اور پھر "یکدم" چھوڑ دوں گا"

"یکدم" کے لفظ پر اُنھوں نے کافی زور دیا اور قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

"کل دفتر جاؤگے؟" مالتی نے پوچھا۔

"نہیں۔ آج میں نے تمام کام ختم کردئے اور کام سمجھا بھی دیا۔ پرسوں میں نے اپنی ترقی کی خوشی میں اپنے دوستوں کو چار پر مدعو کیا ہے۔ اور کل مجھے اس کے متعلق تمام انتظامات کرنے ہیں"

اس کے بعد سرت چندر کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ آج، خلاف معمول، دسترخوان پر انواع واقسام

کی چیزیں موجود تھیں۔ انھوں نے مالتی سے پوچھا "آج یہ چیزیں کہاں سے آئی ہیں ؟" مالتی نے بتایا
سرت چندر بولے "میرے دماغ میں ایک بات آتی ہے۔ اگر یہ پرسوں تک یہاں ٹھہر جائیں تو ہم لوگوں کو
دعوت کے انتظام میں بہت زیادہ سہولت ہو۔"

"لیکن تم خود اُن سے کہو تو بہتر ہے" مالتی نے مسرت کے ساتھ کہا۔

"لیکن اس حالت میں، میں اُن کے پاس جاؤں کیسے ؟"

"بیوقوف !" مالتی نے کسی قدر ملامت آمیز لہجہ میں کہا "کیا تم نے دفتر سے آتے ہی اُن سے گفتگو
نہیں کی ہے ؟"

"ہاں ؟" سرت چندر نے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا۔ تھوڑی دیر بعد انھیں یاد آیا۔ بولے۔ "ہاں
ہاں، ٹھیک کہتی ہو۔ میں نے اُن سے باتیں کی تھیں۔"

مالتی نے شوہر کا پیام، بنارس کی بیوہ تک پہونچا دیا اور انھوں نے بخوشی اسے منظور بھی کر لیا۔

(۸)

اتوار کا دن تھا۔ سرت چندر آج ہی تاری گھاٹ روانہ ہونے والے تھے۔ بنارس کی بیوہ نے مالتی سے
کہا "میں نے اپنی رائے بدل دی ہے۔ اب میرا خیال بنگال جانے کا نہیں ہے۔ میں بنارس ہی واپس
جاؤں گی۔"

مالتی بولی۔ "تو پھر کیا اچھا ہو تا اگر آپ ہم لوگوں کے ساتھ ہی چلتیں اور دو ایک دن تاری گھاٹ میں
بھی قیام کرتیں۔ تاری گھاٹ، بنارس سے تین چار اسٹیشن تو ہٹی ہے۔"

اسی دوران میں سرت چندر باہر سے آئے اور بازار کا حساب صاف کرنے کے لئے انھوں نے
مالتی سے تیس روپئے طلب کئے۔

"تیس روپئے ؟" مالتی نے حیرت سے پوچھا۔ "لیکن روپئے ہیں کہاں ؟"

"کل ہی میں نے تمھیں اسی روپئے لاکر دئے تھے۔ کیا وہ سب خرچ ہو گئے ؟"

"دیکھتی ہوں" مالتی بولی "لیکن دعوت ہی کے لئے تم نے یکمشت مجھ سے پچاس روپئے لئے تھے۔ اور
پھر کل شام کو دوستوں کے لئے شراب منگانے کو تم نے کئی بار باہر سے روپئے منگائے۔" یہ کہتی ہوئی مالتی گئی
اور اس نے اپنے بکس کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ کل دو روپئے چودہ آنے باقی ہیں۔

سرت چندر مضمحل ہو گئے۔ "اب میں کیا کروں ؟" انھوں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تم خود ہی اس کے ذمہ دار ہو" مالتی نے قدرے سکوت کے بعد کہا "میں دیکھ رہی ہوں کہ تمھاری

یہ عادت تمھیں ایک دن تباہ و برباد کرکے چھوڑے گی۔ تمھیں کل کا خیال بالکل ہی نہیں رہتا۔ روپے کو کسقدر بے پرواہی سے خرچ کرتے ہو۔"

سرت چندر نے مالتی کے وعظ و پند پر کوئی توجہ نہ کی اور یہ کہتے ہوئے باہر جانے لگے کہ دیکھو کہیں سے انتظام کرتا ہوں۔

بنارس کی بیوہ یہ تمام باتیں باہر سے سن رہی تھیں۔ اُنھوں نے مالتی کو کنارے لیجا کر کہا "تمھارے شوہر کو مجھ سے روپئے لینے میں کچھ تامل ہوگا، چونکہ اب میں مکان نہیں جارہی ہوں اس لئے اسوقت مجھے روپئے کی ضرورت بھی نہیں ہے"

مالتی نے سرت چندر سے جاکر کہا۔ لیکن وہ بولے "نہیں ایسا کیونکر ممکن ہے اُن سے کس طرح قرض لے سکتے ہیں۔"

بنارس کی بیوہ خود ہی نزدیک آگئیں۔ بولیں "تمھیں مجھ سے قرض لینے میں کیا تامل ہے؟"

سرت چندر تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ پھر بولے۔ "آپ کی بہت مہربانی ہے۔ لیکن اگر آپ ہم لوگوں کے ساتھ تاری گھاٹ چلیں تو میں پانچ چھ دن میں آپ کے روپئے ادا کردوں گا۔"

"کیوں؟ روپئے ادا کرنے کی اتنی جلدی کیا ہے۔ جب تمھارے پاس روپئے ہوں مجھے واپس دیدینا اس وقت تمھیں کتنے کی ضرورت ہے؟ صرف تیس کی؟ میرے پاس روپئے موجود ہیں۔ اگر زیادہ کی بھی ضرورت ہو تو مجھ سے لے سکتے ہو۔ آخر تم سوچتے کیا ہو؟ اس میں زحمت کیا ہے؟"

"جی ہاں تیس روپئے میں کام چل جائے گا۔ لیکن آپ کی بہت نوازش ہے"

بنارس کی بیوہ نے اپنا بکس کھول کر دس دس روپئے کے تین نوٹ سرت چندر کے حوالے کئے۔

اُسی دن رات کی گاڑی سے سرت چندر تاری گھاٹ کے لئے روانہ ہوگئے۔ بنارس کی بیوہ ساتھ تھیں۔ بھجوا کی مائی کو سرت چندر اپنے ساتھ لیجانا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے بہت اصرار کیا لیکن وہ کسی طرح تیار نہ ہوئی۔ تاہم اُس نے چلتے وقت کافی واویلا مچایا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کو اس جدائی کا بڑا قلق ہو کہ اس کا اثر کبھی زائل ہی نہیں ہو سکتا۔

مالتی چاہتی تھی کہ بنارس کی بیوہ کسی صورت سے تاری گھاٹ میں بھی دو چار دن قیام کرے۔ وہ اُن سے بہت زیادہ مانوس ہوگئی تھی۔ اُس نے گاڑی میں بھی اُن سے بہت اصرار کیا لیکن اُنھوں نے اپنی معذوری ظاہر کی۔ صبح کے وقت سرت چندر کو، دلدار نگر میں دوسری گاڑی بدلنی ہوتی تھی۔ وہاں اُنھوں نے بنارس کی بیوہ کو الوداع کہا۔

(۹)

صبح ہوتے ہی یہ لوگ تاری گھاٹ پہونچے۔ یہاں ریلوے کا کوارٹر تھا۔ وہیں ان لوگوں نے قیام کیا۔ چیزوں کو قرینہ سے رکھنے کے بعد سرت چندر اپنے رفیقوں سے ملنے باہر چلے گئے۔

مالتی نے غسل کرنے کے لئے ایک صندوق کھول کر اپنے لئے ایک ساری نکالنی چاہی۔ یہ وہ صندوق تھا جس میں وہ عموماً اپنے زیور کا چھوٹا بکس رکھا کرتی تھی۔ لیکن اُسکی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب اُسنے دیکھا کہ زیور کا بکس صندوق میں موجود نہیں ہے۔ اُسنے آپ ہی آپ کہا "یقیناً یہ کسی دوسرے صندوق میں ہوگا" اور یہ کہکر وہ ایک ایک صندوق کو کھول کھول کر دیکھنے لگی لیکن بکس کسی میں موجود نہ تھا۔

"نہیں نہیں یہ کہیں ضرور ہوگا" مالتی نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور پھر اُس نے ایک ایک صندوق کا جائزہ لیا۔ لیکن بکس کا کہیں پتہ نہ تھا۔"

بالآخر زمین پر وہ بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد سرت چندر واپس ہوئے تو انھوں نے مالتی کو اس حال میں دیکھکر پوچھا "کیا ہے؟"

مالتی نے ہچکی لے لے کر تمام واقعات سرت چندر سے دہرائے۔ سرت چندر کا رنگ زرد پڑ گیا۔ انتہائی غم وافسوس کے ساتھ وہ ایک کرسی پر گر پڑے اور پوچھا۔

"تم نے تمام سامان دیکھ لیا ہے؟"

"ہاں"

"سب سے اخیر مرتبہ تم نے بکس کو کب دیکھا تھا؟"

"مجھے یاد ہے، میں نے کل داتاپور میں اسے بڑے صندوق میں رکھا تھا"

"تمھیں یاد ہے، تم نے کوئی چیز نکالنے کے لئے صندوق کو گاڑی میں کھولا بھی تھا؟"

"ہاں۔ ایک مرتبہ۔ مجھے بہت سردی معلوم ہو رہی تھی تو شال نکالنے کے لئے میں نے ایکبار کھولا تھا"

"ہوسکتا ہے کہ تم نے بکس کو باہر نکالا ہو اور پھر رکھنا بھول گئی ہو"

"نہیں" مالتی نے تیقن کے ساتھ کہا۔ "شال تو اوپر ہی تھی۔ میں دوسری چیزوں کو کیوں الٹ پلٹ کرتی"

"اس کے بعد تم نے کنجی کہاں رکھی؟"

"کنجی کو میں نے اپنے کمر بند میں باندھ لیا تھا"

"اور پھر تم اس کے بعد سو گئیں"

"ہاں" مالتی نے اپنے شوہر کے چہرہ پر خاموش نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔
"میں سمجھ گیا۔" سرت چندر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولے۔ "یہ اُسی اجنبی عورت کا کام ہے۔"
مالتی نے اس کی تردید نہ کی۔ خاموش رہی۔ سرت چندر پھر بولے۔ "جب تم سوگئی ہوگی تو اُس نے آہستہ سے کنجی تمھارے کمربند سے کھول لی ہوگی۔ تم نام جانتی ہو؟"
"نہیں۔ میں اُن سے اُن کا نام کیونکر پوچھتی۔ وہ تو مجھ سے عمر میں بہت کافی بڑی تھیں۔"
"وہ، بنارس میں رہتی کہاں ہیں؟"
"کسی مٹھ میں۔"
"کسی مٹھ میں؟ وہاں تو سیکڑوں مٹھ ہیں۔"
اب سرت چندر برہم ہو چلے تھے۔ بولے "میں نے تمھیں پہلے ہی تنبیہ کیا تھا کہ ایسے لوگوں پر اعتبار یقین نہ کرنا چاہیئے۔ یہ بنارس کی عصمت فروش عورتیں، ایک مستقل عذاب کی صورت اختیار کئے ہوئے ہیں" سرت چندر کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ بولے "اُس نے اپنے تیس روپئے سے اچھا سودا کیا۔"
"لیکن مجھے یقین نہیں آتا ہے کہ انھوں نے ایسا کیا ہوگا۔ ممکن ہے میں نے خود ہی داناپور میں سے چھوڑ دیا ہو،" مالتی نے قدرے یقین کے لہجہ میں کہا۔
لیکن سرت چندر نے اس پر کوئی توجہ نہ کی۔ "تمھیں دُنیا کا بہت کم تجربہ ہے۔ تم کیا جانو کہ دنیا میں کیا ہوتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے سرت چندر پولس کو اطلاع دینے کیلئے باہر چلے گئے۔

(۱۰)

پندرہ دن گزر گئے۔ زیوروں کا غم دن بدن کم ہوتا گیا۔ اب پھر سرت چندر اور مالتی خوشی کی گھڑیاں گزار رہے تھے۔ سرت چندر کا موجودہ کام کافی نفع بخش تھا۔ اس نے ان لوگوں کے غم کو غلط کر دیا تھا۔
خبر پاتے ہی دلدار نگر کے جمعدار اُسی دن تارگھاٹ پہونچ گئے تھے۔ اُنھوں نے سرت چندر کا بیان قلمبند کر لیا تھا اور زیوروں کی ایک مکمل فہرست بھی مانگ لی تھی۔ لیکن اب تک پولس کی طرف سے کوئی خبر نہ آئی تھی۔
ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ سرت چندر دفتر گئے ہوئے تھے۔ مالتی دن کا کھانا کھا رہی تھی کہ دلدار نگر سے گاڑی آئی۔ مالتی کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی گاڑی پلیٹ فارم پر آتی تو وہ دوڑ کر کھڑکی میں چلی جاتی اور اسٹیشن کی چہل پہل کو غور سے دیکھا کرتی۔ گاڑی کے آنے پر پلیٹ فارم پر کیسی زندگی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ مالتی کو یہ منظر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ وہ بچوں کی طرح اسے غور سے دیکھتی اور بہت لطف حاصل کرتی۔

اس وقت بھی وہ کھانا چھوڑ کر دریچہ کی طرف دوڑ گئی۔ بالکل غیر متوقع منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ بنارس کی بیوہ گاڑی سے اُتر کر پلیٹ فارم پر کھڑی ہوگئیں۔ قلی اُن کا سامان اُتارنے لگا۔ مالتی دیکھا کہ انھوں نے قلی سے کچھ دریافت کیا اور قلی نے اُس کے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

مالتی کا دل دھڑکنے لگا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود چند لمحوں میں چوری کے الزام میں ہونے والی ہے۔ وہ دوڑ کر واپس ہوئی۔ بچے ہوئے کھانے کو اُس نے جلد ہی جلد ہی علٰحدہ رکھا اور آپ کو سنبھالنے لگی۔ اُس کی حالت غیر ہوئی جاتی تھی۔ خیالات کا ایک سیلاب تھا جو امڈا چلا آرہا تھا" "ان اُنھیں اسکی واقفیت نہ ہوئی ہو کہ میرے شوہر نے اُن پر چوری کا شبہ کیا ہے۔ کتنے معصوم جذبات سے وہ خدا سے دُعائیں کر رہی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مالتی اب تک بنارس کی بیوہ کو اس معاملہ میں قطعی بے گناہ سمجھتی تھی۔ اور اب تو یقین کامل ہوگیا کہ یہ اُنکا کام نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اُنھیں آنے کی یہاں دوبارہ جرأت کیسے ہوتی۔

چند لمحوں کے بعد بنارس کی بیوہ مالتی کے سامنے تھیں۔ مالتی نے اُنھیں "پرنام" کرتے ہوئے کہا "مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ تشریف لائیں" بیوہ نے مالتی کے سر پر محبت کا ہاتھ دھرا اور آہستہ آہستہ دعائیں دیں۔ مالتی نے چاہا کہ کھانے کا انتظام کرے لیکن بیوہ نے روکا اور کہا "نہیں اس کی زحمت نہ کرو۔ آج ہے اور میں برت سے ہوں۔ دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ مالتی نے دیکھا کہ اُس کے مہمان کا چہرہ اُترا ہوا ہے۔ شگفتگی نام کو بھی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے دماغ پر کوئی بوجھل چیز رکھی ہے وہ حد درجہ ملول اور افسردہ ہے۔ مالتی نے کہا۔ "کیوں، آج آپ کچھ ملول نظر آتی ہیں"۔

"تمھیں تو اس کی وجہ جاننی چاہیئے" بیوہ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کیسے؟" مالتی کی زبان سے نکلا اور وہ جواب کا لرزتے ہوئے انتظار کرنے لگی۔

"تمھیں شبہ ہے کہ میں نے تمھارے زیور چرائے۔ تم نے پولیس کو میرے پیچھے دوڑایا اور پھر دریافت کرتی ہو کہ میں کیوں ملول نظر آتی ہوں"۔

مالتی کی زبان تھوڑی دیر کے لئے گنگ ہوگئی۔ انتہائی شرم و ندامت کے لہجہ میں وہ صرف اتنا "آپ کو یقین ہے کہ میں نے ایک لمحہ کے لئے بھی ایسا شبہ اپنے دل میں پیدا کیا ہوگا؟"

"لیکن تمھارے شوہر نے تو ایسا کیا" بنارس کی بیوہ نے ذرا تلخ لہجہ میں جواب دیا۔

مالتی معذرت کے ساتھ پھر بولی۔ اُنھیں یقین نہ تھا کہ پولیس آپ کو تلاش کر سکے گی۔ آج ہی وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ بنارس میں بے شمار مٹھ ہیں اور یہ قطعی ناممکن ہے کہ کسی گمنام ہستی کو اُن

مٹھوں میں سے تلاش کیا جا سکے "۔

"لیکن پولیس نے بہرحال مجھے تلاش کر ہی لیا اور انھوں نے مجھے اسقدر پریشانیوں میں مبتلا کیا کہ بالآخر مجھے دوسو روپے دیکر ان سے اپنی جان چھڑانی پڑی۔ یہ تم لوگوں سے دوستی کا انجام ہے مجھے سخت افسوس ہے"

تھوڑی دیر تک کامل خاموشی رہی۔ پھر بنارس کی عورت نے کہا "تمھارے شوہر واپس کب ہوتے ہیں؟"

"رات سے گئے"

آسمان پر ابر آنے شروع ہوئے۔ آفتاب بادلوں میں چھپ گیا۔ بنارس کی بیوہ نے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بارش کے آثار معلوم ہوتے ہیں"

"کیوں؟" مالتی نے پوچھا

"مجھے آج ہی جانا ہے"

"آج ہی!" مالتی نے طفلانہ سادگی سے پوچھا۔ "کیوں؟ جلدی کیا ہے؟"

"بیوہ کے ہونٹوں پر ایک ہلکا تبسم آیا اور انھوں نے کہا۔ "بیوقوف لڑکی۔ تیرے شوہر مجھے ڈاکو تصور کرتے ہیں اور تو چاہتی ہے کہ تیرے ہاں اور ٹھہروں۔ نہیں مجھے آج ہی ڈھائی بجے کی گاڑی سے جانا ہے۔ میرے مٹھ کی بہت سی عورتیں جاترا کے لئے جارہی ہیں اور مجھے بھی اُن لوگوں کے ساتھ جانا ہے"۔

"آپ وہاں کیا زیادہ دنوں تک رہیں گی؟" مالتی نے پوچھا

"کیوں پوچھتی ہو؟" بیوہ نے آنکھوں میں آنسو ڈبڈباتے ہوئے کہا۔ "کیا تم خیال کرتی ہو کہ پھر ہم تم مل سکیں گے؟"

بیوہ کا دل بھر آرہا تھا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے دل میں غم والم کا ایک دریا لہریں مار رہا ہے۔ کچھ دیر کے بعد عورت نے کہا "میری بچی کیا تو مجھے خوش کرنا چاہتی ہے؟"

"ہاں" مالتی نے سادگی کے ساتھ جواب دیا۔

"میرے پاس یہاں کچھ زیور ہیں۔ کیا تم اُنھیں میری خواہش سے پہن سکتی ہو" اور یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنے ایک صندوق کو کھولکر ایک اعلیٰ درجہ کا بکس نکالا۔ بکس بہت خوشنما تھا۔ اُنھوں نے اس کا ایک بٹن دبایا جس سے اُس کا ڈھکنا خودبخود کھل گیا۔ سونے کے زیور ہیرے، یاقوت اور دوسرے قیمتی پتھروں سے مزین۔ مالتی کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔

عورت نے محبت آمیز لہجہ میں کہا "یہ چیزیں میں اپنی طرف سے تمھیں دیتی ہوں" تھوڑی دیر کیلئے مالتی ششدر اور مبہوت ہو کر رہ گئی۔ پھر اُس نے کہا۔ آپ مجھے معاف فرمائیں میں ان چیزوں کو نہیں

قبول کر سکتی"۔

"کیوں نہیں" عورت نے شکایت کے لہجہ میں پوچھا

"کیوں ؟ میں یہ تمام چیزیں آپ سے کیوں لوں۔ یہ تو بہت ہی قیمتی ہیں"

"لیکن میں تو اپنی خوشی سے یہ چیزیں تمھیں دے رہی ہوں"

"ہو لیکن مجھے کیا حق حاصل ہے کہ میں انھیں لوں۔ نہیں، میں نہیں لوں گی"

آسمان بہت زیادہ ابر آلود ہوگیا تھا۔ طوفان کے بھی علامات نظر آرہے تھے۔ دن کی روشنی تقریبا مفقود ہو چکی تھی۔

عورت نے دھیمی آواز میں لیکن ایک ایک لفظ پر زور دیکر کہا "فرض کرو کہ تمھیں اسکا حق حاصل ہے" "مجھے اس کا حق حاصل ہے ؟ آپ کیا کہہ رہی ہیں ؟" مالتی نے حیرت واستعجاب کے لہجہ میں پوچھا۔ بیوہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بولیں "ہاں میں تم سے کہوں گی۔ اور اسی لئے آج میں تمھارے پاس آئی بھی ہوں"۔

مالتی کا دل کسی غیر متوقع خطرہ سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے عورت کی طرف مضطربانہ نگاہ ڈالی

"کیا واقعی تمھاری ماں مرچکی ہے ؟" عورت نے پوچھا۔

"لوگ تو ایسا ہی کہتے ہیں ؟ مالتی نے انتہائی سراسیمگی کے عالم میں جواب دیا۔

"تو پھر تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں ہی تمھاری بدقسمت ماں ہوں" لیکن اتنا کہکر وہ ضبط نہ کرسکی اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

مالتی کی حالت اسوقت ایسی تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ بالکل غیر شعوری طور پر وہ اپنی ماں سے علٰحدہ ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ اُس کے دماغ میں یک بیک ایک واقعہ کی یاد تازہ ہوئی جو آج سے چند ماہ پہلے پیش آیا تھا۔ داناپور آنے سے پہلے وہ اپنی ددھیال میں تھی۔ ایک دن شب کے وقت وہ سو رہی تھی۔ اور بغل ہی میں اُس کی چچی اور ایک ضعیفہ جس کا نام مکشودھا تھا اور جسے مالتی "دادی دادی" کہہ پکارتی تھی سوتی تھیں۔ شب کے وقت مکشودھا، اس کی چچی سے کوئی رازدارانہ گفتگو کر رہی تھی۔ لیکن مالتی کی نیند ٹوٹ چکی تھی اور مکشودھا کو اس کی خبر نہ تھی کہ مالتی جاگ رہی ہے۔ مکشودھا ابھی ایک طویل تیرتھ سے واپس آئی تھی۔ مالتی نے جو کچھ سنا اُس سے ایک ایسے راز کا انکشاف ہوا کہ مالتی کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ اُسے بالکل پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اُس کی ماں جسے آج تک وہ مردہ سمجھ رہی تھی دراصل مری نہیں اور مکشودھا سے اتفاقیہ طور پر اُس کی ماں سے ایک تیرتھ میں ملاقات ہوگئی تھی۔ سب سے عظیم صد

جو مالتی کو ہوا وہ یہ جان کر ہوا کہ جس ہستی کی مقدس یاد وہ اپنے دل میں آج تک تازہ رکھتی آرہی تھی وہ دنیا کی نظروں میں ایک "بدچلن عورت" ہے۔ مالتی کو جیسی روحانی تکلیف اُس رات کو ہوئی وہ ناقابلِ بیان ہے۔" اور یہ عورت جو اُس کے سامنے کھڑی ہے وہ اُس کی وہی ماں ہے!"

اُس کی ماں اب تک زار و قطار رو رہی تھی۔ آنسوؤں کی ایک بارش تھی جو کسی طرح نہ رکتی تھی۔ اُنھوں نے اپنی طبیعت کو روکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا میرے داماد کو بھی اس کی خبر ہے؟"

"نہیں۔ اُنھیں نہیں معلوم"

"تمھیں اس واقعہ کی اطلاع کب ہوئی"

"شادی کے بعد"

"مکشودھا چچی سے سُنا ہوگا؟"

"ہاں"

"مجھے بھی اُنھیں سے معلوم ہوا کہ تمھاری شادی اب ہو چکی ہے۔ اور تمھارے شوہر داناپور میں مال بابو ہیں۔ اُنھوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ تم آسون کے مہینہ داناپور جاؤ گی"

مالتی نے اپنی ساری کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "تو یہ محض اتفاقیہ طور پر آپ داناپور نہیں آئی تھیں۔ لیکن آپ آئیں کیوں؟" مالتی کے لہجہ میں اب ذرا سختی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ کبھی وہ ایسے مجرم کے ساتھ ہمدردی نہیں کر سکتی۔

غریب ماں پر پھر رقت طاری ہوئی اور اُس نے اُسی عالم میں رُک رُک کر کہا۔ "کیا کوئی اپنی اولاد کو بھی بھول سکتا ہے" لیکن اتنا کہتے کہتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔

اب مالتی کو بھی رونا آرہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں اب تک یہ بات نہ آئی تھی کہ ایک نووارد عورت سے وہ کیونکر پہلی ہی ملاقات میں اس درجہ مانوس ہو گئی تھی۔ لیکن اب اُسے معلوم ہوا کہ یہ محض خون کی کشش تھی، کوئی اور بات نہ تھی۔

"تو آپ نے اپنے کو کیوں ظاہر کیا؟" مالتی نے تھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھے خود نہیں معلوم۔ لیکن میں اپنے آپ کو روک نہ سکی"

مالتی یہ کہنے ہی کو تھی کہ "مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے اس راز کو مجھ پر ظاہر کر دیا ورنہ میں اپنی ماں کو کیسے پہچانتی" لیکن فوراً ہی دل کی آواز نے اُسے پکارا "کیا سوجھتی ہے؟ ایسی ناپاک ماں۔ بہتر تھا کہ اس کی کبھی صورت بھی نہ دیکھی جاتی"

مالتی کی آنکھیں چمک اُٹھیں، بالکل اسی طرح جیسے پاگلوں کی آنکھیں بعض وقت چمکنے لگتی ہیں۔ وہ تلخ خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئی۔

گاڑی کا وقت قریب آگیا تھا۔ قلی، جیسا کہ پہلے طے پاچکا تھا، سامان لینے کے لئے آیا۔

"آپ ان جواہرات کو لیتی جائیں۔ میں انھیں نہیں پہن سکتی،" مالتی نے کہا

بیوہ نے مالتی کے چہرہ پر نگاہ ڈالی۔ اُس نے معلوم کیا کہ اسوقت اِس کے دماغ میں کس نوع کی باتیں چکر لگا رہی ہیں۔

"جیسا تم خیال کرتی ہو، وہ بات نہیں ہے۔ تم اِن چیزوں کو بلا تامل استعمال کر سکتی ہو۔ اگر ان کی حقیقت کچھ اور ہوتی تو میں انھیں تمھیں دینے کے بجائے دریا میں پھینک دیتی۔ اپنی زندگی کے صرف ایک گناہ کی پاداش میں، میں نے یہ تمام اذیتیں جھیلی ہیں اور کامل چودہ سال میں نے اس کا کفارہ ادا کیا ہے۔ یہ جواہرات میری سیاہ کاری کا نتیجہ نہیں ہیں۔ میرے باپ ایک دولتمند آدمی تھے اور اُنھوں نے شادی کے وقت مجھے یہ چیزیں دی تھیں"

"لیکن پھر بھی میں شوہر سے دریافت کئے بغیر انھیں نہیں استعمال کر سکتی"

"ہاں۔ تم اُن سے پوچھ لو۔ اگر بالفرض وہ تمھیں اِس کی اجازت نہ دیں تو تم ان چیزوں کو فروخت کر کے کسی مندر میں اِس کے روپئے دیدینا"

ماں جانے لگی۔

مالتی کی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ خون کے جوش سے وہ بالآخر مجبور ہوگئی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے ماں کے قدموں کو پکڑ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُسی عالم میں اس کی زبان سے صرف یہ الفاظ نکل سکے۔ "ماما۔ پھر آنا"

"خوش رہو۔ خدا تمھیں عافیت دے، اور چین سے زندگی گزارو" ماں نے روتی ہوئی آواز میں کہا۔ اور ایک لمحہ کے بعد وہ موجود نہ تھی۔

(ماخوذ از بنگال)

ظہیر الدین حیدر۔ تیر آروی
پرکھست کار مکرجی

لامذہبیات

یعنی

(مذہب ایک لامذہب کے نقطۂ نگاہ سے)

علم و مذہب کی جنگ کوئی نئی چیز نہیں اور نہ ہم اسے فطرت کے خلاف کہہ سکتے ہیں، کیونکہ مذہب کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اُسے بلا چون و چرا تسلیم کر لینا چاہئے اور اہل علم کی حجت یہ ہے کہ جب تک کوئی بات سمجھ میں نہ آجائے اس پر یقین لانا ممکن نہیں۔ اہل مذاہب اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ عقل انسانی بہت ناقص ہے اور اس سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی کامل شے کا تصور کر سکے۔ فریق ثانی کہتا ہے کہ جس چیز کو تم "شئے کامل" سے تعبیر کرتے ہو اسی کا ثبوت تمہارے پاس کیا ہے۔ کہ ہماری عقل ناقص کو اس کے سمجھنے سے باز رکھتے ہو۔ الغرض اہل علم و اہل مذہب کی یہ نزاع بہت قدیم چیز ہے اور باختلاف نوعیت اب بھی اسی طرح بلکہ زیادہ شدت کے ساتھ نظر آتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے حکومت و مذہب دونوں ایک چیز تھے اور اس لئے اہل مذاہب بزور شمشیر اپنے مخالفین کو خاموش کر سکتے تھے، اب ایسا نہیں کر سکتے اور معاندین مذہب کی جماعت بڑھتی جا رہی ہے۔ یورپ اور خصوصیت کے ساتھ امریکہ میں جہاں خدائے قادر مطلق کے بجائے [illegible] کی پرستش کی جاتی ہے الحاد نہایت تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور اہل کلیسہ حیران ہیں کہ "آسمانی بادشاہت" کے وجود کو کیونکر قایم رکھ سکیں۔

ہندوستان میں بھی یہ رَو کافی تیزی کے ساتھ دوڑ رہی ہے اور یہاں کے حلقہ ہائے مسجد و خانقاہ میں بھی ان کفر سامانیوں کو نہایت تشویش کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے لیکن اسوقت تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس طوفان سے بچنے کی صورت کیا ہے۔

اہل مذاہب کی طرف سے جو تدبیر دفاع اختیار کی جاتی ہے، وہ زیادہ تر اس لئے بے اثر رہتی ہے کہ انہیں یہی معلوم نہیں کہ ملاحدہ کہتے کیا ہیں اور وہ کن دلایل کی بناء پر خدا اور مذہب سے انکار کرتے ہیں۔

امریکہ وغیرہ میں تو اہل مذہب اُن کے لٹریچر کو شاید کبھی پڑھ لیتے ہوں، لیکن ہندوستان میں تو اس کا دیکھنا ہی گناہ سمجھا جاتا ہے اور اس لئے یہاں کے اہل مذہب قطعاً ناواقف ہیں کہ اس زمانہ کا الحاد کس قسم کا الحاد ہے اور اس کے مقابلہ کے لئے کن نئی تیاریوں کی ضرورت ہے۔

مسلمانوں میں اس وقت صرف دو چار رسایل ایسے ہیں جنھوں نے اپنا مقصود الحاد کی مخالفت اور اسلام کی حمایت قرار دے رکھا ہے، لیکن حقیقتاً ان میں کوئی ایک رسالہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس بیسویں صدی کے منکرین خدا کو خاموش کر سکے اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ جو راہ انھوں نے خدمت اسلام کا اختیار کی ہے وہ نہ صرف یہ کہ بالکل غلط ہے بلکہ اور زیادہ دہریت پھیلانے والی ہے کیونکہ اگر ہم کسی کی بات نہ سنیں اور اپنی ہی کہے جائیں تو ظاہر ہے کہ ہم کو بہرا ہی سمجھا جائے گا۔ پھر چونکہ پیروان اسلام اپنے مذہب کو سب سے زیادہ مکمل اور عین فطرت کے مطابق کہتے ہیں اس لئے اس کی طرف سے جب اس نوع کی جاہلانہ کوششیں دیکھتا ہوں تو مجھے سخت حیرت ہوتی ہے۔

علماء اہل اسلام کی طرف سے ایک عام طریقہ جواب کا یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ مذہب کے خلاف جو عتراض کئے جا رہے ہیں وہ نئے نہیں ہیں بلکہ بہت پُرانے ہیں اور ان کا جواب دیا جا چکا ہے۔ اول تو مجھے اسی میں کلام ہے کہ ان پُرانے اعتراضات کو بھی کبھی دفع کیا گیا ہے یا نہیں اور اگر اسے مان بھی لیں تو انھوں نے یہ کیونکر جان لیا کہ موجودہ ذہنی انقلاب وہی ہے جو اس سے پہلے پایا جاتا تھا اور اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔

اگر اہل مذہب واقعی الحاد کا سدباب کرنا چاہتے ہیں تو ان کا فرض یہ ہے کہ پہلے ملحدین کے بیانات کو سنیں، بغیر کسی جذبۂ غیظ و انتقام کے ٹھنڈے دل سے سنیں اور پھر غور کریں کہ اُن کے دلایل کا کوئی مسکت جواب اُن سے ممکن ہے یا نہیں۔ صرف گالیاں یا بد دعائیں دینے سے کام نہیں چلتا، چنانچہ میں آج کی صحبت میں بتانا چاہتا ہوں کہ ایک لامذہب (انگرسول) کا زاویۂ نگاہ مذہب کے باب میں کیا ہے اور یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہیگا تاکہ اہل مذہب کو معلوم ہو جائے کہ دنیا میں الحاد پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں اور پھر اگر ممکن ہو تو اس کا علاج سوچا جائے۔ ضرورت ہے کہ ملحدین کے ان شکوک و اعتراضات کو دور کیا جائے جو اُن کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور اس لئے اگر اس دوران میں کوئی جوابی و اصلاحی مقالہ کسی کی طرف سے موصول ہوا تو وہ بھی ساتھ ہی ساتھ شائع ہوتا رہیگا۔ مجھے امید ہے کہ قارئین نگار نہایت ٹھنڈے دل سے بغور اس سلسلہ کا مطالعہ کریں گے۔

مذہب کیا ہے

"خدا ہی نے تمام چیزیں پیدا کی ہیں اور وہی ان کا مدبر ہے اس لئے مخلوق کا فرض ہے کہ وہ ا-

خالق کا مطیع رہے، یعنی اگر اس کی طرف سے کوئی حکم نافذ کیا جائے تو اس کی تعمیل کرنا ہر شخص پر لازم ہے"

یہ ہے اصل مفہوم مذہب کا جو صدیوں سے رائج چلا آتا ہے اور تمام قوموں نے اسی اعتقاد کے ماتحت یقین کر لیا کہ خدا ہم سے قربانیاں چاہتا ہے، چنانچہ اول اول لوگوں نے اپنی اولاد تک کو بھینٹ چڑھانے سے عذر نہ کیا اور پھر صرف بیل، بھیڑ، بکری کے خون سے خدا کو راضی رکھنے کی کوشش کی گئی کیونکہ وہ اگر ایسا نہ کرتے تو خدا ان کی فصلیں خراب کر دیتا، پانی برسانا بند کر دیتا، بیماریاں پھیلاتا، زلزلے لاتا اور قحط و وبا کی مصیبت میں مبتلا کر دیتا۔ اس اعتقاد قربانی کی آخری جھلک عیسوی مذہب میں بھی پائی جاتی ہے اور اسلام میں بھی۔ وہاں خدا، اپنے بیٹے کی قربانی قبول کر کے ہمیشہ کے لئے چین سے بیٹھ گیا اور یہاں ابراہیم خلیل اللہ کے تہیۂ قربانی سے خوش ہو کر آئندہ کے لئے صرف جانوروں کی قربانی پر راضی ہو گیا۔

اہل مذاہب کا یہ اعتقاد بھی بہت قدیم ہے کہ خدا ہماری التجائیں سنتا اور ان کو پورا کرتا ہے۔ اس لئے اب اہم اعتقادات کو پیش نظر رکھ کر قدرتاً چند سوال پیدا ہوتے ہیں جو اصل بنیاد ہیں لامذہبیت کی اور چونکہ اسوقت تک اہل مذہب کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکے ہیں اس لئے ملحدین خود ہی اس سے ایک نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں اور اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔

شبہات ملاحظہ ہوں:۔

کیا مذہب کی بنیاد کسی حقیقت معلومہ پر قایم ہے؟

کیا واقعی کوئی ایسی ہستی پائی جاتی ہے جسے خدا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے؟

کیا واقعی خدا ہمارا تمہارا خالق ہے؟

کیا واقعی اس نے کبھی ہماری دعاؤں کو سنا ہے؟

کیا واقعی قربانیوں سے خوش ہو کر اس نے کسی قوم کے ساتھ کوئی خاص رعایت روا رکھی ہے؟

(۱) اگر واقعی اسی نے انسان پیدا کیا ہے تو کیوں ایسے افراد اس نے پیدا کئے جو مسخ و قبیح ہیں، مفلوج و محتاج ہیں اور ذہنی حیثیت سے حد درجہ پست۔

مجرموں، دیوانوں اور بے عقل لوگوں کو پیدا کرنے میں اس کی کیا مصلحت تھی۔ کیا کوئی ایسی قوت کی طرف سے جسے فراستِ کل اور قوت مطلق کہتے ہیں، ان نقایص تخلیق کی کوئی معقول توجیہ پیش کی جا سکتی ہے

(۲) اگر خدا تمام امور عالم کا مدبر و منتظم ہے تو کیا وہ ان بادشاہوں کے افعال کا ذمہ دار نہیں ہے جنھوں نے دنیا میں سوائے ظلم کے اور کچھ نہیں کیا؟

کیا وہ ان تمام لڑائیوں کا ذمہ دار نہیں ہے جن میں لاکھوں بیگناہوں کا خون بہایا جاتا ہے؟

کیا وہ دورِ غلامی اس کی مرضی کے موافق نہ تھا جب صدیوں تک ہزاروں بیگناہ انسانوں کی پیٹھ کوڑوں سے لہولہان بنی رہی اور بے شمار ماؤں کے مضطرب سینوں سے اُن کے بلکتے ہوئے بچے جدا کر کرکے قتل و ذبح کر دئے گئے۔

کیا وہ اُن مذہبی تعذیبات کا ذمہ دار نہیں جو بیگناہ انسانوں کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونک دینے اور شکنجے میں تان تان کر ایک ایک جوڑ علیحدہ کر دینے پر مشتمل تھے۔

خدا نے کیوں ظالموں اور بدکرداروں کو مہلت دی کہ وہ بہادروں اور نیک کرداروں کو پامال کریں خدا نے کیوں کافروں کو اس کا موقعہ دیا کہ اس کے خاص بندوں کو عذاب میں مبتلا کریں۔ اگر ایک رحم و کرم والا خدا واقعی کائنات کا مدبر ہے تو یہ آئے دن کے طوفانوں، زلزلوں، دباؤں اور خشک سالیوں کی کیا توجیہ ہوسکتی ہے؟ سل و دق، سرطان و خناق اور اسی طرح کی سینکڑوں بیماریاں پیدا کرنے کا کیا سبب ہوسکتا ہے جن سے نہ معصوم بچے جانبر ہوسکتے ہیں نہ زاہد و مرتاض انسان۔

درندوں کا انسانوں کو پھاڑ کر کھاتے رہنا۔ زہریلے سانپوں کا لوگوں کو ڈستے رہنا، اور خدا کا کچھ نہ کہنا، عجیب معمہ ہے۔

کیا اس نے ناخن و چنگال اسی لئے پیدا کئے کہ وہ گوشت کے ریشے جدا کرتے رہیں، کیا اسنے پروبال اسی لئے بنائے ہیں کہ معذور و بیکس آسانی سے گرفت میں آسکیں، کیا اس نے جراثیم اسی لئے پیدا کئے ہیں کہ وہ انسانوں کو اندھا، کوڑھی، مسلول و مدقوق بنا کر اپنی بھوک مٹاتے رہیں۔

کیا کائنات کی تنظیم اسی طرح ممکن تھی کہ ایک جاندار کی زندگی دوسرے جاندار کے گوشت و خون پر منحصر ہو اور کیا تدبیرِ عالم یہ آہ و بکاء کا ہنگامہ پیدا کئے بغیر محال تھی؟ پھر ان واقعات و حالات پر غور کرو اور سمجھو کہ مذہب کیا ہے؟

وہ نام ہے صرف ایک بے بنیاد خوف کا — ایک خوف جو خود ہی ایک قربانگاہ بناتا ہے اور خود ہی اس پر قربانیاں چڑھاتا ہے۔ خود ہی ایک معبد طیار کرتا ہے اور خود ہی وہاں جھک جاتا ہے۔

مذہب ہمیں وہی باتیں سکھاتا ہے جو صرف ایک غلام ہی کے لئے موزوں ہیں — اطاعت، فرمانبرداری نفس کشی، صبر و تحمل، عدم مقاومت اور اپنے آپ کو مٹا دینا۔

خود مختاری، سرفرازی، خود اعتمادی، جرأت و اقدام کا وہاں کوسوں پتہ نہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ خدا مالک ہے اور انسان اس کا غلام، لیکن مالک چاہے کتنا ہی بڑا ہو غلامی کو خوشگوار نہیں بنا سکتا۔

اگر خدا کا وجود ہے تو ہم کیونکر جان سکتے ہیں کہ وہ رحم و کرم والا بھی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ لاکھوں کروڑں غریب و جفاکش انسان ہل چلا رہے ہیں، کھیتیاں بو رہے ہیں اور ان کی زندگی کا انحصار صرف اسی محنت پر ہے لیکن وہ پانی نہیں برساتا، کھیتیاں مرجھا رہی ہیں لیکن پانی کا ایک قطرہ نہیں گرتا، کروڑوں انسان اپنی مایوس و منتظر آنکھوں سے آسمان کو دیکھ رہے ہیں لیکن سوائے جھلسا دینے والے آفتاب کے بادل کا ایک ٹکڑا بھی انھیں کسی جگہ نظر نہیں آتا۔ خدا اُن کے دل کے اضطراب کو دیکھتا ہے اور رحم نہیں کھاتا اُن کی اشک آلود آنکھوں کو دیکھتا ہے اور خاموش رہتا ہے۔ بچے ماؤں کی خشک چھاتیوں سے لگے ہوئے بلک رہے ہیں اور دودھ نہیں پاتے، مائیں آنچل پھیلا پھیلا کر اپنے بھوکے بچوں کا واسطہ دے دیکر دعائیں مانگ رہی ہیں، لیکن کوئی سننے والا نہیں۔ پھر کیا خدا کا رحم و کرم ثابت کرنے کے لئے بادِ سموم کے اُن جھونکھوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جو بستیوں کی بستیاں تباہ کر جاتے ہیں اور میدانوں کو لاشوں سے بھر دیتے ہیں۔ کیا اس کی شفقت و محبت کے ثبوت میں زلزلوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جب زمین ہزاروں انسانوں کو نگل جاتی ہے کیا آتش فشاں پہاڑوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جن کے شعلے بچے بوڑھے کی بھی تمیز نہیں کرتے۔

کیا اگر یہ تباہکاریاں نہ پائی جائیں تو ہم کو یہ شک کرنے کا موقع ملیگا کہ خدا اپنے بندوں کی طرف سے غافل ہے کیا اگر زلزلہ و طوفان، قحط و وبا کی مصیبتیں نازل نہ ہوں تو ہم کو یہ کہنے کا موقع ملیگا کہ خدا مہربان نہیں ہے۔

الٰہیات والے کہتے ہیں کہ خدا نے تمام انسانوں کو یکساں پیدا نہیں کیا، اس نے قد و قامت، رنگ و صورت، ذہن و فراست کے لحاظ سے قوموں کو ایک دوسرے سے متمایز کر دیا ہے۔ تو کیا بلند قوموں کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے انھیں پست نہیں بنایا۔ یقیناً شکر کی بات ہے۔ لیکن اس صورت میں کیا پست قومیں اس بات کا شکریہ ادا کریں گی کہ خدا نے انھیں جانور نہیں بنایا؟

جب خدا نے بلند و پست قوموں کو بنایا تھا تو کیا یہ بات اس کے علم میں نہ تھی کہ بلند قومیں پست قوموں کو غلام بنائیں گی، ان کو ایذائیں پہونچائیں گی اور تباہ و برباد کر دیں گی۔

کیا وہ نہ جانتا تھا کہ یہ بلند و پست کا امتیاز دنیا میں کتنا خون بہائے گا، نوعِ انسانی کو کن کن مسائب میں مبتلا کرے گا، کتنے میدان لاشوں سے پاٹ دیگا، کتنے غلاموں کے جسم کا گوشت کوڑوں کی ضرب سے پارہ پارہ کرے گا، اور کتنی ماؤں کے دل اُن کے بچے جدا کر کے تڑپائے گا۔ پھر اگر یہ سب کچھ اس کے علم میں ہوا تو اس کا رحم و کرم اس سے زیادہ دلدوز منظر کا منتظر تھا۔

وہ قید خانے جن کی سنگین دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر دنیا کے بہت سے بلند اخلاق والے انسانوں نے جانیں دیدیں، وہ سولیاں جو مقدس انسانوں کے خون سے رنگین بنائے جانے کے لئے نصب کی گئیں

وہ غلاموں کی جماعتیں جن کی پیٹھ کے زخموں کو خشک ہونے کا کبھی موقعہ نہیں دیا گیا، وہ مقدس ہستیاں جن کا ایک ایک جوڑ شکنجہ میں تان تان کر علحدہ کیا گیا، جن کی کھالیں کھنچوا کھنچوا کر بھس بھروا یا گیا، وہ بیشمار انسان جو قحط و وبا کا شکار ہوئے، جن کو زمین نے نگل کر ڈکار تک نہ لی، جن کو سانپوں نے ڈسا، آتش فشاں پہاڑوں نے جھلسایا۔ اور وہ لاتعداد بدکار ظالم انسان جنھوں نے دُنیا میں تمام مظالم توڑے اور کامیاب زندگیاں بسر کیں ۔ کیا یہ اور اسی طرح کے تمام سمجھ میں نہ آنیوالے واقعات رحم وکرم والے خدا کے علم سے باہر تھے اور کیا یہ سب کچھ بغیر اس کی مرضی کے ہوا ؟

انسان نے ہمیشہ کسی نہ کسی مافوق الفطرت ہستی کا دامن پکڑنا پسند کیا۔ اگر اس نے پتھر کو پوجنا چھوڑا تو ایک اور غیر معلوم قوت کے سامنے جھک گیا۔ جس کو وہ صحیح راہ دکھانے والا باور کرتا ہے لیکن حقیقت کیا ہے ؟

انسان فطرتاً اقدام پسند واقع ہوا ہے، وہ ہمیشہ آگے قدم بڑھاتا ہے اور تجربات اس کو بتاتے ہیں کہ اسنے جو قدم اُٹھایا تھا وہ صحیح تھا یا غلط۔

ایک آدمی کسی جگہ کا ارادہ کر کے چل پڑتا ہے۔ وہ ایک ایسی جگہ پہونچتا ہے جہاں دو راستے پھٹتے ہیں، وہ بایاں راستہ اختیار کر لیتا ہے لیکن اسے کچھ دور چل کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ راستہ غلط تھا، وہ واپس آتا ہے اور داہنے ہاتھ کا راستہ اختیار کر کے منزل تک پہونچ جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اس جگہ پہونچنے میں غلطی نہیں کرتا اور ہمیشہ سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قوت نے کیا رہنمائی اس کی کی۔

ایک بچہ شعلہ کی چمک دیکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور جل جاتا ہے اس کے بعد پھر یہ جرأت وہ کبھی نہیں کرتا۔ تو کیا یہ سبق اُس کو اسی قوت نے دیا یا خود اس کے تجربہ نے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے تجربات میں خود وہ قوت پنہاں ہے جو صحیح راستہ بتانے والا ہے، یہ قوتِ ادراک و ارادہ سے بالکل معرّا ہے، اور اس کا نام ہے تجربہ۔

بہت سے لوگ ضمیر اور احساس اخلاق کے وجود کو، وجود خدا کی دلیل بتاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان طبعاً تمدن پسند واقع ہوا ہے اور خانوادوں، قوموں اور قبیلوں کی صورت میں ہمیشہ زندگی بسر کرتا چلا آیا ہے۔ پھر قبیلہ کے جن افراد نے خاندانی وعائلی مسرتوں میں اضافہ کیا وہ اس کے اچھے اعضاء شمار کئے گئے اور جنھوں نے تکلیفیں پہونچائیں انھیں بُرا سمجھا گیا اور یہیں سے اخلاق کے اچھے بُرے ہونے کا معیار قائم ہوا۔

وحشی قوموں میں ہمیشہ فوری نتائج پر غور کیا جاتا ہے، لیکن ترقی یافتہ قوموں میں نتائج بعیدہ کو سامنے

رکھا جاتا ہے اور اس طرح اخلاق کا معیار بلند تر اور فرض شناسی کا احساس قوی تر ہوتا جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس میں کسی مافوق الفطرت قوت کا کوئی دخل نہیں ہے۔

مذہب کیا ہے؟ انگرسول عیسوی مذہب کو سامنے رکھ کر پوچھتا ہے کہ عیسویت نے دنیا کو کیا فائدہ پہونچایا جب اس کا اقتدار قایم تھا تو کیا اس نے انسان کو زیادہ بہتر انسان بنایا۔ اس کا اثر اطالیہ، اسپین، پرتگال اور آئرلینڈ پر کیا ہوا۔ ہنگری اور آسٹریا کو کیا فایدہ اس سے حاصل ہوا۔ انگلستان، امریکہ، ہالینڈ، واسکاٹلینڈ نے کیا تمتع اس سے حاصل کیا۔ اگر عیسویت کے سوا وہ کسی اور مذہب کے پیرو تھے تو کیا وہ خراب ہو گئے تھے۔ اگر ٹور کسمڈا، زردشتی مذہب کا پابند ہوتا تو کیا اور زیادہ خراب انسان ہوتا۔ کیا کالون اور زیادہ خونخوار بن جاتا اگر وہ یہودی ہوتا، کیا ڈچ اور زیادہ احمق ثابت ہوتے اگر وہ تثلیث مسیحیت کے قایل نہ ہوتے، کیا جان ناکس اور زیادہ بُرے اخلاق کا ہو جاتا اگر بجائے مسیح کے وہ کنفوشس کا ماننے والا ہوتا۔

مذہب کا ہر زمانہ اور ہر ملک میں بہت کافی تجربہ ہو چکا ہے اور اب اس کی ناکامی پر مزید حجت پیش کرنے کے لئے کسی اور جدید تجربہ کی ضرورت نہیں ہے۔

مذہب کبھی انسان کے دل میں جذبۂ رافت و اُلفت پیدا نہیں کر سکا اور اس کے ثبوت میں مذہبی تاریخ کے وہ اوراق پیش کئے جا سکتے ہیں جن کا ایک ایک حرف خون سے رنگین ہے۔

مذہب، علم و تحقیق کا ہمیشہ دشمن رہا ہے اور اس نے کبھی ذہنی آزادی کا ساتھ نہیں دیا۔

مذہب کبھی انسان کو محنتی، جفاکش اور ایماندار بنانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ چنانچہ وحشی اقوام کی برائیوں کا سبب صرف ان کی مذہبی واہمہ پرستی ہے۔

وہ لوگ جو فطرت کی یکسانیت کے قایل ہیں ان کے لئے مذہب کا خیال کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

کیا انسان، فطرت اور صفاتِ مادہ کو اپنی دعاؤں سے متاثر کر سکتا ہے، کیا ہم طوفانوں کو پوجا پاٹ کے ذریعہ سے کم و بیش کر سکتے ہیں، کیا ہم قربانیاں پیش کر کے ہواؤں کا رخ بدل سکتے ہیں، کیا ہم الحاح وزاری سے بیماری کا علاج کر سکتے ہیں۔ کیا عزت و سربلندی بھیک مانگنے سے مل سکتی ہے؟

وہ چیز جسے ہم نفس کہتے ہیں کیا وہ قانون قدرت کا اسی طرح پابند نہیں جس طرح ہمارا جسم؟

مذہب کی بنیاد اس خیال پر قایم ہے کہ عالمِ فطرت کا کوئی ایک مالک ہے، جو دعاؤں کو سنتا ہے، اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے اور جزا و سزا دیتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ واقعات کی دنیا میں کوئی

ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی جس سے ہمیں ان اعتقادات کی تصدیق ہو سکے۔

جب ہم کوئی نظریہ قایم کرتے ہیں تو اس کے لئے کوئی نہ کوئی بنیادی حقیقت ضرور ہوا کرتی ہے، محض وہم و قیاس پر کوئی اُصول مرتب نہیں ہو سکتا، اس لئے اگر ہم لامذہبیت کا نظریہ پیش کرتے ہیں تو اسکے لئے چند بنیادی حقایق بھی اپنے پاس رکھتے ہیں۔

مثلاً ایک یہ کہ مادہ و قوت فنا نہیں ہو سکتے، دوسرے یہ کہ مادہ و قوت ایک دوسرے سے علحدہ نہیں ہو سکتے، تیسرے یہ کہ جو چیز غیر فانی ہے وہ غیر مخلوق ہے، قدیم ہے۔

دُنیا میں ذہانت و ذکاوت کا وجود صرف قوت کی وجہ سے ہے اور قوت بغیر مادہ کے ممکن نہیں اس لئے معلوم ہوا کہ ذکاوت صرف قوت و مادہ کی ممنون ہے اور اس باب میں کسی ایسی مافوق الفطرت ہستی کے تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں جسے مدبّر کائنات کہا جائے۔

اگر مادہ و قوت ازلی و ابدی ہیں تو جو کچھ ممکنات میں تھا وہ واقع ہوا، جو ممکنات میں ہے وہ ظاہر ہو رہا ہے اور آیندہ بھی رونما ہوتا رہیگا۔ کائنات میں اتفاق کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہوتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور پایا جاتا ہے۔ جس چیز کو ہم حال کہتے ہیں وہ ماضی کی پیداوار ہے اور جس کا نام مستقبل ہے وہ نتیجہ ہوگا حال کا جو کچھ نہیں ہوا ہے وہ ہو ہی نہیں سکتا تھا، اور جو ہو چکا ہے اس کا ہونا لازم تھا۔ سیاروں کی تخلیق و گردش سے ایک رینگنے والے کیڑے کی حرکت تک سب اسی قانون سے جکڑے ہوئے ہیں اور اس کے خلاف کسی بات کا ظاہر ہونا ناممکن ہے۔

ہزاروں سال سے دنیا کی اصلاح کی کوشش جاری ہے اور اس غرض کے لئے دیوتا، دیویاں، بہشت و دوزخ، الہامات و معجزات، کلیسا و خانقاہ، قید خانے اور شکنجے، سیکڑوں چیزیں پیدا کی گئیں، ایک بادشاہ کو تخت سے اُتار کر دوسرے کو بٹھایا، ایک ملکہ کی گردن مار کر دوسری کو تخت نشین کیا، آدمیوں کو زندہ جلایا، خونچکانیاں کی گئیں، دعائیں مانگی گئیں، ڈرایا گیا، لالچ دی گئی۔ الغرض مذہب نے بھی کچھ کیا لیکن مقصد آج تک پورا نہ ہوا۔ کیونکہ مذہب غلامی سے ذہن و دماغ کی اور جب تک انسان کا ذہن آزاد و بیدار نہ ہو نوع انسان کی فلاح مجموعی حیثیت سے ناممکن ہے۔

یہ ہیں وہ خیالات اس زمانہ کے ملحد و لامذہب کے جو اخباروں، رسالوں اور لکچروں کے ذریعہ سے

تمام دنیا میں اشاعت پا رہے ہیں اور ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی مقبول ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر ہم دہریت و الحاد کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتے ہیں تو ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ ہم دنیا کے اس ذہنی تشویش و تذبذب کو دور کریں۔ پھر اس کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ ہم منطق و فلسفہ کی پیچیدہ باتوں میں اُلجھا کر فریق مخالف کو خاموش کرنے کی کوشش کریں کیونکہ اس طرح اسکی زبان تو بند ہو سکتی ہے لیکن دل مطمئن نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ضرورت ہے اس مذہبی روح کی تلقین کی جو ظاہری شعائر و مراسم سے بے نیاز ہے اور جس میں سوائے بلند تعلیم اخلاق کے کوئی اور چیز ایسی نہیں پائی جاتی جو ہمیں الہام و معجزات، بہشت و دوزخ، حشر و نشر، قیامت و آخرت کے تسلیم کرنے پر بھی مجبور کرتی ہے۔ یہی وہ تنگ نظری تھی جس نے اہل مذاہب کو ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رکھا اور یہی وہ چیز ہے جو مذہب کے اقتدار کو مٹا کر رہیگی۔ دنیا میں اب کوئی ایسا مذہب نہیں چل سکتا جو تمدنی ضروریات، بین الاقوامی تعلقات، اقتصادی مشکلات، اخلاقی اصولِ عامہ کو پس پشت ڈالکر صرف "امید فردا" پر اپنی کارگاہِ تبلیغ قایم کرے۔ وہ وقت گزر گیا جب مذہب کسی ایک قوم کے لیئے مخصوص ہوا کرتا تھا، اب کہ کرۂ زمین کی ۲۴ ہزار میل کی وسعت کو انسان چند دن میں طے کر لیتا ہے، تخصیص نسل و جغرافیہ کا سوال بالکل لایعنی چیز ہے اور مذہب کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ کوئی ایسا لائحہ عمل پیش کرے جو تمام آبادی کو کسی ایک مشترک پلیٹ فارم پر جمع کر سکتا ہو اور یہ ممکن نہیں جب تک مذہب کے اعتقادی حصہ کو علاحدہ کر کے اسے ہیئت اجتماعی کے اصول پر صرف "سوشل ارگنائزیشن" کی حیثیت نہ دیجائے۔

"نگار" کے پرانے پرچے

حسب تفصیل ذیل دفتر میں موجود ہیں اور علاوہ محصول اس قیمت مِلسکتے ہیں جو اُن کے آگے درج ہے:۔
(۲۲ء) ستمبر ۴ر۔ ۲۳ء مئی ۴ر۔ (۲۴ء) جنوری۔ فروری و اگست ۴ر فی پرچہ (۲۶ء) جنوری ... ن، اکتوبر و نومبر ۴ر فی پرچہ۔ (۲۷ء) اپریل۔ مئی و جون ۴ر فی پرچہ۔ (۳۰ء) مئی ۴ر۔ (۳۱ء) جولائی۔ اگست۔ ستمبر۔ اکتوبر۔ نومبر و دسمبر ۴ر فی پرچہ۔ (۳۲ء) جنوری (غالب نمبر) ۱۲ر ... ری تا دسمبر علاوہ اپریل ۴ر فی پرچہ۔ (۳۳ء) فروری۔ جولائی و اکتوبر ۴ر فی پرچہ۔ (۳۴ء) فروری تا ... و اکتوبر ۶ر فی پرچہ۔ (۳۵ء) جنوری (اُردو شاعری نمبر) عہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

سائنس کے اکتشافاتِ جدیدہ

۱—

صدہا سال سے یہ خیال علماء میں رائج چلا آرہا ہے کہ مادہ تین صورتوں میں پایا جاتا ہے یعنی وہ رقیق ہوگا یا منجمد یا دُخانی (گیسی) حالت میں۔ لیکن فلکیات کے ماہرین کی جدید تحقیقات کے سلسلہ میں معلوم ہوا ہے کہ مادہ کی چوتھی صورت اور بھی ہے۔ یعنی یہ کہ اس کے ذرات بھربھری حالت میں بھی پائے جاتے ہیں جس کا نام انھوں نے "سفوفی ذرات" رکھا ہے۔

فضا میں جتنے سیارے اس سفوفی حالت میں پائے جاتے ہیں وہ دریافت ہو چکے ہیں جن کا نام انھوں نے سفید بونے یا "اقزامِ سفید" (WHITE DWARFS) رکھا ہے۔ اس تسمیہ کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت چھوٹے ہیں اور شعاعوں کی کثرت سے بالکل سفید معلوم ہوتے ہیں۔

ان میں غیر معمولی حرارت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ حال ہی اس سلسلہ کا ایک سیارہ دریافت ہوا ہے اس کی بالائی سطح کا درجۂ حرارت ۱۱۰۰۰ ڈگری ہے یعنی آفتاب کی حرارت سے بھی دو چند۔

ان میں سب سے چھوٹا سیارہ وہ ہے جسے امریکہ کے مشہور ہیئت داں کوپر نے گزشتہ سال دریافت کیا ہے۔ اس کی جسامت کو سورج کی جسامت سے وہی نسبت ہے جو ایک کو ۸۰ لاکھ سے ہے۔ اس کا ثقل پانی سے ۳۰۰۰۰۰۰ گنا زاید ہے یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اس کے ایک مکعب انچ کا وزن ۶۲۰ ٹن ہے۔ اگر سوئی کی نوک کے برابر اس کا ایک ذرہ کسی انسان پر گر پڑے تو سُرمہ کرکے رکھدے۔

اس کا درجۂ حرارت ۲۸۰۰۰ ڈگری ہے اور اسی لئے اس کے ذرات سے پیدا ہونے والی گیس اتنی وزنی ہوتی ہے کہ اگر ٹینس کا ایک گیند اس سے بھر دیا جائے تو اس کا وزن ایک ہزار ٹن ہو جائے۔ اس کی کشش ثقل اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ اس زمین کا ایک انسان جس کا وزن گیارہ اسٹون کا ہے وہاں پہونچکر ۲۵۴۲۲۵ ٹن کا ہو جائے گا اور یہ کشش ثقل اتنی زبردست ہے کہ وہ فوراً پانی کی طرح رقیق ہوکر بہ جائے گا۔

سورج کے ہر مربع انچ سے پچاس گھوڑوں کی طاقت ہر وقت خارج ہوتی رہتی ہے لیکن اس سیارہ کے ہر مربع انچ سے ۳۰ ہزار گھوڑوں کی طاقت پیدا ہوتی ہے۔

ان سیاروں کی قوت آہستہ آہستہ گھٹتی رہتی ہے یہاں تک کہ ان کا اشعاع (RADIATION)
زایل ہو جاتا ہے اور وہ ایک بڑے تاریک ذرہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

۲ —— حال کی تحقیقات سے بعض ماہرینِ سائنس اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ہم نسبتاً خلاء کے ایک بہت خالی
کونے میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور ستاروں کا قریب ترین جھنڈ، کرۂ زمین سے ۲۲ ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے
پیچھے ہٹتا جا رہا ہے۔

انشٹین کا سابق نظریہ کہ خلا میں چونکہ انحنا پایا جاتا ہے اس لئے لامتناہی نہیں ہے، معرض بحث میں آگیا
ہے یہاں تک کہ خود انشٹین بھی مشتبہ ہو گیا ہے۔ اگر انشٹین کا یہ نظریہ صحیح ہو تو خلا کی وسعت صرف آٹھ گنا زیادہ
بڑھ جاتی ہے لیکن جدید تحقیقات سے یہ وسعت اور زیادہ پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور اس لئے وہ فضا میں
انحنا کے خیال سے ہٹتے جاتے ہیں۔

کائنات کی عمر کے متعلق بھی جدید اکتشافات ہوئے ہیں۔ کچھ زمانہ قبل بعض نے یہ خیال قایم کیا تھا کہ
سیاروں کی عمر کا اندازہ کروڑوں نہیں بلکہ ارب اندر ارب سالوں کو سامنے رکھ کر کرنا چاہئے۔ کرۂ زمین کی
عمر کا پتہ چٹانوں سے چلایا جاتا ہے اور اس طرح اس کی عمر دو ارب سال معلوم ہوتی ہے لیکن جو شہاب ثاقب
زمین پر آ کر گرتے ہیں ان کے امتحان سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف زمین بلکہ تمام نظام سیارگان کی عمر اتنی ہی ہے۔

۳ —— زمین کا گزشتہ کارڈ اس وقت تک جتنا معلوم ہوا ہے وہ صرف ۱۶۰۰۰ سال قبل کا ہے یعنی اسوقت تک
جب ڈنمارک، جرمنی اور پولینڈ اول اول برفستان سے نمودار ہوئے۔ لیکن علماء طبقات الارض برابر تحقیقات
میں لگے ہوئے ہیں۔

عہد ثلجی (برف) ایک ایسی دیوار ہے جس سے آگے بڑھنے کی کوئی صورت اس وقت تک پیدا نہیں
ہوئی۔ یہاں تک کہ گرین لینڈ کے اوپر جو غلافِ برف پڑا ہوا ہے اس کی چھان بین سے بھی کوئی زیادہ مفید
مطلب بات معلوم نہیں ہوئی۔

مصنوعی زلزلے پیدا کر کرکے اس غلافِ برف کا عمق معلوم کیا جا رہا ہے۔ اور اس طرح اندر کی طرف
کن چٹانوں کا پتہ چلا ہے ان میں مختلف لچک پائی جاتی ہے۔ بعض چٹانیں بالکل خشک دریافت ہوئی ہیں
اور بعض بالکل تر۔

اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ زمین کے اندر فراہمی آب کے خزانے کہاں اور کن صورتوں میں
پائے جاتے ہیں اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو اصحاب علم و سیاست دونوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہے۔
بعض تحقیقاتی پارٹیاں جو نیو گائنا اور پاپوا کی طرف اسی سلسلہ میں گئی تھیں وہ اتفاقاً بعض ایسے قوموں

سے بھی دوچار ہوئیں جو ہنوز عہد حجری کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔

چار مہمیں قطب جنوبی کی طرف حال ہی میں روانہ ہوئی تھیں۔ ان کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی ایسی بیماریاں جو کرۂ ارض کے آباد علاقوں میں ناقابل علاج سمجھی جاتی ہیں یہاں از خود دور ہو جاتی ہیں۔ یقیناً وہ زمانہ دور نہیں ہے جب قطب جنوبی کے جامد حصے انسانی آبادی کے لئے کھل جائیں گے اور وہاں زندہ رہنے کے ذرایع ہاتھ آجائیں گے۔

۴ ـــــ علمائے نفسیات کی یہ جدید ترین تحقیق بہت حیرت سے دیکھی جائے گی کہ بعض ایسی بیماریاں جو صحت انسانی کو بالکل غارت کر دینے والی ہیں۔ مثلاً۔ سوء ہضم۔ غدود حلق کی خرابی۔ پائیریا وغیرہ۔ ان کا کوئی اثر انسان کی ذکاوت و ذہانت پر نہیں پڑتا۔

انسان کا ذہنی و دماغی نشو و نما جسمانی نشو و نما سے بالکل علحدہ ہوتا رہتا ہے اور جب تک نظام عصبی کو متاثر کرنے والی بیماری پیدا نہ ہو ذہنی نشو و نما بدستور ہوتا رہتا ہے۔

دوسری عجیب تحقیق یہ ہے کہ سال کے جس موسم میں انسان پیدا ہوا ہو وہی موسم اس کی دماغی حالت پر بہت اثر انداز ہوتا ہے چنانچہ سترہ ہزار لڑکوں کی جانچ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ جو بچے جاڑوں میں پیدا ہوتے ہیں وہ نسبتاً کم ذہین ہوتے ہیں۔

دنیا نظریۂ "تاثر عادیہ" (CONDITIONED REFLEXES) سے واقف ہو چکی ہے جس نے پاولو، روس کے سائنس داں کو مشہور کر دیا۔ اس نظریہ کا مفہوم یہ ہے کہ عادتاً جو باتیں ہوتی رہتی ہیں اس کا اثر بعض حالات بدلجانے کی صورت میں بھی وہی باقی رہتا ہے۔ مثلاً اگر کتا کھاتے وقت کسی گھنٹی کی آواز سننے کا عادی ہو گیا ہے۔ تو پھر کھانا سامنے ہو یا نہ ہو محض اس گھنٹی کی آواز سنکر اس کے منہ میں پانی بھر آئے گا۔

اب جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ اس طریق سے جانوروں کو بیماری سے بھی محفوظ رکھا جا سکتا ہے اگر کسی جانور میں گھنٹی یا بگل بجا بجا کر دافع زہر دوا خون میں پہونچانے کے بعد زہر کی پچکاری دینے کی عادت ڈالدیجائے تو چند دن بعد یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی کہ دافعِ زہر دوا دیجائے یا نہ دیجائے محض گھنٹی یا بگل کی آواز ہی زہر کے اثر کو دور کرنے والی ثابت ہو گی۔

ایک دوسرا اکتشاف ماہرین نفسیات نے یہ کیا ہے کہ سیکھنے کی قوت انسان میں ۲۰ سال کے بعد کم ہونے لگتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ تجربہ بھی کیا گیا ہے کہ اگر مطالعہ کے بعد دیر تک گہری نیند لیجائے تو جو کچھ پڑھا ہے وہ حافظہ میں محفوظ رہتا ہے، اسی لئے رات کا مطالعہ ہمیشہ مفید سمجھا گیا۔

حافظہ خواہ وہ شعوری ہو یا نیم شعوری انسان کی زندگی پر بہت کچھ اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک لڑکے کو اس کی ۱۵ ماہ کی عمر سے یونانی زبان کا ایک ڈرامہ سنایا جانے لگا اور تین سال تک برابر یہی عمل جاری رہا۔ چھ سال بعد وہی حصے ڈرامے اس کو پڑھائے گئے جو اس کے سامنے دُہرائے جاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ حصے اس کو بہت جلد یاد ہو گئے اور جو حصے اس کے سامنے دہرائے نہیں گئے تھے ان کے یاد کرنے میں اسے بڑی دقت محسوس ہوئی۔

لیکن وہ کیا چیز ہے جو انسان کو یہ قوت عطا کرتی ہے، دماغ کی حقیقت کیا ہے اور وہ کیونکر کام کرتا ہے۔ ایک شخص کیوں فوراً اپنے اعضاء میں وہی جنبش پیدا کر سکتا ہے جو اس کا ارادہ ہے۔ یہ باتیں ہنوز زیرِ تحقیق ہیں اور ماہرینِ نفسیات کے ساتھ اطبّا و کیمیا دَانین بھی نظامِ عصبی کے اس عمل پر غور کر رہی ہیں۔

اسوقت تک اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ ایک عصب (NERVE) کی کیفیت بالکل برقی تار کی سی ہے اور جب دماغ کوئی حکم کسی خاص عضو کو دینا چاہتا ہے تو عصب کے ذریعہ سے مثل برقی تار کے اس عضو تک پہونچتا ہے لیکن درمیان میں اس حکم کو کئی اسٹیشنوں سے گزرنا ہوتا ہے اور ہر اسٹیشن پر ایک خاص کیمیاوی تغیر پیدا ہوتا ہے۔ ان تغیرات کا کافی مطالعہ ہو چکا ہے یہاں تک کہ ماہرین کہہ سکتے ہیں کہ ہر اسٹیشن پر کیا کیا کیمیاوی تغیرات پیدا ہوئے۔

مکتوبات نیاز

صدیقی -

کرمنامہ ملا - آیئے ، شوق سے تشریف لایئے ، لیکن یہ احسان رکھنے نہ آیئے کہ یہ زحمتِ سفر آپ نے صرف میری وجہ سے اختیار کی ہے - یہ تو اس سے کہئے جو آپ کی فطرت سے واقف نہ ہو -

دل جائے دیگرست ونگہ جائے دیگرست

اور ہاں ، یہ دوسرے صاحب آپ کے ساتھ کون ہیں - میں ان سے بالکل واقف نہیں — دوست کا دوست دوست بھی ہوسکتا ہے اور دشمن بھی - اب خدا جانے مجھے ان کی پذیرائی دوست کی حیثیت سے کرنا ہوگی یا دشمن کی حیثیت سے — بہرحال اگر بر بنائے تکلف ، ان کو یہاں قیام میں کوئی تکلیف ہوئی تو اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے -

---

کرمفرمائے نیازمنداں -

گرامی نامہ کے جواب میں غیر معمولی تعویق ہوئی ، معافی چاہتا ہوں - میں کل ہی ایک طویل سفر سے واپس آیا ہوں اور آج صبح سب سے پہلے جو کام کیا ہے وہ یہ تحریرِ معذرت ہے -

آپ نے جس مسئلہ میں میری رائے دریافت فرمائی ہے وہ اتنی پیچیدہ تو نہیں ہے کہ مجھے زیادہ غور کرنے کی ضرورت لاحق ہو ، لیکن جی یہی چاہتا ہے کہ پہلے اعتکاف کروں اور پھر نمازِ استخارہ پڑھکر خواب میں ملہمِ غیب کی ہدایت کا منتظر رہوں - کیونکہ جب تک میں کوئی ایسی مافوق الفطرت سند پیش نہ کروں آپ کیوں ماننے لگے

قبلہ ، آپ کس وہم میں پڑے ہوئے ہیں ، میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں اور اب پھر عرض کرتا ہوں کہ اس باب میں زیادہ پس وپیش کی ضرورت نہیں -

ختمِ رسالت کے بعد فرشتے تو اب اس دنیا میں آنا ہو گئے ہیں بند ، اس لئے لامحالہ آپ کو انھیں گنہگار آدمیوں میں سے کسی نہ کسی کا انتخاب کرنا پڑے گا - پھر زیادہ سے زیادہ آپ یہی فکر کرسکتے ہیں کہ کم سے کم معصیت کی ہو وہ آپ کے ہاتھ آجائے — حالانکہ دنیا میں عقل معصیت ہی سے بڑھتی ہے

سو، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اور میں کیا یقین دلاتا ہوں خود ان کی حماقتیں آپ کو باور کرا دیں گی کہ وہ کافی سے زیادہ معصوم واقع ہوئے ہیں۔

میرا نظریہ اس باب میں آپ سے بہت مختلف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شوہر بننے کی صلاحیت انسان میں چالیس کے بعد پیدا ہوتی ہے جب وہ تمام گناہوں سے سیر ہو چکا ہو۔ صورت کا سوال چنداں اہم نہیں آپ یہ چاہتے ہیں کہ وہ خوبصورت بھی ہو، جوان بھی ہو اور اس پر طلب محال یہ کہ خیال و تصور میں بھی اس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ سو، حضت، آپ کو ایسے نوجوان تو مل جائیں گے جو صائم الدہر بھی ہوں، تہجد گزار بھی ہوں دلایل الخیرات کا بھی ورد رکھتے ہوں، لیکن اس کا یقین کیونکر ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ وہ جذبات شباب سے خالی الذہن ہو کر کر رہے ہیں۔

آپ ایک فطری رسم ادا کرنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ فطرت سے جنگ بھی کر رہے ہیں۔ عجیب تماشہ ہے۔

بہت زمانہ ہوا جب تھوڑی سی بے اعتدالی اُن سے ہوئی تھی، لیکن جب سے وہ "ہاروت" بنانے والی "زہرہ" غروب ہو چکی ہے، پھر کوئی اور اطلاع اس قسم کی کانوں تک نہیں پہونچی۔ پھر اس سے زیادہ بجھے ہوئے دل کا آدمی آپ کو اور کہاں ملیگا، زیادہ چھان بین نہ کیجئے اور اس فرض سے سبکدوش ہو کر ہجرت کر جائیے۔ تاکہ اس احتساب کے عذاب سے آپ کو نجات ملجائے۔

یہ تم شعر سمجھنا چاہتے ہو یا اس پر جرّاحی کرتے ہو۔ شاعری نہ اقلیدس کا مقالہ ہے نہ حدیقۂ حکیم سنائی کہ "دو اور دو چار" کے سے حقایق اس میں نہ پائے جائیں تو درس اخلاق ضرور ہو۔

نقش و نگار سے لطف اُٹھانے کے لئے صرف نگاہ سے کام لینا چاہئے، تم نے اگر اُن کو کھرچ کر یہ دیکھنا چاہا کہ ان کے پیچھے کیا ہے تو سوائے بے آب و رنگ کاغذ کے اور کیا ملیگا؟

غالب کا یہ شعر کتنا پاکیزہ ہے:-

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

لیکن اگر تم نے یہ بحث شروع کر دی کہ غالب کانچ گلانے کے فن سے کب واقف تھا، یا یہ کہ اُسوقت بلیماروں میں شیشہ گروں کی دوکانیں کہاں تھیں جہاں انھوں نے آبگینہ کے پگھلوایا ہوگا یا یہ کہ ساغر میں ڈالتے کے بعد کانچ رقیق کیونکر رہا ہوگا کہ پیا جا سکتا، یا یہ کہ اس کے پینے کے بعد کوئی زندہ کیونکر رہ سکتا تھا۔ تو سوائے

اس کے کہ سننے والا اپنا مُنھ پیٹ لے اور کیا کر سکتا ہے۔
جن اشعار کا تم نے مضحکہ اُڑایا ہے ان سے لطف اُٹھانے کی اہلیت تم میں ہئی نہیں۔

ہوتا ہے ازدحام تمنا اسی قدر
ہوتی ہے جتنی دیر کشودِ نقاب میں

اس شعر کے سمجھنے میں تم نے جس بدتمیزی سے "جنسی جذبات" کا تجزیہ کیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ تمھاری انتہائی بدذوقی کو ظاہر کرتا ہے، بلکہ فی نفسہٖ "شباب" کی بھی توہین ہے۔
ایک شعر سے لطف اُٹھانے کے لئے شاعر کی "نفسیات" سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم کو خود اپنے علوئے نفس سے کام لینا چاہئے۔ اور اسے بھی جانے دو میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمنا کا ایک خاص مفہوم قرار دینا اور پھر لفظ "ازدحام" کی چھان بین میں اتنی بدتمیزی کا اظہار۔ اس کا تمھیں کیا حق حاصل تھا، جبکہ "کشودِ نقاب" کی تعیین خود اس کے منافی پڑتی ہے۔
ایک صاحب تم سے بھی زیادہ خوش تمیز یہاں موجود ہیں۔
غالب کا مشہور شعر ہے:-

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

انھوں نے رسوائی اور خلوت کو ملا کر ایک عجیب مفہوم پیدا کیا ہے۔ یعنی شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ اگر خلوت میں آپ نے مجھے بلا لیا تو رسوائی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، کیونکہ دُنیا جانتی ہے میں بالکل ضعیف و ناکارہ ہوں اور کسی کو کچھ شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔
بولو قایل ہوئے کہ نہیں۔ اب آؤ گے تو میں تمھیں انھیں کا شاگرد کرا دوں گا۔ ایسے سخن فہم زمانہ میں شاذ و نادر پیدا ہوتے ہیں۔

میرے عزیز دوست۔
آپ کی داستانِ درد سنکر سخت تکلیف ہوئی لیکن آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ جو شخص مصائب کو خود دعوت دے، اُسے شکوہ و شکایت کا کیا حق حاصل ہے۔
آپ کو یاد ہوگا میں نے پہلے ہی مطلع کر دیا تھا کہ دیکھئے اس سے بچئے۔ ایسی مردم فریب صورت یا تو اسوقت نظر آئی تھی جب آدم اس کے مشورہ پر عمل کر کے عدن سے نکالے گئے یا اب اس شخص کو ملی ہے

لیکن آپ نہ مانتے اور آخر کار وہی ہوا جو ہونا چاہئیے تھا۔

میں نے ایک شاعر کے متعلق اپنے تصور کو ہمیشہ بہت بلند پایا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اُصولاً شاعر سے بہتر اخلاق کسی اور کا نہ ہونا چاہئیے۔لیکن یہ بدنصیبی صرف ہندوستان کے حصہ میں آئی ہے کہ جو شخص جتنا اچھا شعر کہتا ہے اتنا ہی زیادہ بداخلاق ہے۔

بہرحال اب بھی کچھ نہیں گیا۔جرأت سے کام لیکر ان سے صاف صاف کہدیجئیے کہ آئندہ مہربانی کی ضرورت نہیں۔ ورنہ سچ کہتا ہوں وقت وہ آنے والا ہے جب آپ خودکشی کے لئے زہر کا پیالہ ہاتھ میں لئے ہوں گے اور وہ دیکھ کر مسکرا رہا ہوگا۔

بہرحال مجھے آئندہ کوئی اطلاع دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں خود سن لوں گا آپ کا کیا حشر ہوا۔

باب المراسلۃ والمناظرہ

(جناب ابوالکمال امید امیٹھوی)

حبیبی ـــ آپ سے یوں تو تقریباً روزانہ گفتگو کا موقع ملتا رہا ہے لیکن آج تحریری گفتگو کو جی چاہتا ہے اور ضرورت بھی ہے۔ ممکن تھا کہ جو کہنا چاہتا ہوں آپ سے کسی صحبت میں زبانی کہتا مگر اس خیال سے کہ میں گفتگو شروع کرتا اور کوئی صاحب، تسلیم یا اسلام علیکم کہکر اپنا قصہ شروع کر دیتے اور میں اپنا سا منھ لیکر رہ جاتا اور آپ کا دل و دماغ دوسری طرف بٹ جاتا، پریشان ہو جایا کرتا تھا یہاں تک کہ بہرائچ چلا آیا۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے کہا تھا کہ شاید آپ کی روانگی سے پہلے میں بہرائچ چلا جاؤں۔ اس لئے بغیر ملے ہوئے چلے جانے کا عذر قبول فرمائیے۔

ہاں تو کہنا یہ ہے کہ واقعہ معلومہ کے بعد مجھ ایسے "فرسودہ رسم ہائے عزیزاں فروگزار" کے تحت پر ایک اچھا خاصہ ڈھیر خطوط کا جمع ہو گیا جس کو آپ تعزیت نامہ یا پُرسا کہہ سکتے ہیں ان احبا و اعزا کے خطوط میں بجز اس کے کہ "خدا صبر جمیل عطا فرمائے" اور کچھ نہیں ہے اور یہی مہمل جملہ لوگوں سے سُنتے سُنتے تھک گیا ان میں ایک شخص بھی آپ کی طرح۔ "در سور نوحہ خواں بہ بزم عزا برقص" کا مصداق نہ ملا۔ غرض وحشت برابر بڑھتی گئی خدا انور تقی صاحب کو زندہ سلامت رکھے جنھوں نے مجھے زبردستی یہاں کھینچ بلایا اور ہر ممکن سامان میرے غم غلط کرنے کا بہم پہونچایا۔ آج کسی قدر میں اپنے آپ کو مطمئن پاتا ہوں اس لئے اپنا مختصر سا واقعہ زندگی بیان کرنے کے بعد آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ کیا بات ہے چونکہ آپ نفسیات کے ماہر ہیں اور میں آپ کا ارادتمند ہوں خدا کے لئے بتائیے کہ لوگوں کو کیا جواب دوں اور اس حالت کو کیا کہوں۔

صاحب ـ پہلا واقعہ میرے والد کا واقعۂ مرگ ہے۔ جس کا غم مجھے کافی ہونا چاہئے تھا لیکن یہ وہ زمانہ تھا اور اُس عالم میں تھا کہ خدا بھی یاد نہیں آتا پھر بندہ کا جینا مرنا کیا یعنی میرا شباب اور ایک ایرانی خاتون کی شبانہ روز شریک زندگی کی حیثیت سے صحبت۔ ہاں اب خاتون کی موت کو میری زندگی کا پہلا واقعہ کہئے جس کے بعد خیال کرتا تھا کہ اس سے بڑھکر دوسرا غم نہ ہوگا۔

دوسرا واقعہ ایک ہفتہ کے اندر بعارضہ طاعون میری والدہ کا انتقال اور ۲۲ برس کے بھائی کا مرنا اور بہن کے بارہ برس والے بچے کا انتقال۔

تیسرا واقعہ مولانا عبؔ کا مرنا جو میرے اُستاد اور محب تھے۔

چوتھا واقعہ یوسف علی کا۔

لوگ کہتے ہیں کہ جب دل پر چوٹ لگتی ہے تو ایک شاعر بہتر سے بہتر شعر کہہ سکتا ہے میں ان واقعات پر ایک مصرع بھی موزوں کرنے کے قابل نہیں رہا۔ جب کوشش کی قلم ہات سے چھوٹ پڑا دماغ مختل ہوگیا۔ حالانکہ اُردو فارسی سیکڑوں تاریخیں میری ان واقعات کے ماسوا موجود ہیں میرا یہ خیال ہے کہ میں نے جن کی تاریخیں لکھی ہیں اُن کا غم صحیح معنوں میں مجھے نہ تھا اور جو کچھ لکھا وہ محض شاعری تھی یا قادرالکلامی آپ بتائیے کہ یہ کیا حالت ہے شاعری کیوں بیسرکار نہیں آتی۔ کیوں ان واقعات پر قلم نہیں اُٹھتا یہ غم نہیں ہے یا وہ رنج نہیں تھا جس پر زور شاعری صرف کیا گیا۔ احباب کہتے ہیں کہ جو شخص سیکڑوں مادۂ تاریخ نکال چکا ہو وہ بیٹے کے مرنے کی اطلاع سندسے کیا قہر ہے خدا کے لئے اس کا جواب لکھئے۔

امید صاحب — گرامی نامہ بالکل خلاف امید پہونچا۔ اچھا کیا اس وقت آپ لکھنؤ سے چلے گئے میں خود بھی آپ سے یہی کہنے والا تھا۔ لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ لکھنؤ چھوڑنے کو کہوں تو کہاں جانے کا مشورہ دوں۔ — بہرائچ کے اس "مردِ غیب" کا علم نہ تھا۔ بہرحال آپ نے خوب کیا کہ چند دن کے لئے اُس ماحول کو چھوڑ دیا ں کا ایک ایک ذرہ آپ کے لئے "یادگارِ غم" ہے۔

مولانا، غم والم ہو یا مسرت ونشاط، سب اضافی چیزیں ہیں۔ "اضافی" سے مراد یہ کہ وہ خود کوئی ستقل وجود نہیں رکھتیں بلکہ پیدا ہوتی ہیں ان حالات و واقعات سے جن سے ایک شخص ضرورتاً یا فطرتاً متاثر ہتا رہتا ہے۔ اسی لئے یہ کیفیتیں گھٹتی بھی ہیں بڑھتی بھی ہیں، فنا ہوتی ہیں اور پھر اُبھر بھی آتی ہیں۔ کہتے ہیں ر کوئی شخص کوشش کرکے پتھر کا دل بنالے — اور آپ شاعر ہونے کی حیثیت سے اس کی ترکیب مجھسے ہتر جانتے ہوں گے — تو احساسِ غم کم ہو جاتا ہے۔

گر میں سمجھتا ہوں کہ غم غم میں بھی بڑا فرق ہے۔ غالب نے اس کی صرف دو تقسیمیں کی ہیں:— م عشق و غمِ روزگار — کیونکہ اس کی زندگی کا انحصار صرف دو تمناؤں پر تھا ایک (صرف برائے گفتن) وہ جسے "دربیارِ بستر و نوروزِ آغوش" کا چیلا کہنا چاہیے۔ اور دوسری (واقعی تحقیقی) وہ جو — جام بدستے و سبوئے بدست" کی حد تک کھُل کھیلنا چاہتی تھی — ان کے علاوہ اسے کچھ نہ معلوم تھا [illegible]

دنیا میں "بینوائیاں اور بے برگ و باریاں" کس کس طرح انسان پر مسلط ہوتی ہیں اور ان کی تڑپ میں کتنا فرق پایا جاتا ہے۔

نفسیات کا مشہور مسئلہ ہے کہ جب کسی ناگوار تاثر کے اسباب پیدا ہوتے ہیں تو فطرت انسانی ان کو دفع کرنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ اسی کا دوسرا نام "تنکے کا سہارا ڈھونڈھنا" ہے۔ خواہ وہ مستقبل کی امید موہوم ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن چونکہ اس کوشش میں زیادہ تر انسان کی قوت ارادی کام کرتی ہے اور قوتِ ارادی خود ماحول سے متاثر ہونے والی چیز ہے، اس لئے کوئی کلیہ قاعدہ اس باب میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ "ہر کارے و ہر مردے" تو آپ نے سنا ہی ہوگا، اگر اعمالِ نفس و ارادہ کو بھی "کام" میں شامل کر لیا جائے تو یہ فقرہ پوری طرح اس نفسیاتی نظریہ پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ خود اپنے ہی حالات کو ملاحظہ فرمائیے۔

جب آپ کے والد کا انتقال ہوا تو آپ نہ صرف یہ کہ جوان تھے، بلکہ جیسا آپ خود لکھتے ہیں، پوری طرح دادِ جوانی دے رہے تھے۔ اس لئے اس کا احساس قدرتاً آپ کو بہت کم ہونا چاہئے تھا۔ البتہ ایرانی رفیق حیات کی موت کا غم لازم تھا کیونکہ آپ کی تمام کارگاہِ نشاط اس پر منحصر تھی، لیکن اس کا دیرپا رہنا بھی ممکن نہ تھا کیونکہ اس کی مقاومت کے لئے آپ کے پاس اگر اور ذرائع موجود نہ ہوتے تو بھی آپ کا شباب ہی کافی تھا جس سے زیادہ حیلہ جو چیز کاروبارِ محبت میں اور کوئی نہیں۔

اس کے بعد والدہ، بھائی اور بھانجے کا یکے بعد دیگرے ایک ہفتہ کے اندر انتقال کر جانا اور آپ کے استاد مولانا عسب کا جدا ہو جانا۔ سو اس میں کلام نہیں کہ یہ تمام واقعات و حادثات دل ہلا دینے والے تھے لیکن چونکہ اسوقت آپ کی عمر اور خود آپ کے ذاتی حالات "ضبط و تحمل" کے اسباب سے معرا نہ تھے اس لئے انھیں بھی جھیل گئے۔ اب کہ آخر وقت میں دل و دماغ بھی جواب دے چکے ہیں اور شکستہ ناخنی نے آیندہ گرہ کشائی کی امید بھی باقی نہیں رکھی، جوان بیٹے کی موت پر آپ کا اس درجہ متاثر ہونا بالکل قدرتی بات ہے لیکن "چارۂ بیداد" نہ آج تک کسی کی سمجھ میں آیا ہے نہ آئے گا۔

آپ تو خیر مرد ہیں اور بحمد اللہ کسی کے محتاج بھی نہیں۔ اس کو آپ کیا کہیں گے کہ ایک محتاج بڑھیا کا اکلوتا جوان بیٹا دو وقت کے فاقوں کے بعد لکڑی کا گٹھا بیچکر گھر واپس آتا ہے کہ اپنی ضعیف ماں کی فاقہ شکنی کا سامان فراہم کرے، اور ٹھیک اسوقت جبکہ وہ اس کا انتظار کر رہی ہے ایک شخص یہ خبر آکر سناتا ہے کہ "تیرے بیٹے کو تو سانپ نے ڈس لیا"۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ قدرت اس سے زیادہ اور کیا سخت صورت "شکر و شکایت" کے سدباب کی اختیار کر سکتی ہے۔ لیکن مذہب کے اس فیصلہ کو ملاحظہ فرمایئے کہ ٹھنڈا پانی پینے کے بعد "الحمد اللہ" کہنا تو واجب ہو

جب دل وجان کی ٹھنڈک چھین لیجائے تو شکایت کرنا کفر۔

الغرض میرے نزدیک شکر و شکایت دونوں لغو ہیں۔ آپ نے اگر ایرانی خاتون کی معیت کا زمانہ بغیر شکر کے بسر کر دیا تھا تو اب "دیوسف" کی گم گشتگی پر بھی شکایت نہ کیجئے۔ نہ ادائے شکر سے اُس خاتون کی عمر بڑھ سکتی تھی، اور نہ شکایت سے اب آپ کا اُجڑا ہوا دل دوبارہ آباد ہو سکتا ہے۔ قدرت کے ناخن وچنگال دونوں خون سے رنگین ہیں اور اپنا یہی "سبھاؤ" اسے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ہم آپ کیا کر سکتے ہیں۔ اگر آپ نے دوسروں کے واقعات مسرت وغم پر سیکڑوں تاریخیں کہہ ڈالیں اور خود "اپنی بیتی" پر آپ کے دماغ نے کام نہ دیا تو حیرت نہ کرنا چاہئے، کیونکہ تاریخگوئی صنایع و بدایع کی ایک قسم ہے جس کا تعلق جذبات و تاثرات سے نہیں ہے۔ آپ کسی اور کے حادثہ پر تو تاریخگوئی کی موشگافیوں میں پڑ سکتے ہیں، لیکن اپنے صدمات پر یہ تصنع و تکلف بالکل خلاف فطرت ہے۔ ایسی حالت میں ایک شاعر مرثیہ تو لکھ سکتا ہے لیکن ریاضی کی مشق نہیں کر سکتا۔

پھر آپ کی شاعری جس ذوق سے متعلق ہے وہ مرثیہ گوئی کے بھی منافی پڑتی ہے۔ آپ کا فطری میلان شوخی ورنگینی کی طرف ہے، اس لئے یہ تو ہو سکتا ہے کہ آپ غم میں بھی کوئی پہلو لطف و انبساط کا پیدا کر لیں، لیکن آپ اپنے "آنسو بہانے" کو صرف "رونا" ہی کہیں گے، "آبشارِ غم" جاری کرنا نہیں کہہ سکتے۔

ایسے ذوق والوں کا تاثرِ الم ہمیشہ "غم ساذج" ہوا کرتا ہے اور حقیقی غم یہی ہے۔ جو غم "شاعری" کی طرف مائل کرے وہ غم نہیں ہے بلکہ صرف شاعری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت آپ اس واقعہ کی بھی تاریخ لکھیں لیکن اسوقت ممکن ہوگا جب امتداد زمانہ اس کی تلخی کو کم کر دیگا۔ فی الحال تو آپ کے آنسو "دُرِ منثور" ہی رہیں گے، اور آپ کچھ ہی کریں۔

(جناب ابوالکمال امید امیٹھوی)

حبیبی!

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو — جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں — غالب

مطلب صاف ہے کہ مے و نغمہ دونوں اندوہ رُبا نہیں ہیں اور جو لوگ اس کے خلاف قایل ہیں وہ اگلے وقت کے لوگ ہیں غرض میں بھی اس سے متفق ہوں (کہ نغمہ اندوہ رُبا نہیں) بلکہ اندوہ فزا ہے کیونکہ اس کا تجربہ مجھے کافی آج کل انوری صاحب کی وجہ سے ہوا جو میرے دل بہلانے اور غم غلط کرنے کے لئے ہر ممکن طریقہ سے کوشاں ہیں باقی رہی شراب تو اس کا تجربہ نہیں اور شاید عمر بھر کبھی نہو سکیگا یہ کیونکر اندوہ ربا نہیں ہوتی حالانکہ اگلے وقت کے لوگ نہیں بلکہ حال کے لوگ اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں۔ غالب

زندہ نہیں پوچھوں توکس سے پوچھوں- آپ سے پوچھتے ہوئے ڈرتا ہوں کہیں آپ کچھ اور خیال نہ کریں اور مجھے اپنے گمان سے شرمندہ ہونا پڑے لیکن واردات قلب کا چھپانا اور پھر آپ ایسے پیر طریقت سے جس کا ہر ارشاد قلب وروح کو پیام صبر وسکون دیتا ہو کیونکر ممکن تھا، کیا آپ زحمت فرمائیں گے کہ اس کا بھی جواب نگار میں کسی طریقہ سے دیں- مکتوبات نیاز کے متعلق آپ کے بعض کوتہ اندیش احباب کی رائے ہے کہ وہ اکثر فرضی ہیں، میں ان باتوں کے جوابات پر آپ کو ابھار کر کے اُن کو جھٹلانا چاہتا ہوں حالانکہ آپ بخدا اس سے بے نیاز اور بالاتر ہیں-

---

حضرت — اندوہ ربائی یا اندوہ فزائی کا تعلق صرف اپنے حال سے ہے- مے و نغمہ میں یہ سلیقہ کہاں کہ وہ کسی کو مسرور یا مغموم بنا سکیں- اگر اپنا دل مسرور و مطمئن ہے تو میر انیس کے شیون کو بھی سنکر رگِ انتقاد جنبش میں آجاتی ہے، ورنہ حافظ کے "بیار بادہ" پر بھی رونے ہی کو جی چاہتا ہے- تاہم یہ ضرور ہے کہ نغمہ کی ترکیب میں عنصر غالب "اندوہگینی" ہی کا ہے اور جب تک "دلی گداختگی" کی کیفیت پیدا نہ کیجائے ہم اس کی حقیقی روح تک نہیں پہونچ سکتے- شراب کے متعلق، شراب پینے والے کہتے ہیں "وہ اسی کیفیت کو بڑھا دیتی ہے جس میں اس کا استعمال کیا گیا ہے" لیکن میں اس نظریہ کا قایل نہیں، شراب واقعی اندوہ رُبا ہے اور غم غلط کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں- خاصکر ہماری آپ کی عمر میں کہ اسوقت تو یہ (بہ فتوائے شیخ بوعلی سینا) آبِ حیات سے کم نہیں-

غالب کا شراب کو "اندوہ فزا" کہنا کوئی سند نہیں کیونکہ وہ شراب پیتا تھا اور ہمیشہ اس "دھڑکے" کے ساتھ کہ مبادا پھر ہاتھ نہ آئے- اس لئے اس کا رنج و ملال بالکل درست و بجا تھا- آپ انوری صاحب کے پاس ہیں (خانۂ انوری میں نہیں) اس لئے کسی بلائے آسمانی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، پیکر دیکھئے — عذاب وثواب میری گردن پر-

میرے مکتوبات کے متعلق یہ خیال ظاہر کرنا کہ وہ فرضی ہیں، بالکل ایسا ہی ہے جیسے (بلا تشبیہ) قرآن پاک کی آیات کے متعلق اس بحث میں پڑجانا کہ یہ کس کے حق میں نازل ہوئی ہیں اور اصل آیات کے مفہوم کو پس پشت ڈالدینا-

میرے مکتوبات کے مخاطب فرضی ہوں یا اصلی، لیکن بہرحال ہیں وہ میرے ہی لکھے ہوئے- اس قسم کی بحث چھیڑنے والے وہی ہیں جو اس رنگ میں لکھنے کے لئے بیتاب ہیں، لیکن لکھنے سے معذور- سو اعتراف کی بہت سی صورتیں ہوا کرتی ہیں اور انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے-

باب الاستفسار

اُردو زبان اور عربی و فارسی الفاظ کا استعمال

(جناب مرزا غفور بیگ صاحب ۔ پونا)

اسوقت اُردو ہندی کے جھگڑے میں اکثر حضرات کا خیال ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اُردو کو عربی و فارسی الفاظ کے بار سے ہلکا کیا جائے، لیکن آپ کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس تحریک کے موافق نہیں۔ سنا ہے کہ ترکی میں بھی یہی کوشش کی جارہی ہے کہ غیر زبان کے الفاظ خارج کردئے جائیں اور ایران بھی یہی کر رہا ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان کی پیروی نہ کریں۔ براہ کرم ذرا تفصیل سے لکھئے کہ آپ کی کیا رائے ہے۔

(نگار) جس طرح ایک قوم کے لئے اس سے زیادہ باعث ننگ امر اور کوئی نہیں کہ وہ اپنی ضروریاتِ زندگی میں اجنبی اقوام کی محتاج ہو، اسی طرح ایک زبان کے لئے یقیناً یہ امر حد درجہ شرمناک ہے کہ وہ اظہار مدعا میں دوسری زبانوں کی دست نگر ہو۔ اس لئے اُصولاً میں نے کبھی اس کی حمایت نہیں کی کہ اُردو کو خواہ مخواہ عربی و فارسی الفاظ سے گرانبار کیا جائے؛ لیکن چونکہ عملاً یہ ممکن نہیں ہے اس لئے میں اس کوشش کو عبث خیال کرتا ہوں۔

اُردو زبان کی تخلیق و تشکیل سے آپ بھی واقف ہوں گے، اسکی ترکیب میں بہت بڑا عنصر عربی و فارسی الفاظ کا شامل ہے اور اس لئے اگر آپ ان کو علٰحدہ کریں گے تو ظاہر ہے کہ ان کی جگہ دوسرے الفاظ سے پُر کریں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ الفاظ کہاں سے لائیں گے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو آپ نئے الفاظ اختراع کریں جو ممکن نہیں ہے، یا پھر لامحالہ سنسکرت سے مدد لیں جیسا کہ ہندو آجکل کر رہے ہیں۔ میں اس کو گناہ نہیں سمجھتا کہ عربی و فارسی الفاظ ترک کر کے سنسکرت کے الفاظ استعمال کئے جائیں،

لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ رسم خط بھی وہی اختیار کیا جائے۔ پھر اگر مسلمان اس کے لئے آمادہ ہو جائیں تو اس میں شک نہیں کہ آپس کی یہ بڑی تفریق مٹ جائے اور زبان کی موجودہ نزاع جو مذہبی نزاع کے بعد سب سے زیادہ تباہکن نزاع ہے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسا ہونا ممکن نہیں اور اس لئے عربی و فارسی الفاظ کی مخالفت سوائے اس کے کوئی معنی نہیں رکھتی کہ آپ اپنی زبان کی وسعت کو کم کرتے جا رہے ہیں اور اردو کو بجائے علمی زبان بنانے کے صرف قصے کہانیوں کی زبان بنانا چاہتے ہیں۔

زبان ایک قوم کی تمدنی و ذہنی خصوصیات کا آئینہ ہوا کرتی ہے اور اس کے مخصوص کلچر سے متاثر ہو کر ایک مخصوص صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس لئے اردو زبان۔ وہی زبان جس میں عربی و فارسی کے الفاظ آپ کو زیادہ ملتے ہیں۔ مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت، مسلمانوں کے قومی و مذہبی جذبات اور مسلمانوں کے تمدنی رجحانات سے پیدا ہوئی ہے اور اس میں عربی و فارسی کا ہر ہر لفظ ان کے مخصوص ذوق کی نمایندگی کرنے والا ہے، اس لئے ان کو نکال دینے کے معنے صرف یہ ہیں کہ آپ قوم کو گونگا بنا دینا چاہتے ہیں اور اسکے پر و بال نوچکر پھینک دینا پسند کرتے ہیں۔

اگر آج مسلمان عربی و فارسی الفاظ ترک کر کے سنسکرت کے الفاظ اختیار کرنے پر آمادہ ہو بھی جائیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ پہلے وہ اپنے تمام اس لٹریچر کو جو ان کی صدیوں کی تہذیب و ثقافت کا نتیجہ ہے دریابرد کر دیں اور پھر کسی پاٹ شالہ میں جا کر "کا کھا۔ گا گھا" سیکھنا شروع کریں۔

اردو زبان اپنی تمام موجودہ خصوصیات کے ساتھ ایک مستقل رکارڈ ہے مسلمانوں کی مذہبی روایات کا، تاریخی واقعات کا، تمدنی خصوصیات کا، رسم و رواج کا اور ان کی روایت و درایت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو اسمیں محفوظ نہ ہو۔ پیدائش سے لیکر جب کان میں اذان دیجاتی ہے، نزع کے وقت تک جب سورۂ یاسین سنائی جاتی ہے، مسلمانوں کا تعلق عربی و فارسی الفاظ سے ایک ایسا غیر منقطع تعلق ہے کہ ہم اس کو علحدہ کر کے اپنے قومی وجود کو قایم رکھ ہی نہیں سکتے۔ اس لئے ہندو مسلمانوں میں یک جہتی کے پیدا کرنے کی غرض سے اردو زبان میں یہ تغیر پیدا کرنا، یقیناً پاکیزہ خیال ہے، لیکن یکسر طلب محال۔ کیونکہ ان دونوں کے اختلاف کا حقیقی سرچشمہ صرف مذہب ہے اور جب تک یہ ایک دوسرے کو کافر و ملکش سمجھنا ترک نہ کریں گے محض زبان و رسم خط کی تبدیلی کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ اس لئے میری رائے میں صحیح راستہ کوشش کا وہ نہیں ہے جو اختیار کیا جا رہا ہے بلکہ دوسرا ہے جس میں قدم رکھتے ہوئے ہندو مسلمان دونوں ڈرتے ہیں۔

بعض حضرات اس سلسلہ میں یہ بھی کہہ اُٹھتے ہیں کہ اگر مسلمان اپنا کلچر ترک کرکے ہندوؤں کا کلچر اختیار کرلیں تو کیا حرج ہے جبکہ ہندوستانی نژاد ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے وہی تہذیب زیادہ مناسب ہے جو ہندوؤں کی ہے۔ لیکن ایسا مشورہ دینے والے حضرات یہ غور نہیں کرتے کہ کسی قوم کی تہذیب و معاشرت ایک دن میں طیار نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں اور ایک جُگ گزرنے کے بعد اس کا ذوق پختہ ہوتا ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ مسلمان کوشش کرنے کے بعد بھی اس میں کامیاب ہو جائیں۔ میرے ایک مسلمان دوست کوشش کرکے کامل بیس سال تک ناتا تی بنے رہے لیکن آخر کار اکیسویں سال بھُنے ہوئے گوشت کی خوشبو کی تاب وہ نہ لاسکے اور جیسے ملکش پہلے تھے ویسی ہی پھر ہوگئے۔
یہ بظاہر ایک نہایت معمولی بات ہے لیکن اس پران تمام خصوصیات ذوق کا قیاس کیجئے جو مسلمانوں کو ہندوؤں سے متمایز کرنے والی ہیں اور جن کو مٹانے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔

قارئین نگار اچھی طرح واقف ہیں کہ میں مذہبی اختلاف کو نوع انسانی کے لئے بدترین لعنت سمجھتا ہوں اور میرے لئے اس سے زیادہ تکلیف دہ امر اور کوئی نہیں کہ ہندو مسلمان مسایل مذہبی میں اختلاف رکھنے کی وجہ سے ایک دوسرے کو بُرا سمجھیں اسی لئے اگر آج دنیا کے تمام مذاہب مٹ جائیں (جو زمانۂ قدیم سے لیکر اسوقت تک استخوانِ جنگ بنے ہوئے ہیں) تو میں اس کو نوعِ انسانی کی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ لیکن خصوصیات قومی کو میں خصوصیات مذہبی سے زیادہ ضروری سمجھتا ہوں اور ان کے مٹانے کی تائید کبھی نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اسوقت ایک جماعت صرف "قومیات" ہی کے اُصول پر زندہ رہسکتی ہے اور اس کی زندگی یہی ہے کہ وہ اپنی تہذیب کو قایم رکھے۔ بہرحال اُردو زبان سے عربی و فارسی الفاظ کو نکالنا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ اس میں ہندی و سنسکرت کے درخور کو تسلیم کیا جائے اور میں اسے قومی حیثیت سے مسلمانوں کی موت سمجھتا ہوں۔ رضا شاہ اور کمال اتاترک بیشک فارسی اور ترکی زبان سے اجنبی الفاظ نکالنے کی کوشش کررہے ہیں لیکن مجھے اس میں کلام ہے کہ وہ عربی و فارسی کے الفاظ علٰحدہ کرنے میں کامیاب ہوں گے کیونکہ دونوں زبانوں میں نصف سے زیادہ عربی و فارسی کے الفاظ پائے جاتے ہیں اور تاوقتیکہ وہ سرے سے اپنی زبان ہی کو نہ بدلدیں اس میں کامیابی محال ہے۔ افسوس ہے کہ اس عہد کے ترکی لٹریچر کا کوئی نمونہ میرے پاس موجود نہیں ورنہ میں شاید اپنی تائید میں مثالیں بھی پیش کرسکتا۔ لیکن اسوقت کا ایرانی لٹریچر آپ کے سامنے موجود ہے اسے دیکھئے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ رضا شاہ کس حد تک اس میں کامیاب ہوئے یا ہو سکتے ہیں۔

ایران میں ایک مجلس جدید فرہنگ مرتب کرنے کے لئے قایم ہوئی ہے اور اس نے بعض اصطلاحات قدیمہ

کو جدید فارسی کے قالب میں ڈھالا[1] ہے، لیکن زبان جس چیز کا نام ہے وہ نصف سے زیادہ عربی الفاظ پر مشتمل ہے۔
اسی سال جب رضا شاہ پہلوی ایران کی جدید یونیورسٹی کے سالانہ جلسہ میں تشریف لے گئے تو وہاں نوجوانانِ ایران کے سامنے ایک تقریر فرمائی جسکے جستہ جستہ فقرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں :-

"دو مطلب را می خواہم بفرزندگان خود گوشزد نمایم۔ اولاً باید دانش آموزہا ہمیشہ در صددِ ترقی و تعالی خود باشند۔ زیرا سعادتِ افراد ست کہ سعادتِ جامعہ را فراہم می کند۔ ... بہ شما فرزندان خود می گویم کہ علاقہ بہ مملکت را باید بواسطہ سعی و عملی کہ بہ آزادی و استقلال کشور شماست، نسبت بہ میہن خود صمیمی باشد و عواطفِ صمیمیت شما بہ میہن خودتان باید مافوق تمام عواطف و احساسات باشد"

اب ملاحظہ فرمائیے کہ ان چند فقروں میں بیس سے زیادہ عربی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور بعض اتنے ثقیل ہیں کہ اُردو میں عام طور پر رائج بھی نہیں ہیں ۔۔۔ اسی سلسلہ میں طالبات کی طرف سے بھی ملکۂ ایران کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا گیا تھا اور اسکے جواب میں علیا حضرت نے جو کچھ فرمایا اس کی زبان بھی دیکھ لیجئے :-

"بے نہایت مسرورم کہ می بینم خانہا در نتیجۂ دانائی و معرفت بوضعیت خود آشنا شدہ و بہ حقوق و مزایائے خود بردہ اند۔ ... من معتقدم کہ برائے سعادت و ترقی ایں مملکت باید ہمہ از صمیم قلب کار کنیم"

یہ ہے وہ جدید ایرانی زبان جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ عربی سے بیگانہ ہوتی جاتی ہے ۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ مان لیں کہ ترکی و ایران اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو بھی ہندوستان کے لئے بطور مثال اس کو پیش کرنا درست نہیں، کیونکہ وہاں مسلمانوں کی حکومت خود اپنی ہے اور وہ جو تغیر چاہیں، آسانی سے پیدا کر سکتے ہیں ۔ یہاں مسلمان محکوم ہیں، مغلوب ہیں اور اگر انھوں نے اپنی خصوصیاتِ قومی کو قایم رکھنے میں ذرا بھی تساہل سے کام لیا یا کچھ بھی رواداری برتی تو پھر اس کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی رہی سہی اجتماعیت کو بھی کھو بیٹھیں اور خود اپنے ہاتھ سے اپنی دوامی غلامی کے کاغذات پر مہرِ توثیق ثبت کر دیں ۔

---

[1] بعض اصطلاحیں ملاحظہ ہوں :-

قدیم	جدید	قدیم	جدید
مملکت	کشور	ملاح	ملوان
وطن	میہن	تحت البحری	زیر دریائی
ارتش	قشون	مدرسہ	دانشگاہ - دبستان - آموزشگاہ
ہنگ	فوج	ادارۂ تنظیمیہ	ادارۂ شاہبانی
امیر لشکر	سرلشکر	محبس	زندان
سلطان	سردان	محبوس	زندانی
بحریہ	نیروئے دریائی	تذکرہ (پاسپورٹ)	گزرنامہ
		تفتیش	دارسی - بازرسی

مُفلِس کی دُنیا

قضا را ایسی دنیا میں ہوااکدن گزر میرا
کہ جس کی یاد سے مجروح ہے اب تک جگر میرا

جہاں کی سرزمیں ذلت جہاں کا آسماں پستی
جہاں کے وادی و کہسار افلاس و تہی دستی

جہاں چاروں طرف مایوسیوں کی حکمرانی ہے
جہاں ہر صورت امید نومیدی کی بانی ہے

جہاں حدِ نظر تک رنج و غم کے پُرخطر بن ہیں
جہاں کے طائروں کی بولیاں بھی آہ و شیون ہیں

جہاں کا ذرہ ذرہ دعوت آلام دیتا ہے
جہاں کا چپہ چپہ دوزخوں کا کام دیتا ہے

جہاں کی صبح درد و رنج کی تمہید ہوتی ہے
جہاں کی شام یکسر دشمنِ امید ہوتی ہے

جہاں کی چاندنی تاریک اور مغموم ہوتی ہے
جہاں کی دھوپ ہمت سوز اور مسموم ہوتی ہے

جہاں ہے ایک ہی مفہوم مرگ و زندگانی کا
جہاں دن دوپہر ڈھل جاتا ہے سورج جوانی کا

جہاں دن رات سر پکڑے ہوئے تدبیر روتی ہے
جہاں آٹھوں پہر آرام سے تقدیر سوتی ہے

جہاں رہ جاتی ہے مفلوج ہو کر جرأت و ہمت
جہاں ہر سو پڑی دم توڑتی ہے روحِ حمیت

جہاں ہر شوق ہو جاتا ہے صرفِ فاقہ بدمستی
جہاں ہر ولولہ ہو جاتا ہے رہنِ تہی دستی

جہاں جوشِ اولوالعزمی کی سانسیں ٹوٹ جاتی ہیں
جہاں احساسِ خودداری کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں

جہاں صدق و صفا کا خون پی لیتی ہے ناداری
جہاں صبر و رضا ہو جاتے ہیں مجبورِ غداری

جہاں بے جرمیاں بھی جرم کا قالب بدلتی ہیں
جہاں آزادیاں بھی قید کے سانچے میں ڈھلتی ہیں

جہاں نشو و نما پاتے ہیں چوری، جھوٹ، عیاری
جہاں پروان چڑھتی ہے خیانت، حرص و مکاری

جہاں ہر ہر قدم پر پائے ایماں ڈگمگاتے ہیں
جہاں کے خوف سے نبیوں کے دل بھی تھرتھراتے ہیں

یہیں بستے ہیں ننگِ زندگی وہ پیٹ کے مارے
جنھیں ہر وقت دن کو بھی دکھائی دیتے ہیں تارے

زمانے بھر کے دُھتکارے خدائی بھر کے ٹھکرائے
ذلیل و خوار۔ اپنی ہستیوں سے آپ شرمائے

مجسّم آہ، سرتاپا زبانِ حال سے نالے
فلک کی آنکھ کے ناسور۔ قلبِ دہر کے چھالے

غلامی کی حیاتِ تیرہ کی تابندہ تصویریں
فنائے عزم و مرگِ ارتقا کی زندہ تصویریں

قتیلِ جہل و پستی، کشتۂ ادہام و نادانی
امیروں کے سگِ ایواں، مگر از قسمِ انسانی

سنانِ جبر اور شمشیرِ استبداد کے گھائل
خدا کیا؟ مالدار و نکی خداوندی کے بھی قائل

تموّل جن کو یکسر پیکرِ بیجاں سمجھتا ہے
تمدن جن کو اک انساں نما حیواں سمجھتا ہے

فقط اک خشک روٹی جنکے جسم و جاں کی قیمت ہے
فقط اک حکم جنکے مذہب و ایماں کی قیمت ہے

مشیئت کھیلتی ہے رات دن جذبات سے جنکے
تمسخر کرتی ہے تقدیر احساسات سے جنکے

ہوا کرتی ہیں سامانِ تفریح عصمتیں جن کی
رہا کرتی ہیں برگشتہ ہمیشہ قسمتیں جن کی

ارادوں پر بھی غالب جنکے غیروں کا ارادہ ہے
نہ جنکی اپنی مرضی ہے نہ جن کا اپنا منشا ہے

دبے ہیں جن کے جوہر اسقدر زنگِ مذلت میں
کہ شک ہونے لگا ہے خود جنھیں اپنی شرافت میں

ہے بس لے دیکے جنکی کائناتِ زندگی ساری
غلامی، مفلسی، فاقہ، مصیبت، بھیک، بیماری

جنھیں انساں کہتے آدمیت ہچکچاتی ہے
جنھیں زندہ سمجھتے زندگی کو شرم آتی ہے

فضا و بحر و بر کون و مکاں کو عار ہے جن سے
اجل کو جن سے نفرت زندگی بیزار ہے جن سے

کوئی غمخوار ہے جن کا نہ کوئی پوچھنے والا
خداوندا۔ الہا۔ داورا۔ اے دادرس مولا

تمکین۔ سرمست

محبت کے دو باغی

(۱)

آج دیوالی کی شب ہے، رنگِ شب صد رنگ ہے　　چشم خیرہ، ہوش حیراں، شادمانی دنگ ہے
لالہ زاروں سے سوا خوش رنگ دیوالی کی رات　　دیدنی ہے آج قندیلوں کی سڑکوں پر برات
جلوہ ہائے حسن کیف و رنگ کے ساماں لئے　　قمقمے، فانوس، برقی روشنی، شمعیں، دئے
ہر طرف نظروں کے جھولوں میں شعاعوں کا ہجوم　　جیسے کاشی میں اُتر کر آئے ہوں ماہ و نجوم
ہر طرف گانا بجانا اور دوالی کی رسوم　　ہر طرف جلووں کی بارش ہر طرف نغموں کی دھوم
آج کی شب میری قسمت بھی ہے کیسی کامگار　　میری نظروں میں سمٹ آئی ہے کاشی کی بہار
آج کی شب جشن میں شیاما بھی میرے پاس ہے　　کامراں ہیں آرزوئیں شادماں احساس ہے

(۲)

"اے مری دیوی، مری پیاری، مری روحِ حیات!　　زبدۂ تخلیقِ فطرت، نوبہارِ کائنات!
میری شیاما، میری دنیائے خوشی کی تاجدار　　میری تنویرِ جوانی کی درخشاں یادگار
آ تجھے میں اپنے سینے سے لگا لوں چوم کر　　اور پھر ہو جاؤں فکرِ دو جہاں سے بیخبر
تو بھی جوشِ کامیابی میں خوشی کی سانس لے　　بادۂ لطف و محبت خود بھی پی مجھکو بھی دے
ہائیں ایہ کیا تو رو رہی ہے میری پیاری، سر اُٹھا　　کچھ تو منہ سے بول ظالم ہو گیا ہے تجھ کو کیا"

(۳)

"کیا سناؤں اپنی بپتی، کیا بتاؤں اپنا حال　　کیا ہنسوں، کیا مسکراؤں، ہر خوشی ہے پائمال

آج تک میں دھرم کے آداب سے مجبور تھی
آرزوؤں کو سلا کر، میں خوشی سے دور تھی

پاک جذبے دل کے لیکن رنگ لاتے ہیں ضرور
پاؤں وہم و رسم کے ہاں ڈگمگاتے ہیں ضرور

عاشقی میں مذہب و ملت کا کیا امتیاز
ایک ہی ہیں عشق کے مسلک میں پوجا اور نماز

منہ کے بل گرنا ہی پڑتا ہے یہاں ہر رسم کو
ٹھوکریں کھانا ہی پڑتی ہیں سماجی نظم کو،

کس سے کہہ سکتی تھی میں مایوسیوں کی داستاں
کون تھا گھر میں مرے، میرے غموں کا رازداں

مختصر یہ ہے کہ میں آئی ہوں سب کو چھوڑ کر،
توڑ کر اس ملک کی پابندیوں کو توڑ کر،

آئیے پھر کیوں نہ آخر ایسی بازی کھیلئے
جس سے دونوں ایک ہو جائیں ہمیشہ کیلئے

آئیے ملکر نکالیں اک نئی راہِ عمل
جس پہ نازاں ہو محبت، جس سے شرمائے اجل

پیجئے یہ جام صہبا لیجئے شیاما کا نام
زہر ہے گو اس میں لیکن زہر ہے امن دوام

لائیے میں بھی پیوں اور شکر کا سجدہ کروں
جی میں ہے اب تو یہی پیکر مروں، مر کر جیوں

(۴)

پی لیا میں نے بھی ہنسکر سم قاتل پی لیا
جی لیا میں، جسقدر جینا تھا مجھ کو جی لیا

ہو کے ہم آغوش دونوں ہو گئے پھر بیخبر
کر رہا تھا زہر بھی ادراک پر پورا اثر

بھولی بھٹکی ہر نظر تھی، دھندلا دھندلا ہر خیال
بے خبر عشق و محبت، بے اثر حسن و جمال

یک بیک بیہوشیوں میں روح نو پیدا ہوئی
دفعتاً احساس میں بجلی کی رَو پیدا ہوئی

پھر تخیل کی پری اُڑکر ہوئی سایہ فگن
جس طرف دیکھا نظر آیا محبت کا چمن

روح جاگی مادیت سے اُبھرنے کے لئے
اُڑ گئے دونوں فضا میں سیر کرنے کے لئے

آخرش پورا ہوا حسن تخیل کا سراغ
ہم جو پہونچے باغ نو میں عرش پر پہونچا دماغ

اک نوید مرحبا آئی صدائے غیب سے
اک نئی جنت ہوئی پیدا فضائے غیب سے

فطرت واسطی

شعر اور عورت

(عرب)

سرزمین عرب ہزارہا برس سے موجود ہے، اُس کا تمدن بھی کچھ نوعمر نہیں تاہم تعجب ہے کہ آج سے صدیوں قبل جبکہ اُن کے چمنستان تمدن میں غریب عورت کی آبیاری کو کچھ دخل نہ تھا اور نہ اُن کی تعلیمی و اخلاقی ارتقاء کے لئے کوئی باقاعدہ نظام مقرر تھا، اُسوقت بھی کم ازکم شعر و شاعری میں جو درحقیقت ایک فطری فن ہے ایسی ایسی قابل عورتیں گزری ہیں جن کے کارنامے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

شاعری کا احساسات وجذبات سے دراصل چولی دامن کا تعلق ہے خود شاعر کے لفظی معنے صاحب شعور کے ہیں، اور شعور اصل میں احساس کو کہتے ہیں۔ یعنی شاعر وہ شخص ہوتا ہے جس کا احساس قوی ہو اس اعتبار سے عورت مجسمۂ شاعری ہے، اس لئے کہ اُس کے احساسات وجذبات فطرۃً نہایت نازک، لطیف اور سریع الاشتعال ہوتے ہیں، ہمارا روز کا تجربہ ہے کہ کسی شخص کی مصیبت کا حال اگر درد انگیز لفظوں میں بیان کیا جائے تو اُس کا اثر جس قدر صنف نازک پر ہوتا ہے مردوں پر نہیں ہوتا۔ دوست کی مفارقت، اولاد کی جدائی، گھر بار کی بربادی، ملک ومال کی تباہی ہر شخص پر اثر کرتی ہے لیکن ایک عورت اس موقع پر فرط غم سے بالکل پاگل ہو جاتی ہے، دریا کی روانی، سبزہ کی لہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، صبح کی شگفتگی اور شام کی دل آویزی ایسے مناظر ہیں جن سے ہر شخص لطف اندوز ہوتا ہے لیکن یہی چیزیں ایک عورت پر وجد کی کیفیت طاری کر دیتی ہیں جس سے وہ سرشار ہو کر جھوم اُٹھتی ہے، یہ بہت ممکن ہے کہ وہ کسی وجہ سے اپنے احساسات کو الفاظ کا جامہ نہ پہنا سکے، لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ تاثر و انفعال میں وہ مردوں سے کہیں زیادہ ہے اور یہی چیز شعر کی کائنات اور شاعری کی حقیقی بنیاد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عورتوں نے شعر و شاعری میں بارہا مردوں سے مقابلہ کیا اور کبھی اُن سے پیچھے نہیں رہیں بلکہ اس میدان میں شاید ہی کوئی ایسا انعام ہو جو انھوں نے حاصل نہ کیا ہو، عربوں کے بڑے بڑے زبان آور شعرا میں خنساء کا نام ایک امتیازی خصوصیت رکھتا ہے جو ایک عورت تھی، اسی طرح لیلی الاخیلیہ ایک بڑی نامور

شاعرہ گزری ہے جو اپنے زمانہ کے بڑے بڑے شعرا سے بار بار بازی لیگئی۔

یوں تو دنیا کا کوئی ایسا طبقہ نہیں جہاں ہر زمانہ اور ہر دور میں کوئی نہ کوئی شاعرہ نہ پیدا ہوئی ہو مگر سرزمین عرب کو اس میں غیر معمولی خصوصیت حاصل تھی۔ شعرگوئی اور انشا پردازی اہل عرب کے خمیر میں داخل تھی، قدرت نے جذبات کے اظہار پر اُن کو ایسی قدرت عطا فرمائی تھی کہ اُس زمانہ کی بڑی بڑی مہذب قومیں بھی اُن کی ہمسری کا دعویٰ نہ کرسکتی تھیں، وہاں کے مرد، عورت، بچے، بوڑھے سب ہومر اور شکسپیر کی شان رکھتے تھے۔

حرب بسوس میں امامہ بنت کلیب کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ جب اُس کے باپ کلیب کو جساس اور عمرو بن حارث نے دھوکہ سے قتل کردیا تو وہ روتی پیٹتی اپنے چچا مہلہل کے پاس پہونچی، دیکھا تو وہ شراب کے نشہ میں مدہوش اور عیش و نشاط میں سرشار ہے اُس کو سخت غصہ آیا، مہلہل کو لعنت و ملامت کرتے ہوئے اُس وقت اُس نے جو فی البدیہہ اشعار کہے تھے اُن میں سے چند درج ذیل ہیں، جن سے عربوں کے فطری شاعرانہ ذوق کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔

۱ —	اتلهو بالملاهي والخمور ولا تدري بعاقبة الامور۔	کیا تم لہو لعب اور شراب و کباب ہی میں مشغول رہوگے اور انجام کی کچھ خبر نہ ہوگی۔
۲ —	ولا تدري بان کلیبا اضحی قتیلاً عند جساس الغدور۔	کیا تمھیں معلوم نہیں کہ کلیب کو غدار جساس نے قتل کردیا ہے۔
۳ —	فوا عجبا لجساس وعمرو لقد جسرا علی امر نکیر۔	جساس اور عمرو پر تعجب ہے کہ انھوں نے ایسے فعل قبیح پر جرأت کی۔
۴ —	ویا ویلا لجساس وعمرو لقد رمیا اخاک بعنقفیر۔	افسوس ہے جساس اور عمرو پر کہ انھوں نے تمھارے بھائی کو انتہائی فریب سے قتل کرڈالا۔
۵ —	فبادروا انزعن الرمح منه فما احدٌ علینا بالجسور۔	پس جلدی پہونچو اور اسکے جسم سے نیزہ نکالو۔ کیا (اس سے قبل بھی) ہمارے مقابلہ میں کسی کو سرکشی کی جرأت ہوسکی ہے۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب) جلد اول صـ

عمرہ خثعمیہ ایک بڑھیا ہے، اہل وعیال سب ختم ہوچکے ہیں۔ صرف دو بچے ہیں جو اسکی زندگی کا آخری سہارا ہیں جب وہ انکی جوان مرگی کی خبر سنتی ہے تو فرط غم سے پاگل ہوجاتی ہے اور درد میں ڈوبا ہوا مرثیہ کہتی ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

۱ —	ابی الناس الا ان یقولوا هما هما ولو انّنا استطعنا لکان سواهما	لوگ اصرار سے کہتے ہیں کہ وہی (میرے دونوں بچے) مرے ہیں اور اگر ہمارا بس ہوتا تو ہم کہتے کہ انکا نہیں بلکہ کسی اور کا انتقال ہوا ہے

۲ — بُنیاً عجوزٍ حرم الدھر اہلہا
فلیس لہا الا الالہ سواہما۔
۳ — ہما اخوا فی الحرب من لا اخالہ
اذا خاف یومًا نبوۃً فدعاہما۔
۴ — ہما یلبسان المجد احسن لبسۃٍ
شحیحان ما استطاعا علیہ کلاھما۔
۵ — شہابان منا اوقد اثم اخمدا
وکان سنناً للمجدلین ضیاھما۔

ہائے وہ بڑھیا جس کے شوہر کو زمانہ پہلے ہی مٹا چکا تھا۔
یہی دو بچے (خدا کے علاوہ) اُس کے سرمایۂ حیات تھے۔
یہ دونوں معرکۂ جنگ میں اُس شخص کے مددگار ہوتے تھے جسکا کوئی نہیں ہوتا تھا۔
جب زمانہ کی نامساعدت کا کسی کو ڈر ہوتا تھا تو وہ ان دونوں کو بلاتا تھا۔
وہ دونوں عزت و مجد کے لباس فاخرہ سے مزین تھے
اور حتی الامکان اُس کے حصول میں کوشاں رہتے تھے۔
ہائے! وہ دونوں میرے چمکتے ہوئے ستارے تھے جو پہلے روشن کئے گئے اور پھر بجھا دئے گئے
ان دونوں کی آگ مہمانوں کے لئے ہمیشہ روشن رہتی تھی۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول صفحہ ۱۴۶)

جس ملک کے بچوں، بوڑھوں کی سحر بیانی کی یہ کیفیت ہو تو پھر قیاس کیجیے کہ وہاں جوان عورتوں کے جذبات و احساسات کا کیا عالم ہوگا؟

جزیرۂ عرب کے اُن خانہ بدوش قبائل میں جو اپنے لطیف تاثرات اور عاشقانہ جذبات کے لحاظ سے بہت مشہور تھے۔ ایک ممتاز قبیلہ بنو عذرہ کا بھی تھا، جس کے حسن و عشق کے افسانوں نے اس درجہ شہرت حاصل کر لی تھی کہ عرب میں حبًا عذریًا کا ایک لطیف محاورہ پیدا ہو گیا تھا جو آج تک ضرب المثل ہے۔ اسی مقدس سرزمین کے دو جانباز عاشق و معشوق زرعہ اور ظریفہ بھی تھے، ظریفہ نہ صرف اپنے حسن و جمال بلکہ ذوق شاعری کے لحاظ سے بھی نمایاں امتیاز رکھتی تھی۔ ایک مرتبہ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ قبیلہ کے تالاب پر ٹہل رہی تھی کہ اتنے میں زرعہ بن خالد شکار کھیلتا ہوا اُدھر آنکلا، دیکھا تو سامنے ظریفہ تھی، نگاہیں چار ہوتے ہی دل ہاتھ سے کھو بیٹھا، سر چکرایا اور بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑا۔

ظریفہ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا اُٹھی اور اُس کے پاس گئی۔ ہوش میں لانے کی بہت سی تدبیریں کیں لیکن جب کسی طرح ہوش نہ آیا تو تالاب سے پانی لائی اور محبت بھرے ہاتھوں سے پانی کے چھینٹے دینے لگی۔ چند منٹ میں مریض عشق نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا تو دلدار کا چاند سا مکھڑا سامنے تھا آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا اور کہنے لگا۔ ہل مقتولٌ یداویہ قاتلہ، (کیا دنیا میں ایسے خوش نصیب بسمل بھی ہوا کرتے ہیں جنکا علاج کرنے والا بھی وہی ہو جس نے ذبح کیا ہے)

ظریفہ بھی دل پر چوٹ کھا چکی تھی، مسکرا کر بولی پھر آپ کو شکایت کیا ہے؟

اب کیا تھا پیمان محبت اُستوار ہوا، زرعہ نے عشق و محبت کی شراب ناب سے مخمور ہو کر یہ اشعار

پڑھنا شروع کئے۔

۱۔ خرجتُ اصید الوحش صادفت قانصًا من الریم صادتنی سریعًا حبائله	میں تو اس ارادے سے نکلا تھا کہ صحرائی جانور کا شکار کھیلونگا، لیکن وہاں ایک سفید رنگ غزالہ نے خود مجھی کو شکار کر لیا۔
۲۔ فلما رمانی بالنبال مصارعًا رثانی وہل میتٌ یداویہ قاتله	پھر جب وہ تیر مار کر مجھے بے بس کر چکی تو خود ہی فکر درماں بھی کرنے لگی کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ مقتول کا علاج خود اُسکا قاتل کرے۔
۳۔ الا فی سبیل الحب صبٌّ قد انقضی سریعًا ولم یبلغ مراداً یحاوله	ہاں! راہ محبت میں ایک عاشق تھا جو بہت جلد ختم ہو گیا اور اُس آرزو میں کامیاب نہ ہوا جو وہ دل میں لئے ہوئے تھا

(الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۲۷۸)

جب ان دونوں کے عشق و محبت کا چرچہ قبیلہ میں پھیلا تو ظریفہ کے اعزہ نے غریب زرعہ کے قتل کی ٹھان لی، عشق کا مارا زرعہ جان بچا کر بھاگا، مگر چلتے چلتے چند اشعار اپنے ایک دوست کو یاد کرا دئے اور کہا کہ موقع دیکھ کر ظریفہ کو سنا دینا، اشعار کا مفہوم یہ ہے:-

"ایک مریض عشق ہے جو قبیلہ کے گھروں کے قریب ایک گوشہ میں پڑا تڑپ رہا ہے، نہ اس کی دوا ہے نہ علاج، لوگ مایوس ہو کر کہتے ہیں کہ تم اُس کی عیادت کو آؤگی تو وہ جی جائے گا۔ اور جب وہ تم سے مہربانی کی درخواست کریں گے تو تم بخل نہ کروگی"

ظریفہ نے جب یہ اشعار سنے تو فوراً سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو یہ زرعہ کا پیام ہے جو اس نے اس طرح مجھ تک پہونچایا ہے۔ وہ تی بیٹھی گھر سے باہر نکل آئی اور جواب میں اس نے فی البدیہہ یہ چند شعر کہے جو بلاغت کی جان کہے جانے کے مستحق ہیں۔

۱۔ رعی اللہ من ہام الفواد بحبہ ومن کدت من شوق الیہ اطیر	خدا اُس کی حفاظت کرے جس کا دل محبت میں بے چین ہے۔ اور جس کیلئے میرا جی چاہتا ہے کہ اڑ کر اُسکے پاس پہونچ جاؤں
۲۔ لئن کثرت بالقلب اتراح لوعتہ فان الوشاۃ الحاضرین کثیر	ہر چند دل میں محبت کے شعلے بکثرت اُٹھ رہے ہیں مگر کیا کروں چغلی کھانے کی بھی کمی نہیں۔
۳۔ فان لم ازر بالجسم خیفۃ معشر فللقلب آتٍ نحوکم فیزور	اگرچہ قبیلہ کے ڈر کی وجہ سے میں تم سے بظاہر نہیں مل سکتی مگر دل روزانہ تمہارے پاس جاتا ہے اور زیارت کرتا ہے

(الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۲۷۸)

زمانہ جاہلیت میں جب اہل عرب کی شاعری بلاغت کے معراج پر پہونچی ہوئی تھی۔ سخن سنجی و شعر گوئی کا

بازار گرم تھا تو صد ہا ایسی خواتین پیدا ہوئیں جن کے کارنامے ادبیات کی تاریخ میں غیر فانی نقوش چھوڑ گئے۔
اس دور کی مایۂ ناز شاعرہ خنساؔ، کا دیوان جس نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ آج بھی دنیائے ادب اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے جیسا کہ صدیوں پہلے قاصر تھی۔

سوق عکاظ میں جو زمانۂ جاہلیت میں نازک خیال اور رنگین طبع شعراء کا دنگل سمجھا جاتا تھا شعر و سخن کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور دل کھول کر داد سخن دیجاتی تھی، اُن میں شعراء کے ساتھ ساتھ اُس زمانہ کی صاحب علم و فضل خواتین بھی شریک ہوتی تھیں جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر خنساؔ ہے ۔ جب یہ آتی تھی تو اپنے بھائی صخر کو یاد کر کے خود روتی تھی اور سارے مجمع کو بھی رلاتی تھی، اُس کے کجاوہ پر ایک سیاہ جھنڈا نصب ہوتا تھا جو اس بات کا نشان سمجھا جاتا تھا کہ وہ اہل عرب میں سب سے زیادہ مظلوم ہے۔

عہد بنو امیہ کے مشہور اُستاد جریر سے کسی نے پوچھا "اشعر العرب" (سب سے بڑا شاعر عرب کا کون ہے؟) اُس نے جواب دیا اگر خنساؔ نہ ہوتی تو میں کہتا کہ میں ہوں اسی طرح ایک مرتبہ عہد بنو عباس کے جلیل القدر شاعر بشارؔ نے تذکرۃً کہا کہ عورتیں جب شعر کہتی ہیں تو اُس میں اُن کی فطری کمزوری کا اظہار ضرور ہو جاتا ہے کسی نے کہا کیا خنساؔ کے کلام میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے، اُس نے کہا "تلک فوق الرجال" (وہ تو مردوں سے بھی بازی لے گئی ہے)

نابغہ ذبیانی جو زمانہ جاہلیت کا مشہور شاعر تھا، خنساؔ، کا بڑا احترام کرتا تھا، جب وہ سوق عکاظ کے مشاعروں میں شریک ہوتی تھی تو نابغہ اُس کے لئے خاص اہتمام کرتا تھا، سرخ چمڑے کا ایک خیمہ لگایا جاتا تھا جس میں بڑی عزت کے ساتھ صدر مقام پر اُس کو بٹھایا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ وہ آئی تو حسن اتفاق سے امام فن ابو بصیر اعشیٰ، حضرت حسان اور اُس زمانہ کے دوسرے مشہور شعراء موجود تھے سب سے پہلے ابو بصیر اعشیٰ نے اپنا کلام سنایا پھر حضرت حسانؔ نے پھر اوروں نے، سب کے آخر میں خنساؔ نے اپنے دل ہلا دینے والے اشعار سنائے اور خوب خوب داد حاصل کی، نابغہ پر تو وجد کی کیفیت طاری ہو گئی بے اختیار بول اُٹھا۔

لولا انّ ابا بصیر انشدنی آنفاً	اگر ابو بصیر نے ابھی اپنا کلام نہ سنایا ہوتا تو میں یہی کہتا
لقلت انک اشعر الجن والانس	کہ تم جن و انس میں سب سے زیادہ باکمال شاعرہ ہو۔

(کتاب الشعر والشعراء مطبوعہ لندن صفحہ ۱۹۸)

لہ الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۱۱۱

حضرت حسان نے خیال کیا کہ نابغہ نے در اصل مجھ پر چوٹ کی ہے خفا ہو گئے اور کہنے لگے نابغہ تم نے کیا کہا ؟ خدا کی قسم میں تم سے، تمھارے باپ سے اور تمھارے دادا سے بھی اچھا شاعر ہوں۔

نابغہ نے حضرت حسان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا خفا ہونے کی بات نہیں، لو سنو اور انصاف کرو، پھر خنسا سے دوبارہ اشعار سنانے کی درخواست کی، اور کہا میرا مطلب یہ تھا کہ وہ عورتوں میں سب سے بڑی شاعرہ ہے۔ خنساء نے یہ سنا تو ناگوار ہوا، ڈانٹ کر بولی "خوشامد نہ کرو، میں مردوں سے بھی زیادہ اچھی شاعرہ ہوں۔

خنساء کا اصلی نام "تماضر بنت عمرو بن الشرید السلیمیہ" تھا اور خنساء لقب جو بعد میں اسقدر مشہور ہوا کہ لوگ اس کا اصلی نام بھول گئے، اُس کے دو بھائی تھے، صخر بن عمرو اور معاویہ بن عمرو۔ صخر کو بنو اسد نے اور معاویہ کو بنو مرہ غطفان نے قتل کر دیا تھا۔ اُس کا سارا دیوان انھیں دونوں کے مرثیوں سے بھرا پڑا ہے، نمونتاً چند اشعار درج ذیل ہیں:-

۱- اعینی جودا ولا تجمدا الا تبکیان بصخر الندا	اے میری دونوں آنکھوں آنسو بہائے جاؤ اور کبھی خشک نہ ہو کیا صخر کی داد و دہش کی یاد پر تمھیں رونا نہیں آتا۔
۲- الا تبکیان الجری الجمیل الا تبکیان الفتی السیدا	کیا تم ایک بہادر و خوبرو کی جدائی پر آنسو نہیں بہاتیں ؟ کیا تم اُس نوجوان سردار پر نہیں روتیں ؟
۳- طویل النجاد رفیع العماد وساد عشیرتہٗ امردا	جس کی تلوار کا پرتلا سب سے لمبا اور جس کا مرتبہ سب سے زیادہ بلند تھا اور جو لڑکپن ہی سے اپنے قبیلہ پر سرداری کرتا تھا۔
۴- اذا القوم مدوا بایدیہم الی المجد مد الیہ یدا	جب لوگ اسکی مدد طلب کرنے کے لئے دست سوال پھیلاتے تھے تو وہ عزت و شرافت کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیتا تھا۔

(کتاب الاغانی مطبوعہ مصر جلد سیز دہم صفحہ ۱۴۰)

شاعری میں کمال حاصل ہونے کے علاوہ خنسا کا شمار زمانۂ جاہلیت کی ان بہادر خواتین میں تھا جو میدان جنگ میں ہمیشہ مردوں کے دوش بدوش شریک رہتی تھیں، مجروحین کی مرہم پٹی کرتی تھیں اور مقتولین کی لاش اُٹھاتی تھیں۔ خنساء کے چار بیٹے تھے چاروں جنگ قادسیہ میں شریک ہوئے تھے، خنساء نے انھیں وصیت کر دی تھی کہ وہ کسی حالت میں بھی پیٹھ نہ دکھائیں۔ چنانچہ وہ سب یکے بعد دیگرے شہید ہوئے اور جب اسکی اطلاع خنساء کو پہونچی تو اُس نے کہا۔ "الحمد للہ الذی شرفنی بقتلہم" (خدا کا شکر ہے اس عزت پر جو مجھے انکے قتل ہو جانے سے نصیب ہوئی)

سلہ آداب اللغۃ العربیہ جلد اول صفحہ ۱۳۹

خنسار کی ایک پھوپھی کا نام بھی "تماضر بنت الشرید السلیمیہ" ہے وہ بھی اپنے زمانہ کی بڑی زبردست شاعرہ تھی قبیلۂ غطفان اور ہوازن کا سردار زہیر بن جدیمہ اُس کا شوہر تھا، جس کو خالد بن جعفر عامری نے جنگ نفراوات میں قتل کردیا تھا اور اُسکے بعد اُس کے بیٹے مالک بن زہیر کو غداری سے قتل ڈالا، تماضر نے جب یہ خبر سنی تو بیٹے کی جواں مرگی پر اُس نے ایک دلدوز اور پر اثر مرثیہ کہا جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

۱۔ کأنّ العین خالطہا قذاھا لحزنٍ واقعٍ افنیٰ کراھا	گویا آنکھیں غبار آلود ہوگئی ہیں۔ ایک غم کی وجہ سے جس نے آنکھوں کی نیند اچاٹ کردی ہے۔
۲۔ علی ولد وزین الناس طرًا اذا ما النار لم ترمن صلاھا۔	میں ایک ایسے بچہ پر آہ وزاری کررہی ہوں جو تمام لوگوں کیلئے زینت و فخر کا باعث تھا مہمانوں کیلئے اُسکی آگ روشن رہتی تھی جبکہ کوئی دوسرا اُسے روشن نہ کرتا تھا
۳۔ لئن حزنت بنو عبس علیہ فقد فقدت بنو عبس فتاھا	اگر بنو عبس اُس پر رنج کریں تو کوئی تعجب نہیں اس لئے کہ انھوں نے اپنے ایک نوجوان کو کھودیا ہے۔
۴۔ حذیفۃُ لا سُقیت من الغوادی ولا روتک ھاطلۃٌ نداھا	حذیفہ خدا کرے تو صبح آنے والے بادلوں سے کبھی سیراب نہ ہو اور نہ ابر کرم کی تجھ پر کبھی بارش ہو۔
۵۔ کما افجعتنی بفتیً کریمٍ ، اذا وزنت بنو عبسٍ علاھا	تو نے ایک شریف نوجوان کو قتل کرکے مجھے دکھ پہونچایا ہے۔ جو اگر تمام بنو عبس کے مقابلہ میں تولا جاتا تو وہی گراں ثابت ہوتا
۶۔ فدمعی بعدہ ابداً ھطول ، ولا یرقاء من عینی بکاھا	میرے آنسو اُس کے بعد ہمیشہ جاری رہیں گے اور میری آنکھیں اُس پر آہ وزاری سے کبھی خشک نہ ہوں گی۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول ص۲۴۳)

علامۂ جرجی زیدان نے زمانہ جاہلیت کی ان مشہور خواتین میں جن کی شاعری اور ادیبانہ بذلہ سنجی پر ساری صنف نسواں کو ناز تھا خنسار کے بعد لیلی العفیفہ، جلیلہ بنت مرہ اور خرنق (طرفہ کی بہن) کا نام لیا ہے اور ان کو اس دور کی باقی ماندہ شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والی خواتین پر ترجیح دی ہے، ذیل میں ہم ان کے کلام کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

لیلی العفیفہ - لکیز بن مرہ کی بیٹی تھی، بچپن ہی میں اُس کی شادی براق بن روحان مری کے ساتھ ہوگئی تھی، براق بن روحان اور اُس کا چھوٹا بھائی غرثان بن روحان قبیلہ بنو ربیعہ کے مشہور شہسوار اور بہادر سردار تھے، غرثان اُس جنگ میں مارا گیا جو سنہ ۵۶۶ء میں بنو ربیعہ اور بنو ایاد ولخم کے درمیان واقع ہوئی تھی، لیلی العفیفہ غرثان کی جواں مرگی پر آنسو بہاتی ہے اور اُسکو تنہا چھوڑ جانے پر بنو ربیعہ کو ملامت کرتی ہے۔

۱۔ لما ذکرتُ غرثًا زادبی کمدی،
حتی ہممتُ من البلویٰ باعلان

میں جب غرثٌ کو یاد کرتی ہوں تو میرے دل میں رنج و غم کا ایک طوفان برپا ہوجاتا ہے حتی کہ میں چاہتی ہوں اس مصیبت کو آشکارا کردوں۔

۲۔ تربع الحزن فی قلبی فذبتُ کما
ذاب الرصاص اذا اصلی بنیران۔

غم میرے دل پر چھایا ہوا ہے اور میں رنج میں اسطرح پگھل رہی ہوں جس طرح سیسہ جب وہ آگ پر رکھا جاتا ہے۔

۳۔ فلو ترانی والاشجان تقلقنی
عجبت براق من صبری وکتمانی

اگر تم مجھے دیکھو اس حال میں رنج و غم مجھے تکلیف پہونچا رہے ہیں تو براق تم میرے صبر وضبط پر تعجب کرو۔

۴۔ یاعین فابکی وجودی بالدموع ولا
تمل یا قلب ان تبلی باشجان

اے آنکھ رو اور آنسو بہا
اے دل ملول مت ہو جبکہ رنج والم سے تو پگھلا جارہا ہے۔

۵۔ فذکر غرثان مولی الحی من اسد
انسی حیاتی بلاشک والسانی۔

غرثان کی یاد نے جو قبیلہ بنو اسد کا سردار تھا
مجھے اور میری زندگی کو مجھ سے بھلا دیا ہے۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول صہ)

جلیلہ بنت مرہ، جساس بن مرہ کی بہن اور کلیب بن ربیعہ کی بیوی تھی، بدقسمتی سے جساس اور کلیب میں ان بن ہوگئی اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے، کلیب کہا کرتا تھا کہ "میں بزدلوں کی باتوں کا کچھ خیال نہیں کرتا، مرد ہو تو میدان میں آئے"۔ جس کا جواب جساس یہ دیتا تھا کہ "گھبراؤ نہیں میدان جنگ جلد فیصلہ کردے گا کہ ہم میں سے کون سچا ہے اور کون جھوٹا"۔ یہ سب کچھ شاعری میں سوال و جواب ہوا کرتے تھے مگر جب کبھی سامنا ہوجاتا تھا تو دونوں جان دینے اور جان لینے کے لئے تیار ہوجاتے تھے، ایسے مواقع پر غریب جلیلہ بیچ میں پڑکر دونوں کو خونریزی سے بچالیتی تھی، مگر یہ روک تھام تابکے؟ آخر ایک دن ایسا آیا کہ یہ ساری تدبیریں بیکار گئیں اور قسمت کا لکھا پورا ہوا، جساس اور عمرو بن حارث نے مل کر کلیب کو قتل کردیا۔

کلیب اپنے قبیلہ کا سردار تھا، اُس کی موت کوئی معمولی موت نہ تھی، قبیلہ کی جوان اور بوڑھی تمام عورتیں گریباں چاک سر پر خاک اُڑائے ہوئے ماتم کررہی تھیں کہ دفعۃً کسی کی نگاہ ناکردہ گناہ جلیلہ پر پڑی سب کے دلوں میں شعلۂ انتقام بھڑک اٹھا، انھوں نے کلیب کی بہن اسماء سے کہا۔ "ہمارے ماتم کدہ میں جلیلہ کی موجودگی ہمارے لئے باعث ننگ ہے، یہ تو کلیب کے قاتل کی بہن ہے، اسے یہاں سے فوراً نکالو"۔

اس مشورہ کی فوراً تعمیل کی گئی اور مصیبت کی ماری جلیلہ روتی پیٹتی وہاں سے چل کھڑی ہوئی اُس وقت اُس نے جو شعر کہے تھے اُن میں سے چند یہ ہیں:-

۱- یا ابنتہ الاقوام ان لمت فلا تعجلی باللوم حتے تسأ لی	اے خاتونو! اگر تم ملامت ہی کرنا چاہتی ہو تو جلدی نہ کرو اور مجھ سے پوچھ تو لو کہ کیا بات ہے۔
۲- فاذا انت تبینت الذی یوجب اللوم فلومی واعذلی	اگر تمھیں معلوم ہو جائے کہ میں واقعی ملامت کی مستحق ہوں تو شوق سے ملامت کرو اور برا بھلا کہو۔
۳- ان تکن اُخت امرئ لیمت علی شفق منہا علیہ فافعلی	پھر اگر کسی کی بہن پر محض اسلئے ملامت کیجا سکتی ہے کہ اُسے اپنے بھائی سے محبت تھی تو بھی ضرور کرو۔
۴- یا کلیب انت لی ذخرا لمنی کنت عزی وردائی المسبل	کلیب! تو ہی میری آرزوؤں کا مرکز تھا تو ہی میری عزت تھا اور میرے فخر کا سرمایہ تھا۔
۵- ما اظن الدھر یاتی مثلہ، فارس الحرب ومردی البطل	میں جانتی ہوں کہ زمانہ اُس جیسا اب پیدا نہیں کرسکیگا۔ وہ جو معرکۂ جنگ میں بہادر شہسوار تھا اور بڑے بڑے نوجوانوں کو تباہ کرکے چھوڑتا تھا
۶- جلّ عندی فعل جساس فیا حسرتی عما انجلت او تنجلی	مجھ پر جساس کی یہ حرکت بہت گراں گذری اور جو کچھ ہوچکا یا ہونے والا ہے اس پر افسوس کرتی ہوں۔
۷- فعل جساس علی وجدی آ قاطع ظھری ومدنِ اجلی	ہر چند مجھے جساس سے محبت ہے مگر اسکی اس حرکت نے مری پیٹھ توڑ دی اور میری موت مجھ سے قریب تر کر دی۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول ص۱۱)

خرنق بنت بدر بن ھفان الثعلبی زمانہ جاہلیت کے مشہور شاعر طرفہ بن عبد کی اخیافی بہن تھی، یہ بھی اپنے زمانہ کی بڑی قادرالکلام شاعرہ تھی، اُس کے اشعار کا مجموعہ دیوان کی شکل میں بیروت میں چھپ گیا ہے۔ اُس کا زمانہ عہد اسلام سے تقریباً ستر سال پیشتر تھا، اُس کا بیٹا عبد عمرو بن بشر بادشاہ حیرہ عمرو بن ہند کا مصاحب تھا، جب اُس کا انتقال ہوا تو دنیا اُس کی نظروں میں تاریک ہوگئی وہ اُس کے فضائل کا تذکرہ کرتے ہوئی کہتی ہے:-

۱- الاھلک الملوک وعبد عمرو وخلیت العراق لمن بغاھا	ہاں! سلاطین مٹ گئے اور عبد عمرو بھی ہلاک ہوگیا، اور عراق اُس شخص کیلئے خالی کر دیا گیا جو اُس پر دھاوا بولے
۲- فکم من والدلک یا ابن بشر تازر بالمکارم وارتداھا،	اے ابن بشر! تیرے باپ جیسے کم لوگ ہونگے جو سر سے پاؤں تک بزرگی کے لباس فاخرہ سے آراستہ تھا۔
۱- بنی لک مرثد وابوک بشر علی الشم البواذخ من ذراھا	مرثد اور تیرے باپ بشر نے تیرے مفاخر پہاڑ کی چوٹیوں سے بھی زیادہ بلند کر دئے۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول ص۳۶)

زمانۂ جاہلیت کی ان مشہور خواتین میں جن کا کلام کتب ادب و شاعری میں کثرت سے ملتا ہے۔ خنساء، جلیلہ بنت مرہ، لیلی العفیفہ، خرنق اخت طرفہ کے علاوہ امیمہ بنت امیہ بن عبد شمس، خالدہ بنت ہاشم، کبشہ بنت عمرو بن معدی کرب، میسہ بنت جابر، سلیمی بنت المہلہل، سلمی بنت مالک بن بدر، ہند بنت حذیفہ فارعہ بنت شداد، اروی بنت حباب، صفیہ بنت عمرو، میہ بنت ضرار، لیلی بنت وھب، مریم بنت طارق وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

جلیل الرحمن اعظمی

حدیث حسن

مصور جذبات جناب فطرت واسطی کی پچاس ولولہ انگیز اور سحر اثر نظموں کا مجموعہ ہے جسکی ہر نظم محبت کے لطیف جذبات کی آئینہ دار۔ لطف زبان سے رنگین حسن تخیل سے مزین۔ ندرت بیان میں معجز نما اور رومانی شاعری کا شاہکار ہے۔ حدیث حسن کی تقریباً نصف نظمیں، نگار، شاہکار، زمانہ اور دوسرے مشاہیر رسالوں میں شائع ہوکر خراج تحسین اور غیر فانی شہرت حاصل کرچکی ہیں۔ اس مجموعہ میں رئیس التحریر حضرت نیاز فتحپوری کی تقریظ کے علاوہ ملک کے دو مایۂ ناز ادیبوں کے فاضلانہ مقدمات شامل ہیں۔ حدیث حسن ۱۱۲ صفحات میں دو تصاویر، بہترین کتابت۔ کلکتہ کی بنی ہوئی خوشنما جلد اور غیر معمولی آب و تاب کے ساتھ بتیس پونڈ کے چکنے کاغذ پر زیور طبع سے آراستہ ہے اور باوجود ان محاسن صوری و معنوی کے قیمت صرف (عہ) علاوہ محصول ہے۔ المعلن: منیجر رسالہ شاہکار گورکھپور (یو، پی)

ضرورت ہے

۲۲ء فروری تا جون۔ اگست و نومبر ۲۳ء مارچ اپریل اگست و دسمبر۔ ۲۴ء ستمبر ۲۵ء جنوری اگست۔ اکتوبر نومبر و دسمبر۔ ۲۶ء مارچ تا مئی۔ ستمبر تا دسمبر۔ ۳۰ء فروری۔ جولائی تا دسمبر۔ ۲۸ء جنوری، فروری۔ اپریل تا جولائی۔ ستمبر تا دسمبر۔ ۲۹ء جنوری، اپریل تا جولائی۔ ستمبر تا نومبر ۳۰ء جنوری، اپریل تا جولائی۔ دسمبر۔ ۳۱ء جنوری، اپریل و مئی۔ ۳۲ء اپریل ۳۳ء جون اگست و ستمبر ۳۴ء جنوری، فروری، اگست و نومبر ۳۵ء اکتوبر۔

منیجر نگار لکھنؤ

ضلع کا ڈاکٹر

ایک مرتبہ موسم خزاں میں جب میں ملک کے دور دراز حصہ سے واپس آ رہا تھا مجھے سردی لگ گئی اور میں بیمار پڑ گیا۔ جسوقت بخار آیا خوش قسمتی سے میں گاؤں کی سرا میں تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو بلا بھیجا ڈاکٹر کا قد اوسط بال سیاہ اور جسم لاغر تھا۔ اُس نے مجھے دیکھ کر ایک نسخہ لکھدیا اور جیب میں ۵ روبل کا نوٹ رکھتے ہوئے کھانسکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کے بعد وہ جانے والا ہی تھا کہ یکایک کسی وجہ سے باتیں کرنے لگا اور بجائے جانے کے میرے ہی پاس ٹھہر گیا۔ میں بخار سے بے چین ہو رہا تھا اور اس خیال سے کہ رات کو نیند تو آنے کی نہیں اس نئے دلچسپ دوست کے ساتھ باتیں کرنے میں مجھے بھی بہت مسرت ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں چاء آئی اور ڈاکٹر نہایت بے تکلفی سے گفتگو کرنے لگا۔ وہ آدمی سمجھدار معلوم ہوتا تھا اور [illegible] کہتا تھا بہت پرزور طریقہ سے، جس میں ایک حد تک ظرافت بھی پائی جاتی تھی۔ دنیا بھی عجیب و غریب جگہ ہے۔ ہم سب اکثر لوگوں کے ساتھ ایک طویل مدت تک رہتے ہیں، ان سے دوستانہ تعلقات بھی ہوتے ہیں تاہم ان سے ایک دفعہ بھی آزادی اور بے تکلفی سے گفتگو نہیں کرتے۔ لیکن بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی سے ملاقات ہوئے مشکل سے چند منٹ ہوتے ہیں کہ ہم یا وہ ایک دوسرے پر اپنے تمام راز دل عیاں کرنے لگتے ہیں اب میں یہ نہیں جانتا کہ اُس ڈاکٹر کو میرے اوپر اس قدر اعتماد کیونکر ہو گیا اور کیوں اُس نے مجھے ایک نہایت دلچسپ قصہ سنایا۔ بہر حال میں ڈاکٹر ہی کے الفاظ میں وہ قصہ بیان کرتا ہوں:۔

"تم نہ جانتے ہو گے" اُس نے ایک کمزور آواز میں کہنا شروع کیا "تم یہاں کے جج میلوپیول لوپچ کو نہ جانتے ہو گے؟..... تم اُسے نہیں جانتے ہو؟..... خیر ہو گا" (اُس نے اپنا گلا صاف کیا اور آنکھیں ملیں) "اچھا۔ تو یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب نہٹ میں برف پگھلنے کا زمانہ آ چکا تھا۔ میں اُس کے یعنی جج کے مکان پر بیٹھا "پریفرنس" (تاش کا ایک کھیل) کھیل رہا تھا۔ جج بڑا اچھا آدمی ہے اور اُسے "پریفرنس" کھیلنے کا بڑا شوق ہے۔ یکایک (ڈاکٹر اس لفظ 'یکایک' کو بہت استعمال کرتا تھا) کسی نے مجھ سے آ کر کہا کہ آپ کو ایک نوکر بلا رہا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ کیا چاہتا ہے، مجھے جواب ملا وہ ایک خط لایا ہے جو غالباً کسی مریض نے

بھیجا ہے، میں نے وہ خط مانگ لیا اور اُسے پڑھکر کہا کہ ہاں یہ ایک مریض ہی کا خط ہے — وہ خط ایک خاتون — ایک بیوہ خاتون کا تھا جس میں اُس نے لکھا تھا کہ میری لڑکی مر رہی ہے۔ خدا کے لئے آجائیے۔ آپ کے لئے سواری بھیجدی گئی ہے ۔ ۔ ۔ مگر مشکل یہ تھی کہ وہ خاتون قصبہ سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر رہتی تھی نصف شب گزر چکی تھی اور سڑکوں کی حالت بہت خراب تھی، اور چونکہ وہ خود غریب تھی اس لئے کسی کو اُس سے دو نقرئی روبل سے زیادہ کی توقع بھی نہ ہو سکتی تھی بلکہ اُس میں بھی تنگ تھا۔ بہرحال تم جانتے ہو، فرض سب پر مقدم ہے — ممکن تھا کہ ایک بنی آدم کا انتقال ہو جائے لہٰذا میں نے پتے تو کیلیوین کو جو صوبجاتی کمیشن کا ممبر ہے دیدئے اور خود گھر آیا۔ یہاں آکر میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی معمولی، بدصورت گاڑی زینہ کے پاس کھڑی ہے، گھوڑے اُس میں کسی کسان کے جتے تھے جو بہت موٹے تھے۔ گاڑی بان ادب کے مارے اپنی ٹوپی اُتارے بیٹھا تھا یہ دیکھ کر میں اپنے دل میں سوچنے لگا "چلو یہ بات تو صاف ہو گئی کہ مریض رئیس نہیں ہے"۔ آپ ہنس رہے ہیں، لیکن بات یہ ہے کہ مجھ ایسے غریب آدمی کو ہر چیز کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اگر گاڑی بان شہزادہ کی طرح بیٹھا رہے، اپنی ٹوپی نہ اُٹھائے، تم کو گھور کر دیکھے اور اپنا کوڑا سڑاسڑ چلاتا رہے تو یقینی ہے کہ معاملہ ۶ روبل والا ہے۔ لیکن اس معاملہ کا رنگ اور تھا۔ خیر، تو میں ضروری دوائیں ساتھ لے کر چلدیا اور کسی نہ کسی طرح وہاں پہونچ بھی گیا۔ البتہ سڑک کیا تھی گویا جہنم کا راستہ تھی۔ چشمے بھی تھے، برف بھی تھی اور سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ ایک جگہ یکایک بند بھی ٹوٹ گیا تھا۔ بہرحال مریضہ کا گھر آگیا۔ مکان پھوس کا بنا تھا، کھڑکی میں روشنی تھی جس کے معنی یہ تھے کہ وہ لوگ میری آمد کے متوقع تھے۔ دروازہ پر ایک ضعیف اور معزز عورت کھڑی ہوئی تھی۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی کہا "اُسے بچا لیجئے، وہ مر رہی ہے!" میں نے جواب دیا "پریشان نہ ہوجئے۔ مریض کہاں ہے؟"۔ عورت نے کہا "ادھر آئیے"۔ میں اس کے ساتھ ایک چھوٹے سے صاف کمرہ میں پہونچا۔ بستر پر ۲۰ برس کی ایک لڑکی بیہوش پڑی ہوئی تھی۔ اُس کا بدن پھنکا جا رہا تھا اور وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی — اُس کو بخار چڑھا تھا! قریب ہی دو اور لڑکیاں بیٹھی تھیں جو اس کی بہنیں تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگیں، کل تک ان کی طبیعت بالکل اچھی تھی اور اشتہا بھی کافی تھی۔ آج صبح درد سر کی شکایت ہوئی اور شام تک یکایک وہ حالت ہو گئی جو آپ دیکھ رہے ہیں"۔ میں نے ان سے بھی اس کے جواب میں یہی کہا "گھبراؤ نہیں، آپ جانئے! یہ ڈاکٹر کا فرض ہے" — میں اُس کے قریب گیا، نبض دیکھی، لیپ لگانے کو کہا اور ایک نسخہ لکھ دیا۔ اس اثنا میں میں نے اُس کی طرف دیکھ بھی لیا تھا — میں نے اُسے وہیں دیکھا — واللہ! میں نے ایسا چہرہ کبھی نہیں دیکھا تھا — مختصر اً یہ کہ وہ حسن کا مجسمہ تھی۔ مجھے اُس پر بے انتہا

رحم معلوم ہوا ــــ ایسے حسین خط وخال! ایسی پرکیف آنکھیں!۔۔۔۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اُس کی حالت سنبھل گئی۔ اُسے پسینہ آگیا اور وہ ہوش میں آتی معلوم ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے چاروں طرف دیکھا مسکرائی اور اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ یہ دیکھتے ہی اُس کی بہنیں جھک کر اُس سے دریافت کرنے لگیں۔ "تم اب کیسی ہو؟" اُس نے جواب دیا "اچھی ہوں" اور یہ کہکر ان کی طرف سے گھوم گئی۔ میں نے اُس کی طرف پھر دیکھا۔ وہ سو گئی تھی۔ میں نے اس پر ان لوگوں سے کہا "اب مریض کو تنہا چھوڑ دیا جائے"۔ اس کے بعد ہم سب لوگ خاموشی سے دوسری طرف چلے گئے اور کمرہ میں صرف ایک خادمہ احتیاطاً چھوڑ دی گئی۔ برآمدہ میں ایک میز پر سماور اور ایک شیشہ شراب کا رکھا تھا۔ ہم لوگوں کے پیشہ میں بغیر اس کے کام نہیں چل سکتا۔
لڑکیوں نے مجھے چائے دی اور مجھ سے درخواست کی کہ رات کو وہیں ٹھہر جاؤں۔ میں نے اسے منظور کر لیا کیونکہ اُس وقت جا ہی کہاں سکتا تھا۔ مگر وہ ضعیف عورت برابر آہ وزاری کرتی رہی تو میں نے پوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے وہ اچھی ہو جائے گی آپ پریشان نہ ہوجیے بلکہ تھوڑا سا آرام کر لیجیے۔ اسوقت دو بجا ہے۔ اس پر وہ کہنے لگی کہ اگر کوئی خاص بات ہو گی تو مجھے جگا لیجئے گا؟ میں نے کہا "ہاں، ہاں"۔ یہ سن کر وہ چلی گئی۔ لڑکیاں بھی اپنے کمرہ میں چلی گئیں اور میرے واسطے انھوں نے برآمدہ میں بستر بچھا دیا۔ میں بھی بستر پر جا کر لیٹ گیا مگر تعجب یہ ہے کہ مجھے نیند نہیں آئی حالانکہ میں بہت تھکا ہوا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے مریض کا تصور اپنے دماغ سے دور نہیں کر سکتا تھا۔ بالآخر مجھے تاب نہیں رہی اور میں یکایک اُٹھ بیٹھا اور سوچنے لگا کہ جا کر دیکھ آؤں کہ مریضہ کیسی ہے۔ اُس کے سونے کا کمرہ برآمدہ سے ملا تھا۔ میں اُٹھا اور چپکے سے دروازہ کھولا ــــ میرا دل دھڑک رہا تھا! میں نے اندر دیکھا! خادمہ سو رہی تھی، اُس کا منھ کھلا تھا اور کمبخت خراٹے بھی لے رہی تھی! مریضہ میری طرف منھ کئے لیٹی تھی۔ میں اُس کے قریب گیا۔۔۔ مگر اُس نے یکایک آنکھیں کھول دیں اور میری طرف گھور کر چلانے لگی "کون ہے؟ کون ہے؟" میں گھبرا گیا اور آخرکار اُس سے کہا "خاتون گھبراؤ نہیں۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ دیکھنے آیا ہوں کہ اب کیسی ہو"۔ وہ بولی "تم ڈاکٹر ہو؟" میں نے جواب دیا "ہاں، میں ڈاکٹر ہوں۔ تمھاری ماں نے مجھے قصبہ سے بلوا بھیجا۔ اب تم سو جاؤ اور خدا نے چاہا تو دو ایک روز میں تم تندرست ہو جاؤ گی۔" "ہاں۔ ڈاکٹر صاحب براہ مہربانی مجھے موت سے بچا لیجئے۔" "تمھیں خدا اچھا کر دے تم اس طرح کیوں باتیں کرتی ہو؟" میں نے محسوس کیا کہ اُس کو پھر بخار معلوم ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے اُس کی نبض دیکھی۔ واقعی اُس کو بخار پھر چڑھ آیا تھا۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی۔ "میں تم سے بتاؤں گی کہ میں مرنا کیوں نہیں چاہتی ــــ میں تم سے ضرور بتاؤں گی۔۔۔ اس وقت ہم اکیلے ہیں ــــ البتہ براہ مہربانی آپ کسی سے ۔۔۔۔ کسی سے بھی کہہ نہ دیجئے گا۔۔۔ اچھا سنیئے!۔۔۔" میں جھک گیا۔

وہ اپنے ہونٹ میرے کان کے قریب لے آئی۔ اُس کے بال میرے رخسار کو چھو رہے تھے — میرا سر چکر کھانے لگا تھا — اتنے میں وہ کچھ کہنے لگی مگر میری سمجھ میں بالکل نہ آیا۔۔۔۔۔۔۔ وہ بدحواس ہوگئی تھی۔۔۔۔ وہ کانا پھوسی کرتی رہی مگر اتنی تیزی سے کہ گویا وہ روسی زبان ہی نہیں بول رہی ہے۔ آخر کار اُس نے اپنی کہانی ختم کی اور اپنا سر تکیہ پر رکھ لیا۔ اس کے بعد اُس نے اپنی اُنگلی سے مخاطب کر کے مجھ سے پھر کہا "ڈاکٹر صاحب یاد رکھیے گا۔ کسی سے کہیے گا نہیں"۔ میں نے اُسے کسی طرح چپ کیا، کچھ پینے کو دیا، نوکر کو جگایا اور پھر چلا گیا"

یہاں پر ڈاکٹر نے ہلاس لی اور اُس کے بعد پھر کہنا شروع کیا:-

"بہر حال، دوسرے روز خلاف توقع مریضہ کی حالت اچھی نہ ہوئی۔ میں سوچنے لگا کہ کیا جائے۔ اور یکایک یہ فیصلہ کیا کہ میں یہیں رہوں گا گو میرے دوسرے مریض میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔۔۔۔ اور آپ جانتے ہیں کہ کوئی شخص اُس سے بے پرواہی نہیں کر سکتا کیونکہ جو شخص ایسا کرتا ہے اُس کے پیشہ کو نقصان پہونچتا ہے۔ لیکن سب سے پہلے تو میں نے یہ خیال کیا کہ مریضہ کی حالت خطرناک ہے اور دوسرے میں خود اُس کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے اُس کا پورا خاندان اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ وہ لوگ غریب تھے مگر پھر بھی بہت تعلیم یافتہ تھے۔۔۔۔۔۔ ان کا باپ بہت قابل آدمی تھا — ایک مصنف! اُس کا انتقال مفلسی کی حالت میں ضرور ہوا تھا مگر اُس نے اپنی لڑکیوں کو تعلیم بہت معقول دلادی تھی۔ کتابیں بھی وہ بہت بڑی تعداد میں چھوڑ گیا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ میں مریضہ کی بہت دیکھ بھال کرتا تھا، اس وجہ سے یا کسی اور وجہ سے نہیں کہہ سکتا ہوں کہ مگر میں اِس طرح خیال کرتا تھا کہ جیسے میں بھی انھیں کے خاندان کا ہوں۔۔۔۔۔۔ [illegible] سڑکیں اور بھی خراب ہوگئیں۔ تمام سلسلہ رسل و رسائل منقطع ہوگیا حتیٰ کہ شہر سے دوائیں بھی بمشکل آسکتی تھیں۔۔۔۔۔ بیمار لڑکی بھی اچھی نہیں ہو رہی تھی۔۔۔۔۔۔ روز بروز۔۔۔۔۔۔ روز بروز۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ یہاں۔۔۔۔۔" (ڈاکٹر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگیا) "بھئی! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سے کیسے کہوں۔۔۔۔" (اُس نے پھر تھوڑی سی ہلاس لی، کھانسا اور ذراسی چاء پی) "خیر! میں تم سے سیدھے سادے بیان کر دوں۔ میری مریضہ۔۔۔۔۔ کیسے بتاؤں!۔۔۔۔ ہاں تو وہ مجھ پر عاشق ہوگئی تھی۔۔۔ یا نہیں۔ وہ عاشق نہیں ہوئی تھی۔۔۔۔ بہر حال۔۔۔۔ واقعی، کس طرح کہوں؟" (ڈاکٹر نیچے دیکھنے لگا اور اُس کا چہرہ سرخ ہوگیا) اس کے بعد جلدی سے کہنے لگا "نہیں۔ واقعی وہ عاشق ہوگئی تھی۔ انسان کو اپنے آپ کو سیدھا سادا بتانا چاہیئے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی تھی، ہوشیار اور بڑی قابل، اور میں سمجھئے، لاطینی بالکل ہی بھول چکا تھا۔ رہ گئی صورت شکل (ڈاکٹر نے اپنی طرف مسکرا کر دیکھا) سو میں اس پر بھی کوئی فخر نہیں کر سکتا لیکن خداوند تعالیٰ نے مجھے بیوقوف نہیں بنایا ہے۔ میں سفید کو سیاہ نہیں سمجھتا ہوں۔ میں تھوڑا بہت

سمجھ بھی لیتا ہوں۔ مثلاً میں یہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ الکسنڈرا اینڈریونا ۔۔ یہ اُس کا نام تھا ۔ مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ایک دوستانہ رغبت تھی ۔ تعظیم و تکریم یا کچھ اسی طرح اکو بعض وقت وہ خود اس جذبہ کو غلط سمجھتی تھی مگر اس کا رویہ تھا ایسا ہی۔ اب آپ اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر نے جو یہ تمام غیر مربوط جملے سانس لئے بغیر بہت گھبراہٹ میں کہے چلا جا رہا تھا اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا) مجھے تعجب یہ ہو رہا ہے ۔ آپ اسے نہیں سمجھ سکتے ۔۔۔ اچھا تو میں آپ کی اجازت سے سلسلہ وار بیان کروں گا"

یہ کہکر اُس نے چاء کی پیالی پی اور پھر کچھ اطمینان سے کہنا شروع کیا :۔

"اچھا تو میری مریضہ کی حالت خراب ہوتی چلی گئی۔ آپ ڈاکٹر نہیں ہیں اور یہ نہیں سمجھ سکتے ہیں کہ غریب ڈاکٹر کے دل پر خصوصاً جب اُسے یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ بیاری اُس کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کرتی جاتی ہے کیا گزرتی ہے اور وہ خود اپنے متعلق کیا خیال کرنے لگتا ہے۔ انسان اتنا پژمردہ ہو جاتا ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم ہر بات بھول گئے ہیں، مریض کو ہم پر اعتماد نہیں رہ گیا دوسروں کو بھی پتہ چلنے لگتا ہے کہ تم پریشان ہو۔ تمھاری طرف ان کا مشکوک نگاہوں سے دیکھنا اور کانا پھوسی کرنا ۔۔ اف! کسقدر تکلیف دہ چیز ہے! دل میں خیال آتا ہے کہ اس بیاری کا کوئی نہ کوئی علاج ضرور ہوگا بشرطیکہ سمجھ میں آجائے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے۔ تم ایک علاج کرتے ہو ۔۔ اور پھر کہتے ہو نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے ۔۔ اصل تو یہ ہے کہ تم دوا کو اپنا کام کرنے کے لئے کافی وقت ہی نہیں دیتے ہو ۔۔۔ تم ایک چیز پکڑتے ہو اور پھر اُسے چھوڑ کر دوسری پکڑنے لگتے ہو۔ مگر اس اثناء میں ایک فرد بھی آدم کی جان بر بن جاتی ہو اور کوئی دوسرا ڈاکٹر اُسے بچا سکتا ہے تو تم کہتے ہو کہ کسی اور ڈاکٹر سے مشورہ کرا لینا چاہئے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ منھ سے یہ بھی نکلتا ہے کہ میں اپنے اوپر ذمہ داری نہیں لوں گا۔ ایسے موقعوں پر تم کتنے بیوقوف معلوم ہوتے ہو۔ مختصر یہ کہ آدمی مرجاتا ہے ۔ مگر اس میں تمھارا قصور نہیں ہے ۔۔ ہم نے اُس کا قاعدہ کی رو سے علاج کیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ چیز یہ ہے کہ تمھارے دست شفا پر دوسروں کو کامل اعتماد ہو مگر تم خود اس کا احساس کر رہے ہو کہ تم کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتے ہو۔ تو یہی کامل اعتقاد تھا جو اینڈریونا کا پورا خاندان مجھ پر رکھتا تھا۔ وہ یہ بھی بھول گئے تھے کہ ان کی لڑکی کی حالت خطرناک ہے۔ میں بھی اُکو یقین دلاتا کرتا تھا کہ کوئی بات نہیں ہے مگر میرا دل اندر ہی اندر ڈوبتا جاتا تھا۔ آفت بالائے آفت یہ تھی کہ گاڑیبان دوا لینے کے لئے جاتا تھا تو شام تک واپس آتا تھا۔ میں مریضہ کے کمرہ سے باہر نہیں جاتا تھا اصلیت یہ ہو کہ میں اُس سے علٰحدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ جانئے میں اُسے دلچسپ قصہ سنایا کرتا اور اُس کے ساتھ

تاش کھیلا کرتا تھا اور رات کو اُس کے پاس بیٹھ کر اُس کی تیمارداری کرتا تھا۔ بیچاری بڈھی ماں با چشم پُر آب یہ اشکریہ ادا کیا کرتی مگر میں اپنے دل میں خیال کرتا کہ میں شکریہ کا مستحق نہیں ہوں'۔ میں آپ سے صاف صاف اس کا اقرار کرتا ہوں ـــــ اب اُس کے چھپانے سے کوئی فایدہ نہیں ہے ـــــ کہ میں اپنی مریضہ پر عاشق تھا۔ الکسنڈرا اینڈریونا کو بھی مجھ سے ایک لگاؤ ہو گیا تھا۔ بعض وقت وہ میرے علاوہ کسی اور کو اپنے کمرہ میں آنے تک نہیں دیتی تھی)۔ وہ مجھ سے خوب گفتگو بھی کرنے لگی اور اس قسم کے سوالات بھی کرنے لگی کہ میں نے تعلیم کہاں حاصل کی۔ میں رہتا کس طرح ہوں، میرے اعزہ کون لوگ ہیں اور میرے ملاقاتی کون کون ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ اُسے گفتگو نہ کرنا چاہئے مگر تم جانتے ہو کہ میں اُسے منع نہیں کر سکتا تھا ـــــ بعض وقت میں اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر اپنے دل سے کہتا، بدمعاش! تو کیا کر رہا ہے؟' ـ ـ ـ ـ مگر وہ میرا ہاتھ پکڑ لیتی، دیر تک مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتی، پھر گھوم جاتی اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگتی 'تم کیسے اچھے آدمی ہو! ـــــ اُس کے ہاتھ میں بخار کا اثر معلوم ہوتا تھا ـــــ اُس کی آنکھیں کیسی بڑی بڑی اور کیسی پر کیف تھیں!!.... وہ کہتی ہاں ـــــ تم بہت اچھے اور رحمدل انسان ہو۔ تم ہمارے اور ہمسایوں کی طرح نہیں ہو.... نہیں تم اُس طرح نہیں ہو.... میں ابھی تک تم سے کیوں نہ ملاقات کر سکی، میں اس پر یہ جواب دیتا 'اینڈریونا! اطمینان رکھو، تم پھر اچھی ہو جاؤ گی'۔ "اور میں آپ سے یہ بھی بتا دوں" ڈاکٹر صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اور آگے بڑھ کر اپنی ابروؤں کو چڑھاتے ہوئے کہا کہ "یہ لوگ اپنے ہمسایوں سے بہت کم تعلق رکھتے تھے کیونکہ چھوٹے آدمی ان کے برابر نہیں تھے اور خودداری ان کو امیروں سے ملنے نہیں دیتی تھی۔ بات یہ ہے کہ وہ نہایت تعلیم یافتہ گھر تھا اور یہ میرے لئے بہت اطمینان بخش چیز تھی ـــــ بہرحال اینڈریونا صرف میرے ہاتھ سے دوا پیتی تھی.... وہ خود اُٹھ پڑتی ـــــ بیچاری غریب لڑکی ـــــ میری مدد سے دوا پیتی اور میری طرف دیکھنے لگتی.... مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ گویا میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔ مگر اس اثنا میں اُس کی حالت برابر خراب ہوتی جا رہی تھی اور میں اپنے دل میں یہ خیال کرتا کہ وہ مر جائے گی، ضرور مر جائیگی آپ یقین کیجئے کہ میں خود اُسکی جگہ قبر میں جانے کیلئے تیار تھا۔ اُسکی ماں اور بہنیں بھی مجھے دیکھا کرتیں۔ اور اب اُنکا مجھ پر اعتقاد کم ہوا وہ مجھ سے دریافت کرتیں۔ اب طبیعت کیسی ہے؟ تو میں جواب دیتا 'بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک۔ میرے ہوش و حواس در اصل درست نہ تھے ـــــ خیر۔ ایک رات میں اپنی مریضہ کے پاس اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ خادمہ بھی وہیں لیٹی تھی زور زور سے خراٹے لے رہی تھی۔ میں اُس غریب لڑکی کو مورد الزام نہیں بناتا۔ وہ بھی بہت تھک گئی تھی اینڈریونا کی طبیعت، اُس شام کو بہت خراب رہی تھی۔ اس وقت اُسے بہت بخار چڑھا ہوا تھا۔ نصف شب تک وہ کروٹیں بدلتی رہی آخر کار ایسا معلوم ہوا کہ اُس کو نیند آ گئی ہے یا کم از کم یہ کہ وہ بالکل ساکت لیٹ گئی

کونے میں حضرت عیسیٰ کی تصویر کے سامنے لیمپ جل رہا تھا - میں وہاں اپنا سر جھکائے بیٹھا تھا بلکہ تھوڑا سا اونگھ بھی رہا تھا - یکایک مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے مجھے چھوا - میں گھوم پڑا ..... ہائیں! اینڈ ریونا مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی ..... اُس کے لب کھلے ـــ اُس کے رخسار جل رہے تھے ـــ میں نے کہا :- "کیا بات ہے؟" "ڈاکٹر صاحب - کیا میں مرجاؤں گی؟" "نعوذ باللہ!" "نہیں - ڈاکٹر صاحب! نہیں یہ مجھ سے نہ کہئے کہ میں زندہ رہوں گی ـــ ایسا نہ کہئے ... اگر آپ جانتے ہوتے ..... سنئے! خدا کے لئے میری صحیح حالت نہ پوشیدہ رکھئے" اب اُس کی سانس تیزی سے چلنے لگی تھی - "اگر مجھے یہ یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ میں ضرور مرجاؤں گی ..... تو میں آپ کو سب کچھ بتا دوں ... سب کچھ!" "اینڈ ریونا - میں تم سے درخواست کرتا ہوں ـــ" "سنئے - میں مطلق نہیں سوئی ہوں ..... میں آپ کو بڑی دیر سے دیکھ رہی ہوں .... خدا کے لئے .... مجھے آپ پر اعتماد ہے - آپ بہت اچھے آدمی ہیں ـــ میں آپ سے دنیا کی تمام مقدس چیزوں کا واسطہ دلاکر پوچھتی ہوں ـــ مجھ سے سچ سچ بیان کر دیجئے - کاش کہ آپ یہ سمجھ لیتے کہ میرے لئے یہ کسقدر اہم ہے .... کیا میری حالت خطرناک ہے؟" "اینڈ ریونا - میں تم سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا - تمھاری حالت واقعی خطرناک ہے - مگر خدا بہت رحیم ہے" "میں مرجاؤں گی ـــ میں مرجاؤں گی" اسوقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ بہت خوش ہے - اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا - میں یہ حالت دیکھ کر گھبرا گیا مگر اینڈ ریونا بولی "ڈرئے نہیں - ڈرئے نہیں - مجھے موت کا خوف نہیں ہے" یہ کہکر وہ بیٹھ گئی اور اپنی کہنیوں پر جھک کر کہنے لگی "اب ..... ہاں ـــ اب میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ میں آپ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں اور یہ کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں!" میں یہ سنکر حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا - میرے لئے یہ عجیب و غریب چیز تھی مگر اینڈ ریونا نے پھر کہا "آپ سنتے ہیں! میں آپ سے محبت کرتی ہوں" "اینڈ ریونا! مجھے کس چیز نے اس قابل بنایا ہے کہ ـــ" "نہیں - نہیں - تم مجھے .... تم مجھے .... سمجھ نہیں پائے ..."

یہ کہکر اُس نے یکایک اپنے ہاتھ پھیلائے اور میرا سر پکڑ کر پیشانی چوم لی .... یقین کیجئے میں اس حرکت سے قریب قریب چیخ اُٹھا .... میں گھٹنوں کے بل جھک گیا اور اپنا سر تکیہ میں چھپا لیا - اینڈ ریونا خاموش لیٹی رہی اور اُس کی اُنگلیاں میرے سر کے بالوں سے کھیلتی رہیں - اتنے میں یکایک اُس نے رونا شروع کر دیا - میں اُسے خاموش کرانے اور اطمینان دلانے لگا ... مگر مجھے یہ نہیں یاد کہ میں نے اُس سے کیا کیا کہا - "دیکھو تم اس خادمہ کو جگا دوگی ـــ اینڈ ریونا! میں تمھارا شکریہ ادا کرتی ہوں ـــ یقین کرو - پریشان نہ ہو" "بس - بس - کسی کی پرواہ مت کرو - اُس کو اُٹھ جانے دو - کمرہ میں آجانے دو - کچھ پرواہ نہیں ـــ میں مر رہی ہوں ـــ تم دیکھتے ہو .... اور تم ڈرتے کیوں ہو؟ تمھیں کس بات کا خوف ہے - اپنا سر اُٹھاؤ ....

اچھا شاید تم کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔ میں غلطی پر ہوں۔۔۔ یہ ہے تو مجھے معاف کردو۔" "اینڈریونا تم کیا کہہ رہی ہو۔۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں ـ اینڈریونا" اس پر اُس نے اپنی آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور اپنے ہاتھ پھیلا کر کہا ' اچھا تو پھر مجھ کو اپنی آغوش میں لے لو!' میں آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر میں اُس رات کو پاگل کیوں نہیں ہوگیا۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ میری مریضہ اپنا خاتمہ کئے ڈال رہی ہو مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پوری طرح اپنے حواس میں نہیں ہے۔ میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اگر وہ اپنے آپ کو موت کے قریب نہ دیکھتی تو میرا کبھی خیال نہ کرتی اور۔ آپ خواہ کچھ بھی کہئے، مگر محبت سے آشنا ہوئے بغیر ۲۰ برس کی عمر میں مرجانا بڑی مشکل چیز ہے۔ یہ چیز۔ اُس کے لئے تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اُسنے نا امیدی میں مجھ سے اظہارِ عشق کیا میں نے اُس سے کہا " اینڈریونا! میرے اوپر اور اپنے اوپر رحم کرو!" "کیوں؟" وہ بولی۔ "خیال کس بات کا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں مرنے والی ہوں"۔ یہ وہ مسلسل کہتی گئی " اگر میں یہ جانتی کہ میں زندہ رہوں گی اور پھر ایک نوجوان لڑکی بن جاؤں گی تو میں شرمندہ بھی ہوتی۔۔۔ واقعی شرمندہ۔۔۔ مگر اس حالت میں اس کی کیا ضرورت ہے؟" "لیکن کس نے کہا کہ تم مرجاؤ گی؟" "اب چھوڑو بھی اسے! تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ تم جھوٹ بولنا نہیں جانتے! ذرا اپنی صورت تو دیکھو!"۔۔ "اینڈریونا تم زندہ رہو گی۔ میں تمہارا علاج کروں گا۔ اور ہم دونوں ایک ہوجائیں گے۔۔۔ اور پھر ہنسی خوشی اپنی زندگی گزاریں گے۔" "نہیں۔ نہیں۔ مجھے تمھاری بات کا یقین ہے۔ میں یقیناً مروں گی۔۔۔ تم نے وعدہ کیا ہو۔۔۔ تم نے کہا ہے" ۔۔۔ میرے لئے یہ بات بہت تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔ خیال تو کیجئے کہ بعض وقت معمولی باتوں سے کیا ہوجاتا ہے۔ بظاہر معاملہ کچھ نہیں مگر ہے بہت اہم۔ اُس کے دل میں یکایک کچھ خیال آیا اور میرا نام دریافت کرنے لگی۔ میرا خاندانی نام نہیں بلکہ پہلا نام۔ میرا نام ٹرائفن بہت برا تھا مگر اب اسے کیا کروں۔ نام ہی ٹرائفن ہے بیچ ہی گھر میں البتہ سب لوگ مجھے ڈاکٹر کہا کرتے تھے بہر حال میں نے اُس سے کہا کہ میرا نام ٹرائفن ہے۔ یہ سنکر اُسنے اپنا سر ہلایا اور فرانسیسی زبان میں کچھ کہا جو میرے خیال میں کوئی اچھی بات نہ ہوگی۔ اسکے بعد وہ ہنسنے لگی۔ قصہ مختصر میں نے وہ تمام رات اُس کے ساتھ اسی طرح بسر کی۔ صبح ہونے سے قبل میں باہر چلا گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میں پاگل ہوگیا ہوں۔ چاء کے بعد میں اُسکے کمرہ میں پھر گیا مگر اب اُسکی یہ حالت ہوگئی تھی کہ میں بمشکل اُسے پہچان سکتا تھا۔ جن لاشوں کو قبر میں اُتارا جاتا ہے وہ بھی اس سے اچھی حالت میں ہوتی ہیں۔ میں آپ سے قسم کھاکے کہتا ہوں کہ میں مطلق نہیں سمجھ سکتا کہ میں اس نظارہ کو کیونکر برداشت کرسکا۔ بہر حال تین دن اور تین رات میری مریضہ اور زندہ رہی۔ مگر معاذ اللہ! کیا راتیں تھیں! نہ معلوم اُس نے مجھ سے کیا کیا باتیں کیں۔ آخری رات میں ــ ذرا خیال کیجئے ـــ میں اُس کے پاس بیٹھا ہوا خدا سے صرف ایک دعا مانگ رہا تھا کہ اے خدا اسے جلدی سے اُٹھا لے اور

اس کے ساتھ ہی مجھے بھی!" میں یہ دعا مانگ ہی رہا تھا کہ اینڈریونا کی بڈھی ماں یکایک کمرہ میں خلاف توقع داخل ہو گئی۔ میں نے شام ہی کو اُس سے یہ کہہ دیا تھا کہ اینڈریونا کے بچنے کی اُمید کم ہے اس لئے بہتر ہو گا کہ وہ کسی پادری کو بلا لے۔ لیکن بیمار لڑکی نے اپنی ماں کو دیکھتے ہی کہا "اچھا ہوا، کہ آپ آ گئیں۔ ہماری طرف دیکھئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں ۔ ہم لوگوں نے ایک دوسرے کو اپنا قول دیا ہے"۔
"ڈاکٹر صاحب! یہ کیا کہہ رہی ہے؟" میں نے جواب دیا "بخار ہے۔ ہذیان بک رہی ہیں"۔ لیکن میرے یہ کہتے ہی اینڈریونا بول اُٹھی "ہائیں تم نے ابھی تو کچھ اور کہا تھا، میری انگوٹھی بھی تم لے چکے ہو۔ تم بنتے کیوں ہو میری ماں بڑی نیک ہے ــــ وہ معاف کر دیں گی ــــ وہ سمجھ جائیں گی ــــ اور میں تو مر ہی رہی ہوں ....
مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اپنا ہاتھ دو"۔ مگر میں یہ سنتے ہی کمرہ سے بھاگا اور بڑھی عورت سمجھ گئی کہ قصہ کیا ہے۔

"میں آپ کی اور زیادہ سمع خراشی نہ کروں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کی یاد خود میرے لئے بڑی تکلیف دہ ہے۔ میری مریضہ کا دوسرے دن انتقال ہو گیا۔ خدا اُس کی روح کو آرام دے"۔ "مرنے سے قبل" ڈاکٹر نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "اُس نے اپنے گھر بھر سے کہا کہ سب لوگ باہر چلے جائیں اور مجھے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اکیلا رہنے دیں۔ جب سب لوگ چلے گئے تو اس نے مجھ سے یوں کہنا شروع کیا "مجھے معاف کر دو۔ تمہارے لئے مورد الزام میں ہی ہوں .... میری بیماری .... لیکن یقین کرو کہ میں نے تم سے زیادہ اور کسی سے نہیں محبت کی .... مجھے بھولنا نہیں ... میری انگوٹھی رکھے رہو"۔ یہ کہکر ڈاکٹر چلنے کے لئے تیار ہوا مگر میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اچھا" وہ بولا "آیئے ہم لوگ معمولی سی شرط پر "پریفرنس" کھیلیں۔ مجھ ایسے آدمیوں کے لئے زیبا نہیں ہے کہ جذبات کے آگے سرنگوں ہو جائیں۔ مجھے تو صرف ایک بات کا خیال رکھنا ہے اور وہ یہ کہ دل کو رونے سے کیسے خاموش کیا جائے اور بیوی کی ڈانٹ سے کیسے بچا جائے۔ اُس واقعہ کے بعد میں نے قانونی شادی کر لی ــــ میں نے ایک تاجر کی لڑکی سے نکاح کر لیا ــــ سات ہزار اُس کے جہیز میں ملے اس کا نام اکولین ہے۔ "ٹرائفن" کے نام کے ساتھ یہ نام بہت موزوں ہے۔ اُس کا مزاج بہت خراب ہے خوش قسمتی سے وہ دن بھر سویا کرتی ہے .... ہاں تو یہ بتایئے کہ "پریفرنس" کھیلئے گا؟"
ہم لوگ نصف پینی فی پوائنٹ کے حساب سے "پریفرنس" کھیلنے لگے۔ اور کچھ دیر بعد ٹرائفن آئیوچ مجھ سے ڈھائی روبل جیت کر، اپنی کامیابی پر مسرور، کافی رات گئے اپنے گھر چلا گیا۔

(ترگینو)

ضیاء بدایونی اور مومن

ہماری قدیم شاعری کے آخری دور میں ذوق، غالب اور مومن وہ باکمال شعراء ہوئے ہیں جنکو زمانہ شاید کبھی نہیں مٹا سکتا اور حقیقت یہ ہے کہ سلاستِ بیان، بلندیِ فکر اور رنگینیٔ خیال کے جو نادر نقوش وہ چھوڑ گئے ہیں وہ آپ اپنی نظیر ہیں۔

ذوق مرحوم کا کلام عام فہم تھا، ہمارے ہی عہد میں باآب وتاب سوانح کے ساتھ شایع ہوگیا۔ غالب کا کلام، دقت و نزاکت فکر میں بے نظیر تھا، اُن کے دیوان پر پہلی افتاد مولانا خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ کرم تھی۔ حیرت ہے حضرت مولانا نے دفتر فلسفہ کیوں دریا برد نہ کردیا، آخر اُن کے بعد کون فلسفہ کا امام پیدا ہونے والا تھا؟

غالب اگرچہ "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" کی مصیبت میں گرفتار ہوگئے تاہم کہہ گزرے کہ:-
"ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو" آسماں نے یقیناً خوب دستورِ صلح جوئی سے کام لیا کہ غالب کے باقیماندہ کلام کی طرف اہل ملک کی توجہ منعطف ہوئی اور "قیمتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن" کی پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ہوگئی، اب رہے حضرت مومن سو غدر ۵۷ء کے بعد گوناگوں مصائب نے ہندوستان کو اس قابل نہ رکھا کہ کوئی بات لطف واطمینان کی ہوسکتی، آخرکار ایک مدت کے بعد آج مومن کا کلام اپنی پوری جامہ زیبی کے ساتھ عالم شہود میں جلوہ گر ہے۔

ہمارے محترم جناب مولنا ضیاء احمد صاحب کا وجود نہ صرف بدایوں بلکہ ملک کے لئے سرمایہ صد فخر و مباہات ہے۔ آپ کی سعی و جمیل سے مومن کے دیوان کا یہ نسخہ معہ شرح کے ہمارے پیش نظر ہے، اس میں شک نہیں کہ مومن کے کلام کے ساتھ جو بے اعتنائی برتی گئی اس کی تلافی مولانا نے فرمائی اور دقیق ترین اشعار کے معانی مولانا نے بحسن و خوبی واضح فرمادئے، اب جو سخن شناس آیندہ مومن کے کلام پر توجہ کرے گا۔ اس کے لئے مولانا کی شرح راہنما ہوگی اور "الفضل للمتقدم" کا شرف مولنا کے لئے مخصوص رہیگا۔

مقدمہ پر ایک سرسری نظر سے معلوم ہوا کہ مولانا محبِ مفرط ہیں، اگرہمیں متعصبانِ مفرط میں قیاس

نہ کیا جائے تو اسقدر عرض کرنا ہے کہ افضلیت یا کم از کم "افضلیت من کل الوجوہ" سے مولٰنا کو احتراز ضروری تھا، مولانا فرماتے ہیں "ذوق و غالب مقلد ہیں اور مومن مجتہد" یہ مولٰنا کا اجتہاد ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے "قصیدہ نگاری میں بجز سودا مومن کا کوئی ہمسر نہیں" اگر ایسا ہے تو چشم ما روشن دل ما شاد لیکن یہ منطق سمجھ میں نہیں آئی کہ "اگرچہ پختگی" اور صفائی میں ذوق کا پایہ کہیں برتر ہے تاہم زور اور ندرت میں مومن کا جواب نہیں۔" اگر زور کے مفہوم میں پختگی اور صفائی بھی شامل ہے تو ماننا پڑے گا کہ ذوق کا مثل قصیدہ نگار، شعرائے اردو میں پیدا نہیں ہوا

مولٰنا فرماتے ہیں "غزل میں تصوف عجز شاعرانہ ہے"[1] تاہم آپ کی رائے ہے کہ ایک صوفی صافی طبیعت غزل سرائی کے لئے رند شاہد باز بنے تو غزل کہے ورنہ قدرت کلام سے محروم قرار پائے۔ حالانکہ حضرت مومن کی پہلی غزل حمد و نعت وغیرہ پر مشتمل ہے۔ گو علمیت کا جلوہ غزل میں بھی موجود ہے ؂

آتش سینہ تفسیدہ کو کیا میں روؤں اشک جانب کرۂ آب کے مایل نہوا

بہرحال ہمیں مولٰنا سے اسقدر عرض کرنے کا حق حاصل ہے، کہ مومن کی تعریف دوسروں کی تنقیص کی متلزم نہ تھی۔ مولٰنا ذوق کی نسبت فرماتے ہیں ملخصاً "ذوق کی تمام عمر لابہ گری و بادخوانی میں بسر ہوئی غلامانہ ذہنیت ایسے ہی نتائج پیدا کرتی ہے" مومن کی بابتہ ارشاد ہے "نعت و منقبت کے علاوہ صرف دو قصیدے جو ارباب دنیا کی مدح میں کہے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو نواب وزیرالدولہ نواب ٹونک کی شان میں (جن سے مومن کو روحانی نسبت بھی تھی) دوسرا راجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ مقیم دہلی کے شکریہ میں جنھوں نے اُن کو خود بلا کر انعام و اکرام سے سرفراز کیا تھا" ابوظفر بہادر شاہ جو سلاطین مغلیہ میں بادر و لیش بادشاہ ہوا ہے راجہ اجیت سنگھ کے برابر بھی مستحق ستایش نہ تھا۔

مقدمہ کے بعد دیوان معہ شرح ہے۔ اور اس حقیقت کا اظہار غالبًا نازیبا نہ ہوگا کہ درس گاہ دنیا کی تم طریفی بیحد دلچسپ ہے کہ ایک مضمون تعلیم کیا جاتا ہے۔ دوسرے میں امتحان لیا جاتا ہے۔ مولٰنا کا کورس تھا دیوان یا مجموعۂ دل، اور امتحان ہوا دیوان مومن میں ——— بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

مومن کی پہلی غزل کا ایک شعر ہے :-

مجھے وہ تیغ جوہر کر کہ میرے نام سے خون ہو دلِ صد پارہ اصحابِ نفاق و اہلِ بدعت کا

---

[1] (نگار) تصوف کے مسایل مفروضہ کا ذکر غزل میں سوائے اس کے کوئی معنی نہیں رکھتا کہ شاعر جذبات عشق سے بالکل بیگانہ ہے مومن کی طرف سے کبھی اس کمزوری کا اظہار نہیں ہوا۔ اگر ابتداء دیوان میں کوئی غزل اسکی حمد و نعت میں پائی جاتی ہے تو وہ بالکل رسمی ہے اور اس کو معارضہ کی دلیل نہیں بنا سکتے۔

مولانا شرح میں فرماتے ہیں کہ:-

"تیغ جوہر- وہ جس کے جوہر تیغ کی طرح ہوں - اصلی تلوار یا آئینہ میں جو نشان ہوتے ہیں اُن کو جوہر کہتے ہیں - خاصیت کے معنی میں بھی آتا ہے"

میری ناقص رائے میں جوہر سے یہاں مراد کمال ہے، تیغ جوہر استعارہ ہے اور کہنا یہ مقصود ہے کہ میرا کمال دیکھ کر اہل بدعت وضلال کا دل خون ہوجائے۔

ایک اور غزل کا شعر ہے:-

حیرتِ حسن نے دیوانہ کیا گر اس کو دیکھنا خانۂ آئینہ بھی ویراں ہوگا

شرح:- خانۂ آئینہ کی ویرانی سے اُس کی بے رونقی مراد ہے - اس کو یعنی معشوق کو آئینہ دیکھتے وقت اگر خود اُسکے حیرتِ حسن نے دیوانہ کردیا - تو پھر آرائش سے بیزار ہوجائے گا"

میں حاصل شرح کچھ نہ سمجھا - شعر میں دو نازک تخیل ہیں - ایک یہ کہ محبوب کا حسن جنوں زا ہے - دوسرے آئینہ پر رشک ہے کہ وہ جلوۂ حسن سے کامیاب ہے لہذا اگر محبوب حیرتِ حسن سے دیوانہ ہوگیا تو پھر آئینہ دیکھنا معلوم - آئینہ یقیناً خانۂ ویراں ہوگا۔[لے]

مومنؔ کا ایک شعر ہے:-

مجمع بسترِ مخمل شبِ غم یاد آیا طالعِ خفتہ کا کیا خواب پریشاں ہوگا

شرح:- "شبِ ہجراں میں کامرانیِ وصل یاد آئی، جب بسترِ مخمل پر دوست کے ساتھ دادِ عیش دے رہے تھے ایسی حالت میں یادِ عیشِ گزشتہ سے سوئے ہوئے نصیب کا خواب کسقدر پریشاں ہوگا - یعنی یادِ وصل، خفتہ طالعی کی تلخی میں اور اضافہ کرے گی - لفظ خواب میں ایہام ہے"

یادِ وصل، خفتہ طالعی کی تلخی میں ضرور اضافہ کرتی ہے - لیکن یہ معنی پیدا کیونکر ہوئے، خوابِ مخمل، مخمل کے روئیں کی ہمواری کا نام ہے - اور اس خواب کی پریشانی اُس کا حرکت یا مس سے ناہموار ہوجانا ہے - شبِ غم وہ وقت یاد آگیا - جب بسترِ مخمل پر دادِ نشاط دے رہے تھے - مخمل کا خواب پریشاں یاد آیا-

---

لے (نگار) میں نہیں سمجھ سکا کہ شارح کے مفہوم سے ہٹ کر آپ نے کونسا دوسرا مفہوم پیدا کیا - جو آپ کہتے ہیں وہی شارح بھی سمجھا ہے - آپ نے آئینہ پر رشک کرنے کا جو مفہوم پیدا کیا ہے وہ بے محل ہے اور شعر سے ظاہر نہیں ہوتا۔

کیا طالع خفتہ کا خواب اس یاد سے پریشان ہو سکتا ہے۔ استفہام انکاری یعنی ہماری خفتہ بختی اب کیا ختم ہوگی۔[1]

مومن:- پان میں یہ رنگ کہاں آسپنے　　آپ مرے خون کا دعویٰ کیا،

شارح:- "یہ رنگ، پان نہیں بلکہ سرخیِ خونِ عاشق ہے۔ آپ نے پان کھا کر اپنے اوپر قتل کا الزام لے لیا۔"

شاعر نے یہ نہ کہا تھا کہ آپ میرا خون پی گئے ہیں۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ میرے خون کا دعویٰ ہی میرے خون کی نسبت سے رنگین ہے۔[2]

مومن:- جائے تھی تیری مرے دل میں سو ہے　　غیر سے کیوں شکوہ بیجا کیا

شارح:- "یعنی غیر کے دل میں تیری جگہ پہلے ہی کب تھی۔"

مطلب صاف ہے۔ عاشق کہتا ہے آپ نے غیر سے ہمارا شکوہ ناحق کیا حالانکہ ہمارے دل میں آپ کی جگہ بدستور باقی ہے۔

مومن:- رحم فلک اور مرے حال پر　　تو نے کرم اے ستم آرا کیا

شارح:- "تو نے مجھ پر اسقدر ظلم کئے کہ اب آسماں کو بھی میرے حال پر رحم آنے لگا۔"

فلک سے رحم مستبعد ہے خصوصاً مجھ پر۔ مگر او ستم آرا تیرے کرم نے میرا[3] یہ حال کیا کہ فلک کو بھی مجھ پر رحم آئے ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو۔

مومن:- امیدِ وعدۂ دیدار حشر پر مومن　　یہ بے مزا تھا کہ حسرت کشِ بتاں نہ ہوا

شارح:- "مومن اسقدر بدمذاق تھا کہ امید وعدۂ دیدار پر بیٹھا رہا اور بتوں کی تمنا نہ کی یعنی نقد کو چھوڑ کر نسیہ کو اختیار کیا۔"

---

[1] (نگار) مقالہ نگار کو لفظ "کیا" کے مفہوم سے اختلاف ہے۔ شارح نے اس کا مفہوم "کسقدر" بتایا ہے اور معترض اس کو استفہام انکاری بتاتے ہیں اور "پریشان خوابی" کے معنی "بیداری" ظاہر کرتے ہیں میرے نزدیک لفظ کیا مومن نے یہاں "کیا کیا" کی جگہ استعمال کیا ہے اور شارح نے مفہوم صحیح سمجھا ہے — [2] (نگار) اعتراض میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ نہ رنگ پان سے یہاں "خون نا حق" مراد ہے اور نہ در واقعی "رنگ پان" بلکہ مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ میرے قتل کے بعد آپ کی یہ آرائش و مسرت خود اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ آپ نے مجھے قتل کیا ہے۔ [3] (نگار) شارح کا مطلب صحیح ہے۔ مومن کا مقصود یہاں اس ستم کا اظہار نہیں جو کرم کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

حشر تک وعدۂ دیدار کی امید، حشر تک مبتلائے حسرت رہنا ہے۔ اس امید سے مومن اس قدر بے مزہ تھا کہ بتوں کی محبت میں حسرت کش نہ بن سکا۔[1]

مومن :- کچھ اپنے ہی نصیب کی خوبی تھی بعد مرگ ہنگامۂ محبت اغیار کم ہوا

شارح :- "یعنی اگر میری زندگی میں رقیبوں کی محبت کا ہنگامہ کم ہوتا تو میں رشک سے کاہے کو مرتا"

معترض :- یہ کہیں ظاہر نہیں ہے کہ رشک سے مر گیا ہنگامۂ محبت اغیار ہماری بدنصیبی کی بدولت تھا۔ ہم نہ رہے تو وہ ہنگامہ نہ رہا۔[2]

مومن :- ناکامیوں کی کاہش بے حد کا کیا علاج بوسہ دیا تو ذوقِ لبِ یار کم ہوا

شارح :- "مومن ناکامیوں کے مصائب کا شکوہ سنج ہے یعنی پہلے تو حسرتِ بوسہ کی کاہش تھی۔ جب بوسہ ملا تو لبِ یار میں وہ لذت باقی نہ رہی۔ غرض دونوں طرح ناکامی ہے۔ قاعدہ ہے کہ حصول شے کے بعد اس شے میں پہلی سی کشش باقی نہیں رہتی"۔

میرے خیال میں شرح کسی قدر بعید الفہم ہے اور لبِ یار میں لذت باقی نہ رہنا بھی شعر سے ظاہر نہیں ہوتا حصولِ نعمت کے بعد نعمت کی قدر کم بھی ہو جاتی ہے۔ اور بڑھ بھی جاتی ہے۔ یہ شوق کی بیشی و کمی پر منحصر ہے۔ شاعر کہتا ہے۔ ناکامی کی کاہش حد سے تجاوز کر کے لاعلاج ہو گئی۔ محبوب نے بوسہ دیا تھا تو چاہئے تھا کہ اس کامیابی سے شوق ترقی کرتا۔ لیکن پیہم ناکامیوں نے یہ عالم کر دیا ہے کہ آیندہ کی امید ہی قائم نہیں ہوتی اور ایک بوسہ ملنے پر ہمارے ذوق میں کمی آ گئی۔[3]

---

[1] (نگار) شارح نے یقیناً اس شعر کا مفہوم نہیں سمجھا۔ "بے مزہ" کے معنی "بدمزاق" قرار دینا خوش ذوقی کے خلاف ہے۔ "بے مزہ ہونا" کا مفہوم "مکدر ہو جانا" ہے۔

[2] (نگار) مقالہ نگار اس شعر کا مفہوم صحیح سمجھے ہیں۔ مومن نے "نصیب کی خوبی"، "بدنصیبی" کے معنے میں استعمال کی ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ یہ بھی میری بدنصیبی تھی کہ جب تک میں زندہ رہا ہنگامۂ اغیار بھی رہا اور اب کہ میں مر گیا ہوں تو اس میں کمی پیدا ہو گئی۔ حالانکہ یہ بات ایسی ہے جو میری ہی زندگی میں ہونی چاہئے تھی۔

[3] (نگار) شارح و معترض دونوں ایک ہی نتیجہ پر پہونچے ہیں۔ صرف الفاظ کا فرق ہے۔ "ذوقِ لبِ یار" میں لفظ "ذوق" کو محبوب سے متعلق کر کے انھیں خالی از لذت بتانا تہذیبِ عاشقی کے خلاف ہے۔ اس لئے "ذوق" کا تعلق خود شاعر کے شوق سے ہے۔ یعنی ہمیں وہ ذوق باقی نہ رہا کہ "لبِ یار" سے لذت کش ہوں۔

مومن :۔ عبث اُلفت بڑھی تمکو وہ کب دیتا تھا دم تم پر یہ مجھکو دیکھ کر دشمن کلیجہ تھام لیتا تھا

شارح :۔ "کلیجہ تھام لینے کا سبب تمھاری محبت کا اظہار نہ تھا بلکہ میرے حالِ زار پر اظہارِ تاسف۔ یعنی میری حالت پر رقیب کو بھی رحم آتا تھا"

دشمن کا عاشق پر رحم کھانا سمجھ میں نہیں آتا۔ کلیجہ تھام لینا دردِ عشق کی بدولت نہ تھا بلکہ رشک و حسد سے تھا کہ مومن اس بزم میں کیوں موجود ہے[1]

مومن :۔ کرۂ خاک ہے گردش میں طپش سے میری میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

شارح :۔ "مجھے حالتِ اسیری میں بھی آزادی میسر ہے اس واسطے کہ جب میں زنداں میں تڑپتا ہوں تو میری طپش کے اثر سے تمام کرۂ زمین گردش کرنے لگتا ہے اور اُس کے ساتھ میں بھی گردش کرتا ہوں۔ اب آزادی کے لئے اور کیا چاہیے"

یہاں شاعر نے تمام روئے زمین کو اپنے لئے زنداں کہا ہے۔ مولٰنا نے ایک مخصوص قیدخانہ قیاس کیا ہے اور آزادی یہ بتائی کہ زمین کے ساتھ میں بھی گردش کرتا ہوں کرہ کے ساتھ ہر چیز گردش کرتی ہے۔ مگر وہ گردش اختیاری کہاں ہے جس کو آزادی کہا جائے۔ شعر میں جو حسن تھا وہ شرح کی نذر ہوگیا۔ طپش کو گردشِ زمین کی علت قرار دینا اور کل کرۂ ارضی کو اپنے لئے زنداں کہنا۔ نہایت لطیف بات ہے جسکی طرف شارح نے توجہ نہیں کی[2]

مومن :۔ لذتِ جور سے دم لینے کی فرصت نہ رہی کیا اثر منتظرِ دعوتِ فریاد رہا

شارح :۔ "اثر کسقدر میری فریاد کی دعوت کا منتظر رہا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ میں نے فریاد ہی نہیں کی اور ستم یار کی لذت میں اتنا محو رہا کہ دم لینے کی مہلت نہ ملی"

'کیا' اگر بتکرار ہو تو 'کسقدر' کے معنی دلیکتا ہے۔ مصرعِ ثانی میں استفہام انکاری ہے یعنی اثر منتظرِ دعوتِ فریاد نہ رہا۔ گو میں نے فریاد نہ کی لیکن اثر ظاہر ہے کہ بیدادِ دوست سے دم لینے کی بھی فرصت نہ ہوئی[3]

مومن :۔ دلبروں میں بیوفا میری وفا کی دھوم ہے بوالہوس سے کیوں کہا تھا راز جو افشا کیا

---

[1] (نگار) کلیجہ تھامنے کا مفہوم اُردو میں صرف ایک ہی ہے یعنی تاثرِ غم والم سے بیتاب ہوجانا۔ اور رشک و حسد سے اسے کوئی واسطہ نہیں

[2] (نگار) مقالہ نگار کی توجیہ یقیناً زیادہ لطیف ہے۔

[3] (نگار) شارح نے مفہوم صحیح سمجھا ہے۔ اگر فریاد کا مقصود "دعوتِ ستم" ہوا کرتا تو مقالہ نگار کی توجیہ قابلِ قبول ہوسکتی تھی۔

شارح ۔ "معشوق کو یہ گوارا نہیں کہ حسینوں میں عاشق کی وفا کی تعریف ہو - اس کی اس ذہنیت سے عاشق یوں فایدہ اٹھاتا ہے کہ تم نے رقیب سے میرا راز محبت کیوں کہدیا - جو افشا ہوگیا - اور حسینوں میں چرچا ہونے لگا کہ مومن انتہا کا وفا پرست ہے - جو ایسے ظالم سے عہد وفا نباہتا ہے - اس اشتعال کا نتیجہ لامحالہ یہ ہوگا کہ آیندہ رقیب سے وہ راز ظاہر نہ کرے گا - جس میں مومن کا سراسر فایدہ ہے"

محبوب کو بیوفا کہا گیا جو بوالہوس رقیب سے ملتا ہے - محبوب یا تو دل سے مومن کی محبت کا قایل ہے - یا بوالہوس کی محبت اور ابھارنے کے لئے اس نے مومن کی محبت کا تذکرہ کیا - بات عالم آشکارا ہوگئی - اب شعر سے دو مدعا حاصل ہوتے ہیں - ایک یہ کہ محبوب کے یہ ذہن نشین ہو کہ رقیب ملنے کے قابل نہیں، دوسرے یہ کہ دلبروں میں مومن کی وفا مشہور ہو جانے سے اس کو یہ خیال پیدا ہو کہ مومن ہاتھ سے دینے کی چیز نہیں[1]۔

مومن :- کیا خجل ہوں اب علاج بیقراری کیا کروں دھر دیا ہاتھ اسنے دل پر تو بھی دل دھڑکا کیا

شارح :- "پہلے تو دل اضطراب کی وجہ سے دھڑکتا تھا - اب جوش مسرت کے باعث دھڑکنے لگا"

اضطراب اور دھڑکنا تو ایک ہی چیز ہے - پھر اضطراب کی وجہ قرار دینا کیا معنی - شعر کا لطف "کیا خجل ہوں" کی شرح میں ہے - یعنی محبوب کو یہ باور کرایا تھا کہ اضطراب دل کا سبب تمہاری جدائی ہے - اس نے دل پر ہاتھ رکھدیا - مگر دل جوش مسرت سے پھر بھی دھڑکتا ہی رہا - شرمندہ ہوں - یوں کہ وہ سمجھیں گے کہ بیان غلط تھا - درحقیقت مجھسے ملنا وجہ قرار نہیں - مضطرب ہوں کیا کروں کہ یہ حرکت قلب بند ہو اور ان کو میری بات میری محبت کا اعتماد ہو[2]۔

مومن :- محشر میں پاس کیوں دم فریاد آگیا رحم اس نے کب کیا تھا کہ اب یاد آگیا

شارح :- "محشر میں عاشق فریاد کرنے والا تھا کہ پاس معشوق سے رک گیا - اب اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ معشوق نے دنیا میں کبھی رحم کیا ہوتا - تو وہ رحم اس وقت یاد آکر مانع فریاد ہوتا - مگر جب ہمیشہ ظلم ہی کئے تو فریاد سے باز رہنے کی کیا وجہ"

---

[1] (نگار) مقالہ نگار نے خواہ مخواہ کھینچ تان سے کام لیا، حالانکہ اس صورت میں بھی مفہوم وہی رہا جو شارح نے بیان کیا ہے

[2] (نگار) شارح کا مقصود بھی وہی ہے جو معترض کا - اگر شارح اضطراب کے بعد "جدائی" کا لفظ بڑھا دیتے تو معترض کو کچھ کہنے کا موقعہ نہ

یہاں مولانا نے لفظ "پاس" "لحاظ" کے معنی میں قیاس کیا ہے حالانکہ کوئی قرینہ اس کا نہ تھا جس سے شعر کے معنی بے لطف ہو گئے معشوق کا لحاظ کر کے ہمیں محشر میں فریاد سے باز رہنا مناسب نہ تھا میرے نزدیک اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ محشر میں وہ دم فریاد میرے پاس کیوں آگیا۔ کیا اُسے فریاد پر رحم آیا۔ رحم اُس نے کب کیا تھا جو اب یاد آیا۔ پاس آنے کی غرض کچھ اور ہے یعنی زبان بندی[۱۱]۔

متن :۔ دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

شارح :۔ "منجم نے شاعر کا حال زار دیکھا۔ اور تاثیر نجوم کے حساب سے اُس کی ناکامی عشق کا پتہ لگا لیا۔ اور خود اُس کا رقیب بن بیٹھا کیونکہ عاشق کی ناکامی دریافت کرکے اُس کو اپنی کامرانی کی توقعات پیدا ہوئیں۔ اس طریقہ سے میرا طالع ناساز دیکھنا منجم کے حق میں سازگار ہو گیا۔"

میرے نزدیک یہاں رقیب مبتدا مؤخر تھا۔ سازگاری طالع یہ ہے کہ رقیب نے نجوم سیکھا تو اُس کو یہ راز معلوم ہوا کہ کسی کے دوست ہو نہیں سکتے[۱۲]۔

متن :۔ ستم ہے شدت گریہ سرایت خوں نے کی پر کی رکھے رومال چشم خوں فشاں پر لاکھ تہ تہ کر

شارح :۔ "میرے گریہ خونیں کی شدت غضب کی ہے۔ جس کی وجہ سے خون رومال کی تہوں میں سرایت کر گیا" "کی پر کی" میں تکرار تاکید کی غرض سے ہے۔"

مصرعہ اول میرے نزدیک یوں ہے۔ "ستم اسے شدت گریہ سرایت تو نے کی پر کی" چشم خوں فشاں دوسرے میں ہے۔ لفظ خوں پہلے مصرعہ میں غیر ضروری ہے۔ ضمیر خطاب آنا ضروری۔ اب شرح دیکھئے تغزل یا عشق دونوں نہ رہا۔ کہنا یہ ہے کہ اخفائے غم عشق مقصود ہے اور شدت گریہ کا ستم یہ ہے۔ کہ باوجود پردہ داری راز افشا ہے۔ خواہ اُن کی بزم میں ہوں یا کہیں اور[۱۳]۔

متن :۔ ہے سرخ ٹپکا اور خون غیر میں رنگا ہوا کیا قتل پر میرے کمر نکلے ہو گھر سے باندھ کر

(۱۱ نگار) معترض کا مفہوم صحیح نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں مصرعۂ ثانی کی ردیف کوئی معنی پیدا نہیں کرتی۔ شارح نے مطلب ٹھیک سمجھا ہے۔

(۱۲ نگار) شارح نے مطلب ٹھیک۔ بیان کیا ہے۔

(۱۳ نگار) معترض کی اصلاح و توجیہ دونوں بے محل ہیں۔ مطلب بالکل واضح ہے اور شارح نے اسے بالکل صحیح سمجھا ہے۔

شارح :- " یہ سب میرے قتل کا سامان ہے۔ کیونکہ میں جذبہ رشک سے ہلاک ہو جاؤں گا۔ پٹکا کمر میں ہوتا ہے اسلئے مصرع ثانی کے محاورے، (کمر باندھ کر نکلے ہو) نے لطف پیدا کر دیا "

سرخ پٹکا آرائش ہے۔ ادائے معشوقانہ ہو لیکن ترکانہ ادا نہیں۔ جو قتل سے مناسبت تامہ[1] رکھے۔ وہ بھی خون غیر سے رنگا ہوا۔ اس ادا سے تم میرے قتل پر کمر بستہ ہو؟ ــــ "کیا" استعجاب بلکہ استحقار کا فائدہ دیتا ہے یعنی جاؤ بھی تمھیں عاشق کا قتل کرنا بھی نہیں آتا۔ یوں ہی معشوق بنے ہو۔[2]

مومن :- پایا جو دشمنوں نے ترے پاس اعتبار　　　آنکھیں چراتے ہیں مجھے احباب دیکھکر

شارح :- " احباب مجھ سے اس لئے آنکھیں چراتے اور اغماض کرتے ہیں کہ میں تیری نگاہوں میں حقیر ہو گیا ہوں "

میرے نزدیک شاعر کا مقصود یہ ظاہر کرنا ہے، کہ تم نے جو میرے دشمنوں سے ارتباط بڑھایا تو میرے دوست مجھ سے بھی بدظن ہو گئے۔ کہ شاید یہ بھی ایسی پست فطرت کا ہوگا، ورنہ وہاں کیوں جاتا۔ ارتباط غیر پر انتہائی سرزنش ہے۔ اور نہایت لطیف انداز میں[3]

مومن :- یہ تشنہ کامیٔ نگہ گرم دیکھنا　　　حسرت سے رو دیا طرف آب دیکھکر

شارح :- " میرا دل محبوب کی نگہ گرم (نظر عتاب) کے اثر سے جلنے لگا اور اس جلن نے اس قدر تشنگی پیدا کر دی۔ کہ میں پانی کو دیکھ کر حسرت سے رو دیا۔ حسرت کی وجہ یہ ہے کہ یہ پیاس پانی سے بجھنے والی نہیں "

نگہ گرم - نگہ عتاب ہی کو نہیں کہتے التفات آمیز نگاہ پیہم بھی گرم کہی جا سکتی ہے۔ خیر نگہ گرم کو نگاہ عتاب کہنے میں بھی چنداں مضائقہ نہ تھا۔ عاشق نگہ عتاب کا بھی آرزومند ہو سکتا ہے کہ آخر نگاہ تو ہے۔ قیامت کہ شاعر اپنے آپ کو نگہ گرم سے محروم نگہ گرم کا آرزومند کہتا ہے۔ اور شارح نے یہ فرمایا کہ نگاہ گرم نے وہ جلن پیدا کی کہ تشنگی (بمعنی حقیقی) پیدا ہو گئی اس قدر الفاظ شاعرانہ ضرور ہیں کہ پیاس پانی سے بجھنے والی نہیں لیکن جب تشنگی حقیقی پیاس کے معنے میں ہے تو کیوں نہ بجھے گی۔ استسقا تو نہیں ؟ معنی صرف یہ ہیں

---

[1] (نگار) خاص مناسبت رکھتی ہے۔

[2] (نگار) "کیا" کا مفہوم معترض نے صحیح سمجھا ہے۔

[3] (نگار) معترض نے جو مفہوم بیان کیا ہے وہی زیادہ قرین قیاس ہے۔

کہ ہم تشنہ کام نگہ گرم سکے آرزومند تھے، پانی نظر آیا۔ کہ عوام الناس کی تشنگی رفع کرتا ہے ۔ حسرت ہوئی کہ ہماری تشنگی کا کوئی مداوا نہیں[1]

مومن :۔ توبہ کہاں کدورت باطن کے ہوش تھے　　غش ہوگیا میں رنگ مے ناب دیکھ کر

شارح :۔ "توبہ مجھے اسقدر ہوش کہاں رہے ۔ کہ شراب ناب کی باطنی کدورت پر نظر کرتا میں تو اسکا رنگ دیکھتے ہی غش ہوگیا۔ باطنی کدورت سے شراب کی تلچھٹ وغیرہ بھی مراد ہوسکتی ہے اور اُسکی اخلاقی مضرت بھی"

باطن سے اپنا باطن مراد ہے نہ کہ شراب کا۔ توبہ مجھے یہ ہوش کہاں۔ تھے کہ میکشی کا نتیجہ خرابی باطن جانتا۔ میں تو وہ مے پرست ہوں ۔ کہ رنگ مے ناب پر غش ہوگیا[2]

مومن :۔ مومن یہ تاب کیا کہ تقاضائے جلوہ ہو　　کافر ہوا میں دین کے آداب دیکھکر

شارح :۔ "اہلِ دین کو یہ تاب نہیں کہ تقاضائے جلوۂ دوست (معشوق حقیقی) کرسکیں اور اگر کوئی جناب کلیم کی طرح تقاضائے ارنی کر بیٹھتا ہے ۔ تو اُسے جواب میں لن ترانی سننا پڑتا ہے ۔ دین میں یہ پابندی آداب دیکھکر میں کافر ہوگیا کہ بتوں کے یہاں یہ قید تو نہیں"

یہاں مولانا "نقلِ کفر ۔ کفر نہ باشد" کا اصول فراموش کرگئے ۔ شاعر نے تو یہ کہا تھا ۔ کہ دین میں تقاضائے جلوہ ممکن[3] ہے اور وہ میرے نزدیک ادب عشق کے خلاف ہے ۔ میں دین کا یہ آداب دیکھکر کافر ہوگیا ۔

مومن :۔ بے مروت ناتواں ہوں میں نہیں دم سے روتا دیکھکر　　دل دیا میں نے اُسے کیا جانئے کیا دیکھکر

---

[1] (نگار) اس شعر میں غور طلب امر یہ ہے کہ "تشنہ کامی نگہ گرم" کی ترکیب اضافی کیسی ہے یعنی مومن کی مراد وہ "تشنہ کامی" ہے جو "نگہ گرم" کے عدم حصول سے وابستہ ہے ۔ اگر پہلا مفہوم لیا جائے تو شعر بہت زیادہ مادی ہوجاتا ہے اور کوئی خاص لطف نہیں دیتا ۔ البتہ دوسرے مفہوم میں (جیسا کہ معترض نے ظاہر کیا ہے) شعر بلند ہوجاتا ہے ۔ مومن یہ کہنا چاہتا ہے کہ "تمھاری نگہ گرم کے لئے میری تشنہ کامیاں اس حد تک بڑھ گئی ہیں کہ جب میں پانی یعنی مادی ذریعہ رفع تشنگی کو دیکھتا ہوں تو بھی خیال فوراً اپنی روحانی تشنگی کی طرف منتقل ہوجاتا ہے اور رو پڑتا ہوں" یقیناً شارح نے اس شعر کے سمجھنے میں غلطی کی ہے ۔

[2] (نگار) شارح کا مفہوم صحیح ہے ۔

[3] (نگار) "ممکن" نہیں "ضروری" کہئے ۔

شارح :- "ناتواں ہیں - حاسد جو کسی کا برا چاہے - یہاں معشوق مراد ہے"

"ناتواں ہیں - حاسد نہیں بلکہ عیب جو یعنی کسی کی کمزوری یا نقص کو دیکھنے والا۔[1]

مومن :- زخمی کیا عدو کو تو مرنا محال ہے — قربان جاؤں تیرے مجھے نیم جاں نہ چھوڑ،

شارح :- "تم نے جو رقیب کو زخمی کیا ہے - تو اس رشک سے میں بھی بسمل ہو گیا ہوں - مگر محض اتنی بات سے میرا مرنا محال ہے - اگر تم (رقیب کو رشک سے) مجھے بالکل ہلاک کرنا چاہتے ہو - تو میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ مجھے نیم جاں نہ چھوڑ دو - اس کی صرف ایک صورت ہے یعنی رقیب کو بالکل قتل کر دو - میں خود غیرت سے مرجاؤں گا - یہ مکر شاعرانہ مومن سے مخصوص ہے"

جدید سائنٹفک تحقیقات سے ایسی نئی ادا "مکر شاعرانہ" مومن کی خصوصیات میں دریافت ہوئی ہے - یہ شعر اسکی بہترین مثال ہے - خلاصہ شرح یہ ہے کہ مومن مکاری سے غیر کے قتل کی التجا کرتا ہے — مومن غیر کے زخمی کرنے کا بھی ملتجی نہیں - چہ جائے قتل - معنی یہ ہیں کہ اگر تو نے عدو کو اپنی ادا کا مایل (زخمی) کیا - اپنا عاشق بنایا - اپنے نظارہ کا بھی موقع دیا - تو میرا تجھ پر (مرنا) فدا ہو جانا تجھ سے محبت کرنا محال ہے - مگر ہاں تیری اس ادا سے یا ترک محبت سے میرا نیم جان (مضطرب) رہنا لازم ہے - میں تیرے قربان جاؤں مجھے نیم جاں نہ رکھ - بلکہ موقع دے کہ میں تیری ہی محبت میں فنا ہو جاؤں تجھ پر فنا ہو جاؤں۔[2]

مومن :- یہ غیرت وفا کا اثر ہے کہ بوالہوس — بسمل تڑپتے ہیں ترے بسمل کے آس پاس

شارح :- "میری وفا دیکھکر رقیبوں کو بھی غیرت آئی - نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر میں بسمل پڑا ہوں اُدھر وہ بسمل ہو کر میرے پاس تڑپتے پھرتے ہیں"

شرح کا حاصل یہ ہوا کہ اغیار کو یہ غیرت آئی کہ ہم بھی ایسے ہی وفا شعار عاشق ہو جائیں - اور وہ عشق صادق سے میری طرح بسمل ہو گئے - [illegible] غیرت عشق ہے کہ جان دی ترک محبت نہ کیا - بوالہوس کو امتیاز ہوا کہ عشق و ہوس میں فرق ہے اور تڑپ گیا۔[3]

مومن :- کیا کیا جلی ہے بزم میں تجھ سے جو جیب کے پھیرے — پروانے شمع شعلہ شمایل کے آس پاس

شارح :- "شمع شعلہ شمایل کی صورت رکھنے والی - یعنی جب تیری موجودگی میں پروانے شمع کے پاس نہ پھٹکے تو وہ تجھ سے کس قدر جلی ہے"

یعنی پروانے بجائے شمع کے تیری طرف مایل ہوئے اور شمع آتش رشک میں جل گئی - شمع کے گرد پروانے ہر وقت نہیں ہوتے شمع نے دیکھا کہ تمہارے عشاق تم سے باوجود شعلہ خوئی عاشق کشی، یک لحظہ جدائی پسند نہیں کرتے - یوں شمع آتش رشک سے جل گئی۔[4]

تنویر قادری

---

[1] (نگار) "ناتواں ہیں" کے معنے شارح نے صحیح نہیں سمجھے — [2] معترض اس شعر کا مفہوم بالکل نہیں سمجھے اور مکر شاعرانہ کو انھوں نے کوئی بڑا اخلاقی عیب سمجھ کر مومن کو اس سے بری ثابت کرنے کی کوشش میں شعر کا مفہوم ہی بالکل بدل دیا - یہ بالکل صحیح ہے کہ مومن اس انداز بیان کا مالک تھا اور اس قسم کے اشعار اسکے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ [3] (نگار) شارح نے کہیں نہیں لکھا کہ بوالہوس بھی بسمل کی طرح بسمل ہو گئے، مدعا صرف یہ ہے کہ وہ عاشق کے اس امتیاز کو دیکھ کر کہ معشوق نے نیم جان بسمل کیا، تڑپ کر رہ گئے۔ [4] (نگار) پروانوں کو یہاں عشاق سمجھنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا - شارح بالکل صحیح سمجھا ہے۔

بالکل وہی روشنی پیدا ہوتی ہے جو آفتاب کی ہے، پھر چونکہ جسم انسانی کو بقائے صحت و نشاط کے لئے نور آفتاب کی سخت ضرورت ہے اس لئے امید کیجاتی ہے کہ یہ ایجاد ڈاکٹری کی دنیا میں بہت مفید ثابت ہوگی کیونکہ اسکے ذریعہ سے ہر موسم میں ہر وقت اور ہر جگہ آفتاب کی صحت بخش روشنی حاصل ہو سکے گی اور بہت سے ایسے مریض، جو نور آفتاب سے پورا فایدہ نہیں اُٹھا سکتے اس سے مستفید ہو سکیں گے۔

کھیوں کی پرورشگاہ

امریکہ کا ایک صوبہ ہے جس کا نام ہا جیا ہے۔ اس کے ایک قصبہ کے جوار میں جسے ہین کہتے ہیں تین سو ایکڑ کا مزرعہ ہے جو ایک شخص موسیٰ نامی کے قبضہ میں ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ دنیا کا عجیب و غریب مزرعہ ہے۔

اس کا مالک پیداوار کاشت حاصل کرنے کے بجائے کھیوں کی پرورش کے لئے وقف کر دیتا ہے جہاں بالکل جدید علمی طریقوں سے ان کی پیدایش و نشوونما کا انتظام کیا جاتا ہے۔ یعنی ساری دنیا تو اس فکر میں ہے کہ کھیاں کسی طرح فنا کی جائیں اور یہ شخص ان کی افزایش و نشوونما میں مصروف رہتا ہے۔

اس کا مقصود اس سے صرف تجارتی فایدہ ہے کیونکہ مچھلی کی محبوب ترین غذا مکھی ہے اور یہ مچھلی کے شکاریوں کے ہاتھ انھیں فروخت کرتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یہ شخص صرف کھیوں کی تجارت سے بڑا دولتمند ہو گیا ہے۔

اٹھارہ سال میں پانچ ہزار کتابیں

امریکہ کے صوبۂ نبراسکا میں ایک نوجوان شوبرٹ اڈورڈ نامی پایا جاتا ہے، جس کی عمر ۱۸ سال کی ہے۔ یہ اپنی اسی قلیل عمر میں پانچ ہزار کتابوں کا نہ صرف مطالعہ بلکہ ان پر ماہرانہ بحث و تمحیص کر چکا ہے۔

اس کی قوت حافظہ کا یہ عالم ہے کہ ایکبار جس کتاب کو دیکھ لیتا ہے وہ اس کے دماغ میں محفوظ رہجاتی ہے اور نکتہ رسی کی یہ کیفیت ہے کہ جو تصنیف اسکی نگاہ سے گزر جاتی ہے اس کے متعلق ماہرانہ رائے قائم کرنے میں اس کو دیر ہی نہیں لگتی۔ علاوہ ادبیات انگریزی کے وہ علوم فلسفہ کا بھی ماہر ہے۔

جاپانی معاشرت کی بعض خصوصیات

جاپان ایک ایسا ملک ہے جہاں بہت کثرت سے مینھ برستا ہے یعنی سال میں تقریبًا ۲۰۰ دن بارش کے سمجھنے چاہیئے اور اسی لئے وہاں رطوبت بہت پائی جاتی ہے یہاں تک کہ درجۂ حرارت جب بہت کافی بڑھجاتا ہے اسوقت بھی نمی دور نہیں ہوتی۔ اسی کے ساتھ سردی بھی وہاں بہت شدید ہوتی ہے اور چونکہ مکان بہت ہوا دار ہوتے ہیں اس لئے ان میں ہر وقت رطوبت پائی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ ان حالات کے ماتحت وہاں گٹھیا وغیرہ کے امراض بکثرت پائے جانا چاہیئے، لیکن غالبًا

یہ سنکر حیرت ہوگی کہ وہاں کے لوگ ان امراض سے بالکل محفوظ رہتے ہیں - اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہر جاپانی امیر ہو یا غریب اسے کم ازکم ایک بار روزانہ گرم پانی سے نہالینا ضروری ہے اور پانی بھی اتنا گرم جس کی حرارت ۴۵ درجہ سے کم نہ ہو - جاپانی جس وقت حمام سے نکلتا ہے تو اس کی جلد سُرخ ہوتی ہے اور اسکے بعد گھنٹوں تک جسم کی حرارت ۳۷ درجہ تک قایم رہتی ہے -

جاپانیوں کے بچے بھی بہت کم مرتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ ائیں ان کو خود اپنا دودھ پلاتی ہیں اور ۶-۷ سال کی عمر تک پلاتی رہتی ہیں - ان کے بچوں کے لباس بھی بہت ڈھیلے ڈھالے ہوتے ہیں جس سے ان کی صحت اچھی رہتی ہے اور جسم تک ہوا آسانی سے پہونچتی ہے -

دولت کے چوچلے

فرانس کی ایک خاتون ہیں جن کا نام لیلی لاکلوش ہے - یہ بہت خوبصورت ہیں - یہ انتہا دولتمند ہیں اور اسی کے ساتھ حد درجہ نفاست پسند - مختلف قسم کے ریاضتی کھیل ایجاد کرنے میں بھی ان کو خاص شہرت حاصل ہے اور لباس کے اہتمام میں تو دنیا کے اندر اپنا جواب نہیں رکھتیں -

وہ کوئی کپڑا بازار سے نہیں خریدتیں بلکہ اس کو خود طیار کراتی ہیں چنانچہ اپنے کپڑوں کے لئے انھوں نے چینی ہند میں بہت سے کارخانے صرف ریشم کے کیڑوں کی پرورش کے لئے قائم کر رکھے ہیں - ان کیڑوں سے ریشم حاصل کرکے ان کارخانوں کو بھیجا جاتا ہے جو انھوں نے ریشمی کپڑا طیار کرنے کے لئے فرانس میں قایم کر رکھے ہیں - اونی کپڑے کی فراہمی کی یہ صورت ہے کہ کاٹھیاوار میں ان کی لاکھوں بکریاں پائی جاتی ہیں جہاں کا اُون نہایت احتیاط سے کاٹ کر اونی کپڑا بُننے والوں کے پاس بھیجا جاتا ہے -

حال ہی میں ایک لباس عجیب و غریب کپڑے کا اُن کے جسم پر دیکھا گیا - دریافت کرنے پر جواب ملا کہ مڈگاسکر میں ایک خاص درخت ہے جس کی چھال سے یہ کپڑا صرف انھیں کے لئے طیار کیا جاتا ہے -

۱۵۶۲۵۰ ٹن سگار

ممالک متحدہ امریکہ میں سالانہ جتنے سگار بنائے جاتے ہیں ان کا اندازہ بجائے شمار کے وزن سے کرنا زیادہ مناسب ہے - یعنی اگر ہم یوں ظاہر کریں کہ وہاں ہر سال ۱۵۶۲۵۰ ٹن یعنی تقریباً ۳۵۰۰۰۰۰۰۰ پونڈ وزن کے سگار طیار ہوتے ہیں تو زیادہ آسانی سے سمجھ میں آجائیگا - پھر لطف یہ ہے کہ جتنے سگار طیار ہوتے ہیں وہ سب ملک ہی کے اندر ختم ہوجاتے ہیں یعنی فی کس سالانہ اوسط ہزار سگار پڑتا ہے - اتنی بڑی مقدار میں سگار طیار کرنے کے لئے وہاں سیکڑوں کارخانے موجود ہیں جہاں لاکھوں آدمی روزانہ آٹھ گھنٹے لگاتار محنت کرتے رہتے ہیں - اس کی طیاری کا اوسط فی سکنڈ ۱۴۰۹۲ یا فی منٹ ۸۴۵۵۲۰ سگار ہوتا ہے -

جاپان کیا چاہتا ہے اور کیوں

جاپان اس آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر "جگہ" چاہتا ہے۔ نہ صرف چاہتا ہے بلکہ اس کے حاصل کرنے پر تلا ہوا ہے جس سے اب مغرب و مشرق کا ہر ملک واقف ہو چکا ہے۔ جاپان کے تین مقاصد ہیں:—

۱۔ ایشیا کی قوموں میں وہ سب سے زیادہ نمایاں شمار کی جائے۔

۲۔ سیاسی حیثیت سے وہ دنیا کی بڑی سے بڑی حکومت کی ہمسر قرار دیجائے۔

۳۔ جاپان والوں کے لئے غذا اور خام مواد فراہم کیا جائے، کیونکہ اب سے ۵۰ سال قبل جتنی پیداوار اہل جاپان کے لئے کافی سمجھی جاتی تھی اب وہ چوتھائی جاپان کے لئے بھی ناکافی ہے۔

گزشتہ ۵۰ سال کے اندر جاپان کی آبادی تین کروڑ بڑھ گئی ہے یعنی تقریباً ساڑھے چھ کروڑ ہوگئی ہے۔ ان اعداد میں خالص جاپانی شامل ہیں ورنہ اگر فارموسا، کوریا اور سکھالین کو بھی شامل کر لیا جائے جو جاپان کی سلطنت میں شامل ہیں تو آبادی ۹ کروڑ تک پہونچ جاتی ہے۔ پھر سوال صرف یہی نہیں کہ انکی آبادی دوچند ہوگئی ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ موجودہ تہذیب و معاشرت کے لحاظ سے ان کی اقتصادی ضروریات کہیں زیادہ بڑھ گئی ہیں جن کا پورا ہونا لازم ہے۔ اب اسی کے ساتھ آپ اس کے ذرائع آمدنی کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ نہ صرف اپنی غذا بلکہ اپنی مصنوعات کے لئے بھی محتاج ہے دوسرے ممالک کا کیونکہ خود اس کے ملک میں خام پیداوار اتنی نہیں ہوتی کہ اسکی ضروریات کو پورا کر سکے۔ چنانچہ یہی وہ چیز تھی جس نے اُسے منچوریا پر قابض ہونے کے لئے مجبور کیا اور اب منچوکو کی طرف مایل کیا ہے۔ منچوکو پر اسکی سیادت قایم ہونے سے اسکی دشواریاں بہت کم ہو جائیں گی کیونکہ یہاں کوئلہ اور لوہے کی معدنیں بکثرت ہیں اور زمین زرخیز ہونے کی وجہ سے غلہ کی پیداوار بکثرت ہوتی ہے، جاپانی قوم بہت زیادہ محنتی ہے اور صنعت کی طرف اس کا میلان بالکل فطری ہے، چنانچہ گزشتہ ۶۰ سال کے اندر انھوں نے اتنی ترقی کی ہے کہ اس وقت وہاں ۶۰ ہزار سے زیادہ فیکٹریاں پائی جاتی ہیں جن میں ۲۰ لاکھ آدمی کام کرتے ہیں۔ ان کارخانوں میں جو مال طیار ہوتا ہے اسکی نصف سے زیادہ کھپت چین و امریکہ میں ہے اور باقی مال دوسرے ملکوں میں فروخت ہو جاتا ہے۔ جاپانیوں نے شروع سے اس بات کا خیال رکھا کہ وہ چیزیں ارزاں طیار کریں اور ارزاں بازار انکے لئے پیدا کریں چنانچہ اول اول انھوں نے اپنے ملک کے آس پاس ایسے بازار پیدا کئے اور رفتہ رفتہ ان کو بڑھانا شروع کیا یہانتک کہ اب دنیا کا بچہ بچہ اس سے واقف ہے کہ جاپانی مال بہت سستا ہوتا ہے اور بازار اسی سے پٹے پڑے ہیں۔ حکومت و سلطنت کے لحاظ سے جو ترقی جاپان نے گزشتہ ۶۰ سال کے اندر کی ہے وہ بھی حیرتناک ہے۔ اول اول اسکے پاس صرف چار جزیرے تھے جنکا رقبہ ۱۴۸۰۰۰ مربع میل تھا لیکن اب منچوریا کو شامل کر کے حکومت کا رقبہ ۶۹۰۰۰۰ مربع میل تک پہونچ گیا ہے۔ یعنی سکھالین سے آسٹریلیا تک وسیع ہو گیا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آیندہ اس میں اور کتنی وسعت ہونا ہے۔

اختراعات

"کارِ زمین" سے ہٹ کر "آسماں پردازی" کو کسی زمانہ میں امرِ محال سمجھا جاتا تھا، لیکن اب علوم جدیدہ نے آسمان و زمین سب کو ایک کر کے رکھدیا ہے یعنی اُدھر اگر آسمان میں تھگلی لگانا مشکل نہیں رہا تو دوسری طرف پاتال کی گہرائیاں بھی نگاہوں کے سامنے آ رہی ہیں۔

امریکہ کے ایک سائنس داں نے حال ہی میں ایک بندوق ایجاد کی ہے جو سمندر کی تہ میں زمین کے اندر بہت دور تک چلی جاتی ہے اور وہاں سے مادی چیزوں کو اپنے ساتھ لے آتی ہے۔ اس ایجاد سے قبل سمندر کی تہ کا زیادہ حال معلوم نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ صرف اوپر ہی سے کنکر پتھر ہاتھ آتے تھے، لیکن اس کی مدد سے زمین کے اندر تین میل تک کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

جس طرح زمین کی بیرونی جلد میں چٹانوں کی تہوں سے اُن تغیرات کا پتہ چلتا ہے جو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوا ہے، اسی طرح سمندر کی تہ میں جو زمین ہے اس کے اندر بھی کیچڑ، مٹی اور چٹانوں کی تہیں پائی جاتی ہیں اور ان کے مطالعہ سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوں گی۔

اس میں شک نہیں کہ یہ ایجاد علماء طبقات الارض کے لئے تحقیقات کا بالکل نیا راستہ کھولدینے والی ہے اور ہم کو اپنی "مادرِ زمین" کے متعلق بہت جلد ایسی نئی نئی باتیں معلوم ہونگی جو اس سے قبل دریافت نہ ہو سکی تھیں۔

امریکہ میں ایک شخص نے خاص قسم کا برقی آلہ ایجاد کیا ہے جو خود بخود نقب زنوں کی آمد کی اطلاع پولیس کو دیدیتا ہے۔ یہ آلہ معمولی ریڈیو سٹ کے برابر ہوتا ہے اور اس طرح نصب کیا جاتا ہے کہ نقب زنوں کو اس کا پتہ نہیں چلتا اور وہ اپنا کام کر جاتا ہے۔

یہ آلہ جس اصول پر طیار کیا گیا ہے اس کا تعلق زیادہ تر روشنی اور بجلی سے ہے۔ جسوقت کوئی چور دروازہ کے اندر داخل ہوتا ہے تو اس کا جسم روشنی اور آلہ کے درمیان حایل ہو کر ایک خاص قسم کی برقی رو پیدا کرنے کا باعث ہو جاتا ہے اور فوراً تھانہ کی گھنٹی بجنے لگتی ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ چور کسی مکان میں داخل ہو رہا ہے

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہو جاتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (عہ) ششماہی تین روپیہ (سے)
بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (سے) سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد (۳۱)	فہرست مضامین اپریل ۱۹۳۷ء	شمار (۴)

مضمون	مصنف	صفحہ
ملاحظات		۲
شعر اور عورت	سید جلیل الرحمان اعظمی	۹
ہماری بت پرستیاں	ہوش بلگرامی	۱۹
مکتوبات نیاز		۳۱
لامذہبیات		۳۵
دوا فروش کی بیوی	ابوالفتح سرمد	۴۵
ضیاء بدایونی اور مومن	تنویر قادری	۵۱
ایک لاسلکی ڈرامہ		۶۳
باب المراسلۃ والمناظرہ		۷۱
باب الاستفسار		۷۳
عجائب وغرائب		۷۹

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری — معاون: جلیل الرحمان اعظمی

جلد (۳۱) | اپریل ۳۷ء | شمارہ (۴)

ملاحظات

تاثرات دکن

میں ۱۲ فروری سے ۵ مارچ تک حیدرآباد میں رہا۔ یہ زمانہ شہریار دکن کی تقریبات سلور جوبلی کے مخصوص تھا۔ جن کی غیر معمولی نوعیت پر گزشتہ ماہ کے ملاحظات میں مختصراً اظہار خیال کر چکا ہوں۔ اس ماہ نگار میں مختصراً میں اپنے ان تاثرات و توقعات کو قلمبند کرنا چاہتا ہوں جو حیدرآباد کے حال و مستقبل سے متعلق

حیدرآباد ہندوستان ہی کی ایک ریاست ہے اور چونکہ ریاستوں کے متعلق ایک عام خیال قائم ہو چکا کہ وہاں سوائے بدنظمی اور بدتمیزی کے اور کچھ نہیں ہوتا اس لئے ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات حیدرآباد کی بھی یہی گمان رکھتے ہوں، لیکن جن کو وہاں جانے اور حالات مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا ہے وہ سمجھتے ہیں حیدرآباد کیا چیز ہے اور دوسری ریاستوں کے حالات اس پر منطبق کرنا کسقدر غلط ہے۔

قطع نظر اس سے کہ حیدرآباد کی ریاست اپنے رقبہ کے لحاظ سے بعض مغربی سلطنتوں سے

زیادہ وسیع اور بہ لحاظ آبادی افغانستان و مصر سے زیادہ بڑی ہے، اس کی اہمیت زیادہ تر اس حقیقت سے وابستہ ہے کہ وہ مغلیہ حکومت کی تنہا یادگار ہے اور اس لحاظ سے تمام اسلامی ہند کو ایک مرکز اجتماع پر لانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ پھر یہ حقیقت اگر ایک طرف حکومت ہند کے نزدیک مسلم ہے تو دوسری طرف خود یہاں کے فرمانرواؤں نے بھی اس کو کبھی نظر انداز نہیں کیا اور اسلامی تہذیب و کلچر کا معیار قایم رکھنے میں انھوں نے ہمیشہ بیش از بیش سعی سے کام لیا۔

تعلیمات اسلامی کا یہ مقصود کبھی نہیں رہا ہے کہ انسان صرف رکوع و سجود پر قناعت کرکے خاموش بیٹھ رہے یا صوم و صلوۃ کے ذریعہ سے توشۂ آخرت حاصل کرنے کو تنہا نصب العین قرار دیکر دنیاوی ترقیوں کی طرف سے روگردانی اختیار کرلے۔ بلکہ اسلام کا مدعا ہمیشہ حقایق کی جستجو اور نوامیس فطرت کی تلاش رہا ہے اور اس سلسلہ میں اس نے سب سے پہلے دنیاوی فوز و فلاح حاصل کرنے کی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں تمام انسانی دعاؤں کا خلاصہ اس ایک آیت میں جمع کر دیا ہے:۔

"ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ و قنا ربنا عذاب النار"

جس میں سب سے پہلے اسی دنیا کی بھلائیوں اور ترقیوں کی خواہش کی گئی ہے اور اس کے بعد آخرۃ یعنی ان ترقیوں کے قیام و بقا کی۔ کیونکہ ایک انسان کے لئے اس سے زیادہ عذاب جہنم اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ وہ ذلت و نکبت کے ساتھ اس دنیا میں زندگی بسر کرے اور دوسروں کی محکوم ہو کر رہے۔

پھر اس رمز کو تمام فرمانروایان دکن اور خصوصیت کے ساتھ آصف جاہ سابع نے جس تکمیل کے ساتھ سمجھا ہے اس کا اندازہ صرف یوں ہو سکتا ہے کہ آپ عہد عثمانی پر غایرانہ نگاہ ڈالیں اور اسی کے ساتھ ان ارشادات و اقوال پر غور کریں جو وقتاً فوقتاً زبان مبارک سے ادا ہوتے رہتے ہیں۔

گزشتہ تقریبات جوبلی کے سلسلہ میں ایک دن علماء و مشایخ کے سپاسنامہ کے لئے بھی مخصوص تھا، چنانچہ سپاسنامہ یا دعانامہ پیش کیا گیا اور اس میں وہی سب کچھ تھا جس کی ایک دعا گو و دعا پیشہ طبقہ کی طرف سے توقع کی جا سکتی ہے۔ یعنی اس میں شہریار دکن کی ان تمام خدمات کا ذکر ضرور تھا جن سے براہ راست یا کسی واسطہ سے کوئی نہ کوئی فایدہ اس جماعت کو بغیر کوئی کام کئے ہوئے پہونچتا رہتا ہے، لیکن ان حقایق کا کوئی ذکر نہ تھا جو بہ حیثیت ایک مدبر و سیاست داں فرمانروا کے اعلیحضرت کے پیش نظر رہتے ہیں اور جن کا تعلق غالباً مذہب سے زیادہ صرف انسانیت و اخلاق سے ہے۔ چنانچہ اعلیحضرت نے اس کو محسوس کیا اور اپنے جواب میں موجودہ گروہ علماء و مشایخ کے بیکار و مجہول ہونے کی طرف ایک نہایت لطیف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ قرآن پاک میں جن علماء کی تعریف کی گئی ہے ان میں آج کل بہت کمی محسوس کی جا رہی ہے

اور جس زمانہ میں ایسے علماء پیدا ہوتے تھے وہ اب باقی نہیں رہا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آصف جاہ سابع کے نزدیک منصب شہریاری کا کیا مفہوم ہے اور اگر گزشتہ ۲۵ سال کی ترقیوں پر نظر کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اعلیٰحضرت نے اپنے عمل کے لحاظ سے بھی اس حد تک اسے پورا کرکے دکھا دیا ہے کہ مشکل ہی سے کوئی دوسری نظیر اس کی دنیا میں مل سکتی ہے۔

جس طرح ہم ایک گھر کی حالت دیکھ کر اس کے مالک کے ذوق کا پتہ چلا سکتے ہیں اسی طرح ہم ایک ملک کی حالت دیکھ کر اس کے فرمانروا کا حال معلوم کر سکتے ہیں۔ اگر ملک ترقی کر رہا ہے، رعایا خوشحال ہے، ذہنی ترقی کے ذرائع عام ہیں اور تہذیب و تمدن کے آثار نمایاں، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہاں کا فرمانروا بیدار مغز اور فرائض شناس ہے ورنہ ہم اس کے خلاف حکم لگانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ پھر اس بات میں نہ مجھے کہنے کی ضرورت ہے نہ آپ کو سننے کی، حیدرآباد جائیے اور دیکھئے کہ وہاں کا ایک ایک ذرہ اعلیٰحضرت کے غیر معمولی تدبر و فراست کا شاہد ہے اور وہاں کا نظم و نسق بتاتا ہے کہ یہاں کی عنانِ حکومت کسی نہایت ہی بلند فطرت رکھنے والے انسان کے ہاتھ میں ہے۔

ایک بادشاہ کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ملک کی دولت کا امین سمجھے اور اہل ملک ہی پر اس کو صرف کرے، اُس کا حصہ اگر کوئی ہے تو صرف یہ احساس کہ اس نے اپنے ان فرائض کو پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کیا اور ضمیر کا یہ اطمینان ہی اس کی تمام خدمات کا سب سے بہتر معاوضہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نہایت بلند بات ہے اور جاہ و ثروت کی دنیا میں اس کا وجود مفقود، لیکن دکن اور شہریار دکن یقیناً اس سے مستثنیٰ ہے اور وہیں پہونچکر ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ راعی و رعایا کے حقیقی تعلقات کا معیار کیا ہونا چاہئے، چنانچہ اعلیٰحضرت خود اپنے اس احساس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ:-

> "میری کوششیں سب میری رعایا کی سود و بہبود کی خاطر صرف ہوتی ہیں اور جو کچھ دنیوی متاع مجھکو حاصل ہے وہ میری نہیں بلکہ بطور امانت میرے پاس رکھی ہوئی ہے۔ اگر کوئی چیز درحقیقت میری ذاتی ملک ہے، وہ فقط میرا نورِ ایمان اور جذبۂ قلبی ہے"

پھر ظل ہمایونی کا یہی وہ احساس ہے جس نے تمام ملک میں ایک عام بیداری پیدا کر دی ہے اور جس طرف دیکھئے آثار ترقی و حیات بکھرے نظر آتے ہیں۔

عہدِ عثمانی کو ابھی صرف ۲۵ سال کا زمانہ گزرا ہے اور کسی ملک یا قوم کی ترقی کے لئے یہ زمانہ کوئی چیز نہیں لیکن اتنی ہی قلیل مدت میں جو انقلاب سلطنت دکن کے حالات میں رونما ہوا ہے، کسی دوسرے فرمانروا کے عہد میں اس کے لئے غالباً صدیاں درکار ہوتیں اور شاید پھر بھی یہ نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔

تمدن و تہذیب کے لحاظ سے ہر ملک میں تین طبقے ہوا کرتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا ادنیٰ یا غیر تعلیم یافتہ طبقہ کہلاتا ہے جس میں مزدوری پیشہ اور کاشتکار وغیرہ شامل ہیں، دوسرا متوسط طبقہ ہے جو بہ لحاظ تعلیم زیادہ ترقی یافتہ لیکن اقتصادی حیثیت سے بہت کمزور ہوتا ہے، تیسرا طبقہ امراء کا ہے جن میں تعلیم کم، بداخلاقی زیادہ ہوتی ہے اور جو سرمایہ داری کی تمرانیوں کا مرکز ہے۔ چنانچہ حیدرآباد میں بھی تینوں طبقے موجود ہیں لیکن ان کی حالت دوسرے مقامات کے لحاظ سے بہت مختلف ہے۔

عام طور پر ادنیٰ طبقہ اپنے اخلاق و اطوار کے لحاظ سے حد درجہ پست ہوا کرتا ہے، کیونکہ وہ تعلیم سے بے بہرہ ہوتا ہے اور مالی حالت اس کی حد درجہ سقیم ہوتی ہے، لیکن یہاں اس طبقہ کی اقتصادی حالت عام طور پر نہایت اچھی ہے اور نہ صرف یہ کہ وہ فقر و فاقہ کی مصیبت سے آزاد ہے بلکہ ایک حد تک مطمئن زندگی بسر کرنے کے ذرائع اپنے پاس رکھتا ہے، اس کا سبب صرف یہ ہے کہ زراعت پیشہ جماعت کے لئے تمام وہ آسانیاں فراہم کی جاتی ہیں جو جدید ترین اسباب فلاحت و زراعت سے متعلق ہیں اور صرف فطرت کے رحم پر اس کو نہیں چھوڑ دیا جاتا۔ ذرائع آبپاشی کی کثرت، اتحادی بنکوں کی افراط، اصول زراعت کی ترویج، مویشیوں کی حفاظت کا اہتمام اور خود مزارعین میں اصول حفظان صحت کی اشاعت، یہ وہ تمام باتیں ہیں جنھوں نے حیدرآباد کے طبقۂ مزارعین کو خوشحال بنا رکھا ہے اور جن کی بدولت وہ امن و سکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ رہا مزدوری پیشہ طبقہ سو اس کے اطمینان کا سبب یہ ہے کہ ریاست کے مختلف شعبوں نے رفاہ عام کے کام کثرت کے ساتھ جاری کر رکھے ہیں اور یہاں سے انھیں خاطر خواہ اُجرت ملتی ہے

یہاں کا متوسط طبقہ اب سے چند سال قبل یقیناً اچھی حالت میں نہ تھا، لیکن جب سے تعلیمات کی جدید اسکیم کا نفاذ ہوا ہے اور جامعۂ عثمانیہ وجود میں آئی ہے اسوقت سے اس جماعت میں نمایاں ترقی ہو رہی ہے اور عام طور پر بیداری پیدا ہوگئی ہے۔ یہ شرف غالباً صرف سلطنت دکن ہی کو حاصل ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا تقریباً آٹھواں حصہ اپنی رعایا کی تعلیم پر صرف کرتی ہے اور ملک کی جاری و صناعتی ترقی کے لئے ایک حکومت کی مساعی کا انتہائی معیار اس سے زیادہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ وہ ڈھائی کرور روپیہ کا محصول اس غرض کو سامنے رکھ کر معاف کر دے۔

جامعۂ عثمانیہ نے دکن کے نوجوانوں میں جو احساس خود اعتمادی پیدا کر دیا ہے اور ملک کے نظم و نسق کو وہ جس انداز سے آہستہ آہستہ سنبھال رہے ہیں، وہ نہایت عظیم الشان توقعات اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔

تیسرا طبقہ یہاں امراء کا ہے جن میں سے اکثر ریاست کے جاگیردار ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عہدِ عثمانی سے قبل ان کی حالت بہت سقیم تھی اور کوئی جاگیر ایسی نہ تھی جو قرض کا بار نہ رکھتی ہو، لیکن اعلیٰحضرت نے

اپنے دورِ حکمرانی میں ان کی اصلاح حال کی طرف بھی خاص توجہ سے کام لیا اور تمام جاگیریں کورٹ کرکے اسوقت تک واگزاشت نہیں کیں جب تک ان کی مالی حالت اچھی نہیں ہوگئی۔ چنانچہ اس وقت غالباً حیدرآباد ہی کا طبقۂ امرا ایسا ہے جو قرض کی مصیبت کا شکار نہیں ہے اور جسے آیندہ اس بلا سے محفوظ رکھنے کے لئے خاص قوانین کا پابند بنا دیا گیا ہے۔ پھر چونکہ فرمانروائے وقت کی زندگی کا اثر سب سے زیادہ امراء کی جماعت پر پڑتا ہے، اس لئے ان میں بھی اپنی رعایا کی فلاح و بہبود اور عام تعلیمی و اقتصادی ترقی کا ذوق پیدا ہوگیا ہے اور جو خوشحالی ریاست کے اندر نظر آتی ہے وہی جاگیروں کے حدود میں بھی پائی جاتی ہے اور اس طرح گویا ادنیٰ طبقہ سے لیکر اعلیٰ طبقہ تک سب کے سب ایک ہی منزل کی طرف قدم اُٹھا رہے ہیں اور ان سب کی راہنما وہی آصف جاہ سابع کی ذات گرامی ہے، جس کی زندگی کا واحد مقصود نفس کُشی اور جس کے آئین حکمرانی کا تنہا نصب العین دوسروں کی خدمت ہے۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومتوں کی بدنظمی کا سبب اکثر بیشتر فرمانروا کی ذات نہیں ہوتی بلکہ جماعت عمال ہوا کرتی ہے۔ یقیناً بادشاہ اپنے وسیع ملک کے ہر ہر گوشہ میں پہونچکر ہر ہر فرد کا مطالعہ نہیں کرسکتا اور نہ وہ تنہا ہر ہر شعبہ کی عاملانہ ذمہ داری اپنے سر لے سکتا ہے۔ اس لئے اگر فرمانروا اچھا ہے لیکن بدقسمتی سے اس کے کارکن بُرے ہیں تو بدنظمی بدستور قایم رہتی ہے اور ملک کوئی ترقی نہیں کرسکتا۔ لیکن اسکو آصفجاہ سابع کے حُسن نیت کا نتیجہ سمجھئے یا اس کی نگاہِ مردم شناس، خوش قسمتی سے حیدرآباد کو کام کرنے والے بھی ایسے ملگئے جو اعلیٰحضرت کے مزاج شناس تھے اور جنھوں نے ذات شاہانہ کی تمام تدابیر حکمرانی کو بروئے کار لانے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اُٹھا نہیں رکھا۔

یہاں کا آئین حکومت ایک کونسل سے متعلق ہے جو تمام شعبوں کی نگراں ہے اور جملہ اہم معاملات سمع اقدس تک پہونچانے کی ذمہ دار ہے۔ اعلیٰحضرت کے عہد ہمایوں میں اس کونسل کی قابل ذکر صدارت اول اول سر علی امام کے سپرد ہوئی تھی اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنے زمانہ میں (گو وہ بہت مختصر تھا) اچھی طرح ثابت کردیا کہ وہ فرمانروائے وقت کے بلند ارادوں کی تکمیل کی پوری اہلیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد یمین السلطنتہ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر اس منصب جلیل پر فائز ہوئے اور حیدرآباد میں کوئی ایک متنفس ایسا نظر نہ آئے گا جو مہاراجہ بہادر کے بلند و پاکیزہ اخلاق کا معترف نہ ہو۔ آپ کا تعلق طبقۂ امراء سے ہے اور اس میں شک نہیں کہ امراء دکن کی جو روایات سننے میں آئی ہیں وہ اس وقت صرف آپ کی ذات سے زندہ ہیں۔ اس کا اعتراف خود اعلیٰحضرت نے بھی متعدد بار کیا ہے اور رساکنان حیدرآباد تو روز اس کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ آپ کی صدارت عظمیٰ کا زمانہ نہ صرف سکون و اطمینان بلکہ تمام ان ترقیوں کے لحاظ سے جو خسرو دکن کے پیش نظر ہیں،

بڑا سعید و مبارک زمانہ تھا اور تاریخ حیدرآباد میں آپ کے خدمات جلیلہ اور آپ کے اوصاف حمیدہ کو یقیناً زریں حروف سے لکھا جائے گا۔

کونسل میں صدارت عظمٰی کے بعد سب سے زیادہ مہتم بالشان حق ممبر مالیات کی ہوا کرتی ہے، کیونکہ اگر ملک کے اقتصادیات کی نگہداشت کا اچھا انتظام نہ ہو تو پھر کسی قسم کی کوئی ترقی ممکن نہیں، اور میں اسے سلطنت دکن کی انتہائی خوش نصیبی قرار دوں گا کہ اسے سر اکبر حیدری ایسے غیر معمولی دل و دماغ کا انسان یہ عظیم الشان خدمت انجام دینے کے لئے میسر آگیا۔

سر اکبر حیدری بین الاقوامی شہرت رکھنے والے انسان ہیں اور ہندوستان کے اُن چند مخصوص نفوس میں سے ہیں، جنھوں نے اپنی شہرت و قابلیت صرف اپنے دل و دماغ کے زور سے تسلیم کرائی ہے۔ سر اکبر نے بہ حیثیت ممبر مالیات جو جلیل القدر خدمات انجام دی ہیں ان کی تفصیل کے لئے حقیقتاً دفتر کے دفتر ناکافی ہیں مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ ریاستوں اور حکومتوں کی خوش انتظامی جانچنے کا بڑا زبردست معیار زمانۂ بعد از جنگ کا اقتصادی عدم توازن تھا کہ حکومت ہند ایسی عظیم الشان سلطنت بھی بقول شخصے "جیین" بول گئی اور ہر محکمہ میں تخفیف اور قطع و برید اس نے شروع کر دی، لیکن دکن کے دم خم اس زمانہ میں بھی وہی رہے، جو کام جس طرح جاری تھے بدستور جاری رہے، جو ترقیاں ہونے والی تھیں وہ برابر ہوتی رہیں، تنخواہوں میں جو سالانہ اضافہ ہوا کرتے تھے وہ اسی طرح ہوا کئے اور ایک لمحہ کے لئے بھی کسی نے یہ محسوس نہیں کیا کہ آگ کب لگی تھی اور کب بجھائی گئی۔ آپ اس زمانہ کے تمام حکومتوں کے بجٹوں کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ترازوں کے دونوں پلڑے برابر کرنے کے لئے کیسی کیسی ناگوار تدبیروں سے کام لیا گیا تھا لیکن ایک حیدرآباد ہی کا میزانیہ ایسا تھا جس میں کوئی ردو بدل نہیں کیا گیا اور کسی ایک شخص کو بھی شکایت کا موقعہ نہیں ملا۔ یہ سب حقیقتاً اعجاز تھا سر اکبر حیدری کی اس غیر معمولی تدبیر کا جس کا اعتراف اسوقت بڑے سے بڑے ماہر مالیات کو ہے اور جس نے ایسے نازک زمانہ میں بھی سلطنت دکن کی روایات ترقی کو کوئی صدمہ پہونچنے نہیں دیا۔ چنانچہ آپ کی انھیں غیر معمولی خدمات کا صلہ خسرو دکن کی طرف سے یہ ملا کہ سر مہاراجہ بہادر کے رٹائر ہونے کے بعد صدارت عظمٰی کی خدمت آپ کے سپرد کی گئی، اور اس میں شک نہیں کہ اس سے بہتر انتخاب کوئی اور ہو نہیں سکتا تھا۔

انتخابات اور مسلمان

دستور جدید کے مطابق حال ہی میں جو انتخابات عمل میں آئے ہیں، وہ بحالات موجودہ ہمارے دکھ درد کا

صحیح علاج ثابت ہوں یا نہ ہوں، لیکن یہ یقینی ہے کہ اس نے ملک و اہل ملک کے لئے ایک سیاسی نجات کی شاہراہ ضرور متعین کر دی ہے اور ممکن ہو کہ اب مسلم جماعت بھی، جو اسوقت تک بدنصیبی سے سب سے زیادہ گم کردہ راہ تھی، اسپر چل پڑے ـــ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں، سوائے پنجاب، بنگال، سرحد اور سندھ کے ہر جگہ کانگریس کے نامزد کردہ ممبر سب سے زیادہ کامیاب ہوئے ہیں اور جس آپا دھاپی کی حالت میں یہ سب کچھ ہوا ہے اس کو دیکھ کر ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ آیندہ شاید ہی کوئی غیر کانگریسی ممبر انتخاب میں آسکے۔

چنانچہ عام طور پر مسلمانوں نے اپنے باہمی اختلافات کے اس بُرے نتیجہ کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور کثرت سے شرکت کانگرس کا میلان ان کے دل میں پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ سر وزیر حسن ایسا شخص بھی بے اختیارانہ پکار اُٹھتا ہے کہ اب اگر کوئی نجات کی صورت باقی ہے تو صرف یہ کہ مسلمان کانگرس میں بہ کثرت شریک ہوں چنانچہ جذبات کے اس تغیر کو دیکھ کر، پنڈت جواہرلال نہرو نے بھی محسوس کیا کہ ہندو مسلمانوں کے افتراق و اختلاف کے مٹانے کا زمانہ شاید اب دور نہیں اور ہو سکتا ہے کہ خدا مسلمانوں کی نجات کا کام بھی بجائے کسی مولوی کے ایک پنڈت ہی سے لینا چاہتا ہو۔

مسلم لیگ کا وجود یوں تو اس سے قبل بھی بیکار تھا اور اس نے جو کام اسوقت تک کیا اس کی صورت بالکل ایسی تھی جیسے پرانی دیوار پر قلعی کر دیجائے، لیکن اب اس انتخاب کے نتائج دیکھ کر ماننا پڑے گا کہ مسلم لیگ کا قیام نہ صرف یہ کہ غیر مفید بلکہ بڑی حد تک مضرت رساں بھی ہے اور اگر اب بھی مسلمان اس مردہ گھوڑے کو ایڑ دے دیکر اُٹھاتے رہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اب ان کی بے بصری واقعی علاج کے حدود سے گزر گئی ہے۔

مسٹر محمد علی جینا، اس میں کلام نہیں کہ نہایت قابل انسان ہیں لیکن قومی کام کے لئے جس ایثار و قربانی کی ضرورت ہے وہ ان میں مفقود ہے اور "شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی" کا فلسفہ کبھی ان کی سمجھ میں آیا، نہ آسکتا ہے۔ جہانتک میں نے اندازہ کیا ہے محمد علی جینا کی ذہنیت وہی ہے جو ایک ڈکٹیٹر کی ہوا کرتی ہے اور اسی لئے وہ مسلم لیگ کے ڈھونگ کو قایم رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ انکا یہ ذوق وہیں پورا ہو سکتا ہے اور کانگرس سے علحدہ رہنے کی بھی وجہ یہی ہے کیونکہ وہاں سوال شخص کا نہیں بلکہ صرف جانبازی کا ہے اور ظاہر ہے کہ انکا "ذوالجناح" اس فضا میں زیادہ پرواز نہیں کر سکتا لیکن مسلمانوں کو اپنی اپنی جگہ سوچنا چاہئے کہ وہ کب تک اپنی قسمت کا فیصلہ دوسروں کے ہاتھ میں چھوڑے رکھیں گے اور شخصی تمناؤں پر اجتماعی مصالح کی قربانیاں کب تک چڑھائی جاتی رہیں گی۔ وقت اب نہ سوچنے کا ہے نہ پس و پیش کا۔ اسوقت تک صرف مرض کا علم تھا، تشخیص کا نہ تھا لیکن اب کہ یہ مسئلہ بھی طے ہو چکا ہے، اور علاج بھی معلوم ہو گیا ہے، ہمارا بدستور خاموش بیٹھے رہنا یا "عطائیوں" کے ہاتھ میں اپنے آپ کو دیدینا یقیناً کھلم کھلا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ جمعیتہ العلماء دہلی پھر اس تحریک کو اپنے حلقہ میں زندہ رکھنا چاہتی ہے، خدا کرے یہ خبر صحیح ہو اور اسے مذہبی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر غور کرنے کی توفیق کبھی نہ میسر آئے۔

شعر اور عورت

(مسلسل)

زمانہ اسلام کے ابتدائی دور میں عربی شاعری کے اندر وہ زور باقی نہیں رہا جو زمانۂ جاہلیت میں تھا، اس لئے کہ زمانۂ جاہلیت میں جو قبایلی عصبیت پائی جاتی تھی، اسے اسلام نے محو کر دیا تھا۔ قبائل کی باہم خانہ جنگیاں ختم ہو گئی تھیں اور سارے ملک میں "ھل من مبارز" کا نعرہ لگانے والا کوئی نہ رہا تھا، چنانچہ شاعری کی گرم بازاری بھی ختم ہو گئی اور اُن کی زبان آوری کا سیلاب شعر و سخن کے بجائے خطابت و موعظت کی طرف پلٹ گیا، اب اُن کی جادو بیانی اخلاقی اور معاشرتی تعلیم، قومی اور ملکی اصلاح، حمایت دین اور دعوت الی الحق میں صرف ہونے لگی، جس میں ظاہر ہے کہ عورت کا حصہ قدرتی طور پر کم ہوتا ہے۔ جذبات شاعری میں طوفان برپا کرنے والی در اصل تین چیزیں ہیں، جنگ، موت، محبت، زمانۂ جاہلیت میں گو عشقیہ شاعری تھی مگر بہت کم، اُن کی شاعری کا زیادہ حصہ مرثیہ گوئی اور فخریہ شاعری پر مشتمل تھا جو در اصل جنگ میں ناکامی اور کامیابی کے دو نتیجے ہیں۔

اُس زمانہ میں اہلِ عرب کی شاعری چونکہ اکثر قبائل میں خونریز جنگ کا باعث بن جایا کرتی تھی اس لئے آنحضرت کو اس سے دلچسپی نہ تھی، آپ سارے ملک عرب کو ایک پرچم کے نیچے جمع کرنا چاہتے تھے، جس میں اس قسم کی شاعری ہمیشہ سنگ راہ واقع ہوتی تھی، اس لئے آپ اس کو سیاسی حیثیت سے بھی کچھ زیادہ پسند نہیں فرماتے تھے، آپ فرمایا کرتے تھے کہ شاعر نے اگر کبھی کوئی سب سے اچھی اور سچّی بات کہی ہے تو وہ صرف لبید کا یہ قول ہے:۔

الا کل شیئٍ ما خلا اللہ باطل —— ہاں! خدا کے علاوہ سب کچھ جھوٹ ہے

(تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جلد اول ص۱۹۶)

مگر اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ آنحضرت صلعم شعر یا شعر گوئی کو بُری چیز سمجھتے تھے، آپ نے خود حضرت حسّان بن ثابت، کعب بن مالک، عبداللہ بن رواحۃ کو کفار مکہ کا دندان شکن جواب دینے کے لئے مقرر کر رکھا تھا آپ مذکورۂ بالا حضرات کا کلام سنتے تھے، اظہار مسرت فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ اشعار کفار مکہ پر نیزے اور بھالوں سے زیادہ گہرا اثر کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے حضرت حسّان سے فرمایا:۔

"اُھجہم (یعنی قریشاً) فو اللہ لہجاؤک علیہم اشد من وقع السہام فی غلس الظلام اُھجہم و معک جبریل روح القدس"

قریش کی ہجو کرو، خدا کی قسم تمہاری ہجو اُن پر اُس تیر سے زیادہ کاری ہوتی ہے جو اندھیری رات میں کسی پر پڑتا ہے۔ اُنکی ہجو کرو اسلئے روح القدس جبریل تمہارے مددگار ہیں۔

(کتاب العمدہ جلد اول صہ ۱۱۴)

خلفاء راشدین اگرچہ خود اچھے خاصے شاعر تھے چنانچہ حضرت ابوبکر کا وہ قصیدہ مشہور ہے جو انھوں نے غزوۂ عبیدبن حارث میں کہا تھا حضرت عمر اور حضرت عثمان کے بھی حکمت و موعظت پر بہت سے عمدہ اشعار منقول ہیں، حضرت علی تو شاعری اور خطابت کے امام ہی مانے جاتے ہیں، آپ کا دیوان بھی مصر و حجاز اور ہندوستان وغیرہ مختلف مقامات پر چھپ چکا ہے تاہم شعر و شاعری کو مذکورۂ بالا وجوہ کی بناء پر یہ حضرات بھی کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے، اس لئے اس دور میں فخریہ شاعری تو تقریباً مفقود ہو گئی، مرثیہ گوئی اور ہجو گوئی بھی برائے نام رہگئی تھی، اخلاقی شاعری کو البتہ کسی قدر عروج ہوا، بہاریہ شاعری کا تو کہیں پتہ بھی نہ تھا، اور ملک کی آب و ہوا اور جائے وقوع کو دیکھتے ہوئے ہو بھی کیسے سکتا تھا،

ہاں عشقیہ شاعری جو انسان کے جذبات لطیفہ سے تعلق رکھتی ہے البتہ پائی جاتی تھی مگر بہت ہی معصومانہ انداز میں، نہ اُس میں وصل و ہجر کی بے بنیاد داستان ہوتی تھی اور نہ شہوانی خواہشات کے من گھڑت افسانے حتیٰ کہ کسی محبوبہ کا نام لیکر تشبیب کرنا بھی بدتمیزی میں داخل تھا، خلفاء راشدین اس معاملہ میں بہت سخت تھے، اگر کوئی شاعر ایسی حرکت کرتا تھا تو اُس کو درے لگوائے جاتے تھے۔

اسی مقدس عہد کے دو سچے عاشق و معشوق عتبہ بن حباب انصاری اور ریا بنت الفطریق السلمی ہیں جو حسن و جمال کے ساتھ ہی ساتھ شعر و شاعری میں بھی کمال رکھتے تھے، ان دونوں کا افسانہ محبت کا وہ پاک صحیفہ ہے جس کا جواب دنیائے عشق میں تا قیامت نہ ہو سکیگا۔ داستان اگرچہ دلچسپ ہے لیکن طویل ہے اور ہمارے موضوع بحث سے خارج بھی اس لئے ہم اُسے نظر انداز کرتے ہیں اس جگہ پر بیچاری ریا بنت الفطریق کے صرف دو شعر نقل کئے جاتے ہیں جو اس نے اسوقت لکھے تھے جب وہ شادی کے بعد اپنے عاشق دولہا کے ساتھ مع سارا سامان کے اپنے گھر سے رخصت ہو کر مدینہ جا رہی تھی، راستہ میں غریب عتبہ ڈاکوؤں کے ہاتھ سے مارا گیا جسے وہ کھڑی دیکھ رہی تھی۔

۱۔ تصبرتُ لا انی صبرت و انما اُعلل نفسی انہا بک لاحقۃ

میں نے صبر کیا مگر یہ صبر اس لئے تھا کہ میں اپنی جان کو تمہارے پاس پہونچنے کے لئے بہلا سکوں

۲- ولو انصفت روحی لکانت الی الردیٰ اماکمَ من دون البریۃ سابقتہ	اگر انصاف کرو تو میری روح ہلاک ہو کر تمام دنیا سے پہلے تمہارے پاس پہونچنا چاہئے

(الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور ص۲۱۳)

نازنین ریّا نے یہ کہا اور ایک چیخ مار کر اپنے عاشق زار عتبہ کی لاش پر گری اور وہیں تڑپ کر جان دیدی۔ یہ قیامت کا منظر تھا، جس پر ڈاکو اور قافلے والے سب ہی کھڑے رو رہے تھے، روتے روتے جب انھیں ذرا ہوش آیا، تو ان شہیدان باوفا کی لاشیں اٹھا کر انھیں ایک ہی قبر میں دفن کر دیا، کچھ روز کے بعد ان کی قبر پر ایک درخت اُگا جس کا نام لوگوں نے "شجرۃ العروسین" رکھا تھا، یہ تھا اُس خیر القرون کا پاک اور سچا عشق جس کی داستان قیامت تک حُسن وعشق کے بڑے بڑے افسانوں کو شرماتی رہے گی۔

خلفاء راشدین کا زمانہ ختم ہوتے ہی بنو اُمیّہ کے عہد میں زمانہ جاہلیت کی شاعری پھر سے زندہ ہوگئی، قبایل میں پھر وہی عصبیت جاہلیہ اور خاندانی تفوق کا جذبہ پیدا ہوگیا، اور فخریہ شاعری نے دوبارہ جنم لیا، وجہ صرف یہ تھی کہ امیر معاویہ بڑے سیاسی اور مدبر آدمی تھے، انھوں نے جب اپنی حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنا چاہیں تو اُن کو ضرورت محسوس ہوئی کہ قبایل عرب میں پھر وہی عصبیت جاہلیہ اور خاندانی تفوق کا جذبہ پیدا کر دیا جائے اہل بیت اور انصار علی کے خلاف خوب پروپگنڈا کیا جائے تاکہ پھر کوئی سر نہ اُٹھا سکے، اس کام کے لئے انھوں نے بڑا روپیہ صرف کیا شعراء کو داد و دہش سے مالامال کر دیا، اُن کی تنخواہیں اور وظیفے مقرر کئے جس سے شاعری کا پھر وہی دور آگیا جو زمانہ جاہلیت میں تھا، مشاعرے کی مجلسیں منعقد ہونے لگیں، شعر وسخن پر تنقیدیں کیجانے لگیں جن میں مردوں کے دوش بدوش عورتوں نے بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔

خود سکینہ بنت حسین، عایشہ بنت طلحہ اور اُس زمانہ کے مشہور شاعر ابو دہبل کی بیوی عمرۃ وغیرہ اکثر شعر وسخن کی مجلسیں منعقد کیا کرتی تھیں۔ جن میں مرد بھی بلا تکلف شریک ہوا کرتے تھے، اُن کے کلام پر خوب خوب تنقیدیں کی جاتی تھیں، تبصرے ہوتے تھے، اور کلام کی خوبی پر دل کھول کر داد دی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت سکینہ کی دعوت پر اس زمانہ کے مشہور اساتذہ جریر، فرزدق، نصیب، کثیر اور جمیل جمع ہوئے سب نے باری باری سے اپنا اپنا کلام سنایا، آخر میں بثینہ کے عاشق زار جمیل کے پاس لونڈی آئی اور اُس نے کہا ہماری مالکہ آپ کو سلام کہتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ جب سے میں نے آپ کا یہ شعر سنا تھا میں آپ کا اور کلام بھی سننے کی مشتاق تھی،

۱- الالیت شعری ھل ابیتن لیلۃ بوادی القریٰ انی اذاً لسعیدٌ	کاش مجھے علم ہوتا کہ میں وادی القریٰ میں کبھی رات گزاروں گا تو میں اپنے کو اس وقت بڑا خوش نصیب سمجھتا۔

(الدر المنثور ص۲۴۶)

اس زمانہ میں گو بہت سی قادرالکلام عورتیں پیدا ہوئیں مگر ان میں جو مرتبہ لیلیٰ الاخیلیہ کا ہے کسی کا نہیں علامہ جرجی زیدان نے بھی لیلیٰ الاخیلیہ ہی کو سب پر ترجیح دی ہے اس لئے اس دور میں ہم صرف اسی کے مختصر حالات بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

لیلیٰ الاخیلیہ، عبداللہ بن مرحال کی بیٹی ہے، وہ اپنے زمانہ کی نہایت ہی پرجمال اور نازک خیال شاعرہ تھی۔ زمانۂ اسلام کی نسوانی شاعری میں اس کا وہی مرتبہ ہے جو زمانۂ جاہلیت میں خنساء کا تھا، اس زمانہ کا مشہور شاعر توبہ بن الحمیر العامری کو اس سے عشق تھا، پہلے تو چھپ چھپ کر وہ اس سے ملتا رہا لیکن جب آتش عشق زیادہ تیز ہوئی تو اس نے لیلیٰ کے والد بزرگوار کے پاس شادی کا پیام بھیجا، چونکہ یہ خبر پہلے ہی اڑ چکی تھی کہ توبہ کو لیلیٰ سے عشق ہے اس لئے اس نے اس رشتہ سے انکار کر دیا اور قبیلہ بنی ادلع کے ایک شخص سے لیلیٰ کی شادی کر دی، توبہ کو اس کی پرواہ نہ تھی، ایک روز حسب معمول رات کی تاریکی میں لیلیٰ سے ملنے گیا، دیکھا تو خلاف معمول اس باعصمت خاتون کے چہرہ سے نقاب اٹھا ہوا ہے، توبہ کھٹکا اور سمجھا کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے، لیلیٰ آگے بڑھی اور اس نے رازدارانہ طریقہ سے کہا، میں دیر سے تمہاری منتظر تھی، لوگ تمہاری تاک میں ہیں خیریت اسی میں ہے کہ ابھی یہاں سے چلدو، محبت کا مارا توبہ جان بچا کر بھاگا، مگر ساتھ ہی اس نے اس واقعہ کو ایک بڑے لمبے چوڑے قصیدہ میں نظم کر ڈالا جس کا ایک شعر یہ بھی ہے:-

کنت اذا ما زرت لیلی تبرقعت	میں جب کبھی لیلیٰ کے پاس آتا تھا تو وہ چہرہ پر نقاب ڈال لیا کرتی
فقد رابنی منھا انعداۃ سفورھا	کل جو میں نے اسکی نقاب الٹی ہوئی دیکھی تو مجھے کھٹکا پیدا ہوا

لوگ عام طور سے چونکہ اس کے اور لیلیٰ کے پاک تعلقات پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں کرتے تھے اس وہ اسی قصیدہ میں اپنی اور لیلیٰ کی پاکدامنی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:-

علیّ دماء البدن ان کان بعلھا	مجھے کفارہ میں اونٹوں کی قربانیاں دینی پڑیں اگر اسکا
یری لی ذنبا غیر انی ازورھا	علاوہ اسکے کہ میں اس سے مل لیتا ہوں میں اور کوئی خطا

(الدرالمنثور ص ۴۶۸)

توبہ بڑا جنگجو اور دلیر نوجوان تھا، بہت سے غزوات میں اس نے شرکت کی اور ہمیشہ ظفر مندی کا پرچم اڑا ہوا لوٹا۔ ۸۵ھ میں ایک مرتبہ وہ بری طرح بنو عوف کے نرغہ میں پھنس گیا اور مارا گیا، لیلیٰ کو جب اس حادثہ کی خبر ہوئی تو اس کو دلی صدمہ پہونچا، اس غم میں اس نے بہت سے مرثیہ کہے جن میں سے ایک درج ذیل ہے:

۱۔ اقسمت ارثی بعد توبۃ ھالکا	میں نے قسم کھائی ہے کہ توبہ کے بعد ہر ہلاک ہونے والے کا مرثیہ کہونگی اور
احقل لمن دارت علیہ الدوائر	اس شخص کیلئے جلسۂ تعزیت منعقد کرونگی جس پر مصائب ٹوٹ پڑے

۲۔ لعمرک ما بالموت عارٌ علی الفتی
اذا لم تصبہٗ فی الحیوۃ المعایرُ

تمہاری جان کی قسم اُس نوجوان کے لئے باعث شرم نہیں ہے جس کی زندگی ننگ و عار سے خالی ہو۔

۳۔ وما احدٌ حیٌّ وان عاش سالمًا
باخلد ممن غیّبتہ المقابرُ

کوئی زندہ شخص اگرچہ وہ بالفعل صحیح و سالم ہو ہمیشہ باقی رہنے والا نہیں، وہ اُن لوگوں میں سے ہو کر رہیگا جنکو قبروں نے غائب کر رکھا ہے

۴۔ ومن کان یحدث الدھر جازعًا
فلا بد یومًا ان یُری وھو صابر

جس شخص کو زمانہ نے آج آہ وزاری میں مبتلا کر رکھا ہے کسی نہ کسی روز دیکھا جائے گا کہ اُسے صبر آگیا ہے۔

۵۔ وکل شبابٍ اوجدیدٍ الی بلیً
وکل امرئٍ یومًا الی اللہ صائرُ

ہر جوانی اور نئی چیز بوسیدہ ہو کر رہے گی
اور ہر شخص خدا کی طرف لوٹ کر رہے گا۔

۶۔ وکل قرینیٍ الفتہ لتفرقٍ،
شتّا تًا وان ضنّا وطال التعاشر

دنیا کے تمام عاشق و معشوق جدا ہو کر رہیں گے
اگرچہ وہ اس میں بخل کریں اور کتنے ہی دن تک زندہ رہیں

(الدر المنثور صا۱۷۴)

لیلی اخیلیہ بڑی حاضر جواب اور زبان آور شاعرہ تھی، لیلی نے امیر معاویہ کا بھی زمانہ دیکھا تھا اور توبہ کے متعلق ان سے بہت دلچسپ باتیں بھی ہوئی تھیں۔ مروان اور عبدالملک بن مروان سے بھی ملی تھی اور اُن کو بھی دنداں شکن جواب دے چکی تھی، اُسی زمانہ میں ایک مرتبہ والی عراق حجاج بن یوسف ثقفی نے اُس سے کہا "اب تو تمہاری جوانی گزر گئی سچ بتاؤ تم سے اور توبہ سے کیسے تعلقات تھے؟" لیلی نے کہا۔ "خدا کی قسم وہ ہمیشہ اپنے عشق میں پاکباز رہا، ہاں! ایک مرتبہ البتہ خواہشات نفس سے مجبور ہو کر اُس نے کچھ ناجائز ارادہ کیا تھا مگر میں نے یہ دو شعر پڑھے جس پر وہ نادم ہوگیا اور پھر کبھی اُس نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔

۱۔ وذی حاجۃٍ قلنا لہ لاتبح لنا
فلیس الیھا ما حییت سبیل

ایک صاحب حاجت نے درخواست کی مگر ہم نے اُس سے کہا کہ تمہارے لئے جائز نہیں، جب تک تم زندہ رہو گے کبھی اس کامیابی نہ پاؤ گے

۲۔ لنا صاحبٌ لاینبغی ان نخونہٗ
وانت لاخریٰ فارغ وحلیل،

میرا ایک شوہر ہے جسکی ہمیں خیانت نہ کرنی چاہئے اور تم بھی ایک دوسری عورت سے وابستہ ہو اور اُسکے شوہر ہو۔

حجاج نے پھر پوچھا "اچھا پھر کیا ہوا؟" لیلی نے جواب دیا کہ ایک مرتبہ اُس نے اپنے ایک دوست کو بھیجا اور کہا کہ ہمارے قبیلہ کے پاس کسی ٹیلہ پر چڑھ کر یہ شعر پڑھنا۔

عفا اللہ عنھا ھل ابیتنّ لیلۃً
من الدھر لایسری الیّ خیالھا

خدا اُس نازنین کے گناہ معاف کرے، کیا میں کبھی ایسی رات گزاروں گا جو میرے خیال میں بھی نہیں آتی۔

جب میں نے یہ شعر سنے تو فوراً میں سمجھ گئی کہ یہ توبہ کا فرستادہ ہے میں نے بھی یہ شعر کہکر فوراً اُسے سنا دیا :-

وعنہ عفار بی و احسن حفظہ	خدا اُسکے بھی گناہ معاف کرے اور اُس کو اپنی حفاظت میں رکھے
عزیزٌ علینا حاجۃٌ لا ینالہا ،	اُسکی وہ حاجت جو کبھی بر نہ آئے گی ہمیں بہت عزیز ہے ۔

(آداب اللغۃ العربیہ جلد اول صفحہ ۳۰۶)

لیلیٰ اخیلیہ کی موت کا واقعہ ایک عجیب داستان ہے ، کہتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ اپنے بھائی قتیبہ بن مسلم سے ملنے خراسان گئی ، واپسی میں توبہ کی قبر کے پاس سے گزری ، شوہر بھی ساتھ تھا ، لیلیٰ نے شوہر سے اجازت چاہی ، اُس نے منع کیا لیکن وہ نہ مانی ، قبر پر پہونچی اور کہا "السلام علیک یا توبہ" جب کوئی جواب نہ ملا تو اُس نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں اس سے پہلے کبھی توبہ کو جھوٹا نہیں سمجھتی تھی ، کیا یہ توبہ کا قول نہیں ہے ۔

۱- ولو ان لیلی الاخیلیۃ سلمت	اگر لیلیٰ اخیلیہ مجھے سلام کرے اور میری یہ حالت ہو کر
علیّ و دونی تربۃٌ و صفائح	مجھ پر خاک کا ڈھیر ہو اور پتھر کی سلیں ہوں ۔
۲- لسلمتُ تسلیم البشاشۃ او ابی	تب بھی میں اُسکو خوشی خوشی سلام کا جواب دونگا ، یا
الیہا صدیٌ من جانب القبر صائح	قبر کے پہلو سے ایک آواز بلند ہوگی جو اُسکے سلام کا جواب دیگی
۳- واغبط من لیلی بما لا انالہ ،	مجھے لیلیٰ کی اُس چیز پر رشک ہے جسکو میں نہیں پاسکا
الا کل ما قرت بہ العین صالحُ	ہاں جو کچھ بھی آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچائے وہ اچھی ہے ۔

(الدر المنثور ص ۱۸۹)

یہ اشعار لیلیٰ پڑھ رہی تھی کہ توبہ کی قبر سے ایک بہت بڑا اُلّو نکلا اور اُس کے اونٹ سے ٹکرایا ، لیلیٰ منہ کے بل زمین پر گری اور وہیں جاں بحق ہوگئی ۔

بنو اُمیہ کا عہد ختم ہوتے ہی عربی شاعری اور بھی معراج کمال پر پہونچ گئی ، بنو عباس کا دار السلطنت بغداد تھا ، وہاں کی آب و ہوا ، باغات ، نزہت گاہیں اور تمام وہ چیزیں جو شاعری میں کہربائی رنگ پیدا کرتی تھیں ، قدرت نے ایک ایک کرکے اُس کو ودیعت کر دی تھیں ، سارے ملک میں گل و سوسن ریحان و نرگس و نسرین ، سرو و چنار کی بہتات تھی جس نے عربی شاعری کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا ۔

شعراء عرب جب اپنی حدود چھوڑ کر بغداد کی سدا بہار زمین میں پہونچے تو اُن کے شاعرانہ جذبات بھی یہاں کی آب و ہوا کی اثر انگیزی کی وجہ سے بہت کچھ رنگین اور پر کیف ہوگئے اور وہ سادگی جو اُن کی شاعری کی جان تھی جاتی رہی ، اُس کے بجائے لطافت و رنگینی ، نزاکت و شوخی پیدا ہوگئی یہاں کے بہار آفریں اور

مناظر نے ایسی روح پھونک دی کہ انھیں اپنی سادگی خود بری معلوم ہونے لگی۔ عرب کی شاعری میں ہم کو پہاڑوں کی بلندی، گھوڑوں اور اونٹوں کی رفتار گرمی کی شدت سفر کی مصیبت، مکانوں کی ویرانی اور باد سموم کے جھونکوں وغیرہ کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ لیکن بغداد پہونچکر اس کا رنگ کچھ سے کچھ ہوگیا۔ یہاں کا سارا ملک مرغزار تھا، چپہ چپہ سرسبز و شاداب نظر آرہا تھا، ذرہ ذرہ آفتاب حسن کی تنویر سے روشن ہو رہا تھا، پھر نوخیز ترکوں کے حسن کی معصومیت اس شراب کو دو آتشہ سے سہ آتشہ بنا رہی تھی، امراء و سلاطین کے درباروں میں ساقی گری اور مجلس آرائی کی خدمات انھیں شباب پروروں کے سپرد تھیں۔ یہی جلوت و خلوت کے شریک سفر و حضر کے ہمدم تھے، اُن کے جمال جہاں آرا کی شوخیاں اور حسن نظر فروز کی رعنائیاں شباب پر تھیں۔ جس طرف اُنکی مدبھری نظریں اُٹھ جاتی تھیں اُس کو بیگانۂ عقل و ہوش ہونا پڑتا تھا۔

عہد بنو اُمیہ کے شعراء گو ان جذبات کی اثر انگیزی سے ناواقف تو نہ تھے، مگر یہ رنگینیاں اور سرمستیاں کہاں سے لاتے، جو بہاریہ اور عشقیہ شاعری کی جان ہیں۔ اُن کا حسن بدویانہ سادگی کا سرمایہ دار تھا، شوخی، شرارت، ناز و غمزہ سے ان کا حسن معرا تھا، اُن کے عشق و محبت کا مرکز امرد لڑکے نہیں بلکہ قانون فطرت کے موافق عورت کی ذات تھی اور وہ بھی پردہ نشین، اُن کے زمانہ میں بھی عشقیہ شاعری زوروں پر تھی، تشبیب بھی خوب دل کھول کر کی جاتی تھی مگر ان سب میں بدویت کا رنگ غالب تھا۔ بنو امیہ کو اپنی عربیت اور بدویت پر ناز تھا وہ ملک عرب اور اُس کی تہذیب کے دلدادہ تھے اور اس کے مقابلہ میں تمام دنیا کو حقیر سمجھتے تھے مگر بنو عباس اس عربی تہذیب اور بدویت کو اپنی گردن کا ایک بدنما طوق سمجھتے تھے، اُن کی معاشرت سے متنفر اور اُس سے گلو خلاصی چاہتے تھے حتیٰ کہ خلیفہ منصور نے تو یہ طے کرلیا تھا کہ حجازی کعبہ توڑ کر ایک عراقی کعبہ قائم کیا جائے جہاں لوگ حج کیا کریں، مگر شکر ہے کہ وہ اپنی اس تجویز میں کامیاب نہ ہوا۔

بنو عباس کے دور میں عورتوں نے بھی مردوں کے دوش بدوش حصہ لیا چنانچہ تمام وہ چیزیں جو اس عہد کی خصوصیات سمجھی جاتی تھیں، عورتوں کے کلام میں بھی پائی جاتی تھیں۔ حتیٰ کہ امرد لڑکوں سے تشبیب کرنا جو اُس زمانہ کی سب سے بڑی خصوصیت تھی خواتین کی شاعری کا بھی جزو تھی۔ خود ہارون رشید کی بہن عُلیہ بڑی دقیقہ رس، سخن سنج، صاحب ذوق اور نامور شاعرہ تھی، شعر و شاعری کے ساتھ ہی ساتھ حسن و جمال، عفت و عصمت دینداری اور تقویٰ میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ مگر بایں ہمہ اُس زمانہ کے شاعرانہ دستور کے مطابق ہارون رشید کے دو غلام طل اور رشا، اُس کے معشوق تھے جن کو مخاطب کر کے وہ ہمیشہ طبع آزمائی کیا کرتی تھی۔ رشا کو مخاطب کر کے جو نظمیں اُس نے کہی ہیں اُس میں سے بعض میں رشا کے بجائے اُس میں زینب کا نام ڈال دیا ہے، مگر طل کو تو اُس نے ہر جگہ صاف نام لیکر مخاطب کیا ہے، طل سے اُس کو بہت زیادہ محبت تھی اُسکی شان میں

اُس نے بہت سے شعر کہے ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:-

۱- یارب انی قد عرضت بہجرہ فالیک اشکو ذاک یا ربّاہ	خداوندا! میں اُس کے ہجر میں مبتلا کر دی گئی ہوں، بار الٰہا! میں تجھی سے اس کی شکایت کرتی ہوں،
۲- مولاۃ سوءٍ تستہین بعبدھا نعم الغلام وبئست المولاہ	ایک نالایق مالکہ ہے جو اپنے غلام کے مقابلہ میں اپنے کو حقیر سمجھتی ہے، وہ غلام اچھا ہے خود مالکہ نالایق ہے۔
۳- طلّ ولکنی حُرِمت نعیمہ، ووصالہ ان لم یغثنی اللہ	وہ طل ہے، اگر خدا نے مجھ پر مہربانی نہ کی تو میں اُس کی نعمت وصال سے محروم رہوں گی۔
۴- یاربّ ان کانت حیاتی ہٰکذا ضرّاً علیّ فما ارید حیاہ،	خدایا! اگر میری زندگی اسی طرح میرے لئے وبال جان رہی تو میں ایسے جینے سے باز آئی

(کتاب الاغانی جلد نہم صفحہ ۸۴)

ہاروں رشید کو اس کی اطلاع ہوگئی تو اُس نے عُلیّہ کو بلا کر قسم لی کہ آیندہ وہ کبھی اس کا نام زبان پر نہ لاوے گی، علیہ نے وعدہ کر لیا اور وہ چلی گئی، ایک مرتبہ وہ اپنے کمرہ میں بیٹھی تلاوت قرآن میں مشغول تھی جب وہ اس آیت پر پہونچی "فان لم یصبہا وابلٌ فطلٌ" تو بے اختیار اُس کی زبان سے نکل گیا: "فالذی منعناہ امیر المومنین"۔

خوش قسمتی سے ہاروں رشید اُس وقت کہیں کھڑا سن رہا تھا، اس پر اس جملہ کا بڑا اثر ہوا، سیدھا اُس کے کمرہ میں چلا گیا اور اُس کی پیشانی پر بوسہ دیکر بولا "میں نے طل تمھیں کو دے ڈالا اب تم جو چاہو کر" ہاروں رشید کو علیہ سے بڑی محبت تھی، اُس کو سفر وحضر میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اور اُسکے آرام وآسایش کا بڑا خیال رکھتا تھا، ایک مرتبہ وہ ملک رے گیا تو علیہ بھی ساتھ تھی جب وہ مقام مرج پہونچی اُس نے یہ شعر کہے:-

۱- ومقترب بالمرج یبکی لشجوہ وقد غاب عنہ المسعدون علی الحب	مرج کے قریب پہونچنے والا غم والم کے آنسو بہا رہا ہے اور محبت میں کامیاب ہونے والے نظروں سے اوجھل
۲- اذا ما اتاہ الرکب من نحو ارضہ تنشق یستشفی برائحۃ الرکب	جب کوئی سوار وطن کی طرف سے آجاتا ہے تو وہ اُس کے پاس جاکر سونگھتا ہے کہ شاید بوئے وطن

(الدر المنثور صفحہ ۳۵)

ہاروں رشید نے جب یہ شعر سنے تو سمجھ گیا کہ وطن کی یاد علیہ کو ستا رہی ہے، اُس نے فوراً اُسے وا

پہونچانے کا حکم دیا، اسی طرح ایک مرتبہ کسی ضرورت سے شہر رقہ گیا، عجلت میں علیہ ساتھ نہ جاسکی، وہاں پہونچکر اس نے علیہ کو بلوا بھیجا، جب وہ محمل میں بیٹھکر روانہ ہوئی تو اُس نے یہ شعر کہا:-

لولا الرجا لمن املت رویتہ	اگر اُس شخص سے امیدیں وابستہ نہ ہوتیں جسکے دیدار کی متمنی
ما جزت بغداد فی خوف وتعذیر	ہوں تو میں بغداد سے اس خوف وخطر کی حالت میں روانہ ہوتی

علیہ شاعری کے علاوہ علم موسیقی میں بھی بڑا کمال رکھتی تھی اور اپنے ہی شعروں میں اپنی ذہانت اور طباعی سے ایسی دھنیں قائم کرتی تھی کہ جو سنتا تھا اپنا سر دھننے لگتا تھا۔ لیکن باوجود ان تمام مشاغل کے وہ بڑی دیندار، پرہیزگار اور پابند صوم وصلوۃ تھی، شاعری میں باوجودیکہ عاشقانہ مضامین نظم کرتی تھی اور کھلے ہوئے صاف صاف لفظوں میں تشبیب کرکے زور طبع دکھایا کرتی تھی، مگر کسی شخص کو کبھی اُس کی پاکدامنی میں شک وشبہ نہیں ہوا وہ خود کہا کرتی تھی کہ یہ سب کچھ محض تفنن طبع کے لئے ہے۔

ایک دفعہ ہارون رشید ایک کنیز کے دام محبت میں پھنسکر عیش وطرب کے مزے اُڑا رہا تھا اور دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوگیا تھا، علیہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اُس نے فوراً دو شعر کہے اور اپنی کنیزوں کو اُس کا سُر بتاکر گوایا جسے سنکر ہارون رشید مبہوت ہوگیا، اور اپنی بیجا حرکت پر انتہا سے زیادہ نادم ہوا، وہ شعر یہ تھے

۱-	منفصل عنی وما قلبی عنہ منفصل	اُس نے مجھے چھوڑ دیا مگر میرا دل اُس سے جدا نہیں ہوتا
۲-	یا قاطعی الیوم لمن نویت بعدی ان تصل	اے آج مجھے چھوڑنے والے بتا تو سہی کہ اب تو نے مرے بعد کس سے ملنے کا ارادہ کیا ہے۔

(کتاب الاغانی جلد نہم صـ۸۸)

افسوس ہے کہ دولت عباسیہ کا آفتاب ڈھلتے ہی تمام علوم وفنون کے ساتھ شاعری کا بھی خاتمہ ہوگیا، ۶۱۶ھ میں چنگیز خاں نے تاتار سے نکل کر خراسان سے شام تک تمام ملک برباد کردئے، سینکڑوں شہر خاک میں مل گئے، زمین وآسمان میں سناٹا چھا گیا، مدینۃ العلم بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور کم وبیش چالیس پچاس لاکھ آدمیوں کا خون بہہ گیا، مغلوں کی اس تباہ کاری نے لوگوں کے دلوں کو بجھا دیا اور طبیعتوں کو مضمحل کردیا جس کا اثر تمام علوم وفنون کے ساتھ شعروشاعری پر بھی بہت برا پڑا، شعروسخن سے دلچسپی رکھنے والے خانہ نشین ہوگئے، اور اپنا وقت دوسرے مشاغل میں صرف کرنے لگے، اور عربی شاعری کا وہ رنگ جو دولت عباسیہ میں تھا ہمیشہ کے لئے فنا ہوگیا۔

عہد مغلیہ کے سلاطین وامراء کو اس سے قطعی دلچسپی نہ تھی، اُن کے درباروں میں کسی عالم یا فاضل کو

تقرب ہوتا تھا تو محض اس لئے کہ وہ اس عہد کی تاریخ مرتب کریں، جنگی کارنامے لکھیں یا پھر علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی کتابیں تصنیف کریں اور بس۔ اس عہد میں چونکہ علوم بغداد، بخارا، رَے، قرطبہ اور اشبیلیہ وغیرہ سے منتقل ہو کر قاہرہ، اسکندریہ، دمشق، حمص اور تونس وغیرہ میں آگئے تھے اس لئے یہاں کے باشندوں میں خال خال شعر و سخن کا چرچا باقی تھا۔ مگر عربی شاعری کا وہ عہد شباب جو دولت عباسیہ میں تھا ایسا فنا ہوا کہ آج تک نہ لوٹا اس لئے ہم اسی دور کے حالات پر اپنے مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

زمانۂ اسلام میں عہد عباسیہ تک کی مشہور شاعرہ خواتین میں عاتکہ بنت عمرو بن نفیل، خولہ بنت الازور الکندی ام حکیم بنت قارظ، ہند بنت زید بن مخرمۃ الانصاریہ، عریب بنت جعفر البرمکی، لیلیٰ بنت طریف، حمدہ بنت زیاد لطیفۃ الحدانیہ، حفصہ بنت حجاج الرکونیہ، صدونیہ بنت عیسیٰ، عائشہ بنت احمد، نزھون الغرناطیہ اشاعرۃ الغسانیہ الشبیلیۃ الاندلسیہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کی شاعرانہ نازک خیالی اور ادیبانہ بذلہ سنجی سے ملک و قوم ہی نہیں بلکہ اس زمانہ کے سلاطین بھی لطف اندوز ہوتے تھے اور ان کی شاعری اور زبان آوری کی ساری دنیا میں دھوم تھی۔

شواعر عرب کے حالات اور ان کے اشعار تاریخ و سیر کی کتابوں کے علاوہ کتاب الاغانی، کتاب الشعر والشعراء طبقات الشعراء، محاضرات الادباء، کتاب المنظوم والمنثور، کتاب الصناعتین، کتاب العمدہ المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر وغیرہ ادب کی کتابوں میں بھی جستہ جستہ ملتے ہیں مگر زمانۂ حال کی مصری ادیبہ سیدہ زینب بنت علی العاملی کی کتاب " الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور" صنف نسواں کے علمی و ادبی خدمات پر بہترین تصنیف ہے، اس میں خواتین عرب کے حالات بہت کچھ تفصیل سے ملتے ہیں جس میں وہ بھی شامل ہیں جنکو شعر و شاعری سے دلچسپی تھی، لیکن افسوس ہے کہ ان جواہر پاروں کا ذخیرہ اسقدر بکھرا ہوا ہے کہ ان کو یکجا کرکے ایک سلک میں پرونا ہفتوں نہیں مہینوں کی فرصت کا محتاج ہے، انشاء اللہ آیندہ کسی فرصت میں اس موضوع پر کچھ زیادہ تفصیل سے بحث کرنے کی کوشش کروں گا۔

سید جلیل الرحمان اعظمی

ہماری بُت پرستیاں

سرفراز (لکھنؤ) مورخہ ۸ رجمادی الاول ۱۳۵۵ھ میں سید اکبر حسین صاحب رضوی (کوئٹہ) کا مضمون "شیعہ اور گریہ و بکا" جب میں نے پڑھا تو مجھے اس لئے حیرت ہوئی کہ رضوی صاحب کے اکثر خیالات میرے اُن خیالات سے ملتے جلتے ہیں جن کی ابتدائی کھٹک بچپن کے معصومانہ زمانہ میں پیدا ہوئی تھی اور اب تو میں اسے محسوس کر کر کے اس بے راہ روی پر افسوس ہی نہیں ماتم کرتا ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ رضوی صاحب کے قلم کا لہجہ ذرا "سرحدانہ" ہوگیا ہے مگر میری رائے میں یہ درشتی اُن اوہام کا ردِّعمل ہے جو مذہب کے پردے میں ہمارے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں، جنھوں نے ہم کو حقیقت سے دور کر دیا ہے اور ہماری روحِ صداقت کو بجھا کر رکھدیا ہے۔

میں نے شیعہ خاندان میں آنکھ کھولی، شیعی فضا میں تربیت پائی اور شیعی رسم و رواج ہی سے واسطہ پڑا، اسلئے میں اُن مراسم سے اچھی طرح واقف ہوں جنھوں نے "شیعیانِ علی" کے پاک نہاد مشرب میں داخل ہوکر معلوم اُسے کیا سے کیا بنا دیا اور ایک شیعوں پر کیا منحصر ہے میں تو سارے اسلامی افق کو اوہام باطلہ کے بادلوں سے گھرا ہوا پارہا ہوں، اور جب کبھی مجھے کوئی سنجیدہ موقع مل سکا ہے میں نے اپنے حلقۂ احباب میں (خواہ وہ شیعہ ہوں یا سُنّی) اس حقیقت کے اظہار میں کبھی پس و پیش نہیں کیا:-

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس　　　در بند ایں مباش کہ نشنید یا شنید

رضوی صاحب نے اپنے مضمون میں عزاداری کی بدعات اور موقع بے موقع مجالس کے انعقاد پر نکتہ چینی کی ہے جس سے میں اس حد تک متفق ہوں کہ شہادتِ عظمیٰ کا مقصد صرف گریہ و بکا ہی پر ختم نہیں ہوجاتا بلکہ کربلا کی حسینی تعلیمات پر غور کرنے اور انھیں اپنا نصب العین بنانے کی ضرورت ہے، کیونکہ دنیا کی تاریخ میں "ذبحِ عظیم" کو شرمادینے والا یہ وہ غیر فانی واقعہ ہے جس کی مثال کوئی قوم پیش نہیں کرسکتی، دنیا نے ازل سے اب تک بیشمار کروٹیں بدلی، ان گنت اقوام و ملل منصۂ شہود پر آتی اور فنا ہوتی رہی ہیں اور شاید ہی کوئی قوم ایسی ہو جس کی تاریخ کا کوئی ورق کسی خونیں داستان سے رنگا ہوا نہ ہو، لیکن یہ تمام خونفشانیاں، یہ تمام

صف آرائیاں اور یہ تمام تیغ آزمائیاں حیاتِ عمرانی کی کشمکش کا نتیجہ تھیں جس کا مقصد یہ تھا کہ ایک کو دوسرے پر تفوق حاصل ہو جائے اور ملکی و سیاسی خواہشات کی قربانگاہ پر انسانی جانوں کی بھینٹ چڑھ جائے، ان محاربات کو حق و باطل سے کوئی واسطہ نہ تھا بلکہ اُن حسیات کو سکون پہونچانا تھا جو کسی قوم کی فاتحانہ حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے انسانی دل و دماغ میں پرورش پاتی رہتی ہیں۔

جنھوں نے تاریخ کی ورق گردانی کی ہے اور اُس کے صحیح نتائج کو اخذ کرسکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یورپ و ایشیا کے بڑے بڑے صاحبانِ فکر نے کربلا کے اس "ذبح عظیم" کو دنیا کا عظیم الشان واقعہ مانا ہے، اور چند تنگ نظروں کو چھوڑ کر سب متفق اللفظ ہیں کہ یہ جانگداز اور روح فرسا واقعہ اپنی نوع کا ایک ہی واقعہ تھا، جو سیاسیات، ذاتیات اور نزاع مالی و ملکی سے بالکل دور صرف حق و صداقت کی حمایت میں پیش آیا، حقیقت یہ ہے کہ امام مظلوم نے اپنی قربانی سے نہ صرف اسلام کی صداقت پر مہر دوام ثبت فرمادی بلکہ ساری دُنیا کو دکھا دیا کہ دیکھو معرفتِ ربانی اس کا نام ہے، شیوۂ تسلیم و رضا اس کو کہتے ہیں اور صداقت و حقانیت کی آزمائش میں ثابت قدمی کا یہ مفہوم ہے۔

مذہبی کتب میں (متفقہ فریقین) یہ موجود ہے کہ کربلا کے شہیدِ اعظم کے اس انعام کی اطلاع نانا کی پیغمبری کو دیدی گئی تھی ماں کی مامتا بتا گئی تھی اور باپ کی شفقت سمجھا گئی تھی اس لئے وہ جان بوجھکر چلے، سوچ سمجھ کر روانہ ہوئے اور صرف اُن کو ہمراہ رکاب رکھا جنھیں قدرت نے اس سعادت کبریٰ کے لئے ازل ہی میں نامزد کر دیا تھا، جن کے پیشِ نظر صرف یہ مقصد تھا کہ اسلام کا قصرِ نوتعمیر کہیں پھر عہدِ جاہلیت کی باطل پرستیوں سے نہ ہل جائے اس لئے مشیت ایزدی نے چاہا کہ باطل پرستوں کو دکھا دیا جائے کہ توحید کس کو کہتے ہیں، رسالت کا مقصد کیا ہے اور امامت کے فرائض کیونکر ادا ہوتے ہیں، یہ نہ سمجھئے کہ کربلا کے حسین نے خونریزی سے اجتناب کے لئے اتمام حجت نہیں کی لیکن بندگانِ ہوس کی باطل پرستیاں بھڑکا رہی تھیں: ناپاک خواہشیں بہکا رہی تھیں اور خود پسندیاں اُکسا رہی تھیں، جب وعظ و پند بے اثر رہے اور تعلیم و تلقین بیکار ہوگئی تو کچھ دیر ذوالفقار حیدری کے جوہر بھی دکھا دئے اور صبر و ضبط کا عملی درس بھی دیدیا اور پھر یہ فرماتے ہوئے رضائے دوست پر سر جھکا دیا:-

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی ۔۔۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یہ تھی شہادت اور یہ تھا مقصدِ شہادت، اب آیئے عزاداری کے متعلق غور کریں کہ یہ کیونکر وجود میں آئی اور شہادت سے اس کا کیا تعلق ہے، باطل پرستوں نے جب تلواریں نیام کرلیں اور اس عارضی فتح کا نشہ ایک ابدی شکست کا عنوان بن کر اُتر گیا تو وہ لُٹا ہوا قافلہ روانہ ہوا جس کی بیکسی پر ایمان والوں کی

آنکھیں خون کے آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکیں، کوئی اپنے مولا کے لئے رویا، کسی نے اب وجد کی یاد میں آنسو بہائے اور کوئی اُس پیکرِ حق و صداقت کے عزم و استقلال سے متاثر ہوا۔ غرض مختلف قسم کے تاثرات تھے جو دل میں تڑپ پیدا کرتے تھے اور آنکھوں سے ظاہر ہونے لگتے تھے، یہ وہی جذبۂ بے اختیارانہ ہے جو اس غم کو دل سے دور نہیں ہونے دیتا اور نہ آنکھیں خشک ہوتی ہیں، اسی نے شعراء سے مرثیہ لکھوائے اسی نے بین اور نوحوں کے اسلوب وضع کئے، اور اسی نے خاموش آنسو بہانے کے انداز سکھائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبایل میں سنسنی پھیل گئی، اہل عرب و عجم میں بے چینی پیدا ہوگئی اور دنیا جانتی ہے کہ قدرت دشمنانِ ملت سے انتقام لئے بغیر نہ رہی، آج نہ یزید ہے اور نہ اُس کی باطل پرست ذریات، نہ شمر ہے اور نہ ابن زیاد، ان کا نام تاریخ کے اوراق میں اس لئے محفوظ ہے کہ ان کی بے دینی کے کارنامے عبرت و بصیرت حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ دہرائے جائیں۔

رونا رُلانا ایک فطری چیز ہے انسان جب غیروں کے دکھ درد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تو ایسے ایمان پیکر آقا کی بیکسی اور مظلومیت پر کیونکر خاموش رہ سکتا ہے، مجلسِ عزا کا بانی علم النفس کے اس راز سے واقف تھا کہ اگر کربلا کے واقعات کو بار بار دہرایا جائے گا تو حسین مظلوم کی تعلیم ہمیشہ حافظوں میں باقی رہے گی اور اُن کے خدائی کارنامے حیات ابدی پا سکیں گے۔ بظاہر تو رونا ہے مگر یہی آنسو ایمان کو تازہ رکھتے ہیں، لیکن رفتہ رفتہ دنیا جس قدر حق و صداقت سے دور ہوتی گئی اسی قدر اصل مقصد سے بُعد ہوتا چلا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ آج شہادت کی روح صرف گریہ و بُکا ہی سمجھی جاتی ہے اور اُس کی بے اندازہ برکتیں طاقِ نسیاں کی نذر ہو کر رہ گئی ہیں، حالانکہ یہ تو ایک ایسا واقعہ ہے جس نے نبوت کی تکمیل کی، جس نے توحید کی بنیادوں کو استوار کیا، اور ہمیں جہل و باطل اور فسق و فجور کی تاریکیوں سے نکالا تاکہ ہم اپنے کو عرفانِ حق اور احساسِ صداقت کا اہل ثابت کریں اور خدا کی راہ میں اس والہانہ سرفروشی کا ثبوت دیں۔

حسین کا پیغام ہے کہ باطل کے آگے پیشانیاں نہ جھکاؤ، ہجوم باطل کا مردانہ وار مقابلہ کرو، صداقت کے لئے جان و مال قربان کر دو، ایمان و حق پر ثابت قدم رہو، اور وہ سب کچھ کرو جس سے خدا کی خدائی باقی رہے اور انسانیت ذلیل نہ ہو، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہم نے عملی طور پر اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے اور جب ہمارا ایمان اس درجہ ضعیف و کمزور اور ہمارے عادات و اخلاق اس قدر انسانیت سوز ہیں تو للّٰہ مجھے بتایئے کہ واقعۂ شہادت کے جیسے "ذبح عظیم" پر آپ کو رونے اور اسے اپنے سے متعلق کرنے کا کیا حق ہے؟ آپ میں جب ایسے ایمان و ایقان اور حق و صداقت کی شان باقی نہیں ہے تو حسینؑ کے ایسے مولائے کائنات سے اپنی وابستگی کیونکر قائم رکھ سکتے ہیں اور دُنیا اسے تسلیم کرنے کی غلطی میں کیونکر

مبتلا ہو سکتی ہے، ہمارے سارے دین و ایمان کا خلاصہ صرف اس قدر رہ گیا ہے کہ محرم کے عشرہ میں سوگواروں کی صورت بنا کر مجلسوں میں رسمی طور سے شریک ہولیں، اور سوزخوانوں کی آواز کے اُتار چڑھاؤ پر واہ واہ کرلیں، "تحت اللفظ" خوانوں کی بہاریہ تشبیہوں پر جھوم لیں، ساقی نامہ میں عرفانی شراب کے جلوے دیکھ لیں، کبھی گھوڑوں کی سُبک رفتاریوں پر حیران ہو جائیں، کبھی تلوار کی خون آشامیوں سے کانپ اُٹھیں اور پھر داد و ستایش کے فلک شگاف نعروں سے چھتوں کو ہلا دیں، ٹوپیاں اُچھلتی دیکھیں، اور تعریف کرنے والوں کی تہذیب کا ماتم کریں، یہ مجلس تو نہ ہوئی، ایک مشاعرہ کی محفل ہوگئی۔

کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ ایسی مشاعرہ نما مجلسوں میں، صداقت کی روح کس کس طرح کانپ جاتی ہوگی، آپ کے اس شیوۂ مذہبی سے اصل مذہب کو کیا شکایت ہوتی ہوگی اور آپ جس کے اسوۂ حسنہ کے پیرو ہیں اُس کی روحِ مقدس آپ کے اس اندازِ عمل پر کس قدر بے چین ہوتی ہوگی یقین کیجئے کہ حسینؑ خدا کے اُس برگزیدہ ترین بندہ کا اسم گرامی ہے جس نے خدا کی راہ میں سب کچھ قربان کر دیا، پھر کیا اُن کا مطالبہ آپ سے چند ظاہری رسوم کی حد تک ہے، جنھوں نے ساری کائنات کو حق و صداقت کا درس دیا تھا، جنھوں نے سارے اوہامِ باطلہ کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا تھا، اُن کا تو ہر عمل ایک مستقل درس ہے اُن کے لئے جو قلت سے گھبرا کر باطل کے سامنے سر جھکا دینے پر مجبور ہوتے ہیں، جو ناحق کا ساتھ دے کر اپنی ضعفِ ایمانی کا ثبوت دیتے ہیں، حسینؑ آپ سے صرف رو لینے کے طالب نہیں ہیں، بلکہ آپ سے دینِ متین کی استواری کے طالب ہیں، آپ سے صداقت کی تعمیر میں سرفروشی کے طالب ہیں اور اُن تمام حق پرستیوں اور حق شعاریوں کے طالب ہیں جو جہل و باطل کی تاریکیوں کو افقِ ہستی سے مٹا کر دُنیا کو سراپا انوار کر دیں۔

میں نہیں کہتا کہ مجلسوں سے وہ مقصد بالکلیہ پورا ہی نہیں ہوتا جس کے لئے ان کو وضع کیا گیا تھا لیکن ضرورت یہ ہے کہ اس یادگارِ شہادت کو اُس مرکز پر آنا چاہئے جو اسوۂ حسینی کی تبلیغ کا کام دے سکے۔ اس کو اسی حدود میں رکھنا چاہئے جس سے اصل مذہب متاثر نہ ہو اور تعلیماتِ حسینی کی روح کو صدمہ نہ پہونچے، صرف رونے رُلانے کو ذریعہ نجات نہ خیال کیا جائے بلکہ اس کے ساتھ اپنے باطن کی اصلاح اور اُن حقایق کی تکمیل ہونی چاہئے جو اس شہادت کبریٰ کے پردے میں سکھائے گئے ہیں اور جو ساری کائنات میں دینِ حنیف کا طغرائے امتیاز ہیں، ہم میں ایک یہ عیب بھی استحکام کے ساتھ پیدا ہو گیا ہے کہ جس بات کو ہم اچھا سمجھتے ہیں، اُسے اپنے ضمیر کی آواز بھی جانتے ہیں، میں اپنے ایمانی بھائیوں سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا تعزیہ و علم اور قبر پرستی کی حدیں بُت پرستی سے نہیں مل جاتیں، آپ ایک خدا کے ماننے والے ہیں، وہ خدا جو دانا بھی ہے اور بینا بھی، قادر بھی ہے اور توانا بھی، زندہ بھی ہے اور گویا بھی، اس

کسی دوسرے کے سامنے نہ آپ کی پیشانی جھک سکتی ہے نہ آپ کے دل میں وہ گداز پیدا ہو سکتا ہے جو معبودِ برحق کی عبادت کے لئے مخصوص ہے، پھر اے صاحبانِ توحید! اے آفریدگار واحد کے پرستار یہ لکڑی اور کپڑے کے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے کھلونوں اور مٹی کے ڈھیروں کے سامنے نیایش اور فروتنی کیسی! میرے ایمان کے نزدیک تو اسلامی ضمیر کو اس پر شرم آنی چاہئے وہ ضمیر جو سوائے معبودِ حقیقی کی توحید کے اور کچھ نہیں جانتا، وہ ضمیر جو خدائے واحد کی پرستاری کو زندگی سمجھتا ہے، وہ ضمیر جو صرف اسی ایک صداقت کی حمایت کا دعویدار ہے، میں یہ جانتا ہوں کہ اس گئی گزری حالت میں بھی کوئی مسلمان انھیں خدا نہیں سمجھتا مگر اُن کے توسل سے اپنی عقدہ کشائی کا آرزومند ضرور ہوتا ہے اس لئے نفس کا فریب جہالت کا ڈھکوسلا ان سے وہ تمام خدا کی صفات منسوب کرنے میں تامل نہیں کرتا جو صرف خدائے تعالیٰ کی صفات خاصہ ہیں، اولاد ان سے مانگی جاتی ہے، شوہر کے التفات ان سے طلب کئے جاتے ہیں، بچوں کی زندگی، بیماروں کی صحت اور مالی پریشانیوں سے نجات، غرض کونسی ایسی تمنا نہیں ہے جن کا ان سے مطالبہ نہیں کیا جاتا، اس میں شک نہیں کہ ایمان ہم کو رسول اور آلِ رسول ہی سے ملا ہے، خدا کو ہم نے انھیں کی وجہ سے پہچانا ہے، توحید کے اسرار انھیں نے ہمیں بتائے ہیں۔ لیکن یہ تو سوچئے کہ انھوں نے ہماری زندگی کی اصلاح کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کئے اور ہمارے ذہن و دماغ سے اوہام کیونکر مٹائے، انھوں نے سارے معبودانِ باطل سے چھڑا کر ایک خدا سے ہمارا رشتہ جوڑا اور اپنی خدائی زبان سے فرمایا:-

اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ

اس کا مطلب بالکل صاف ہے کہ کہیں وہ صفات ہماری ذات سے منسوب نہ کر دینا جو صرف خداوند حقیقی کے لئے ہیں، لیکن ہم باوجود اس دعوئے توحید و حق پرستی کے وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو حریفِ اسلام ہے، دشمنِ توحید ہے اور اُن کی تمام تعلیمات کے بالکل مخالف ہے اور اس پر یہ بوالعجبی کہ یہ یقین بھی کرتے ہیں کہ اُن کی ارواح مقدسہ ہمارے ان اعمال سے خوش ہوتی ہوں گی میں جب یہ سوچتا ہوں تو میرے قلب کی رگیں ہل جاتی ہیں ہم ان سیاہ کاریوں کو اپنے دامن میں لیکر انھیں کیا مُنھ دکھائیں گے جنھیں زبان سے تو ہمیشہ اپنا آقا اور مولا کہا اور دل سے کبھی نہ جانا کہ اُن کی تعلیمات اور اُن کا اسوۂ حسنہ کن اجزا سے عبارت تھا، حیف!

بُت گری پیشہ کیا بُت شکنی کو چھوڑا

تعزیہ داری کی ابتدا کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی بنا امیر تیمور کی عقیدت نے ڈالی تھی جس کو شاہ نجف اور سلطان کربلا سے والہانہ عشق تھا، لیکن اُس کے بڑھتے ہوئے فاتحانہ عزائم اُسے

ایک مقام پر زیادہ ٹھہرنے کا موقع نہ دیتے تھے جس کی وجہ سے وہ بقدرِ شوق حاضری کی سعادت حاصل نہ کرسکتا تھا، اُس نے روضۂ مبارک کی نقل (ضریح) اس لئے بنوائی تھی کہ وہ اس سے اپنے ایمانی جذبات کی تسکین کرسکے، اس روایت کی صحت میں اکثر حضرات کو کلام ہے ممکن ہے کہ صحیح ہو میں اس پر کوئی ایسی گفتگو کرنا نہیں چاہتا جس سے مورخانہ چھان بین شروع ہو جائے، کیونکہ عقاید نے دنیا میں بڑے بڑے انقلاب پیدا کئے ہیں اس لئے اگر تیمور نے اپنے جذبۂ شیفتگی کے اظہار میں روضۂ مبارک کی نقل بنوالی تو اس پر حیرت و استعجاب اور حجت و تکرار کیوں کی جائے، جب کہ اہل بیت کے ساتھ مسلمانوں نے علی العموم جذبات شیفتگی و ارادت کے اظہار میں مختلف پیرائے اختیار کئے ہیں انھیں میں سے ایک یہ بھی ہوسکتا ہے لیکن مسلمانانِ ہندیہاں کی اوہام پرست فضا میں اس پر کیوں اکتفا کرتے، انھوں نے تعزیہ داری کی عقیدتمندانہ رسم کے سایہ میں دُنیا کی ساری بدعتوں کو جمع کردیا اور وہ رنگ کھیلے جن پر رسالتمآب کا اسلام یقیناً ماتم کرتا ہوگا، ذرا سوچئے تو کہ جماعت حسینی اور مہندی وضریح کی رسمیں اور پھر اُن کے نام سے جو ان رسم و رواج کو مٹانے آئے تھے جو ان اوہام باطلہ کو دماغوں سے نکالنے آئے تھے، جب معمولی ٹٹوؤں کو دُلدل اور ذوالجناح کا مرتبہ دیکر سڑکوں پر پھرایا جاتا ہوگا جب امام زین العابدینؑ کے جیسے عابد و زاہد صاحب عرفان حقیقت کے لباس میں کم سواد انسانوں کو اونٹ پر دکھایا جاتا ہوگا تو خدا را غور کیجئے کہ ملت حقہ کے دل پر کیا گزرتی ہوگی اور شہدائے کربلا کی ارواح مقدسہ کی کیا حالت ہوتی ہوگی ان حالات میں اگر اغیار ہم پر آوازے کستے ہیں اور ان مراسم کو رام لیلا کے سوانگ سے تعبیر کرکے ہمارے ایمان کا مضحکہ اُڑاتے ہیں تو اس میں بُرا ماننے اور تیوریوں پر بل ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا میرے برادرانِ ملت اس سے انکار کرسکیں گے کہ عقائد کا یہ غلو، خواہ کیسے ہی حُسنِ نیت پر مبنی سہی، اسلام کی تعلیمات سے اُس کو کوئی دور کا بھی تعلق ہوسکتا ہے؟ وہ اسلام جسے قرآن نے سمجھایا، وہ اسلام جسے احادیث صحیحہ نے پھیلایا، اور وہ اسلام جسے آئمہ اہل بیت نے عملی طور پر پیش کیا۔

اُنھوں نے خدا کو منوانے کے لئے جانیں دی تھیں، ہم تعزیوں کے لئے انسانی قربانی کو حلال سمجھ رہے ہیں، اُنھوں نے توحید کے لئے دُنیا بھر کی مصیبتیں اُٹھائی تھیں، ہم تعزیہ، علم اور مزاروں کے مجاور بنے ہوئے ہیں، اُن کا حق و صداقت شعار تھا، ہمارا دُنیا طلبی و دہر پرستی، وہاں ابن ملجم کے جیسے شقی کی پیاس کو اپنی پیاس پر مقدم سمجھا جاتا تھا، ہم اپنے جذبات کی پیاس بجھانے کے لئے انسانیت کا خون پر تیار رہیں، وہاں عنتر کے جیسے دیو پیکر کو قبضہ میں آنے کے بعد چھوڑ دیا جاتا تھا اور ہم ایک دوسرے ذبح کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر آپ فی الواقع اُسی کے پیرو ہیں جو اماموں کا امام ہی جو فرزند رسول

مکتوبات نیاز

صدیقی - عتاب نامہ ملا - حیران ہوں کیا کروں - آپ معذرت سننے سے رہے اور میں الزام تسلیم کرنے سے - وہ آپ کے دعوائے فرزانگی کے منافی ہے اور یہ میری خودداری کے خلاف - پھر کیسی سلجھے تو کیونکر؟ ایک تدبیر میرے ذہن میں آئی ہے، آپ اس پر کاربند ہوں یا نہ ہوں لیکن سن لینے میں کیا حرج ہے -

آپ ایک خط رشید صاحب کو لکھئے - ظاہر ہے کہ ان سے زیادہ میرا دشمن اور کوئی نہیں --- اور انھیں سے پوچھئے کہ قصور کس کا ہے - میرا یا اُن حضرت کا جن کی معصومیت کو آپ ریاضی کا ایک مسلمہ مسئلہ مانتے ہیں -

میں نے ان کو خط لکھا جواب نہیں دیا، آدمی بھیجا کوئی توجہ نہیں کی، خود گیا مگر باوجود وعدہ تشریف نہیں لائے - اب بتایئے کیا کرتا - میں نے ان سے کہدیا تھا کہ نواب صاحب پرسوں چلے جائیں گے اور کل کا وقت مقرر ہوچکا ہے، لیکن صبح سے دوپہر تک انتظار کرتا رہا، تشریف نہیں لائے -

مجھے جستجو ہوئی کہ کیا بات ہے - معلوم ہوا کہ وہ اس سے قبل خود براہ راست ملنے چلے گئے تھے اور وہاں سے مایوس واپس آئے - پھر اب کیا منھ لیکر جاتے اور اپنی اس خفت کو مجھ پر کیونکر ظاہر کرتے - کیا بتاؤں کتنا افسوس ہوا ہے، میں تمام مراحل زبانی طے کرچکا تھا اور کامیابی کی پوری توقع تھی لیکن اس کا کیا علاج کہ اپنی حماقت سے انھوں نے تمام بنا بنایا کھیل بگاڑ کے رکھدیا -

اگر اس کے بعد بھی آپ مجھے موردِ عتاب قرار دیں، تو یہ آپ کی محبت ہے - اور کیا کہہ سکتا ہوں -

---

کرمی - آپ نے بھی کس ظالم کا ذکر کیا - مجھ سے پوچھئے کہ وہ حضرت کیا ہیں اور کیا نہیں - ان کے انسان پیدا ہونے میں کلام نہیں لیکن ایک بے روح انسان --- جس کی تنہا مسرت زندہ چیزوں کو کچلکر گزر جانا ہے - اب کیا بتاؤں میں نے کیسی کیسی بیدردیاں اس شخص کی دیکھی ہیں - آپ کو وہ ہستی یاد ہوگی جو اپنی صحت، اپنی مسرت اپنی زندگی اور اپنا وہ سب کچھ (جس کا سودا کونین کے عوض بھی گراں نہ تھا) اسپر قربان کرچکی تھی -- پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ جس وقت وہ نزع کے عالم میں تھی تو ان کی بے نیازیوں کی کیا کیفیت تھی -

ایک دن میں نے کہا کہ "پھول کی پنکھڑیاں توڑنے کے بعد انھیں مجتمع کرکے آپ پھر پھول نہیں بنا سکتے" بولے کہ "چمن میں جب تک پھولوں کی پیداوار بند نہیں ہوئی، اس پر غور کرنا حماقت ہے"۔

آپ اسے ذہن انسانی کی گمراہی بتاتے ہیں، میں قدرت کی ستم ظریفی کہتا ہوں، اور خدا کو نہ ماننے والے اس کو "عدمیت" کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔

اندھیر ہے، ظالم کا ظلم جاری ہے اور اس کی کوئی سزا نہیں، مظلوم کی کراہوں سے فضا گونج رہی ہے اور کوئی سننے والا نہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ اس کا فیصلہ دوسری دنیا میں ہوگا، اس کی مصلحت آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ فیصلہ کرنے والے کا ہاتھ یہاں کس نے پکڑا تھا کہ وہاں چھوڑ دے گا۔ خیر، اس قصہ کو جانے دیجئے، یہ بتایئے کہ آپ کی اُن کی یکجائی کیونکر ہوگئی۔ میں سننا چاہتا ہوں، بہت لطیف داستان ہوگی۔

مجھے تو ان سے ملے ہوئے ایک زمانہ ہوگیا، لیکن سنتا ہوں کہ خوش ہیں، اچھے ہیں۔ آپ کو اگر اور زیادہ تفصیلی حالات معلوم ہوں تو مطلع فرمایئے، مجھے ان سے اور ان کے واقعات زندگی سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اور رہے گی۔

اے حضرت، یہ آپ میری طرف سے اس قدر مایوس کیوں ہیں۔

چشم ہماں قوت دیدش ہماں !

مجھے یاد کرکے تو دیکھئے، اس طوفانِ آب و رنگ سے، کون ہے، جو اپنی جان سلامت لے آئے گا، اس گلی میں جانے کے لئے کون اپنے "دین و دل" کو عزیز رکھے گا۔ مگر میں خوب جانتا ہوں یہ سب جی جلانے کی باتیں ہیں ورنہ آپ

دشمن کے ساتھ صرفہ کریں رسم و راہ میں

مجن صاحب کا حال سنکر بہت ملال ہوا۔ اللہ، اللہ، وہ بزم جہاں سوائے رندان باصفا کے اور کسی کا گزر نہ تھا، آج وہاں "خرقۂ سالوس" کی حکومت ہے۔

عبرت آتی ہے کہ کیا بتخانہ ویراں ہوگیا !

دیکھئے تاریخیں یونہی تو غلط مرتب ہو جاتی ہیں۔ انجام خراب ہوگا ان کا اس صحبت سے اور دنیا سمجھے گی کہ ان کو تباہ کیا "زندی" نے۔ ملیں تو کہدیجئے کہ آپ کس دھوکے میں مبتلا ہیں، روح کی تشنگی کو وہی چیز بجھا سکتی ہے جس نے اس تشنگی کو پیدا کیا ہے۔

پاک ست خرقۂ کہ بہ مے شستہ و شو کنند

خوشا نصیب، کہ آخر کار آپ کو اس دور افتادہ پر رحم آ ہی گیا۔ آپ نہ سہی آپ کے الفاظ تو ہیں،

بالذتِ دیدار ز پیغام گرفتیم
مشتاق تو دیدن ز شنیدن نشناسد

حقیقت یہ ہے کہ مجھے آپ کی بے اعتنائی کا اتنا گلہ نہیں ہے، جتنا اپنی شکستہ پائی کا، کیونکہ میرے پاس سوائے خاموشی کے کوئی عذر نہیں اگر آپ میرے شکوہ و شکایت کے جواب میں یہ کہہ دیں کہ "کرمیں نے کی تھی توبہ" تو نامعقول تجھے کیا ہوا تھا۔

بہر حال میرے لئے یہ مسرت بھی کم نہیں کہ آپ کو میرے اس "رنجِ دوری" کا احساس ہے۔

آپ نے جس امر میں میری سعی چاہی ہے، وہ اس حیثیت سے کہ یوسف کی "دل باختگی" اس سے متعلق ہے، یقیناً لائق توجہ ہے، لیکن انجام کے لحاظ سے مجھے زیادہ پسند نہیں۔ ان کے لئے تو یہ تعلق باعث صد ہزار شرف ہے، لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے سلطانہ آسانی سے راضی نہ ہوگی اور جبر و اکراہ کے ساتھ "ہاں" کر بھی دی تو تعلقات کی شگفتگی معلوم۔

میں یہ جانتا ہوں کہ وہ "تعلیم یافتہ" ہے "تعلیم زدہ" نہیں اور والدین کی مرضی کی خاطر وہ اپنے دل کو مجبور بھی کر سکتی ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ "یوسف" کی ملاقات سے بہت پہلے وہ کسی اور سے "پیمانِ محبت" کر چکی ہے اور حتی المقدور وہ اسے نباہنے کی کوشش کرے گی۔

پھر اگر آپ سودا صرف جسم کا کرنا چاہتے ہیں، دل کا نہیں، تو میں کوشش کے لئے آمادہ ہوں، ممکن ہے بار آور ہو جائے، لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ آپ کا گھر ماتمکدہ بن جائے گا اور ممکن ہے کہ یوسف بھی اس رسوائی کو برداشت نہ کر سکیں۔

یقیناً معاملہ بہت نازک ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یوسف کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ وہ چیز ہی ایسی ہے۔ لیکن تمناؤں کا خون ہو جانا بھی تو کوئی نئی بات نہیں۔ بہر حال ایک نفسیاتی تدبیر میرے ذہن میں آئی ہے، وہ یہ کہ آپ انھیں میرے پاس بھیج دیجئے تاکہ وہ خوب سیر ہو کر دیکھ لیں، ممکن ہے "نگاہِ اولین" کا عشق "نگاہِ ثانی" کے بعد کچھ ہلکا پڑ جائے، اور اس کا بھی امکان ہے کہ تکلف ٹوٹنے کے بعد "تریاہٹ" اتنی باقی نہ رہے۔ ان سے کہئے کہ کچھ تو شرم اپنے نام کی رکھیں۔ ایسی بھی کیا بیتابی ہے۔ زلیخا وہی ہے جو اپنے اوپر جان دے۔

یہ کیسے یوسف ہیں کہ خود زلیخا کے لئے مٹے جا رہے ہیں۔

گرامی جناب - والانامہ پہونچا - شکریہ - مشورہ درست ہے لیکن کیا کروں،

ہمت نہ خورد نیشتر لا و نعیم را

آپ کو معلوم نہیں، میں جانتا ہوں کہ اس باب میں، کتنی بدلیقگی مجھے عطا ہوئی ہے - کیا ہجوم افکار میں مبتلا رہنا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے - کیا میرا جی نہیں چاہتا کہ میں بھی دادِ عیش دوں، لیکن جبوقت یہ دیکھتا ہوں کہ اس مقصد کے حصول کے لئے کیسی کیسی قربانیاں پیش کرنے کی ضرورت ہے، تو اپنی بیکسی و بے چارگی کے ساتھ میری محبت اور بڑھجاتی ہے -

میں ناشکرگزار نہیں ہوں، لیکن میری التجا یہی ہے کہ کسی ایسی بات پر مجھے مجبور نہ کیجئے کہ آخر کار خود مجھے اپنی اوقات سے نفرت ہونے لگے — آپ کی دل پُرسی کا مکرر شکریہ -

---

مجمع الادب، اسماعیل کالج جوگیشوری کا

"انعامی مقابلہ"

اسماعیل کالج میں ۷ر فروری کو جو "یوم ولی" منایا گیا تھا اس کو عملی و علمی صورت سے مستقل و مفید بنانے کے لئے مجمع الادب نے یہ طے کیا ہے کہ ملک کے ادیبوں، انشاپردازوں اور مضمون نگاروں سے درخواست کیجائے کہ وہ مندرجہ ذیل موضوع پر اظہار خیال فرمائیں - جو مضامین سب سے اچھے سمجھے جائیں گے انکے لئے معقول انعامات پیش کئے جائیں گے - انشاپردازوں کے علاوہ تمام طلبہ سے بھی درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اس موضوع پر لکھیں، طلبہ کے مضامین میں سے بھی سب سے اچھے دو مضامین میں اول کو ایک سونے کا تمغہ اور دوسرے کو چاندی کا تمغہ دیا جائے گا - موصول مضامین میں سے چند مضامین ایک کتاب کی صورت میں شایع کئے جائیں گے - مضامین مندرجہ ذیل پتہ پر یکم جولائی ۳۷ء تک پہونچ جانا چاہئے - طلبہ کو اپنے مضامین اپنے کالج یا اسکول کے اعلیٰ افسر کے ذریعے روانہ کرنا چاہئے - کوئی ایسا مضمون جو کہیں پڑھا جاچکا ہے روانہ نہ کیا جائے -

(۱) اُردو ادب و شاعری میں ولی کا درجہ — (۲) ولی سے پہلے گجرات، دکن اور شمالی ہند میں اُردو کا درجہ

(۳) ولی کی لسانی، ادبی، سماجی اور شعری خدمات - (موجودہ اُردو ادبیات پر ولی کا اثر -

مجمع الادب - اسماعیل کالج جوگیشوری -

۲۰ر فروری ۱۹۳۷ء -

نجیب اشرف ندوی

صدر شعبۂ اُردو

لامذہبیات

آجکل کے ملحدین کیا کہتے ہیں؟

(بہ سلسلۂ ماسبق)

دو راستوں میں کونسا راستہ اختیار کرنا چاہئیے؟

ہمارے سامنے دو راستے ہیں، ایک وہ جو فطرت اور عالم اسباب کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے اور دوسرا وہ جو مافوق الفطرت باتوں کی جانب مایل کرتا ہے ـــــ یعنی ایک وہ ہے جو ہمیں تحقیق و جستجو، اکتشافات واختراع، سعی و کاوش اور رشتۂ علت و معلول کی طرف متوجہ کر کے راحت و آسایش، امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے اور دوسرا وہ جو ہمیں بتاتا ہے کہ اصل دنیا یہ نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہے اور اسی غیر معلوم دنیا کے لئے بلا حیل و حجت ہمکو قربانیاں، دعائیں، اور عبادتیں کرتے رہنا چاہئیے۔

ان دونوں راستوں میں اور کیا فرق ہے؟

ایک بتاتا ہے کہ زندگی نام ہے اپنے اور دیگر ابنار جنس کے ساتھ ہمدردی رکھنے اور ان کیلئے اسباب راحت و سکون فراہم کرنے کا۔

دوسرا کہتا ہے کہ حیاتِ انسانی کا مقصد خداؤں اور دیوتاؤں کی پرستش ہے جو دوسری دنیا میں ہمارے اس تمام عجز و انکسار کا ابدی معاوضہ دیں گے۔ ایک عقل و حقایق پر اعتماد کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور دوسرا صرف عقاید پر بھروسہ کرنے کی۔ ایک کہتا ہے کہ اپنے حواس و ادراک کی اس روشنی سے کام لو جو خود تمھارے اندر پائی جاتی ہے، دوسرا کہتا ہے کہ اس مقدس روشنی کو گل کردو

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید!

اس میں شک نہیں کہ ہمارے اسلاف نے جو کچھ کیا وہ اس سے زاید کچھ نہ کر سکتے تھے ـــــ وہ ایک دق الفطرت قوت پر یقین رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اگر وہ طاعت و عبادت، دعا و قربانی نہ کریں گے تو

نہ بارش وقت پر ہوگی اور نہ ان کی کھیتیاں بار آور ہوں گی۔ وہ یقین کرتے تھے کہ خدا ایک مستبد بادشاہ ہے جس کو ذرا ذراسی بات ناگوار ہوجاتی ہے اور جو برہم ہوکر سزا دینے پر اُتر آتا ہے۔ وہ خدائے خیر کے ساتھ، خدائے شر کے بھی قایل تھے اور انھیں دو خداؤں کے درمیان بیم و رجائی "رعشہ براندام" زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ ان کی حیات کا کوئی لمحہ خوف سے خالی نہ گزرتا تھا اور ہر وقت وہ اسی ڈر سے کانپتے رہتے تھے کہ مبادا کوئی اُن سے خفیف سی خفیف گستاخی سرزد ہوجائے اور خدا ناراض ہوکر انھیں بڑی سی بڑی سزا کا مستوجب قرار دے۔

طوفان آتا تھا تو وہ سمجھتے تھے کہ نتیجہ ہے انھیں کی بداعمالیوں کا، زلزلہ آتا تھا تو وہ یقین کرتے تھے کہ خدا ان پر برہم ہو رہا ہے، وبائی بیماریاں پھیلتی تھیں تو وہ اسے بھی اپنے ہی گناہوں کی پاداش جانتے تھے اور جب چاند سورج کو گرہن لگتا تھا تو اسے بھی اپنی ہی خطاؤں کا نتیجہ باور کرتے تھے ۔۔۔ تمام فضا انھیں فرشتوں یا خبیث روحوں سے معمور نظر آتی تھی اور شب و روز وہ صرف اس لئے الحاح و زاری، کیا کرتے تھے کہ خدا ان سے خفا ہوکر تباہ و برباد نہ کردے۔ قدرت ان کے نزدیک گویا ایک سوتیلی ماں تھی جو پیشانی پر شکنیں ڈالے ہوئے ہر وقت انھیں خونچکاں آنکھوں سے دیکھتی رہتی تھی۔

آخر کار ایک زمانہ آیا جب بعض افراد سوچنے والا دماغ لیکر پیدا ہوئے اور انھوں نے تمام حوادث و واقعات پر غور کرنا شروع کیا۔ انھوں نے سمجھا کہ طوفانوں اور زلزلوں کے اسباب طبیعی کچھ اور ہیں۔ سورج گرہن کے لئے ایک زمانہ معین ہے اور پہلے سے اس کے وقوع کی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے ۔۔ اسی طرح رفتہ رفتہ سیاروں کی گردش، کرۂ زمین کے جغرافی حالات، آب و آتش کے خواص، مظاہر فطرت کے اسباب، حیات انسانی کی خصوصیات، اعضاء جسم کے وظائف معلوم کئے گئے اور واہمہ پرستی کی زنجیر کی کچھ کڑیاں ٹوٹیں۔

اس کے بعد کچھ زمانہ اور گزرا یہاں تک، کہ مدارس کی بنیادیں پڑیں، کتابیں تصنیف کی گئیں، مفکرین کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی، علمی انکشافات نے انسان کے دماغ کو منور کرنا شروع کیا، فکر و خیال کی آزادی بڑھی اور ما فوق الفطرت کی جگہ فطرت اور اصول فطرت نے لیلی۔ پھر روح کے اس احساسِ آزادی کا جو نتیجہ ہونا چاہئے تھا وہ ظاہر ہوکر رہا یعنی اختراع و ایجاد کے دروازے کھل گئے اور ارباب مذہب اپنی اور اپنے اعتقادات کی کمزوری کو دیکھ کر بری طرح جھنجھلانے لگے۔

ظاہر ہے کہ مفکرین کے مقابلہ میں "متقدین" کوئی علمی و عقلی دلیل تو پیش کر نہ سکتے تھے، کیونکہ یہ چیز اُن کی دسترس سے دور تھی، اس لئے وہ اہل علم کے خلاف ملک میں نہایت مکروہ پروپیگنڈا کی اشاعت پر اُتر آئے اور واہمہ پرستی کے پاس جہل و تعصب کے جتنے گندے حربے موجود ہیں، ان سب کا استعمال بیک وقت شروع کردیا گیا۔ ان کو ذریات شیطان بتایا گیا، خدا کا دشمن ظاہر کیا گیا، ان کے مٹا دینے کا نا

مذہبی جہاد قرار پایا اور استعمالِ آتش و زنجیر اور تعذیب و تذلیل کی جتنی مہیب صورتیں ہیں، وہ سب بروئے کار لائی گئیں۔

پھر یہ سب کچھ چند دن کا ہنگامہ نہ تھا، بلکہ خوں آشامیاں صدیوں تک جاری رہیں اور اس سلسلہ میں کوئی جرم ایسا نہ تھا جس کا ارتکاب مذہب کے نام پر جایز و مستحسن نہ قرار دیا گیا ہو۔ ایک فریق کہتا تھا کہ جذبات انسانی کو فنا کر دو اور ضروریات زندگی کو کم، اپنے آپ کو معذور سمجھو اور آسمانی قوت پر اعتماد کامل رکھ کر تمام کام اسی پر چھوڑ دو۔ دوسری جماعت کہتی تھی کہ جذبات انسانی اسی لئے پیدا ہوئی ہیں کہ مناسب حدود میں ان کو تسکین پہونچائی جائے اور ضروریات زندگی کا بڑھانا بھی لازم ہے کیونکہ بغیر ان کے انسان کو اپنی قوتوں کا علم نہیں ہو سکتا اور دنیا میں کوئی ایجاد و اختراع معرض ظہور میں نہیں آ سکتی۔

ایک فریق کا فلسفۂ حیات یہ تھا کہ مال و دولت کو ٹھکرا دیا جائے اور اسباب راحت سے نفرت کی جائے، یہ لوگ فنونِ لطیفہ کے دشمن تھے، اچھی غذا، اچھے لباس، اچھے مکانوں سے متنفر تھے، گویا یوں سمجھئے کہ یہ حکمار تھے غربت و افلاس کے، تشنگی و گرسنگی کے، جھونپڑوں کے، چیتھڑوں کے، برہنہ پائی کے اور ایک ایسے آہستہ رو عمل خودکشی کے جو دفعتًا نہیں بلکہ تدریجًا قوم کی قوم کو ہلاک کر دینے والا ہے۔ ان کو اس دنیا میں سوائے عذاب و مصیبت کے کچھ نظر نہ آتا تھا اور دوسری دنیا ہر قسم کے اسباب و نشاط اور راحت سے معمور دکھائی پڑتی تھی۔ وہ امرار، اصحاب ثروت سے اور تمام ان لوگوں سے جو اپنی قوتِ بازو کی مدد سے راحت و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں نفرت کرتے تھے اور جنت میں سوائے گداگروں اور بھکاریوں کے کسی اور کا درخور محال سمجھتے تھے۔

الغرض یہ تھے وہ لوگ جنھوں نے دنیا کو ویران و غیر دلچسپ رکھنے کے لئے صدہا سال تک جہاد کیا اور کچھ زمانہ تک انھیں کامیابی بھی حاصل رہی، لیکن ذہنی و عقلی آزادی بجائے خود ایسی زبردست لذت ہے کہ ایک بار چکھ لینے کے بعد اس کا چھوڑنا محال ہے، اس لئے اس کا ذوق رفتہ رفتہ عام ہوتا گیا اور ذہن و خیال کی دنیا ہی بالکل بدل گئی۔

چنانچہ اب انسان اس جسم متحرک کا نام نہیں ہے جو ایک وقت معین تک حرکت کرتے رہنے کے بعد فنا ہو جاتا ہے، بلکہ انسان نام ہے قوائے عقل و دماغ کی ترقی کا، حرکت و عمل کا، تحقیق و جستجو کا، اعتماد ذاتی کا اور آسمان سے لیکر زمین تک تمام مناظر قدرت پر چھا کر رہجانے کا اب وہ اس کا قایل نہیں ہے کہ طاعت و عبادت بجائے خود کوئی تقدس و پاکیزگی ہے اور انعام خداوندی کی مستحق، اب وہ یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ جزا و سزا اور مافوق الفطرت قوت سے متعلق ہے بلکہ وہ تقدس کا مفہوم صرف حرکت و عمل کو قرار دیتا ہے

اور یقین کرتا ہے کہ انسان کی دوزخ وجنت خود اسی کے اندر اور اسی دنیا میں موجود ہے، اور اسے اختیار حاصل ہے خواہ وہ مجہول وبیکار زندگی بسر کرکے جہنم میں چلا جائے خواہ سعی ومحنت سے کام لیکر فردوس حاصل کرے۔

یہ اعتقاد کہ بادشاہ کو خدا، بادشاہ بناکر بھیجتا ہے اور رعایا کا کام صرف اس کی اطاعت ہے، اب ختم ہوگیا یہ عقیدہ کہ مذہب خدا کی بنائی ہوئی چیز ہے اور اس کے بتائے ہوئے اُصول وعقاید کو بغیر چون وچرا تسلیم کرنا ہمارا فرض ہے، بہت کچھ مٹ گیا ہے، خدا کے بھیجے ہوئے بادشاہ بھی رفتہ رفتہ فنا ہورہے ہیں اور مذہبی حکومتیں بھی محو ہوتی جارہی ہیں۔

انگلستان میں بجائے خدا کے اب پارلیمنٹ کی حکومت ہے اور امریکہ میں مذہبی اقتدار کی جگہ رائے عامہ نے لیلی ہے، فرانس اپنی آبادی کے سوا کسی اور مافوق الفطرت قوت کو حکومت میں دخل دینے کا مستحق قرار نہیں دیتا اور روس میں سب سے بڑا جُرم خدا اور مذہب کا نام لینا ہے۔ یوروپ میں صرف ایک قیصر ولیم (شاہ جرمنی) ایسا بادشاہ تھا جو اپنے آپ کو فرستادۂ خدا سمجھتا تھا سو گزشتہ جنگ میں وہ بھی ختم ہوگیا۔

انسان آزادی کامل کی اس منزل تک سخت صعوبتیں اُٹھانے کے بعد پہونچا ہے اور استعمال عقل کے استحقاق کو اب اس سے کوئی نہیں چھین سکتا، جسوقت تک وہ اپنی فہم وفراست کو مشعل راہ بنانے سے باز رکھا گیا، بیشک وہ کہہ سکتا تھا کہ اصل نیکی صرف خوف جہنم سے کانپتے رہنا ہے اور حصولِ نجات کے لئے یہی کافی ہے، لیکن جب اس نے دیکھا کہ تنہا یہ عقیدہ نہ اس کے لئے روزی فراہم کرسکتا ہے نہ تن پوشی کے لئے لباس تو اس کی نگاہیں آسمان کی طرف سے زمین کی جانب مایل ہوئیں اور وہ یہ دیکھ کر متعجب ہوا کہ جو لوگ اپنے آپ کو مذہب کا پابند کہتے ہیں وہ بھی اسی کی طرح جُرم ومعصیت کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ سقراط کو جس نے زہر کا پیالہ دیا وہ بھی مذہبی انسان تھا، اور عیسیٰ کو جنھوں نے سولی پر چڑھایا وہ بھی خدا ہی کے ماننے والے تھے اس لئے اس کی روح میں بغاوت پیدا ہوئی اور اس طرح سب سے پہلا جذبۂ انتقاد جو مذہب کے خلاف رونما ہوا وہ خود اہل مذہب ہی کا پیدا کیا ہوا تھا۔

آپ کسی مذہب والے سے دریافت کیجئے وہ سوائے اپنے تمام دنیا کو گمراہ بتائے گا اور اسی خدا کو قابل پرستش قرار دیگا جو اس نے وضع کیا ہے، دوسرے مذاہب واقوام کے خداؤں کو وہ جھوٹ بتائے گا۔ وہ سوائے اپنے معبد کے کسی اور کی پرستش گاہ کی عزت نہ کرے گا، سوائے اپنے طر

عبادت کے وہ کسی اور اصول بندگی کا احترام نہ کرے گا، وہ اپنی قربانیوں کے مقابلہ میں دوسرے مذہب کی قربانیوں کو لغو و بیکار بتائے گا۔ گویا اسی کا خدا خدا ہے اور اسی کا پیغمبر پیغمبر، اسی کی کتاب الہامی صحیفہ ہے اور اسی کی دعائیں مقبول۔

اب خدا کے اس تصور کو دیکھئے جو الہامی مذاہب نے پیش کیا ہے۔ خدا کو قادر مطلق، بے نیاز اور کسی چیز سے متاثر نہ ہو سکنے والا بتایا جاتا ہے لیکن اسی کے ساتھ کتب مقدسہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو غصہ بھی آتا ہے، وہ انتقام بھی لیتا ہے اور اپنے بندوں میں سے ایک کے ساتھ رعایت اور دوسرے کے ساتھ ظلم بھی کر سکتا ہے۔

عدن میں آدم و حوا کو خود ہی پیدا کرتا ہے اور نافرمانی و سرکشی نہیں بلکہ معمولی سی غلطی پر خود ہی اتقدر برہم ہو جاتا ہے کہ عدن سے انھیں اٹھا کر زمین پر پھینک دیتا ہے اور نہ صرف ان کے لئے بلکہ ان کی اولاد کے لئے بھی تمام عمر غم و غصہ میں مبتلا رہنا مقسوم کر دیتا ہے ــــ خدا اور اتنا غصہ! خالق اور اپنی مخلوق پر اتنی برہمی! اگر وہ جانتا تھا کہ ان سے یہ غلطی ضرور ہو گی تو پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور اگر پیدا کیا تھا تو کیا اس کے اختیار میں نہ تھا کہ وہ غلطی نہ کر سکنے والی مخلوق پیدا کرتا۔ خود ہی ان کو پیدا کیا، خود ہی ان میں لغزش کی کیفیت پیدا کی اور خود ہی برہم ہو کر انھیں مبتلائے آلام کر دیا، عجیب تماشہ ہے۔

الہامی صحائف خدا کے غصے اور جنگ و قتال کے احکام سے بھرے پڑے ہیں۔ قوموں کو اس نے برباد کیا، بستیوں کو اس نے ویران کیا، وبائیں اس نے مسلط کیں، آسمانی عذاب اس نے نازل کئے، حالانکہ انسان کی سرکشی یا نافرمانی بھی اسی کی پیدا کی ہوئی چیز تھی اور خود اسی کی مرضی تھی کہ وہ ایسا کرے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب انسانوں کو (جن میں عورتیں اور معصوم بچے بھی شامل تھے) تباہ کرنا ہی مقصود تھا تو ان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور پیدا کیا تھا تو کیا اس کے اختیار میں نہ تھا کہ انھیں معصوم پیدا کرتا۔

ایک بار وہ ساری دنیا کو سوائے آٹھ آدمیوں کے طوفان میں غرق کر دیتا ہے اور تمام زمین کو لاشوں سے پاٹ دیتا ہے، اس کے بعد وہ صرف یہودیوں کو لطف و کرم کا مستحق سمجھتا ہے اور باقی تمام مخلوق کو بغیر کسی سبب کے مردود قرار دیتا ہے۔ نہ وہ اہل مصر کی طرف متوجہ ہوتا ہے نہ اہل ایران کی طرف، نہ اسیریوں کو قابل اعتنا خیال کرتا ہے نہ یونانیوں کو (حالانکہ ان سب کا خالق بھی وہی تھا) اور صدیوں تک صرف ایک فرقہ کا خدا بنا رہتا ہے۔ کیوں؟

خدا ایک قوم کو حکم دیتا ہے کہ وہ دوسری قوم سے جنگ کر کے ان کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو ہلاک کرے اور جو زندہ ہاتھ آجائیں انھیں لونڈی غلام بنائے۔ اس کے علاوہ وہ ادارۂ غلامی قائم

رکھنے کے لئے ان کی خرید و فروخت کی بھی اجازت دیتا ہے، بادشاہوں کے جرائم کے عوض میں رعایا کو ہلاک کرنا مناسب سمجھتا ہے، اور وہ بغیر کسی وجہ کے اپنے بندوں میں سے کسی ایک جماعت سے خوش ہو جاتا ہے اور دوسری سے برہم۔ اس کا سبب؟

حقایق عالم کے لحاظ سے صحف مقدسہ نے جو معلومات انسان کے سامنے پیش کی ہیں، ان کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے۔ زمین کا چپٹا و سطح بتانا، طبقات الارض کا انتہائی درس ہے اور تاروں کو آسمان میں جڑا ہوا ظاہر کرنا فلکیات کا بلند ترین نظریہ۔

صحت و امراض کے متعلق دو نظرئے دنیا میں رائج ہیں، ایک مذہبی، دوسرا علمی، مذہبی نظریہ یہ ہے کہ بیماریاں ارواحِ خبیثہ سے پیدا ہوتی ہیں جو جسم انسانی میں حلول کر جاتی ہیں اور ان ارواحِ خبیثہ کو مذہب کے نفوس مقدسہ ہی دور کر سکتے ہیں۔

جب تک مسیح زندہ رہے ان کی عمر شیاطین و ارواح خبیثہ کے دور کرنے میں بسر ہوئی اور بعد کو ان کے مقدس راہبوں نے صدیوں تک یہ خدمت انجام دی، چنانچہ ازمنۂ وسطیٰ میں لاکھوں کروروں شیاطین اسی طرح بھگائے جاتے رہے اور امراض کا علاج جھاڑ پھونک، دعا تعویذ اور گنڈوں سے ہوتا رہا۔ امراض کے طبیعی اسباب کا کوئی علم نہ تھا، مقدس اہل مذہب دعاؤں کے بہانہ سے ہزاروں روپیہ کماتے تھے (فقیروں کی روزی کا مدار اسی پر ہے)

آخر کار جب علم بڑھا تو آہستہ آہستہ امراض کے طبیعی اسباب کا بھی علم ہوا اور ان کے دور کرنے کی طبیعی تدابیر بھی رائج ہوئیں چنانچہ اسوقت سوائے جاہل ممالک کے جن میں ہندوستان کا مرتبہ سب سے بلند ہے، جنات و شیاطین یا ارواح خبیثہ کا عقیدہ بالکل اُٹھ گیا ہے اور جب کوئی بیمار پڑتا ہے تو بجائے دعا تعویذ کے علاج کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔

مذاہب عالم اور کتب مقدسہ کے متعلق بھی دو خیال ہیں۔ ایک جماعت (اہل مذہب کی) کہتی ہے کہ وہ بالکل الہامی ہیں اور انسانی فکر کو ان میں دخل نہیں، اور دوسری جماعت کہتی ہے کہ صحف مقدسہ سب انسانوں کے دماغ کا نتیجہ ہیں اور مذہب رونما ہوا ہے صرف اس جذبۂ خوف سے جو حوادث طبیعی و مظاہر قدرت کو دیکھ دیکھ کر انسان کے دل میں پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ دنیا میں کوئی قدیم قوم ایسی نہ تھی جس کا کوئی مذہب نہ رہا ہو اور طاعت و عبادت کو اس نے اپنی حفاظت و نجات کا ذریعہ خیال نہ کیا ہو، لیکن رفتہ رفتہ یہ واہمہ پرستی کم ہوتی گئی،

یہاں تک کہ اب ہر ذی فہم انسان جانتا ہے کہ دنیا میں ہر واقعہ کا ایک فطری سبب ہوا کرتا ہے اور قدرت بغیر اس خیال کے کہ انسان کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں اپنے کام میں مصروف ہے۔

اب منکرین اچھی طرح واقف ہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب خود انسانوں نے وضع کئے تھے اور خدا و الہام خداوندی سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا، جن کتابوں کو وہ الہامی کہتے ہیں وہ بھی انسان ہی کے دماغ کا نتیجہ تھیں اور اسی لئے ہر قوم و زمانہ کے لحاظ سے ان میں مختلف خیالات و تعلیمات پائی جاتی ہیں۔ نہ خدا کو طاعت وعبادت کی ضرورت ہے اور نہ وہ کسی کی دعا سنتا ہے، اہل دنیا پر ہزاروں مرتبہ قحط و وبا، طوفان و سیلاب کی مصیبتیں نازل ہوئیں اور کوئی دعا انھیں دور نہ کرسکی۔ زلزلے آتے رہے، جوالامکھی آگ برساتے رہے، ہزاروں معصوم نفوس فنا ہوتے رہے اور انسان کی کسی گریہ وزاری نے خدا کو اس ہلاکت باری سے باز نہ رکھا۔ کھیتیاں سوکھتی رہیں اور انسانوں کی دعائیں ایک قطرہ پانی کا نہ حاصل کرسکیں، وبائیں پھیلتی رہیں اور خدا کے نام پر لکھے ہوئے تعویذ کسی ایک متنفس کو بھی ہلاکت سے نہ بچا سکے، غلاموں کی پیٹھ کوڑوں سے لہولہان ہوتی رہی، عورتوں کی عصمت دری کو علی الاعلان جایز رکھا گیا، شیر خوار بچے ماؤں کی آغوش سے چھین چھین کر بازاروں میں فروخت کئے گئے، اور ان کی فریاد و زاری ایک لمحہ کے لئے خدا کو متوجہ نہ کرسکی کہ وہ ظالم بادشاہوں کی حکومت کے بجائے آسمانی بادشاہت قایم کرتا۔

اخلاقیات کے باب میں اہل مذہب کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا نے جس فعل سے باز رکھا ہے وہی بُرا ہے اور جس کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ اچھا ہے، خود بندہ کو اس کا کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ خود کسی فعل کے مستحسن یا قبیح ہونے پر رائے زنی کرے، گویا مذہبی انسان کسی اچھے کام کو خود اچھا سمجھ کر انجام نہیں دیتا بلکہ فرمان خداوندی کی تعمیل سمجھ کر اس کو اختیار کرتا اور صرف اس خوف سے کہ مبادا خدا برہم ہوجائے اور اسے عذاب میں مبتلا کرے۔

تقریباً تمام اہل مذہب کا عقیدہ ہے کہ ایک انسان اچھے اخلاق کا ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ وجود خدا کا قایل نہ ہو اور اگر کسی میں یہ صفت پائی بھی جائے تو بغیر خدا کو مانے ہوئے وہ بالکل بیکار ہے۔

علماء اخلاقیات کا نظریہ یہ ہے کہ نیکی و بدی اشیاء کی فطرت میں موجود ہے۔ بعض افعال ایسے ہیں جو انسانی مسرت کا باعث ہوتے ہیں اور بعض آزار و مصائب کا سبب بن جاتے ہیں، چنانچہ اول الذکر افعال کو ہم اخلاق حسنہ کہتے ہیں اور موخرالذکر کو افعال قبیحہ یا معصیت سے تعبیر کرتے ہیں۔

اخلاق انسانی کا تعلق اسی دنیا سے ہے اور یہیں ان کے نتائج دیکھ کر ان کے بُرے یا اچھے ہونے کا اصول قایم کیا گیا ہے، نہ خدا ان سے متاثر ہوتا ہے اور نہ دوسری دنیا میں ان کا محاسبہ کرکے جزا و سزا دینے کی ضرورت

چوری کو بُرا سمجھنے کے لئے کسی الہام کی ضرورت نہ تھی انسان کے تجربہ نے اس کے نقصانات دیکھ کر خود اسے بُرا قرار دیا۔ تمام وہ جرائم جو انسان کو جسمانی، اقتصادی و عمرانی نقصان پہونچاتے ہیں، ان سے اپنے آپ کو محفوظ رہنے کا احساس ہر شخص میں فطری طور پر پایا جاتا ہے اور یہی وہ احساس تھا جس نے اسے بتایا کہ نیکی کسے کہتے ہیں اور بدی کس کو۔

پھر جو چیز اس لحاظ سے بُری ہے وہ یقیناً بُری سمجھی جائے گی خواہ مذہب کے نزدیک اچھی ہو۔ واقعات و تاثرات کو کوئی قوت نہیں بدل سکتی، جس طرح قدرت ایک مربع کو دایرہ ثابت کرنے سے عاجز ہے اسی طرح وہ کسی بُری بات کو اچھی اور اچھی کو بُری نہیں بنا سکتی۔

الغرض اہل مذہب نے جو نظریہ اخلاق قایم کیا ہے اس پر ایک انسان کبھی فخر نہیں کر سکتا، ایک شخص نیک کام کرتا ہے صرف اس ڈر سے کہ خدا کا حکم ہے اور اس طمع سے کہ اس کا انعام دوسری دنیا میں ملیگا، دوسرا اچھے اخلاق اختیار کرتا ہے صرف اس بنا پر کہ یہ اس کا انسانی فرض ہے اور نیکی آپ اپنی جزا ہے اور دونوں کے فرق کو ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے۔

الغرض اسوقت دو راستے ہمارے سامنے ہیں۔ ایک وہ جو مذہب کی طرف ہم کو لیجاتا ہے اور دوسرا وہ جو عقل کی طرف رہبری کرتا ہے۔ سر اول الذکر کا تجربہ بہت کافی ہو چکا ہے اور ہمیشہ اس کا نتیجہ ایک ہی نکلا ہے۔

فلسطین میں اس کا تجربہ کیا گیا لیکن اہل فلسطین کی مذہبیت ان کو تباہ و برباد ہونے سے نہ بچا سکی، وہ مفتوح و مغلوب ہو کر خارج البلد کئے گئے، صدیوں تک امداد خداوندی کا انتظار کرتے رہے اور اس توقع پر زندہ رہے کہ خدا انھیں پھر جمع کرے گا، ان کی بستیوں، ان کے معبدوں اور قربانگاہوں کو از سرِ نو تعمیر کرے گا، لیکن صدیوں پر صدیاں گزرتی گئیں اور ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔

اس کا تجربہ سوٹزرلینڈ میں کیا گیا لیکن وہاں بھی سوائے غلامی کے اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، ترقی کی تمام راہیں مسدود کر دی گئیں، اور صرف انھیں لوگوں کو آزادی سے بولنے کا حق حاصل رہا جو صاحب جاہ و ثروت تھے۔ عوام سے ان کی معصوم مسرتیں چھین لی گئیں، ان کے لئے ہنسنا ممنوع قرار پایا، اور سوائے رنجِ غلامی کے کچھ نہ ملا۔ ان لوگوں نے اوراد و وظائف، روزہ و صلوۃ، وعظ و پند سبھی کو آزما کر دیکھ لیا لیکن کوئی چیز انھیں مسرت و راحت سے آشنا نہ کر سکی۔

اسکاٹ لینڈ میں بھی مذہب کا تجربہ ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کی ماننے والی تمام آبادی کو خوش قسمت

لیکن ظالم گرگوں کا غلام بنکر رہنا پڑا - پادری ہر خاندان میں گھس جاتے تھے اور خوف و اوہام پرستی پھیلا پھیلا کر لوگوں کی عقلیں سلب کر رہے تھے، وہ اپنی ہدایات کو الہام ربانی کہتے تھے اور ان سے انحراف کرنے والے کو عذاب خداوندی کا مستوجب قرار دیتے تھے - پھر اس مذہبی حکومت میں بھی وہی ہوا جو ہونا چاہیئے - انسان غلام تھا اور غلامی کے ناقابل برداشت بار سے اس کی پیٹھ جھکی جا رہی تھی -

انگلستان میں مذہبی حکومت نے جو گل کھلائے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں - اس زمانہ کے قانون اس زمانہ کے اوہام و تعصبات اس قدر سخت تھے کہ خدا کی پناہ - پادری خدا کے بیٹے بنے ہوئے آسمان و زمین کی ملکیت کا دعویٰ کر رہے تھے، بہشت و دوزخ کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں تھیں اور جس کو جہاں جی چاہتا تھا ڈھکیل دیتے تھے، نہ ان کے دلوں میں رحم تھا، نہ آنکھوں میں مروت، ادنیٰ ادنیٰ سی غلطیوں پر خارج البلد کر دینا، کوڑے لگوانا اور قید و بند میں ڈال دینا معمولی بات تھی -

ازمنۂ ظلمہ میں مذہبی زندگی کا جو نتیجہ ہوا وہ اور زیادہ ہادم انسانیت تھا - ہزاروں سولیاں ہر وقت خون سے تر رہتی تھیں اور بیشمار تلواریں انسانی سینے میں پیوست - قید خانے کھچا کھچ بھرے رہتے تھے اور سیکڑوں انسان دہکتی ہوئی آگ کے اندر پڑے ہوئے تڑپا کرتے تھے - کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو خدا کے نام پر روا نہ رکھا گیا ہو اور کوئی معصیت ایسی نہ تھی جس کا ارتکاب مذہب کے پردہ میں نہ ہوتا ہو - الغرض یہ تھا مذہبی حکومتوں کا رنگ جو اہل مذہب نے دنیا کے سامنے پیش کیا -

اب اس کے مقابلہ میں اُس راستہ کو دیکھو جس کی رہنمائی عقل نے کی ہے - کیا صاف و ہموار راستہ ہے - کیسی کھلی ہوئی فضا ہے، کیسی پُر بہار زمین ہے، ہر شخص دوسرے کا بوجھ ہلکا کرنے کی فکر میں ہے اور ہر دماغ اسی فکر میں ہے کہ وہ بنی نوع انسان کی راحت و مسرت کا سامان بہم پہونچائے - نہ وہاں سولیاں ہیں، نہ قید خانے، نہ جہنم کے اژدہے ہیں نہ فرشتوں کے کوڑے - قدرت کی وسیع فضا ہے جس سے ہر شخص یکساں فایدہ اُٹھا رہا ہے، عقل و فراست کا ایک آفتاب ہے جو سب کو برابر مستفیض کرنا چاہتا ہے، انسانیت کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، غلامی کا داغ اشرف المخلوقات کی پیشانی سے مٹ چکا ہے، ذہنی آزادی نے مختلف قسم کے چمن کھلا رکھے ہیں اور ہر فرد دوسرے سے ہم آغوش و بغلگیر نظر آتا ہے -

جس وقت میں تاریک ماضی کی طرف دیکھتا ہوں، تو میرا ریشہ ریشہ کانپ اٹھتا ہے - سب سے پہلے مجھے وہ تنگ و تاریک غار نظر آتے ہیں، جہاں مقدس اژدہے کنڈلیاں مارے ہوئے قربانیوں کا انتظار کر رہے ہیں ان کے جبڑے کھلے ہوئے ہیں، ان کی زبانیں باہر نکلی ہوئی ہیں، آنکھیں چمک رہی ہیں اور زہریلے دانت خون آلود - جاہل ماں باپ اپنے معصوم بچوں کو اس انھی دیوتا کے حضور میں پیش کرتے ہیں، وہ اس

چیختے تڑپتے ہوئے بچہ کو اپنے بل میں لپیٹ کر پیس ڈالتا ہے اور بے رحم والدین اس ہدیہ کے قبول ہونے پر خوش خوش واپس جاتے ہیں ـــــ اس کے بعد مجھے وہ عبادتگاہیں نظر آتی ہیں جن کو بڑے بڑے پتھروں سے طیار کیا گیا ہے ۔ لیکن یہاں ان کی قربانگاہیں بھی خون سے رنگین ہیں اور مقدس پجاریوں کے خنجر معصوم لڑکیوں کے سینوں میں یہاں بھی پیوست نظر آتے ہیں ۔ اس کے بعد کچھ اور معبد سامنے آتے ہیں جہاں مقدس آگ کی روشنی کو انسانی گوشت و خون سے قایم رکھا جاتا ہے ۔ پھر چند عبادتگاہیں اور دکھائی دیتی ہیں جن کی قربانگاہیں بیلوں اور بھیڑیوں کے خون سے تر ہیں ـــــ اس کے بعد ہی مجھے کچھ اور معبد، کچھ اور پجاری کچھ اور قربانگاہیں نظر آتی ہیں، جہاں انسانی آزادی کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے ۔ خدا کے معبد تو نہایت عظیم الشان ہیں لیکن کسانوں کے پاس جھونپڑا تک نہیں، پجاریوں اور بادشاہوں کے جسم زرکار عباؤں سے آراستہ ہیں لیکن رعایا کے پاس جسم ڈھانکنے کو بوسیدہ سا چیتھڑا بھی نہیں ـــ اور کیا دیکھتا ہوں ؟ ـــ یہ کہ ۔ قید خانے انسانوں سے بھرے ہوئے ہیں، خارج البلد خاناں برباد بوڑھے، بچے، عورتیں پہاڑوں اور صحراؤں میں سر ٹکرا رہی ہیں ۔ آلات تعذیب حرکت میں آرہے ہیں اور لاکھوں انسانوں کی چیخ سے خانقاہیں گونج رہی ہیں ـــ اُف، وہ تاریک قید خانے، وہ زنجیروں کی جھنکار، وہ آگ کے بلند شعلے، وہ جھلسے ہوئے سیاہ چہرے، وہ اینٹھنے والے اعضاء وہ شکنجوں میں کسے ہوئے ہزاروں معصوم انسان اور وہ ان کے رگوں کے ٹوٹنے کی آوازیں ـــ اس کے بعد جو میری نگاہ اُٹھتی ہے تو افق میں مجھے ایک نئی روشنی نظر آتی ہے، انسانی جسموں کی راکھ کے ڈھیر سے ایک نیا آفتاب طلوع کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے، یعنی عقل و مذہب آزادی و غلامی کی جنگ جاری ہے اور آہستہ آہستہ زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں، قربانگاہیں فنا ہوتی جاتی ہیں، عبادتگاہیں مسمار ہو رہی ہیں، زبان کی بندشیں اُٹھتی جاتی ہیں، اور ذہن و عقل کے قفل ٹوٹتے جا رہے ہیں، ـــ اب میں پھر دیکھتا ہوں، لیکن ماضی کی طرف نہیں بلکہ مستقبل کی طرف اور فرط مسرت سے اُچھل پڑتا ہوں ۔ اس وقت مجھے کیا نظر آتا ہے ۔ یہ کہ :- پجاری اور بادشاہ ختم ہو چکے ہیں، قربانگاہیں اور تخت و تاج خاک میں مل چکے ہیں، امارتیں نیست و نابود ہو چکی ہیں اور تمام دیوتا مفقود ـــ ان کی جگہ ایک نیا مذہب رونما ہوا ہے، جس کا نام آزادی ضمیر ہے اور ایک نئی سلطنت قایم ہوئی ہے جس کی ملکہ حریت فکر و رائے اور جس کی رعایا اخوت عامہ ہے ۔ ہر جگہ امن و سکون ہے اور ہر شخص مطمئن ۔ نہ کوئی قید خانہ ہے، نہ بیمارستان، نہ عدالت گاہیں ہیں نہ جرم و معاصی کی داستان ۔ ایک ایسی دنیا ہے جہاں سوائے صداقت کے کسی چیز کا گزر نہیں، سوائے حسن و جمال کے کوئی شے پیش نظر نہیں ـــ جدھر دیکھو نور کی بارش ہے اور انسانی دماغ کی کھیتیاں لہلہا رہی ہیں ۔ عقبیٰ کا خوف دنیا کی مسرتوں میں تبدیل ہو چکا ہے اور خدا کا ڈر انسانیت کی تعمیر میں ۔

دوافروش کی بیوی

بؔی ــ کا مختصر سا قصبہ جو دو یا تین پیچیدہ سڑکوں پر مشتمل تھا گہری نیند سو رہا تھا۔ ہوا بالکل ساکت تھی کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ لیکن شہر سے دور، بہت دور، البتہ، کتوں کے بھونکنے کی مدہم مگر خوفناک آواز آرہی تھی۔ پَو پھٹنے کے قریب تھی۔

ساری دنیا غافل سو رہی تھی۔ وہ تنہا ہستی جو ابتک بیدار تھی، ڈاکٹر ٹلکر نوسٹک، کی بیوی تھی جس نے بؔی۔ میں دوافروشی کی دوکان کھول رکھی تھی، وہ بستر پر سوجانے کی ناکام کوشش کررہی تھی اور تین دفعہ کچھ دیر سو کر بیدار ہوگئی تھی۔ وہ حیران تھی کہ آخر اس بے خوابی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ شب خوابی کے کپڑے پہنے کھلی کھڑکی سے سڑک کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اُس کی روح مضمحل، افسردہ، اور غمگین تھی، اتنی مغموم کہ اُس کا دل بے اختیار چیخ اُٹھنے کو چاہتا تھا۔ اور اب بھی وہ اس اضمحلال کا سبب سمجھنے سے قاصر تھی۔ اُس کے دل پر ایک بوجھ سا معلوم ہوتا تھا جو بتدریج حلق کیجانب بڑھ رہا تھا۔۔۔۔ اور اُس کے پیچھے کی جانب کچھ ہی فاصلہ پر ٹلکر نوسٹک دیوار کے قریب پاؤں پھیلائے خراٹے لے رہا تھا۔ ایک لالچی پسو اُس کی ناک کی نوک پر نیش زنی کررہا تھا مگر اُسے حس تک نہ تھی۔ وہ خواب کی حالت میں بھی مسکرارہا تھا۔ شاید وہ اسوقت یہ خواب دیکھ رہا ہو کہ شہر کے ہر فرد کو کھانسی ہوگئی ہے اور ہر شخص اُسکی دوکان سے "شاہ ڈنمارک کی کھانسی کے قطرے" خرید رہا ہے۔ وہ اب سوئی چبھونے سے بھی جاگ نہیں سکتا تھا۔

دوافروش کی دوکان، شہر کے انتہائی سرے پر واقع تھی، اس لئے دوافروش کی بیوی کھیتوں کی طرف دور دور تک دیکھ سکتی تھی۔

یکایک، رات کی خاموشی میں قدموں کی چاپ اور آہستہ آہستہ بات کرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ آواز قریب تر ہوتی گئی ــ "یقینی، یہ افسران ہیں جو اپنے گھروں سے خیمے کی طرف جارہے ہیں۔" دوافروش کی بیوی نے دل میں سوچا۔

اس کے بعد دو شکلیں، افسروں کی سفید وردی میں ملبوس نظر پڑیں۔ ایک دراز قد اور فربہ، دوسرا نحیف اور پستہ قد۔ قدم اُٹھاتے اور بلند آواز سے گفتگو کرتے ہوئے وہ دوکان کی سمت چل پڑے۔ جب وہ دوافروش کی دوکان کے قریب پہونچے تو انھوں نے اپنی چال بالکل آہستہ کر دی اور کھڑکی کی جانب دیکھنے لگے۔

"معلوم ہوتا ہے یہاں پر دوافروش کی دوکان ہے" نحیف شخص نے کہا۔

"اور یہ بالکل صحیح ہے!" "آہ! مجھے یاد ہے میں گزشتہ ہفتہ یہاں ایک دوا لینے آیا تھا۔ یہاں ایک ژولیدہ مُو اور بھدے جسم کا دوافروش رہتا ہے"

"ہاں، درست ہے" دراز قد نے ہلکی آواز میں کہا۔ دوافروش سو رہا ہے اور اسکی بیوی بھی سو رہی ہوگی۔ او تبٹکو، وہ بڑے دلکش خد و خال کی عورت ہے"

"میں نے اُسے دیکھا ہے۔ وہ بیحد حسین ہے۔ ڈاکٹر مجھے بتاؤ کیا وہ اُس گدھے سے محبت کر سکتی ہو؟"

"نہیں، یقیناً وہ اس سے محبت نہ کرتی ہوگی" ڈاکٹر نے یہ کہکر اس طرح سانس لی جیسے اُسے دوافروش سے بیحد ہمدردی ہو۔ "کھڑکی کے قریب وہ نازک اندام حسینہ، خواب نوشیں کے مزے لے رہی ہوگی۔ کیوں؟ اس کا ننھا سا دہانہ کھلا ہوگا۔۔۔ اور ایک نازک پاؤں پلنگ کے نیچے پڑا ہوگا۔ مجھے دعویٰ ہے کہ وہ بے وقوف دوافروش اس حقیقت سے بیخبر ہے کہ وہ کس درجہ خوش نصیب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک حسین عورت اور ایک بوتل تیزاب میں اُسے کوئی امتیاز نہیں"

"میں کہتا ہوں ڈاکٹر" افسر نے رکتے ہوئے کہا۔ "ہم دوکان میں چل کر کوئی چیز خریدیں۔ شاید اسی بہانہ سے ہم اُسے دیکھ سکیں"

"کیا بات کہی۔ ہے ۔۔۔ شب میں؟"

"اس سے کیا ہوتا ہے چلو اندر چلیں"۔

"جیسی تمھاری مرضی"

دوافروش کی بیوی نے پردے کی اوٹ سے گھنٹی کی آواز سُنی۔ شوہر کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے، جو پہلے کی طرح مسکرا رہا تھا اور خراٹے لے رہا تھا، اُس نے اپنا لباس پہنا، اپنے ننگے پیروں کو جوتوں میں چھپایا، اور دوکان کی طرف بھاگی۔ شیشے کے دروازے کی دوسری جانب اُسے دو سائے نظر پڑے اُس نے جلدی سے روشنی کی اور دروازہ کھولنے کے لئے آگے بڑھی، اور اب ۔۔۔۔ نہ وہ افسردہ تھی

غمگین اور نہ اب اس کا جی چلانے کو چاہتا تھا، مگر دل ضرور دھڑک رہا تھا۔ دراز قد ڈاکٹر اور پستہ قد اوبسٹکو اندر داخل ہوئے۔ اب وہ انہیں بجلی کی روشنی میں صاف دیکھ سکتی تھی۔ ڈاکٹر، توانا تنومند اور قوی الجثہ تھا۔ اس کے داڑھی تھی اور وہ آہستہ رو تھا۔ ذری سی جنبش میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی پتلون پھٹ جائے گی اور اس کی پیشانی پر پسینہ آجاتا تھا۔ افسر، سرخ رو، داڑھی منڈا، نازک اور انگریزی بید کی طرح لچیلا تھا۔

"میں آپ کو کیا پیش کروں؟" دوا فروش کی بیوی نے اپنے سینے پر پڑے ہوئے لباس کو درست کرتے ہوئے پوچھا۔

"دیدیجئے ۔۔۔ ار ۔۔۔ ار ۔۔۔ چار پنس کی پیپر منٹ کی گولیاں"

تیزی سے دوا فروش کی بیوی نے طاق سے بکس اتارا اور گولیاں تولنے لگی۔ ڈاکٹر نے ایک آسودہ بلی کی طرح اس پر نظریں جمالیں لیکن اس کے برعکس، لفٹنٹ اسے برابر خاموشی سے دیکھتا رہا۔

"یہ پہلا موقعہ ہے کہ میں نے ایک خاتون کو ایک دوا فروش کی دوکان میں کام کرتے دیکھا ہے" ڈاکٹر نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے" دوا فروش کی بیوی نے سرخ رو افسر کی طرف گوشۂ چشم سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے شوہر کا کوئی مددگار نہیں ہے اور میں ہمیشہ اس کا ہاتھ بٹاتی ہوں"

"بالکل صحیح۔ تمہاری چھوٹی سی دوکان نہایت عمدہ ہے! کتنی بوتلیں ہیں۔ اور تمہیں ان زہروں کے درمیان پھرتے ڈر نہیں معلوم ہوتا؟ کمال ہے!"

دوا فروش کی بیوی نے پڑیا کو تہہ کیا اور ڈاکٹر کے حوالہ کی۔ اوبسٹکو نے قیمت ادا کی۔ آدھ منٹ تک خاموشی مسلط رہی۔ مردوں نے تبادلۂ نگاہ کیا، دروازے کی جانب ایک قدم بڑھایا، اور پھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"براہ کرم کیا آپ دو پنس کا سوڈا بھی دے سکتی ہیں؟" ڈاکٹر بولا۔ پھر دوا فروش کی بیوی نے آہستگی اور خاموشی سے اپنا ہاتھ طاق کی طرف بڑھایا۔

"کیا آپ کی دوکان میں کوئی چیز مثلاً ۔۔۔۔ اوبسٹکو اپنی انگلی ہلاتے ہوئے بڑبڑایا۔ کوئی چیز نشہ آور ۔۔۔۔ فرحت بخش ۔۔۔۔ ہے؟"

"ہاں!" دوا فروش کی بیوی بولی۔

"خوب! تم عورت نہیں پھلواہو۔ تین بوتلیں لاؤ"

دوا فروش کی بیوی نے آہستہ سے سوڈے کی پڑیا کو تہ کیا اور دروازہ کی راہ سے تاریکی میں گُم ہوگئی"
ایک منٹ بعد دوا فروش کی بیوی آئی اور اُس نے پانچ بوتلیں کھڑکی پر رکھدیں۔ اُسکے رُخسارے تمتمائے ہوئے اور سُرخ تھے۔

اوبشکو بوتل کا کاگ کھول کر اُس کے ڈھکنے کو الگ رکھتے ہوئے بولا، "دو اتنا شور نہ کرو تمھارا میاں جاگ اُٹھے گا"

"دو تمھیں کیا، اگر میں اُسے بیدار کردوں ؟"

"وہ کیسی میٹھی نیند سو رہا ہے۔ وہ تمھارے خواب دیکھ رہا ہوگا تمھاری تندرستی کے!
ڈاکٹر سوئے ہوئے پانی کا ایک گھونٹ لے کر بولا۔

"شوہر ایسی لغو چیز ہوتے ہیں کہ وہ ہمیشہ سوتے رہیں تو اچھا"

"اس پانی میں گلابی شراب کا ایک قطرہ کیا لطف دے جاتا"

"کیا بہتر خیال ہے" — دوا فروش کی بیوی ہنسی۔

"بہت خوب ہوتا! کیا قہر ہے کہ دوا فروش شراب نہیں بیچتے۔ حالانکہ دوا کی طرح تمھیں شراب بھی فروخت کرنی چاہئے۔ کیا تمھارے یہاں کوئی شراب ہے ؟"

"ہاں !"

"تو تھوڑی سی لاؤ۔ لاؤ، جلدی کرو!"

"تمھیں کتنی چاہئے"

"نہیں ایک اونس پانی میں ملاکر دو پھر دیکھا جائے گا"

ڈاکٹر اور اوبشکو کھڑکی کے قریب اپنی ٹوپیاں اُتار کر بیٹھ گئے اور شراب کا دور چلنا شروع ہوا۔
شراب ہر شخص تسلیم کرے گا، بہت بُری چیز ہے، گو اس کا مزہ انگور کی طرح ہوتا ہے۔

—"تم بڑی دلکش ہو خاتون! میں تصور میں تمھارے ہاتھ کا بوسہ لے رہا ہوں"

— میں اسے حقیقت میں منتقل کرنے کے لئے ایک بڑا سرمایہ خرچ کرنے کے لئے طیار ہوں بلکہ زندگی قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کروں گا"

"یہ بہت ہے!" بیگم ٹکرنوٹیک نے لجاتے اور سنجیدہ صورت بناتے ہوئے کہا۔

"تم کیسی نادان ہو" ڈاکٹر اُس کے سراپا پر ایک نگاہ پسندیدگی ڈالتے ہوئے نرمی سے ہنسا "تمھاری آنکھیں چنگاریاں برسا رہی ہیں! میں تمھیں مبارکباد دیتا ہوں کہ تمنے میری روح پر فتح حاصل کرلی

اور ہم مفتوح ہو گئے ''

دوافروش کی بیوی نے اُن کے سرخ بھبھوکے چہرے کو دیکھا، ان کی گرمجوش اور محبت بھری باتوں کو سنا، اور وہ بھی زندہ دلی اور نرمی سے بولنے لگی۔ وہ کتنی مسرور تھی! اس کی زندگی کی ابتدا دو ہی ساعت پہلے ہوئی تھی! ان کی باتوں میں وہ بھی دلچسپی لینے لگی، ہنسی، لجائی اور ان کے مکرر اصرار پر دو جام پی گئی آخر وہ بولی۔

"آپ حضرات میرے یہاں کبھی کبھی ضرور تشریف لایا کریں۔ میری زندگی اس جگہ بیحد سرد اور بے لطف گزرتی ہے۔ میں تو اس زندگی کے ہاتھوں ایک دن مرجاؤں گی"

"میں آپ کی تجویز پر غور کروں گا" ڈاکٹر نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "فطرت کا شاہکار یوں بے وقعتی کے ہاتھوں تباہ ہو رہا ہے! اب ہمیں چلنا چاہیے۔ آپ کی شناسائی سے مسرت ہوئی، بیحد۔ آپ کو کیا دام چاہئیے۔

دوافروش کی بیوی نے اپنی بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں چھت کی طرف اُٹھائیں اور اس کے لب کچھ دیر جنبش میں رہے۔

"بارہ روبل اڑتالیس کوپیک" اس نے آہستہ سے کہا۔

ابشلکو نے اپنی موٹی تھیلی نکالی اور نوٹوں کو کچھ دیر گننے کے بعد رقم ادا کر دی۔

تمھارا شوہر میٹھی نیند سو رہا ہے۔ وہ خواب دیکھ رہا ہوگا" وہ بڑبڑایا اور چلتے وقت اسکے ہاتھوں کو دبایا۔

"میں ایسی باتیں سننا پسند نہیں کرتی"

"کونسی باتیں! اس کے برخلاف یہ کوئی بری بات نہیں۔ شکسپیر نے کہا ہے: "شاد ہے وہ جو اپنے عہد شباب میں بھی نوجوان ہے"

"میرا ہاتھ چھوڑ دے"

آخر، بہت دیر باتیں کرنے کے بعد اور خاتون کے ہاتھوں کا الوداعی بوسہ لیکر خریدار دوکان سے بلا ارادہ چل کھڑے ہوئے۔ گویا وہ حیران تھے کہ وہ کوئی چیز تو نہیں بھول آئے۔

وہ تیزی سے سونے کے کمرے کی طرف گئی اور اسی جگہ بیٹھ گئی۔ اُس نے ڈاکٹر اور افسر کو دوکان سے نکلنے کے بعد سست قدموں سے جاتے دیکھا۔ اس کے بعد وہ ٹھہر گئے اور سرگوشیاں کرنے لگے۔ لیکن کس چیز کے متعلق؟ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کی پلکیں پھڑکنے لگیں لیکن کیوں؟ یہ اسے خبر نہ تھی۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے ان کی سرگوشیاں اُس کی قسمت کا فیصلہ کر رہی ہوں

پانچ منٹ بعد، ڈاکٹر اشلکو سے جدا ہو کر چلا گیا اور اشلکو واپس لوٹا۔ وہ دوکان سے ہو کر ایکبار پھر گزرا۔

دروازے کے قریب رک جاتا اور پھر آگے کی طرف بڑھ جاتا۔ آخر، گھنٹی کی مدہم آواز سنائی دی۔ "کیا ہے، وہاں کون ہے؟" دوافروش کی بیوی نے دفعتاً اپنے شوہر کی آواز سنی۔ "دروازہ پر گھنٹی بج رہی ہے اور تمہیں خبر نہیں" ... اس نے سختی سے کہا۔ "کیا اسی طرح کام چلتا ہے؟" وہ اُٹھا اپنی پوشاک پہنی اور نیم بیداری کی حالت میں سلیپر پہنا، جھومتا ہوا دوکان کی طرف چلا۔ "کیا ہے؟" اُس نے اسٹکو سے پوچھا۔

"دیدیجئے... دیدیجئے... چارپنس کی پیپرمنٹ کی گولیاں"

مسلسل خرخراتے، جمائی لیتے ہوئے، غنودگی کے عالم میں دوافروش طاق تک گیا اور ڈبہ اٹھایا۔

دو منٹ بعد، دوافروش کی بیوی نے اسٹکو کو دوکان سے باہر جاتے اور کچھ دور چل کر پیپرمنٹ کی پڑیا گردوغبار سے اٹی ہوئی سڑک پر پھینکتے دیکھا۔ ڈاکٹر تاریکی سے نکل کر اُس سے ملنے آیا...... وہ ملے اور قہقہا لگاتے ہوئے صبح کے دھندلکے میں روپوش ہو گئے۔

"میں کس درجہ افسردہ ہوں" دوافروش کی بیوی اپنے شوہر کو غصہ سے دیکھکر بولی۔

"میں چارپنس کھڑکی پر بھول آیا ہوں" دوافروش چادر تانتے ہوئے بڑبڑایا۔ "اسے اُٹھا کر صندوقچہ میں رکھدینا" اور فوراً ہی پھر سوگیا۔

(روسی افسانہ) ابوالفتح سرمد

بہار

ضیاء بدایونی اور مومن

(بسلسلۂ ماسبق)

ترے بال لاکر سونگھائے کہیں　　　کہ غش ہوگئے چارہ فرمائے غش

شارح:- "شاید میرے غش کا علاج کرنے والوں نے علاج کی خاطر مجھے تیرے بال سونگھائے جو خود اُن کی خوشبو سے بے ہوش ہوگئے۔"

صحیح ہے۔ مگر شعر میں دو نازک خیالیاں ہیں۔ ایک یہ کہ "غش ہوگئے" فریفتہ ہوگئے کے معنی میں مستعمل ہے اور دوسرے یہ کہ اغیار ہماری طرح نفیس طبع نازک دماغ نہ تھے لہذا اُنکو خوشبو سے غش آگیا۔[1]

افلاس سے کھایا کئے غم سبز خطوں کا　　　افسوس کہیں زہر بھی ہم کو نہ ملا قرض

شارح:- "سبز خطوں اور زہر (جس کے کھانے سے رنگ سبز ہوجاتا ہے) کی مناسبت ظاہر ہے۔ افلاس کی وجہ سے غم کھانے میں بھی لطافت ہے۔"

حسینوں نے افلاس کی بدولت منھ نہ لگایا۔ غم کھایا کئے۔ زہر بھی قرض نہ ملا کہ اسے کھا لیتے اور قصہ پاک ہوجاتا۔[2]

تھا ربط غیر میں مرے مرنے کا انتظار　　　اسے شوخ بیوفا تو وفادار ہے غلط

شارح:- "لوگ کہتے ہیں معشوق مومن کے ساتھ وفادار ہے۔ اس لئے کہ جب تک مومن نہ مرگیا۔ اس نے رقیب کے ساتھ ربط ضبط نہ رکھا۔ شاعر کہتا ہے یہ قول غلط ہے۔ اس لئے کہ وفاداری کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ رقیب سے کبھی نہ ملتا۔"

---

[1] (نگار) ان دونوں نازک خیالیوں کے صرف کرنے کی ضرورت یہاں نہیں ہے۔ مومن نے لفظ "کہیں" یہاں "شاید" یا "غالباً" کے معنے میں استعمال کیا ہے۔

[2] (نگار) معلوم نہیں ہوتا کہ معترض کو اس شرح میں کیا اعتراض ہے علاوہ اس کے افلاس کی بدولت منھ نہ لگانے کا مفہوم پیدا کرنا بھی مومن کے مقصود کے خلاف ہے۔

لوگوں کے کہنے کا کوئی قرینہ شعر میں موجود نہیں ہے۔ خطاب محبوب سے ہے۔ بیوفائی کا ثبوت یہ ہے کہ وہ شاعر کے مرنے کے بعد اغیار سے ربط رکھتا ہے گویا اس کے لئے وہ اس کی مرگ کا منتظر تھا۔ غیر سے بھی بیوفائی اس لئے ثابت ہے کہ ربط میں تا حیات شاعر التوا رہا۔[۱]

ڈر مری آہ سے ظالم نہ جلا جی کہ نہیں یہ جہنم سے تو کم شعلہ فشاں اے واعظ

شارح :- "تو جہنم سے ڈر کر میرا جی جلاتا ہے۔ مگر میری آہ سے نہیں ڈرتا یہ بھی جہنم سے کم نہیں۔"

میری رائے میں یہ شعر بلاغت کا بہترین نمونہ ہے۔ واعظ (اپنے زعم میں عشق کو ہوس کاری مان کر) جہنم کا خوف دلا کر عشق سے مانع ہے۔ یہ سنکر شاعر کا جی جلتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ جہنم سے زیادہ شعلہ فشاں آہ جو ہم نے قبول کر رکھی ہے۔ تو ایسا عاشق ہو سنا کیونکر ہو سکتا ہے۔ پھر ہم کو جہنم کا ڈر کیا۔ "میری آہ سے ڈر" کا خطاب ظالم سے ہے۔ یعنی اس آہ سے ڈرایا جاتا ہے جو مظلوم کے دل سے نکلے۔ اس شعر کے طرز ادا نے آہ کو بالفعل موجود ظاہر کیا ہے۔ یعنی وہ آہ جو سوز عشق کا حاصل ہے۔ موجود ہے۔ کہیں تیرے جی جلانے سے تجھ پر نہ پڑ جائے۔[۲]

محفل فروز تھی تب و تاب نہانِ شمع پروانہ جل گیا کہ نہیں راز دانِ شمع

شارح :- "شمع کے سوز نہاں نے محفل کو روشن کر دیا۔ چونکہ پروانہ شمع کا راز داں نہ تھا۔ اس لئے جل گیا۔ ورنہ وہ بھی اس کی روشنی سے متمتع ہوتا۔"

پروانہ (آتش رشک سے) جل گیا کہ جلوۂ محبوب اغیار کے لئے کیوں وقف ہے۔ یوں کہیئے کہ راز داں نہ ہونے کی سزا میں جلگیا کہ وہ شمع کو محفل فروز سمجھا۔ حالانکہ تب و تاب نہاں محفل فروز تھی۔ شمع، محبت کی آگ میں خود جل رہی تھی۔ محفل فروزی شمع کیا تھی۔ عشق کا شعلۂ سرکش جو حسن کے پیرہن میں مخفی

---

[۱] (نگار) یقیناً شارح مفہوم کو پوری طرح ظاہر کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ لیکن معترض نے اپنے ایراد میں جو ٹکڑا غیر سے بیوفائی کا بڑھایا ہے وہ بھی درست نہیں ہے۔

[۲] (نگار) شارح اور مقالہ نگار دونوں نے مفہوم کے اظہار میں غلطی کی ہے اس شعر کا صاف مطلب یہ ہے کہ مومن واعظ سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ تو جو مجھے ترک محبت کی نصیحت کرتا ہے تو کیا تجھے میری آہ کا ڈر نہیں جو شعلہ فشانی میں جہنم کے برابر ہے۔ یعنی اگر اس تیری نصیحت پر ایک آہ بھی منہ سے نکل گئی تو جل کر خاک سیاہ ہو جائے گا۔

نہ رہ سکا اور اس صورت سے جلوہ گر ہوا[۱]

پروانے کیوں نہ صدقہ ہوں اس آگ کے کہ ہے　　　ہر رشتۂ فتیلۂ زخم جگر چراغ

شارح :۔ "سوزش دروں کی وجہ سے میرے زخم جگر کی بتی کا ہر ڈورا چراغ کا حکم رکھتا ہے۔ پھر پروانہ اس پر کیوں نہ صدقہ ہوں۔ فتیلہ۔ بتی۔ یہاں وہ بتی جو زخم میں رکھی جائے مراد ہے"۔

یہاں اس قدر کہنا ضرور تھا کہ پروانہ سے کنایتاً عشاق مراد ہیں اور اس آگ سے مراد عشق ہے عشاق آتش عشق پر فریفتہ ہیں۔ مٹے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ زخم جگر کی ہر بتی کا رشتہ سوزِ دروں کی برکت سے چراغ کی طرح روشن ہوتا ہے[۲]

چھوڑا نہ لالہ زار میں ساتھ اُس نے غیر کا　　　ہر چند سینہ چیر کے میں نے دکھائے داغ

شارح :۔ "وہ لالہ زار میں غیر کے ہمراہ مصروف گلگشت رہا۔ ہر چند میں نے سینہ چیر کے داغہائے رشک دکھائے۔ داغ اور لالہ زار کی رعایت ملحوظ رکھی ہے"۔

یعنی غیر کے مقابل خود کو پیش کیا۔ اور لالہ زار کے مقابل داغہائے دل کو۔ اصل مراد داغ عشق ہے۔ اور ضمناً داغ رشک بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے[۳]

مجلس میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف　　　دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف

شارح :۔ "معشوق پہلے اغیار کو دیکھ کر مجھ کو دیکھتا ہے۔ اور اس کا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ میں رشک کی وجہ سے اس (معشوق) کی طرف دیکھنا چھوڑ دوں"۔

رشک مانع دید نہیں۔ ہاں اغیار کا متوجہ ہو جانا مانع دید ہو سکتا ہے[۴]

---

[۱] (نگار) شارح کا بتایا ہوا مفہوم بالکل درست ہے۔ معترض اس شعر کو بالکل نہیں سمجھے۔
[۲] (نگار) یہاں پروانے سے مراد پروانے ہی ہیں، عشاق نہیں۔ معترض کی تاویل نادرست ہے۔
[۳] (نگار) اس میں بھی معترض نے خواہ مخواہ اپچ کی لی ہے غیر کے مقابل خود کو پیش کرنے کا یہاں کوئی سوال نہیں ہے۔
[۴] (نگار) شارح نے صحیح مفہوم ظاہر کیا ہے۔

شب ہجر و روز وصال کی تری شوخیاں جو نظر میں تھیں کہوں کیا تغیر حال دل کبھی تھا سکوں کبھی تھا قلق

شارح :- "ہجر میں تیری شوخیاں جو نظر میں تھیں - اس لئے دل کو قلق ہوتا تھا - اور چونکہ وصال کی یاد دل میں تھی اس لئے سکون ہوجاتا تھا"

محض شوخی کی یاد سے قلق ہونا عجیب ہے اور وصال کی یاد سے سکون ہوجانا عجیب تر ہجر کی شب روز وصل کی شوخیاں (یعنی کبھی التفات کبھی ملال - کبھی بعد کبھی اتصال) میری نظر میں تھیں - اس لئے دل کا حال بھی متغیر تھا - کبھی سکون تھا - کبھی قلق - قلق ہجر ظاہر ہے - اور سکون کی وجہ یہ کہ خیال ہوتا تھا کہ ہجر ہجر نہیں ہے - یہ ایک عارضی شوخی ایسی ہی ہے، جس طرح وصل میں جدا ہو بیٹھتے تھے[۱]

آفت جاں ہے کوئی پردہ نشیں کہ مرے دل میں آ چھپا ہے عشق

شارح :- "میرے دل میں عشق چھپا ہے - یہ اس امر کی شہادت ہے - کہ کسی پردہ نشیں کی بدولت میری جان پر آفت آئی ہے"

پہلا مصرع ایک دعوی تھا - مولنا نے دوسرے مصرع کو دعوی قرار دیا - اور پھر دعوی کو بجائے خود جان پر آفت آنے کا ثبوت قرار دیا - مطلب یہ ہے کہ کوئی پردہ نشیں آفت جاں ہے - اس لئے عشق میرے دل میں آ چھپا ہو[۲]

دیکھ حالت مری کہیں کافر نام دوزخ کا کیوں دھرا ہے عشق

شارح :- "کافر میری حالت دیکھکر کہتے ہیں کہ یہ عشق نہیں عذاب دوزخ ہے، یعنی دوزخ میں اتنا ہی عذاب ہو جتنا مومن کو عشق میں ہے"

کافر حشر و نشر جنت دوزخ کے منکر ہیں، علاوہ اس کے شعر کا انداز بیان بھی ایسا نہیں جس سے یہ مفہوم لیا جائے کہ کافر بھی دوزخ کے قایل ہوکر ایسا کہہ اٹھتے ہیں - مولنا نے "کہیں" کو فعل سمجھا مفہوم یہ ہے کہ :- او کافر (معشوق) کہیں میری حالت زار دیکھ - میری یہ حالت تو عذاب دوزخ ہے - اسکا نام عشق و عاشقی کیوں رکھا ہے[۳]

۱؎ (نگار) دونوں نے غلطی کی ہے، شوخیوں کا تعلق صرف روز وصال سے ہے، شب ہجر سے نہیں - اس شعر میں لف و نشر غیر مرتب ہے اور صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہجر و وصال کی دو مختلف کیفیات (سکون و قلق کی) مجھ پر طاری تھیں۔

۲؎ (نگار) ایراد بالکل غلط ہے — ۳؎ (نگار) معترض کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ کافر حشر و نشر، دوزخ و جنت کے قایل نہیں ہیں - تمام غیر مسلم اہل مذاہب اس چیز کے قایل ہیں - لیکن یہ بالکل درست ہے کہ شارح نے اس کا مفہوم غلط سمجھا معترض نے جو مطلب بیان کیا ہے وہ درست ہے -

جرم معلوم ہے زلیخا کا طعنۂ دست نارسا کب تک

شارح :۔ " زلیخا نے حضرت یوسف کے دامن پر ہاتھ بڑھایا۔ مگر رسائی میسر نہ ہوئی۔ شاعر کہتا ہے کہ تم جو زلیخا کا جرم جرم پکارتے ہو۔ ہمیں سب معلوم ہے۔ (یعنی کوئی جرم نہ تھا) اصل میں تم اس کو اس بات کا طعنہ دیتے ہو کہ اُس کا ہاتھ دامن یوسف تک رسا نہ ہو سکا"

زلیخا کا ہاتھ دامن یوسف تک رسا نہ ہونا صحیح نہیں " قدت قمیصہ " کی شہادت اس کے خلاف ہے یہ بھی خیال میں نہیں آتا کہ زلیخا کی وکالت حضرت مومن کیوں کرتے ہیں زلیخا کا جرم عشاق کی نظر میں جرم ہی نہ تھا، سو مومن کہتا ہے کہ تمھیں حقیقتاً زلیخا کو ادب عشق سے بیگانہ کہنا مقصود نہیں۔ بلکہ تم طنزاً اُس کو مجرم کہتے ہو۔ مدعا ہم کو دست نارسا کا طعنہ دینا ہے [۱]

دیکھئے خاک میں ملاتی ہے نگہ چشم سرمہ سا کب تک

شارح :۔ " سرمہ اور خاک کی مناسبت ظاہر ہے۔ ملاتی۔ ملاتی رہے گی"۔

جی نہیں۔ " ملاتی ہے " کے معنی یہ ہیں کہ کس وقت ملائے گی یعنی ہم آرزومند ہیں کہ ملائے [۲]

کہا کرتے تھے بیتابی کو بے تاثیر اکثر ہم نہیں پاتے اثر اپنا یہ غیرت کا اثر دیکھا

شارح :۔ " ہم اپنی بیتابی کو بے اثر کہا کرتے تھے۔ آخر بیتابی کو غیرت آگئی۔ اور اس نے یہ اثر دکھایا کہ ہمارا ہی (اثر فنا ہو) باقی نہ رہا یعنی بے تابی نے تاثیر تو دکھائی مگر وہ ہمارے خلاف پڑی"۔

شاعر نے یہ نہیں کہا تھا کہ بیتابی نے اپنا اثر دکھایا۔ وہ غیرت کا اثر بیان کرتا ہے۔ تخیل یہ ہے کہ ہم خود بیتابی کو اکثر بے اثر کہتے تھے۔ اب محبوب نے بے اثر کہا ہم غیرت سے مٹ گئے [۳]

---

[۱] (نگار) زلیخا کے ہاتھ کا دامن یوسف تک رسا ہونا کامیابی کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے اس لئے یہ اعتراض کہ یوسف کے دامن تک زلیخا کا ہاتھ پہونچ کر اس میں چاک پیدا کر چکا تھا درست نہیں ہو سکتا۔ تاہم شارح کا یہ کہنا کہ معشوق زلیخا کو اس کا طعنہ دیتا ہے درست نہیں، مفہوم یہی ہے کہ وہ بظاہر ذکر تو زلیخا کا کرتا ہے لیکن مقصود مومن کی سعی ناکام پر طنز کرتا ہے۔

[۲] (نگار) شارح نے یقیناً غلطی کی ہے اور معترض نے مفہوم کو صحیح سمجھا ہے۔

[۳] (نگار) محبوب کا بیتابی کو بے اثر کہنا اور پھر غیرت سے عاشق کا مٹ جانا شعر سے ظاہر نہیں۔ مفہوم صرف اتنا ہے کہ ہم اپنی بیتابی پر بے اثر ہونے کا الزام لگایا کرتے تھے آخر کار اسے غیرت آہی گئی اور ہمیں مٹا کر رکھدیا۔

قیس شوخ اب کیونکہ دعوی ملک وحشت کا کرے مُہرِ محضر ہو گیا نقشِ سمِ آ ہو ہمیں

شارح :۔ "اس شعر میں "شوخ" بمعنی محبوب قیاس کیا ہے اور منادے قرار دیا ہے"

حالانکہ شوخ، قیس کی صفت ہے۔ مقصود یہ کہنا ہے کہ قیس نے شوخ چشمی سے دعوائے وحشت کیا تھا اگر وہ دعوی ہمارے عہد میں نہیں چل سکتا۔[۵۱]

چشم وا نے نابینا کر دیا جدائی میں کوئی آنکھ لگتی ہے خواب وصل کیا دیکھیں

شارح :۔ "ہجر میں انتظار کی بدولت عاشق کی آنکھیں کھلے کھلے بصارت سے معذور ہوگئیں۔ اس کی نئی توجیہہ یوں کرتا ہے کہ انتظار میں آنکھ تو لگتی نہیں۔ اور جب آنکھ نہیں لگتی تو خواب وصل کیونکر نظر آئے اور جسکو کوئی چیز نظر نہ آئے (خواہ وہ خواب ہی کیوں نہو) وہ لازماً نابینا ہی کہلائے گا اس میں ندرت یہ ہے کہ چشم وا کی طرف نابینائی کو منسوب کیا گیا"

اگر مولانا یہ فرماتے کہ آنکھ کا عرصہ تک کھلا رہنا نابینائی کا سبب ہے۔ یا عرصہ تک آنکھ کھلے رہنے کا سبب جدائی میں انتظار ہے تو صحیح تھا۔ لیکن نابینائی کی یہ توجیہہ کہ خواب نظر نہیں آیا۔ بہت عجیب ہے اور یہ بات کہ جس کو کوئی چیز خواہ وہ خواب ہی کیوں نہ ہو نظر نہ آئے لازماً نابینا کہلائیگا، سمجھ میں نہیں آتی۔[۵۲]

اتنی بھی تاب دوری خورشید طلعتاں نقصاں کیا کمال سے آیا ہے ماہ میں

شارح :۔ "چاند کمال کی حالت میں خورشید سے دور تر ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد ناقص ہونا شروع ہوتا ہے شاعر کہتا ہے خورشید طلعتوں (حسینوں) کی اتنی جدائی بھی اچھی نہیں دیکھو چاند کا کمال اس کے لئے نقصان کا موجب ہے۔ مصرع ثانی بطور تمثیل ہے"

جب حالت کمال میں ماہ خورشید سے دور تر ہوتا ہے۔ تو حالت نقصان میں یقیناً مقابلۃً قریب ہوا۔ پھر گزشتہ کمال کو نقص کی علت کیوں کہیں۔ قرب ہی نقصان ماہ کی علت قریبہ ہے۔ لہٰذا حسینوں سے دوری اچھی۔

دوری سے بُعد مکانی مراد نہیں ہے۔ ہجر مراد ہے۔ چاند کامل ہوتا ہے۔ جب زمین شعاع مہر

---

۵۱ (نگار) میری رائے میں بھی شوخ کو منادی قرار دینا درست نہیں۔

۵۲ (نگار) شارح نے بالکل صحیح سمجھا ہے، اور معترض کا اعتراض درست نہیں۔

کے لئے قطعاً حاجب نہو۔ اس حالت کمال میں ہجر بدستور ہے۔ اتصال نہیں۔ لہذا چاند کی چمک دمک بحالت کمال باوجود عدم اتصال شاعر کی نظر میں عین نقص ہے۔ وہ کہتا ہے۔ اس قدر تاب دوری عجیب ہے کہ ماہ بحالتِ عدم اتصال مہر۔ کاہیدہ و زار و نزار نہیں ہے [۵۱]

پردہ نشیں کے عشق میں پردہ دری نہو کہیں ہوتی ہیں بے حجابیاں جانِ نہفتہ راز میں

شارح :- "جانِ نہفتہ راز۔ جان جس کا راز مخفی ہے۔ میری جان پردۂ راز سے نکل کر بے حجاب ہو رہی ہے۔ اور میں مر رہا ہوں۔ اس حالت میں اگر کوئی اندیشہ ہے تو یہ کہ کہیں پردہ نشین کا رازِ عشق افشا نہو جائے"۔

ہم نے کسی جان کو پردۂ راز سے نکلا ہوا بےحجاب نہیں دیکھا۔ خیریت ہے مولانا نے "ہو رہی ہے" کہا اگر ہو گئی کہتے تو ہم مومن کی جان کو دیکھنے عدم آباد جاتے۔ یہ بھی نہیں کہا ہے کہ میں افشائے راز کے اندیشہ سے مر رہا ہوں۔ اور "مر رہا ہوں" حقیقی معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ موت کا شعر میں کہیں ذکر نہیں ہے۔ نہ موت جان کی پردہ در ہو سکتی ہے۔ شعر میں بجائے "جانِ نہفتہ راز" کے "حالِ نہفتہ راز" ہے اور اس طرح مطلب صاف ہو جاتا ہے [۵۲]

درد بے درماں مرامنت کشِ مرہم نہیں داغ نو ہے چارۂ داغ کہن کی فکر میں

شارح :- "میں جب داغ کہن کے علاج کی فکر کرتا ہوں تو ایک نیا داغ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ میرا لاعلاج مرض محتاج مرہم نہیں"

میں علاج کی فکر کرتا ہوں شعر میں نہیں ہے۔ فکر علاج سے جدید داغ پیدا ہونا بھی غلط ہے مرض کا لاعلاج کہنا بھی شاعر کا مقصود اصلی نہیں ہے۔ شاعر یہ کہتا ہے کہ داغ نو داغ کہن کا علاج ہے۔ میرا دردِ بے درماں مرہم کا احسان مند نہیں ہے۔ مدعا یہ ہے کہ نو بنو آلام و افکار گزشتہ غم کو خود بھلاتے رہتے ہیں۔ صائب نے اس مضمون کو ایک جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے۔

داغ است ہماں مرہم داغے کہ کہن شد ہم نقش قدم محو کند نقش قدم را [۵۳]

---

۵۱ (نگار) غور طلب یہ ہے کہ لفظ کیا مومن نے کس معنے میں استعمال کیا ہے یعنی یہ محل استفسار ہے یا محل استعجاب میری رائے میں یہاں محل استعجاب میں استعمال کیا گیا ہے اور مفہوم یہ ہے کہ ماہ کامل کا نقصان اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اس حالت میں خورشید سے بعید تر فاصلہ پر واقع ہے ۔ ۵۲ (نگار) معترض نے اعتراض تو کر دیا لیکن خود کوئی مفہوم نہ بتایا۔ میری رائے میں یہاں "جان نہفتہ راز" ہی ہے اور جان کو حال سمجھنا درست نہیں۔ دوسرے مصرعہ میں مومن نے یقیناً اپنی مرگ کی طرف اس اندیشہ کا اشارہ کیا ہے اور مقصود یہ ہے کہ میری موت کسی پردہ نشیں کی عشق کی پردہ دری نہ کرے ۔ ۵۳ (نگار) شارح نے اس شعر کا مفہوم سمجھنے میں واقعی غلطی کی ہے اور مقالہ نگار کا اعتراض درست ہے مفہوم دونوں درست ہیں۔

بس کہ بن آئے مرگئے ہم شبِ انتظار میں　　　دن جو رہے تھے عمر کے جیتے رہے مزار میں

شارح :۔ "چونکہ ہم بن موت آئے قبل از وقت شبِ انتظار میں مرگئے تھے۔ اس لئے عمر کے باقی دن جو رہ گئے تھے قبر میں کاٹنے پڑے "

"بن آئے مرنے"۔ سے حقیقتاً مرجانا مراد نہ تھا۔ نہ مزار میں جیتے رہنے کا مدعا واقعی تربت میں سانسیں پوری کرنا تھا۔ پہلے مصرع میں شبِ انتظار کی زندگی کو موت کہا ہے۔ اور دوسرے میں ایام مابعد کو تہ مزار جلنے سے تعبیر کیا ہے[۱]

کشتۂ یار ہوں اس رشک سے مرتا ہے جہاں　　　وہ بھی کیا ہیں جو مری موت کا غم کرتے ہیں

شارح :۔ "وہ لوگ بھی عجیب قسم کے ہیں جو میرے مرنے کا غم کرتے ہیں۔ کیونکہ انھیں در اصل یہ میرا غم نہیں بلکہ یہ رشک ہے کہ یہ (مومن) کشتۂ یار ہوا ہم کیوں نہوئے "

غم کرنے والوں کو غم نہیں رشک ہے شاعر نے نہ کہا تھا۔ مولنا "جہاں" سے منطقی طور پر غم کرنے والوں کو مستثنٰی نہ کر سکے۔ شاعر کی غرض یہ تھی کہ چند افراد کے سوا سارا عالم میری موت پر غم کرتا ہے اور یہ چند حضرات غم کرنے والے عجیب مٹی کے بنے ہوئے ہیں کہ میری موت پر رو تے ہیں[۲]

دشمن سے ہے چشم مہربانی　　　محروم نگاہ آشنا ہوں

شارح :۔ "چشم بمعنی توقع۔ آشنا سے محبوب مراد ہے"

دشمن سے محبوب مراد ہے۔ اور نگاہِ آشنا سے نگاہِ باخبر[۳]

شبِ وصل اسکے تغافل کی زہر تاب نہیں　　　تلخی مرگ ہے آنکھوں میں شکر خواب نہیں

---

[۱] (نگار) شارح نے مطلب صحیح سمجھا ہے۔

[۲] (نگار) شارح اور معترض دونوں نے غلطی کی ہے۔ مومن کا مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے، میرا کشتۂ یار ہونا ایسا واقعہ ہے جو سارے جہاں کیلئے باعث رشک ہے اس لئے مجھے حیرت ہے ان پر جو میرے مرنے کا غم کر رہے ہیں حالانکہ انھیں بھی صرف رشک کرنا چاہئے۔

[۳] (نگار) مطلب کسی نے بیان نہیں کیا۔ مدعا یہ کہنا ہے کہ نگاہِ آشنا سے میری محرومی اب اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ دشمن سے اب اس کی توقع رکھنے لگا ہوں۔

شارح :۔ "مجھے شب وصل یہ بھی گوارا نہیں کہ ذرا دیر کو بھی محبوب مجھ سے غافل ہو۔ اگر ایسا ہو تو میرے لئے پیام موت
ہے۔ اس لحاظ سے شب وصل اُس کی آنکھوں میں جو نیند آرہی ہے اس کے لئے شکر خواب ہو مگر میرے
حق میں تلخیٔ مرگ ہے کہ اتنی دیر وہ مجھ سے غافل رہے گا۔ یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ میری آنکھوں میں جو
شکر خواب وصل کا اثر ہے در اصل میرے لئے تلخیٔ مرگ کا حکم رکھتا ہے۔ کیونکہ اتنی دیر بھی محبوب سے غفلت
مجھ کو گوارا نہیں مگر اس صورت میں مصرع اول میں " اس سے تغافل" ہونا چاہئے"

مجھے دونوں معنے سے اتفاق نہیں۔ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ وصل کی شب اس کے غفلت برتنے کی مجھے تاب
نہیں۔ وصل کی شب جو بظاہر میں میٹھی نیند سو جاتا ہوں۔ یہ حقیقتاً تلخیٔ مرگ ہے[1]

سرفروشوں کے اگر آپ خریدار ہوئے تو گراں ہوویگی وہ جنس جو کمیاب نہیں

شارح :۔ " یعنی اس صورت میں یہ جنس کم ارز گراں قیمت ہو جائے گی"

جنس سے مراد سرفروش نہیں ہو سکتے۔ شاعر کبھی یہ نہیں کہنا چاہتا کہ سرفروش جانباز عشاق ہزاروں ہیں
کمیاب نہیں۔ مصرعہ ثانی میں صاف " وہ جنس جو کمیاب نہیں" کہا ہے، جنس سے مراد ہوس ہے یعنی اہلِ ہوس
مراد ہیں جن کی جانب التفات ہے اور وہ کمیاب نہیں ہیں اگر سرفروشوں کی خریداری دربارِ حسن میں ہوئی تو اہلِ
ہوس مٹ جائیں گے یعنی جو چیز کمیاب نہیں ہے وہ گراں قیمت ہو جائے گی[2]

لذت بغیر جاندہی مردگاں محال آب بقا فشردهٔ دامانِ تر نہو

شارح :۔ آب حیات سے مردوں میں جان آتی ہے۔ مگر جب تک آب حیات میں لذت نہو گی جاں بخشی کا اثر ہوتا
معلوم۔ اس سے ثابت ہوا کہ اس میں لذت ضرور ہے۔ اب چونکہ شاعر کے نزدیک تمام لذتوں کا سرچشمہ
دامانِ تر ہے۔ اس لئے قیاس چاہتا ہے کہ آبِ حیات دامان تر کا نچوڑ ہے اور اسی لئے اُس میں اسقدر مزہ
ہے۔ دامانِ تر۔ (دامن گناہ آلودہ) سے لذت کا تعلق بدیہی ہے"

آب حیات کا اثر زندوں کو موت سے محفوظ رکھنا سنا گیا ہے۔ نہ کہ مردوں کا زندہ کرنا۔ یہاں جاندہی سے جان
دینا یعنی جان فدا کرنا مراد ہے۔ یعنی آبِ حیات کی تمنا میں جنھوں نے جان دی ہے ان کا جان دینا اس کا ثبوت
ہے کہ آبِ حیات فشردهٔ دامانِ تر ہوگا۔ لذت گناہ ظاہر ہے[3]

---

[1] (نگار) شارح کا مطلب درست ہے۔ [2] (نگار) شارح نے واقعی صحیح مطلب نہیں سمجھا۔

[3] (نگار) مقالہ نگار کی توجیہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میرے نزدیک شارح نے مفہوم صحیح سمجھا ہے۔

یارب کوئی معشوقۂ دلجو نہ ملے اب　　جو اُن کی دعا ہے وہی اپنی بھی دعا ہے

شارح :- " دعا دونوں کی ایک ہے مگر نیت مختلف، معشوق عاشق سے ناراض ہو کر دعا کر رہا ہے - اور عاشق عشق سے بیزار ہو کر "

دلجوئی - دلدہی اور طلب دل کے معنی میں ہے - دونوں معنی شاعر نے ملحوظ رکھے ہیں ان کی دعا بمعنی اول اور اپنی دعا بمعنی ثانی ہے۔ عشق سے بیزاری کا ذکر کہیں نہیں ہے [۵۱]

توبہ گنہ عشق سے فرمائے ہے واعظ　　یہ بھی کہیں دل دیکھئے گنہگار ہوا ہے

شارح :- " مراد یہ ہے کہ اگر واعظ گنہگار نہ ہوتا تو توبہ کیوں کرتا فرمائے ہے طنزاً استعمال کیا ہے "

میری رائے میں معنی یہ ہیں کہ واعظ ہمیں گناہ عشق سے توبہ کا حکم دیتا ہے۔ کیا کبھی اس نے بھی گناہ عشق کیا ہے (یعنی نہیں کیا ہے) اگر گناہ عشق واعظ سے سرزد ہوتا - تو جانتا کہ عشق سے توبہ امکانی نہیں ہے - اگر مصرع ثانی کو جملہ خبریہ مانا جائے تو بھی یہ معنی ہوتے ہیں کہ گناہ عشق کے نتائج دیکھ کر ہمیں ہدایت کرتا ہے مگر پہلے معنی لطیف تر ہیں [۵۲]

سمجھ کے اور ہی کچھ مر چلا میں اے ناصح　　کہا جو تو نے نہیں جان جا کے آنے کی

شارح :- ناصح نے سمجھایا کہ جان جا کر آنے والی نہیں جس سے اس کی مراد یہ تھی کہ عمر چند روزہ کو مغتنم سمجھو اور عمل خیر کی طرف توجہ کرو عاشق اپنی خوش فہمی سے یہ سمجھا کہ جب زندگی کا اعتبار نہیں تو جہاں تک ہو سکے کاروبار عاشقی سے غافل نہ رہنا چاہئے - مر چلا - مرنے لگا عشق کرنے لگا "

میری رائے میں شاعر نے " جان " سے محبوب کی ذات مراد لی اور جدائی میں یہ خیال کر اب نہ ملیں گے۔ قیامت ہوگیا [۵۳]

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے　　فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہونگے

شارح :- " سوختہ ساماں = بے سروساماں - گل شمع شبستاں = شمع کا شانہ کا گل - ہم سوختہ ساماں جب زمین میں دفن ہونگے - تو ہماری سوختہ سامانی کے اثر سے ماہی زمیں کے سینے بھی گل شمع کی طرح جلنے لگیں گے یا گل شمع کا کام دینگے "

یہ شعر تکلف و تصنع سے خالی نہیں ہے - میرے خیال میں فلس ماہی کا جل اُٹھنا شاعر کا مقصود نہیں ہے۔

---

۵۱ (نگار) مطلب وہی ہے جو شارح نے ظاہر کیا ہے اور مقالہ نگار کا یہ خیال کہ دلجوئی یہاں طلب دل کا بھی مفہوم پیدا کرتی ہے - درست نہیں

۵۲ (نگار) فارسی میں توبہ کردن اور توبہ فرمودن دونوں جدا جدا مفہوم میں مستعمل ہیں - اول الذکر توبہ کرنے کے معنے میں آتا ہے اور موخر الذکر توبہ کی تعلیم دینے کے معنے میں آتا ہے ذیل کے مصرعہ میں ان دونوں کا فرق ملاحظہ ہو - توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند - اس لئے شارح کا مفہوم یقیناً صحیح نہیں ہے - ۵۳ (نگار) مقالہ نگار نے صحیح سمجھا ہے -

وہ یہ کہتا ہے کہ ہم سوختہ ساماں بعد دفن فلس ماہی کی شبستاں میں گل شمع ہو جائیں گے ۔ آتش موجب تنویر ہے ۔ اور جل بجھنا ہم بے سامانوں کی تقدیر ۔ لہذا گل شمع ہوں گے ۔ اور ماہی کے شبستاں میں نہیں بلکہ فلس ماہی کے شبستاں میں ۔ فلس ماہی خود سراپا داغ ہے ۔ اس کے لئے شبستاں اور شمع فرض کر کے اپنے سوختہ ساماں وجود کو گل شمع کہا ہے۔[۱]

مجھ کو مارا مرے حال متغیر نے کہ ہے ۔۔۔ کچھ گماں اور ہی دھڑکے سے دل مونس کے

شارح " مونس سے ہمدم یا ہمنشیں مراد ہے ۔ میرا حال دگرگوں (متغیر) دیکھ کر ہمدم کا دل دھڑکتا ہے ۔ اور مجھے اور ہی کچھ گمان ہے (یعنی اب نہ بچوں گا) اس حال متغیر نے مجھے تباہ کر دیا ۔ نہ یہ ہوتا نہ ہمدم کا دل دھڑکتا اور نہ مجھے بدگمانی ہوتی ۔ لطف یہ ہے کہ عاشق کو خود اپنی حالت کا احساس نہیں ۔ ہمدم کا حال دیکھ کر سکہ اندیشہ ہوا"

اگر درحقیقت میں حال دگرگوں ہو تو ضرور یہ اندیشہ ہو سکتا ہے کہ اب نہ بچوں گا مگر عاشق اس اندیشہ سے فارغ ہے گماں یہ ہے کہ ہمدم کی نظر میں اب میرا مداوا ممکن نہیں ۔ یا یہ کہ ہمدم کا دل میرے لئے کیوں دھڑکتا کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ خود محبوب پر فریفتہ ہو گیا ہو۔[۲]

ناتوانی سے نزاکت ہے زیاد ۔۔۔ مجھسے تو دامن چھڑانا چھوڑ دے

شارح : " تو نازک ہے میں ناتواں ۔ پھر بھی میں اس قدر ناتواں نہیں کہ تو مجھسے اپنا دامن چھڑا سکے ۔"

شاعر کہتا ہے کہ نزاکت کو ناتوانی پر یقیناً فوقیت حاصل ہے اس لئے تو مجھ سے دامن نہ چھڑا کہ یہ بات ثابت ہو جائے[۳]

کس طرح مایوس ہوں تاثیر سے ۔۔۔ دم رکے ہے نالۂ شبگیر سے

شارح :- "نالۂ شبگیر (پچھلے پہر کا نالہ) سے سانس رکنے لگتی ہے ۔ او رنالہ لب پر نہیں آتا ۔ اگر لب پر آئے اور تاثیر نہ ہو ۔ تب مایوسی کا موقع ہے"

۱؎ (نگار) شارح کا مفہوم صحیح ہے اور مقالہ نگار کی تاویل بالکل دور از کار ۔

۲؎ (نگار) شارح نے مفہوم صحیح سمجھا ہے ۔

۳؎ (نگار) شارح مومن کے مدعا تک نہ پہونچ سکے ۔ شاعر صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ مقابلۃً معشوق کی نزاکت عاشق کی ناتوانی سے بڑھی ہوئی ہے اس لئے اگر اس نے دامن چھڑا لیا تو یہ نزاکت کے منافی ہو گا ۔

نالہ کا لب پر نہ آنا شعر میں کہاں ہے۔ دم کا رکنا اس کو مستلزم نہیں۔ کہ نالہ لب تک نہ آئے۔ اور اگر نالہ لب پر نہیں آتا تو تاثیر کیا ہوگی۔ پھر مایوسی کیوں نہیں ؟
شاعر کہتا ہے نالہ سے دم رکتا ہے۔ یعنی دم رکنا نالہ کا اثر ہے۔ پھر تاثیر سے مایوس کیوں ہو۔[۵۱]

لے گیا ہے پشت خم شاید تری شمشیر سے　　کام ہوتے ہیں جوانوں کے سپہر پیر سے

شارح :- "آسمان پیر ہے اور اُس کی پشت خم ہے۔ مگر اس کے باوجود جوانوں کے سے کام کرتا ہے۔ شاید تری شمشیر خمیدہ سے پشت مستعار لے گیا ہے۔ جو یہ حال ہے۔ یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اسکے ہاتھوں سے جوانوں کے کام تمام ہوتے ہیں۔"
شمشیر کا لفظ چاہتا ہے کہ کام سے ستمگری مراد ہو۔ اس کے سوا یوں بھی آسمان جفا کاری میں بدنام ہے شرح میں صرف یہ : کہنا تھا کہ جوانوں کے سے کام کرتا ہے۔ پشت مستعار لے جانا بھی کوئی ٹھکانے کی بات نہیں۔ پشت کچھ ذریعہ ستم نہیں۔ پہلے مصرع میں "کام ہوتے ہیں جوانوں کے" اس کے یہ معنی ہیں کہ جوانوں کے کام تمام ہوتے ہیں۔ طریقہ گزارش سے مستنبط نہیں ہو سکے۔
پشت خم کردن۔ پشت دوتا کردن۔ عاجزی، فروتنی کرنا ہے۔ شاعر نے اس اصطلاح کا ترجمہ کیا ہے۔ یا ترجمہ بالفاظ موزوں نہ ہوا۔ یا کاتب نے کچھ اصلاح کی یا ممکن ہے پشت خم از کسے بُردن بھی اس معنی میں مستعمل ہو۔ معنی بہرحال یہی ہیں کہ آسمان نے غالباً تمھاری شمشیر کے سامنے پشت دوتا کی ہو کہ ستم شعاری میں باوجود خمیدہ پشت ہونے کے جوانوں کی طرح مشاق ہے۔[۵۲]

تنویر قادری

---

[۵۱] (نگار) ہو سکتا ہے کہ مومن کا مقصود وہی ہو جو مقالہ نگار نے ظاہر کیا ہے۔
[۵۲] (نگار) مقالہ نگار کی دور از کار تاویل میری سمجھ میں نہیں آئی کام ہونا، کام تمام ہونا کے معنے میں کبھی استعمال نہیں ہوتا۔

ایک لاسلکی ڈرامہ

اسوقت ہندوستان میں آٹھ نئی لاسلکی نشرگاہیں قایم ہورہی ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ آیندہ پندرہ سال کے اندر یہ تعداد کم ازکم پچاس تک پہونچ جائے گی۔

اس وقت جتنے اسٹیشن کام کررہے ہیں ان میں دہلی کا اسٹیشن مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور اسمیں شک نہیں کہ اس نے گزشتہ ایک سال کے اندر غیر معمولی شہرت حاصل کرلی ہے۔ موسیقی کے علاوہ اس نے اچھے اچھے مقالے بھی نشر کئے اور تفریح وافادہ دونوں باتوں کو پیش نظر رکھکر اپنا پروگرام مرتب کیا لیکن اس کو یہ شکایت ہمیشہ رہی کہ لاسلکی ڈرامہ لکھنے والے میسر نہیں آتے۔ اس کی یہ شکایت درست ہے کیونکہ لاسلکی ڈرامہ میں جن خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے اس سے ہمارے اکثر انشاپرداز ناواقف ہیں۔

چونکہ لاسلکی ڈرامہ کا تعلق صرف سماعت سے ہوتا ہے اور ایکٹ کرنے والے سامنے نہیں ہوتے اس لئے اسکی ترتیب میں ایسی چیزیں نظرانداز کرنا پڑتی ہیں جن کا تعلق باصرہ سے ہے اور انھیں سامعہ کے حدود میں لاکر پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کو مختصر ہونا چاہئے۔ آدھ گھنٹے سے زیادہ کا کوئی ڈرامہ پیش کرنا اصول کے خلاف ہے۔ انھیں خصوصیات کو سامنے رکھکر ذیل میں ایک ڈرامہ جو میں نے خود اپنے ایک افسانہ کو سامنے رکھکر مرتب کیا ہے پیش کرتا ہوں۔

نیاز

افراد:۔

انتظام علی:۔ معاشیات کے پروفیسر، شعروموسیقی سے بالکل بیگانہ لیکن بیوی سے محبت کرنے والے

ثریا بیگم:۔ پروفیسر صاحب کی جدید تعلیم یافتہ بیوی، شاعری کی دلدادہ، گھرکی طرف سے ایک حدتک غافل لیکن شوہرکی مطیع

گلشن:۔ گھرکی پرانی ضعیف خادمہ

اختر:۔ پروفیسر صاحب کے دوست

(۱)

{ پروفیسر صاحب- مکان کے اندر داخل ہوتے ہیں[1] (دروازہ کھلنے کی آواز
پھر پاؤں کی چاپ-)[2]

انتظام علی — "گلشن، گلشان!"

گلشن — (دور کی آواز سے) "حاضر ہوئی حضور"

(تیز قدموں کی آواز)

انتظام علی — "کیا تم کچھ کام کر رہی تھیں، گلشن!"

گلشن — "پتیلی چڑھا رہی تھی میاں!"

انتظام علی — "بیگم کہاں ہیں؟"

گلشن — "وہیں باورچیخانہ میں ہیں؟"

انتظام علی — "کیا کر رہی ہیں؟"

گلشن — "کچھ لکھ رہی ہیں"

انتظام علی — "اور گنگنا بھی رہی ہیں؟"

گلشن — (دبی زبان سے رُک رُک کر)- "ہاں- میاں- کبھی کبھی- گنگنانے بھی لگتی ہیں"

انتظام علی — "شعر کہہ رہی ہوں گی- وہ تو میں جانتا ہوں کہ ہمیشہ کام ہی کے وقت ان پر شاعری کا دورہ پڑتا ہے، خیر، ذرا خیال رکھنا، اختر صاحب بھی کھاتا یہیں ——"

{ دور سے "گلشن، گلشن" کی آواز سُنائی دیتی ہے اور گلشن تیز قدموں کے ساتھ واپس جاتی ہے-

وہی آواز — "کمبخت، مرگئی جاکر، جب دیکھو کام ہی کے وقت غائب ہوتی ہے"

انتظام علی — (بلند آواز سے) "بیگم، ذرا ادھر تو آؤ" {دروازہ کھلنے کی آواز

ثریا بیگم — (غصہ کے لہجہ میں)، "کیوں کیا کہتے ہو؟"

انتظام علی — "یہ اتنی خفگی گلشن پر کیوں ہو رہی ہے- خیریت تو ہے؟"

ثریا بیگم — (تیز غصہ کی آواز سے) "سالن جلکر کوئلہ ہوگیا، خدا جانے پتیلی چڑھاتے چڑھاتے کہاں غائب ہوگئی مردار، اب کیا میں اپنا سر کھانے کو دوں گی"

---

[1] یعنی ([illegible]) اس کا اظہار کریں گے — [2] لاسلکی ڈرامے چونکہ ریکارڈ کرنے کے بعد پیش کئے جاتے ہیں اس لئے ان میں ہر قسم کی آوازیں مصنوعی طور پر مرتسم کردی جاتی ہیں-

انتظام علی ــــ (نرم آواز سے) "مگر تم تو وہاں موجود تھیں"
ثریا بیگم ــــ (برہمی کے تیز لہجہ سے) "تھی تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ میں ہر وقت چولھے میں سر ڈالے بیٹھی رہتی"
انتظام علی ــــ (نرم مگر طعنہ آمیز لہجہ سے) "مگر بیگم، یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے، تمھاری شاعری سلامت چاہئے سالن جلتا ہی رہیگا، روٹیاں جھلستی ہی رہیں گی۔ اس میں خفا ہونے کی کونسی بات ہے"
ثریا بیگم ــــ (دبگڑ کر) "میں پوچھتی ہوں کہ تمھیں میرے لکھنے پڑھنے سے کیوں بیر ہے۔ تم اگر یہ چاہتے ہو کہ میں بھی ہر وقت تمھاری طرح اس فکر میں مبتلا رہوں کہ غلہ کا کیا نرخ ہے، کپڑے کا کیا بھاؤ ہے۔ کتنا سونا ہندوستان سے باہر جارہا ہے، کتنی شکر جاوا سے ہندوستان آرہی ہے، تو میں صاف صاف کہے دیتی ہوں کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ میں تمھارے کام میں حارج نہیں تو تھیں کیوں میرا مشغلہ بُرا معلوم ہو، خوب!"

(باہر سے "گلشن، گلشن" کی آواز آتی ہے)

انتظام علی ــــ (آہستگی سے لیکن غصہ کے انداز میں)۔ "اختر آگئے ہیں، میں باہر جاتا ہوں، کھانا بازار سے آجائیگا، آپ جایئے شعر کہیے"۔

[قدموں کی چاپ اور پھر دروازہ کھُلکر بند ہونے کی کرخت آواز]

اختر ــــ "خیریت تو ہے، اس وقت اندر کیا کررہے تھے؟"
انتظام علی ــــ (مایوسی کے لہجہ میں) "کرکیا خاک رہا تھا، اب تو تمھاری بھابھی کی شاعری میری برداشت سے باہر ہوتی جاتی ہے"
اختر ــــ (ہنسکر) "شاعری کرتی ہیں تو کرنے دو، تمھارا اس میں کیا نقصان ہے؟"
انتظام علی ــــ "ہونہہ، تمھیں کیا خبر کہ ان کا ایک ایک شعر میرے لئے کتنا قیمتی ثابت ہوتا ہے، آج ہی انھوں نے ایک شعر کہا، لیکن اُسوقت جب گوشت جلکر خاک سیاہ ہوگیا، پرسوں بھی خیر سے ایک شعر فرمایا تھا لیکن جب بلی سارا دودھ پی چکی۔ کل ہی کی بات ہے کہ بندر ان کے پاس سے میری شیروانی اُٹھا کرلے گیا، اُدھر جب وہ تار تار ہوچکی تو ادھر شعر پورا ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ مشق سخن چند دن اور جاری رہی تو دیوان پورا ہونے سے پہلے ہی یہاں دیوالہ نہ نکل جائے"
اختر ــــ (قہقہہ لگاتے ہوئے) "بھئی، برا نہ مانو تو کچھ کہوں۔ بات یہ ہے کہ کچھ قصور تمھارا بھی ہے"۔
انتظام علی ــــ "میرا، میرا کیا قصور ہے؟"
اختر ــــ "یہی کہ تم انکے ذوق کا خیال نہیں رکھتے اگر کبھی کبھی تم بھی شعروشاعری سے دلچسپی لے لیا کرو تو کیا حرج ہے"

انتظام علی ــــ "عجیب باتیں کرتے ہو۔ مجھے جب ایک چیز سے لگاؤ ہی نہیں تو کیا خاک دلچسپی لے سکتا ہوں"
اختر ــــ "تاہم محض ان کی دلدہی کے لئے اگر مصنوعی طور پر اس کا اظہار ہو تو کیا نقصان ہے"
انتظام علی ــــ (ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے)۔ "بہتر ہے یہ بھی کر دیکھوں گا"

ــــ(۲)ــــ

(ایک ہفتہ کے بعد۔ ثریا بیگم چوکی پر بیٹھی ہوئی چھالیہ کتر رہی ہیں
انتظام علی ایک کتاب ہاتھ میں لئے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں۔
(چھالیہ کترنے کی آواز اور پھر قدموں کی چاپ)

انتظام علی ــــ "بیگم، تمھارے لئے ایک عجیب چیز لایا ہوں، یہ لو جرمنی کا چھپا ہوا دیوان غالب، دیکھو کتنا خوشنما ہے"
(تھوڑے وقفہ کے بعد) ورق اُلٹنے کی آواز

ثریا بیگم ــــ "بیشک بہت خوبصورت ہے"
انتظام علی ــــ "غالب واقعی اچھا شاعر تھا"
ثریا بیگم ــــ "ہوگا، مجھے کیا معلوم"
انتظام علی ــــ "ہوگا؟ اس کے کیا معنی۔ کیا تمھیں شاعری سے دلچسپی نہیں رہی"
ثریا بیگم ــــ "جی نہیں"
انتظام علی ــــ "اور یہ جو دو گھنٹے سر کھپا کر میں نے غزل کہی ہے، اسے کون سنے گا؟"
ثریا بیگم ــــ (ہنستے ہوئے) "آپ اور غزل۔ کیا کہنا"
انتظام علی ــــ "ہائیں، تم مذاق سمجھتی ہو، لو، سنو، ہر چند یہ میری پہلی کوشش ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ناکامیاب نہیں رہا۔ پہلا شعر ــــ پہلے شعر کو مطلع ہی کہتے ہیں نا؟ اچھا تو مطلع سنو:ــ

ہم نہیں وہ جنھیں آتا ہو پریشاں ہونا　　مفت میں بیٹھے بٹھائے یونہی حیراں ہونا"

ثریا بیگم ــــ "سبحان اللہ، کیا کہنا"
انتظام علی ــــ "اچھا دوسرا شعر سنو اسی سلسلہ کا ہے:ــ

کف افسوس کا ملنا کسے کہتے ہیں جناب　　نام کس چیز کا ہے سر بگریباں ہونا"

ثریا بیگم ــــ "تو یوں کہئے کہ آپ نے "نظم مسلسل" تحریر فرمائی ہے"
انتظام علی ــــ "اسے نظم مسلسل کہتے ہیں؟ اچھا تو آج یہی سن لو، کل غزل بھی سن لینا۔ تیسرا شعر اس میں میرا نام بھی ہے:ــ

کیوں وہاں تم گئے بیکار اے انتظام کس نے تم سے کہا وہاں جاکر بیابان ہونا

(ثریا بیگم کے قہقہہ کی آواز)

انتظام علی — "کیوں اس میں ہنسی کی کیا بات ہے"

ثریا بیگم — "آپ کا مقطع تو تقطیع سے بالکل گر گیا"

انتظام علی — "تقطیع سے گر گیا؟ گر جانے دو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ بیس دفعہ تم سے ہنیس دیگچی چولھے میں گر گئی، شعر تقطیع سے گرا تو کوئی نقصان نہیں ہوا اور تم نے ہر مرتبہ دیگچی گرا کر کم از کم آٹھ آنے کا نقصان کیا۔

ثریا بیگم — پھر تم نے وہی طعن تشنیع کی باتیں شروع کر دیں"

انتظام علی — (نرمی سے) بگڑو نہیں، دیکھو اب میں شعر کہنے لگا ہوں — اور ہاں بیگم یہ جو غالب نے لکھا ہے:
"در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا" اس کا کیا مطلب ہے"

ثریا بیگم — "میں بھلا آپ ایسے قابل شخص کو کیا سمجھا سکتی ہوں۔ آپ کیوں مجھے بناتے ہیں

انتظام علی — "شعر کو قابلیت سے کیا واسطہ۔ یہ بھی کوئی ریاضی کا مسئلہ ہے، علم الکیمیا کا نظریہ ہے جسکے سمجھنے میں قابلیت کی ضرورت ہو۔ چند الفاظ خاص ترتیب سے جمع کر دئے اور کوئی مہمل سی بات کہدی، شعر ہو گیا"

ثریا بیگم — "بجا ہے، شعر کی یہ تعریف مجھے آج ہی معلوم ہوئی۔ میں تو سنا کرتی تھی کہ شعر فنون لطیفہ میں داخل ہے اور وہی شخص شاعری کر سکتا ہے جو قدرت کی طرف سے خاص دماغ لیکر آیا ہو اور —"

انتظام علی — (بات کاٹ کر) شعر فنون لطیفہ میں داخل ہو یا فنون کثیفہ میں۔ اس سے بحث نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس سے دنیا کو کیا فائدہ پہونچتا ہے۔ زمانہ کی حالت تو یہ ہے کہ پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنے میں آجائیں تو جانئے کہ بڑی دولت ہاتھ آگئی اور اُدھر جب دیکھئے دامن کا چاک گریباں سے پاک سے ملا ہوا ہے۔ کوئی پوچھے کہ ان دھجیوں کو کوئی کہاں تک رفو کرے گا اور ایسی فضول خرچی کی تعلیم کا اثر ملک پر کیا ہوگا"

ثریا بیگم — "ماشاء اللہ خوب سمجھے ہیں۔ اس سمجھ کی داد دینی چاہئے"

انتظام علی — "خیر، جانے دو۔ یہ تو پھر جھگڑے کی بات شروع ہو گئی۔ یہ بتاؤ کہ میں نے غزل کیسی کہی"

ثریا بیگم — "کیا کہنا، جواب نہیں ہے"

انتظام علی — "اچھا تو اب روز دو غزلیں مجھ سے لے لیا کرو۔ اب تو تمہیں شکایت نہ ہوگی کہ مجھے شاعری سے لگاؤ نہیں۔ (پاؤں کی چاپ) — کیوں کہاں جا رہی ہو"
"کہیں جا رہی ہوں، آپ کو کیا، آپ تو کپڑے پہنئے، کالج جانے کا وقت قریب ہے"
(کرسی سرکانے کی آواز۔ تحت کی چرچراہٹ)

(۳)

شام کا وقت - زنانخانہ کے برآمدہ میں ثریا بیگم چوکی پر بیٹھی ہوئی تلاوتِ قرآن میں مصروف ہیں ــــ تلاوت کی آواز لیکن نہایت دھیمی - اسی دوران میں دروازہ کھلنے، کسی کے چلنے اور پھر کرسی گھسیٹنے کی آواز آتی ہے

انتظام علی ــــ "ہائیں، ابھی تک فارغ ہی نہیں ہوئیں، کیا آج پورا کلام مجید ختم کرنے کا ارادہ ہے"

("ہونہہ" کی آواز اور پھر تلاوت کلام مجید)

انتظام علی ــــ "اجی منہ سے بولو، یہ وظیفہ کبھی ختم بھی ہوگا یا نہیں - مجھے غزلیں سنانا ہیں، عشق و عاشقی کی باتیں کرنا ہیں اور آپ خدا سے لو لگائے بیٹھی ہیں"

(تلاوت کی آواز برابر آرہی ہے) ــــ (کچھ وقفہ کے بعد)

انتظام علی ــــ "اچھا تم تلاوت کئے جاؤ، میں بھی غزلیں سناتا ہوں"

ثریا بیگم ــــ (غصہ کی آواز سے) لاحول ولا، ناک میں دم ہے - اس گھر میں نماز روزہ بھی دشوار ہوگیا ہے"

انتظام علی ــــ (نرمی سے) میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ جو دورہ آپ پر پڑا ہے کبھی ختم بھی ہوگا یا نہیں ؟"

ثریا بیگم ــــ (بگڑ کر) توبہ کرو، توبہ، نماز روزہ کیا کوئی بیماری ہے جس کا دورہ پڑتا ہے، خوب، آپ کے یہاں مذہب کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے"

انتظام علی ــــ مذہب کے ساتھ کون بُرا سلوک کرسکتا ہے، نماز روزہ میرا ایمان ہے، لیکن میں تو یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس وقت تک تو تم نے کبھی بھولکر بھی سجدہ نہ کیا تھا، اب جو اس کا خیال آیا تو کیوں ؟ اور وہ بھی اس شدت کے ساتھ کہ جب دیکھئے سفید چادر میں لپٹی ہوئی تیمم کا تودہ بنی بیٹھی ہیں"

ثریا بیگم ــــ "چلو ہٹو، مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں - اللہ رسول کے ساتھ مجھے مذاق پسند نہیں"

انتظام علی ــــ "مذاق - مذاق کیسا ؟ میں تمہیں نماز پڑھنے سے نہیں روکتا، تلاوت سے باز نہیں رکھتا، لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی ہے - نماز چھوڑی تو اس طرح کہ بھولے سے بھی کبھی خدا کو یاد نہ کیا اور اب جو عبادت پر آئیں تو اس شان سے کہ گھر کو مسجد بنا کے رکھدیا"

ثریا بیگم ــــ "خیر، ہوگا، کسی کو کیا ؟ میں نماز نہیں پڑھتی تھی تو خدا کا گناہ کرتی تھی اور اب پڑھتی ہوں تو اپنے لئے پڑھتی ہوں - آپ کا اس میں کیا ہیچ ؟"

"میرا ہیچ یہ ہے کہ جس دن سے تم نے نماز شروع کی ہے صرف دو غزلیں ہو کر رہ گئی ہیں ــــ

سُنانے کا موقعہ ملے تو اور کہوں۔ مجھے تو اس مہینے میں پورا دیوان ختم کرنا ہے۔ آخر یہ کام کیونکر چلیگا"

ثریا بیگم ــــ "آپ غزلیں کہے جائیے، مجھے سُنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

انتظام علی ــــ "اور تم برابر اسی طرح رات دن نماز پڑھتی جاؤگی، مانوگی نہیں"

ثریا بیگم ــــ "نہیں مانونگی"

انتظام علی ــــ "بہتر ہے"

(کرسی سرکانے اور چلنے کی آواز)

ــــ(۴)ــــ

(مرغ کے بولنے کی آواز۔ اِدھر اُدھر چلتے ہوئے قدموں کی چاپ)

ثریا بیگم ــــ (بلند آواز سے)۔ "گلشن، گلشن"

گلشن ــــ (دور سے) "حاضر ہوئی، بیوی"

(گلشن کے قدموں کی آواز)

ثریا بیگم ــــ "میرا مصلا کیا ہوا"

گلشن ــــ "بیوی، مجھے کیا خبر، آپ نے جہاں رکھا ہوگا، وہیں ہوگا"

ثریا بیگم ــــ (بگڑ کر تیز آواز میں) سوائے چوکی کے اور کہاں رکھتی ہوں۔ یہیں جانماز تھی، یہیں کلام مجید تھا، اسی جگہ دلائل الخیرات تھی، تسبیح تھی، رحل تھی اور اب کسی ایک چیز کا پتہ نہیں"۔

گلشن ــــ "بیوی، بندر لے گیا ہوگا"

ثریا بیگم ــــ (طعن آمیز لہجہ میں) اور مصلے پر بیٹھا ہوا کلام مجید بھی پڑھ رہا ہوگا، نامعقول کہیں کی، جلد ڈھونڈھ کے لا، وقت جارہا ہے"

گلشن ــــ "بیوی، میں کہاں دیکھوں، میں نے کہیں رکھا ہوتا تو لاکر دیدیتی"

(دروازہ کھلنے کی آواز اور قدموں کی آہٹ)

انتظام علی ــــ "بیگم، گلشن پر کیوں خفا ہو رہی ہو۔ مجھ سے پوچھو۔ لو، یہ ہے تمہارا تمام عاشور خانہ میری بغل میں ــــ مگر خدا کے لئے یہ تو بتا دو کہ یہ چلّہ کتنے دنوں کا ہے۔ تاکہ میں اتنے زمانہ کے لئے کہیں باہر چلا جاؤں"

(ثریا بیگم کی ہنسی کی آواز)

ثریا بیگم ــــ "خفا تو نہ ہوگے اگر سچ سچ کہہ دوں"

انتظام علی — "یہ لو، تمھاری جانماز، تسبیح اور قرآن سب اپنے سر پر رکھ کر کہتا ہوں کہ خفا نہ ہوں گا"

ثریا بیگم — "اچھا تو وعدہ کیجئے کہ آیندہ آپ کبھی کوئی شعر نہ کہیں گے"

انتظام علی — (سنجیدگی سے) "کیوں، کیا تمھیں میری شاعری سے تکلیف ہوتی ہے"

ثریا بیگم — "تکلیف! یہ نہیں کہتے کہ کلیجہ بیپ ہو کر رہ گیا ہے"

انتظام علی — "تمھیں تکلیف ہوتی ہے تو جانے دو۔ میں نے تو صرف تمھاری خوشی کے لئے شاعری شروع کی تھی، تم پسند نہیں کرتیں تو کیا میرا سر پھرا ہے کہ خواہ مخواہ اپنا وقت ان مہملات میں ضایع کروں"

ثریا بیگم — "ہاں، میری خوشی ہو چکی اب میری مرضی یہی ہے کہ آپ اس سے توبہ کر لیں"

انتظام علی — "اچھا، میں توبہ کرتا ہوں، لیکن تم بھی توبہ کرو کہ ——"

ثریا بیگم — "خدا تمھیں شرمائے، نماز سے توبہ کراتے ہو جس نے تم سے شاعری کی لت چھوڑوائی"

انتظام علی — "اور تم شاعری سے توبہ کراتی ہو جس نے تمھیں نماز کی عادت ڈلوائی"

(دونوں کا قہقہہ)

باجلاس مسٹر ایف۔ ایچ۔ ٹیل صاحب بہادر سب جج درجہ چہارم چھاؤنی لاہور

بمقدمہ لالہ خوشی رام ولد لالہ جمنوں رام قوم ناگیہ پروپرائٹر گلوب بک ڈپو چھاؤنی لاہور........ مدعی

بنام

ڈاکٹر ڈی سنگھ ایم۔ بی۔ ڈی۔ ڈی۔ ایس معرفت سول سرجن صاحب کنگ جارج دی فورتھ سول ہسپتال بنارس چھاؤنی مدعا علیہ

دعوےٰ دلاپانے مبلغ -ا-/71 24 روپیہ

مقدمہ صدر میں ہماری تسلی ہو گئی ہے کہ مدعا علیہ دیدہ دانستہ تعمیل سمن سے گریز کرتا ہے اور معمولی طریقہ سے اس کی تعمیل سمن نہیں ہو سکے گی۔ لہٰذا بذریعہ اشتہار ہذا زیر آرڈر 5 رول 20 ضابطہ دیوانی مشتہر کیا جاتا ہے کہ اگر ڈاکٹر ڈی سنگھ مدعا علیہ مذکور تاریخ مقررہ مورخہ 17 4/1937 کو برائے پیروی مقدمہ اصالتاً یا وکالتاً حاضر عدالت ہذا نہ ہو گا تو اس کے برخلاف کارروائی یکطرفہ عمل میں لائی جائے گی۔

آج بتاریخ 16 3/37 ہمارے دستخط و مہر عدالت سے جاری ہوا۔

سب جج درجہ چہارم چھاؤنی لاہور

مہر عدالت

باب المراسلۃ والمناظرہ

(جناب سید علی اوسط صاحب۔ بنارس)

مکرمی۔ تسلیم۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کا رجحان اخلاقیات میں مادی دنیا سے زیادہ روحانیات کی طرف ہے لیکن اسی کے ساتھ آپ حیات بعد الموت اور دوزخ وجنت وغیرہ سے بھی انکار کرتے ہیں، یہ اجتماع ضدین میری سمجھ میں نہیں آیا۔ براہ کرم اس گتھی کو سلجھائیے۔

(نگار) گرامی جناب، آپ کی تحریر پڑھکر مجھے آپ پر بہت رحم آیا اور یہ معلوم کر کے سخت افسوس ہوا کہ مذہب کی کورانہ تقلید واقعی انسان کی قوت ادراک وفہم کو اسقدر بلید کر دیتی ہے کہ سیاہ وسفید کا امتیاز بھی اسے باقی نہیں رہتا۔ آپ نے مادی دنیا اور روحانیات کے الفاظ تو ضرور اپنی تحریر میں استعمال کئے ہیں، لیکن معاف فرمایئے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ ان دونوں کے صحیح مفہوم سے بے خبر ہیں، اور اس لئے میرے متعلق آپ کا یہ ارشاد کہ میرا رجحان بہ نسبت مادیات کے روحانیات کی طرف زیادہ ہے، سوائے اس کے کہ اسے حسن ظن سے تعبیر کروں اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ دیکھئے میں آپ کو نہایت ہی آسان طریقہ سے ان دونوں کا فرق بتاتا ہوں، اسے یاد رکھئے اور آیندہ جب ان الفاظ کو استعمال کیجئے اس کو کبھی نہ بھولئے۔

مادیات و روحانیات فی الاصل کیا چیز ہیں، اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں، آپ تو اتنا سمجھ لیجئے کہ دنیا میں دو چیزیں ہیں ایک وہ جنھیں ہم حواس ظاہری سے محسوس کرتے ہیں مثلاً پھول کہ آپ اسے دیکھ سکتے ہیں، سونگھ سکتے ہیں، چھو سکتے ہیں یا آواز جس کا احساس آپ کو سامعہ کے ذریعہ سے ہوتا ہے، دوسری چیز وہ جس کا تعلق احساس ظاہری سے نہیں ہے بلکہ صرف کیفیت و وجدان سے ہے مثلاً کیفیت مسرت وغم کہ نہ اسے ہم دیکھ سکتے ہیں نہ چھو سکتے ہیں۔ اب آپ خود غور فرمایئے کہ حشر ونشر، جنت ودوزخ وغیرہ کا عقیدہ روحانیات سے متعلق ہے یا مادیات سے۔ یعنی ان باتوں کو تسلیم کرنے کے بعد آپ کی مادہ پرستی ثابت ہوتی ہے یا ان کے انکار کے بعد میری مادہ پرستی۔

فرض کیجئے میں کہتا ہوں کہ مرنے کے بعد انسان نسیاً منسیا ہوجاتا ہے یا یہ کہ اگر روح باقی بھی رہتی ہے تو مذہب کے بتائے ہوئے عذاب وثواب سے اس کا تعلق نہیں ہوتا۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ اس عقیدہ میں مادیت کا لگاؤ کہاں ہے۔ برخلاف اس کے آپ اپنے معتقدات کو ملاحظہ کیجئے کہ:۔

۱۔ آسمان سے ایک فرشتہ (عزرائیل) آتا ہے اور وہ روح کو جسم سے نکالکر آسمان کی طرف لیجاتا ہے۔

۲۔ جب مردہ قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو روح پھر جسم کے اندر واپس کردیجاتی ہے (معلوم نہیں وہ قومیں جو اپنے مردوں کو جلاکر ان کی خاکستر منتشر کردیتی ہیں، ان کی روح پھر کیونکر جسم میں واپس کی جاتی ہوگی، غالباً ان کے تمام منتشر اجزا کو جمع کرکے پہلے جسم بنایا جاتا ہوگا اور پھر روح اس کے اندر داخل ہوتی ہوگی)

۳۔ قبر کے اندر دو فرشتے (منکر ونکیر) آتشیں گرز لئے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور مردہ کو بٹھاکر خدا اور رسول کے متعلق سوال کرتے ہیں، اگر اس نے جواب معقول دیا یعنی اگر وہ مسلمان ثابت ہوا تو کیا کہنا ورنہ پھر غریب کی شامت آجاتی ہے اور گرز بازی شروع ہوجاتی ہے (گویا سوائے مسلمانوں کے اور جتنی مخلوق خدا نے پیدا کی ہے وہ صرف جہنم میں جھونکنے کے لئے)

۴۔ حشر کے دن تمام مردے اپنے اپنے اصلی جسموں کے ساتھ اٹھیں گے، ان کے ہاتھ میں ان کے نامۂ اعمال ہونگے پُل صراط سے گزریں گے اور میزان میں ان کے اعمال تولے جائیں گے۔

۵۔ اگر جنت کے قابل سمجھے گئے تو وہاں انھیں کھانے کو عمدہ عمدہ پھل ملیں گے، رہنے کو سونے چاندی کے مکان، اور خواہش نفسانی پوری کرنے کے لئے حور وغلمان۔

۶۔ اگر دوزخ نصیب ہوئی تو وہاں سانپ بچھو انھیں ڈسیں گے، کھولتا ہوا پانی انھیں پینا پڑے گا، آگ میں جلتے رہیں گے اور خدا جانے کس کس طرح کی جسمانی سزا انھیں دیجائے گی۔

اب غور فرمائیے کہ مرنے کے بعد آپ جس عالم کے قایل ہیں اس کا تعلق مادیات سے ہے یا روحانیات سے یعنی اس میں کمیت پائی جاتی ہے یا کیفیت۔ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی جزو ایسا نہیں ہے جس میں مادیت وجسمانیت نہ پائی جائے اور زمان ومکان سے اس کا تعلق نہ ہو۔ گرز، میزان، پُل صراط، سانپ، بچھو، حور وقصور وغیرہ کا غیر مادی تصور محال ہے اور تاوقتیکہ آپ انھیں محسوس ومرئی چیز نہ مانیں آپ کے جنت ودوزخ کا تخیل پورا ہو ہی نہیں سکتا۔ اب اس کے مقابلہ میں آپ میرے اعتقاد کو دیکھئے کہ وہاں ان میں سے کسی چیز کو درخور حاصل نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف کیفیت ووجدان یا احساس محض سے متعلق ہے۔ پھر آپ ہی انصاف فرمائیے کہ روحانیات کا قایل میں ہوں یا آپ، مادہ پرستی آپ کے اسلام میں پائی جاتی ہے یا میرے اسلام میں۔

خیال کن تو کجائی وما کجا واعظ!

باب الاستفسار

جعفر و عباسہ کا نکاح۔زوال برامکہ

(جناب عطا کریم صاحب۔ضلع شاہ آباد)

۱۔ خاندان برامکہ کے زوال و استیصال کے اسباب کیا تھے۔

۲۔ جعفر و عباسہ کے نکاح اور اولاد ہونے کا واقعہ صحیح ہے یا محض افسانہ، ہارون الرشید خلیفۂ بغداد کے عادات و اطوار کیسے تھے؟

(نگار) عباسہ کا نکاح جعفر کے ساتھ بہت مشہور چیز ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی حقیقت افسانہ سے زائد نہیں اس کا سب سے پہلا راوی طبری ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ہارون الرشید اپنے وزیر جعفر برمکی اور اپنی بہن عباسہ سے حد درجہ مانوس تھا اور کسی وقت ان سے جدائی پسند نہ کرتا تھا، لیکن چونکہ یہ دونوں غیر محرم تھے اس لئے دونوں کا پردہ توڑنے کے لئے اس نے ان کا نکاح کر دیا مگر شرط یہ قرار دی کہ خلوت میں ایک دوسرے سے نہ ملنے پائیں (یہ شرط غالباً اس لئے تھی کہ مبادا تعلقات زن و شو، خلافت کو برمک خاندان میں منتقل کر دیں) لیکن اس کی پابندی نہ ہو سکی اور آخر کار مکہ میں عباسہ کے ایک لڑکا (اور بہ روایت دیگر دو توام بچے) پیدا ہوئے۔ اسی زمانہ میں جب ہارون الرشید مکہ پہونچا تو کسی کنیز نے یہ خبر اس کو پہونچا دی اور اس نے جعفر سے انتقام لینے کا ارادہ کر لیا، چنانچہ محرم ۱۸۷ھ میں اس نے دفعۃً جعفر کو قتل کرا دیا۔

یہ ہے روایت طبری کی جس کو اس نے صرف افواہاً نقل کیا ہے اور اس سے قبل کی کسی تاریخ میں اس کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ اس واقعہ کی غلطی کا ایک اور ثبوت ہے۔ وہ یہ کہ عباسہ کی تین شادیاں پہلے ہو چکی تھیں اور اس کے تینوں شوہر مر چکے تھے، چنانچہ عربی کے مشہور شاعر ابونواس نے عباسہ کے متعلق چند طنزیہ اشعار لکھے جس میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر خلیفہ کسی باغی کو موت کے گھاٹ اُتارنا چاہتا ہے تو چاہئے

کہ عباسہ سے شادی کر دے کیونکہ اس صورت میں اس کی موت یقینی ہے۔ ابونواس نے اس سلسلہ میں عباسہ کے ان تینوں شوہروں کا بھی نام لکھا ہے اور جعفر کا ذکر اس میں کہیں نہیں ہے۔

علاوہ اس کے جس وقت جعفر کے ساتھ عباسہ کی شادی کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے اسوقت عباسہ کی عمر ۴۰ سال کی تھی اور ظاہر ہے کہ اس عمر میں جوانی کے وہ ولولے جو اسے جعفر کی مواصلت کے لئے بے اعتنا کر دیتے کہاں سے پیدا ہو سکتے تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کیوں مشہور ہوگیا۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جاہلیت عرب میں وہاں کے داستان گویوں کا عام میلان یہ تھا کہ جب کسی بادشاہ کا ذکر کرتے تھے تو وزیر سے اس کی بہن کا تعلق ازدواج یا رشتۂ محبت ضرور دکھاتے تھے۔ اور ان کی یہی وہ ذہنیت تھی جس نے عباسہ (ہارون الرشید کی بہن) اور جعفر (وزیر) کے معاشقہ کا اختراع کر کے قتل جعفر کی داستان کو رنگین بنا کر پیش کر دیا۔ اور کسی ایسی ہی داستان کو طبری نے درج کر کے بعد کے مورخین کے لئے اس کے نقل و روایت کا دروازہ کھولا۔ طبری کے بعد کے مورخین میں سب سے پہلے ابن خلدون نے اس پر انتقادی نگاہ ڈالی اور اسے ناقابل اعتماد قرار دیا۔

برامکہ کے زوال کا سبب عباسہ کے نکاح کو قرار دینا سخت غلطی ہے، کیونکہ اول تو اس کی صحت بہت مشتبہ ہے اور اگر اسے صحیح مان لیں تو بھی اس کو صرف بہانہ قرار دے سکتے ہیں نہ کہ اصل سبب۔

حقیقت یہ ہے کہ برامکہ کا غیر معمولی اقتدار ہی ان کے زوال کا باعث ہوا۔ آپ برامکہ کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ خالد، یحیٰی اور جعفر تینوں اپنے اپنے زمانہ میں خاص اقتدار رکھتے تھے، خالد نے خلیفہ ابوالعباس اور خلیفہ منصور کے زمانہ میں جو اہمیت حاصل کی وہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ اور اس کے بیٹے یحیٰی کو جو عظمت خلیفہ ہادی اور ہارون الرشید کے عہد میں حاصل تھی وہ بھی سب پر ظاہر ہے، اسی طرح جعفر کو جو عروج ہارون الرشید کے زمانہ میں میسر آیا وہ بھی سب کے علم میں ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جعفر اپنے باپ یحیٰی اور اپنے دادا خالد کی طرح اچھا گورنر ثابت نہ ہوا، اس میں شک نہیں کہ وہ بڑا اچھا خطاط تھا، نہایت بے مثل خطیب تھا، علم نجوم میں ماہرانہ درک رکھتا تھا اور وضع کی تراش خراش کا بھی خاص ذوق رکھتا تھا، لیکن ایک سیاست داں امیر یا حاکم کی حیثیت سے وہ ناکام شخص تھا۔ متعدد بار بڑے بڑے صوبوں کا چارج اس کو دیا گیا، لیکن اس نے ہمیشہ اپنے نائبوں پر سارا کام چھوڑ دیا اور کبھی اپنے فرائض صحیح طور پر انجام نہیں دئے۔ اس کو ہارون الرشید اچھی طرح جانتا تھا، چنانچہ جعفر کے خلاف فضل بن ربیع کی کامیابیاں اس کی بخوبی شاہد ہیں۔ اسی کے ساتھ دوسری بات جو ہارون کے دل میں کھٹک رہی تھی برامکہ

کی عجم پرستی تھی اور اسے اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں خلافت وحکومت بنو عباس کے ہاتھ سے نکل کر ایرانیوں کے قبضہ میں نہ چلی جائے۔ چنانچہ عربوں نے اس کا کافی پروپیگنڈا بھی کیا اور برامکہ کو ملحد و کافر تک ثابت کر دکھایا۔ چنانچہ ابن قتیبہ نے عیون الاخبار میں اصمعی کی ایک نظم نقل کی ہے جس میں لکھا ہے کہ "جب کسی محفل میں اسلام کے مخالف کوئی بات کہی جاتی ہے تو برامکہ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھتا ہے اور جب قرآن کی کوئی آیت ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے تو وہ صحیفۂ مزدک کی کہانیاں سنانے لگتے ہیں"۔ بیان جاحظ اور عیون الاخبار میں ایک اور شاعر کی طنزیہ نظم درج ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ "تعمیر مساجد سے دلچسپی لینا تو صرف میری تفریح ہے ورنہ فی الحقیقت میں ان کی طرف سے ایسا ہی بے پرواہ ہوں جیسے یحییٰ بن خالد"۔

کہا جاتا ہے کہ خلیفۂ منصور نے خود خالد وزیر سے صاف صاف کہدیا تھا کہ "تم ایرانیوں کی بہت طرفداری کرتے ہو"۔ اور خلیفۂ ہادی نے (حسب بیان طبری) یحییٰ (جعفر کے باپ) کو کھلم کھلا کافر کہہ ہی دیا تھا۔

اسی طرح ہارون الرشید نے بھی محسوس کیا کہ برامکہ کا اقتدار نہ صرف بنو عباس بلکہ اسلام کے لئے خطرہ کا سبب ہے اور آخرکار وہ اس کے استیصال پر آمادہ ہوگیا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ جعفر کو معزول کر کے اس کے باپ بھائی کی طرح اس کو بھی مقید کر دیتا، لیکن چونکہ ہارون الرشید انتہا پسند شخص تھا اور ہر بات میں وہ انتہائی تکمیل چاہتا تھا اس لئے اس نے سوچا کہ جعفر کا ہلاک کر ڈالنا ہی مناسب ہے، کیونکہ بصورت دیگر وہ سمجھتا تھا، ممکن ہے اسے پھر رحم آجائے۔ (کیونکہ وہ واقعی اس سے بہت محبت کرتا تھا)۔

ہارون الرشید کا زمانہ نہ صرف عہد بنی عباس بلکہ عہد اسلام کا دور زریں کہلاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ جو عظمت و جبروت، سطوت و جلالت اس کو حاصل ہوئی وہ اس سے پہلے خلفاء عرب میں کسی کو میسر نہیں آئی۔ اس کے بعد تو خیر زوال ہی شروع ہوگیا تھا۔

وہ علوم و فنون کا بڑا زبردست مربی تھا اور اس کے دربار میں ہر وقت علماء شعراء حاضر رہتے تھے علمی مباحث سے اسے خاص دلچسپی تھی اور فنون لطیفہ کا بھی اسے خاص ذوق حاصل تھا، شان و شوکت کا وہ عالم تھا کہ اکاسرۂ عجم کی داستانیں بھی ماند پڑ گئی تھیں اور بذل و کرم کی وہ کیفیت تھی کہ جس کی طرف توجہ ہوگئی اسے بے نیاز کردیا۔

وہ نہایت خوش خلق، ہنس مکھ اور رحیم المزاج انسان تھا۔ اور کبھی کسی پر ظلم کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ میدان جنگ میں وہ ایک سپہ سالار بھی تھا اور عربی شہامت و بسالت کے پورے جوہر دکھاتا تھا۔ اس کے پورے دور حکمرانی میں صرف قتل جعفر کا ایک ایسا واقعہ ہے جسے ظلم و ستم سے تعبیر کیا جا سکتا

ہے۔ لیکن اگر اس وقت کی سیاسیات پر غور کیا جائے تو ہارون الرشید کا جرم ہلکا نظر آئے گا۔

قبرص ——— اقریطش

(جناب اسلام علی خانصاحب۔ گوجرانوالہ)

اگر زحمت نہ ہو تو کریٹ اور سائپرس سے متعلق تاریخ اسلام پر روشنی ڈالئے ممنون ہوں گا۔

(نگار) سائپرس (CYPRUS) جسے عربی میں قبرص یا قُبرُس اور ترکی میں قبرس کہتے ہیں ایک جزیرہ ہے بحرروم کے مشرق میں۔ ایام قدیم میں جب شام و مصر کے درمیان بحری سفر کیا جاتا تھا تو تمام جہاز اسی جزیرہ سے ہو کر گزرتے تھے، چنانچہ اسی طرح رفتہ رفتہ وہ تجارتی مرکز اور مصری و شامی تہذیب کا سنگم بن گیا تھا تانبا یہاں کی خاص پیداوار تھی اور اسی لئے اسے قبرس کہنے لگے (عربی میں اچھے تانبے کو قبرس کہتے ہیں)

جب اسلام کی فتوحات وسیع ہونے لگیں تو یہ جزیرہ بازنطینی حکومت کے قبضہ میں تھا اور سب سے پہلے امیر معاویہ نے ۲۸ھ میں فوجی مہم یہاں روانہ کی اور بجائے بازنطینی حکومت کے مسلم حکومت کا باجگزار بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ عبادہ بن الصامت کی بیوی ام حرام اسی مہم میں شہید ہوئی تھیں اور انکا مقبرہ ابھی زیارتگاہ عام ہے۔

بلاذری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳۳ھ میں دوسری فوجی مہم یہاں روانہ کی گئی اور زیادہ استحکام کے ساتھ مسلمانوں کی حکومت یہاں قایم ہوئی۔ لیکن امیر معاویہ کے بعد ان کے جانشین یزید نے اس جزیرہ سے اپنا قبضہ اٹھا لیا اور اس کا خراج عرب اور بازنطینی حکومت میں برابر تقسیم ہو گیا۔ الغرض عہد بنی امیہ میں اس پر مستقل قبضہ کبھی مسلمانوں کا نہیں ہوا اور اس طرح اس کی حیثیت ایک طور سے خود مختارانہ قایم رہی سوائے اس کے کہ وہ بازنطینی حکومت اور عربوں کو خراج ضرور ادا کرتا تھا۔ پھر چونکہ یہاں کی آبادی عیسائیوں کی تھی اس لئے قدرتاً انھیں بازنطینی حکومت سے زیادہ دلچسپی تھی اور اسی کی اخلاقی حکومت یہاں قایم تھی۔ عہد عباسیہ میں مسلمانوں کی گرفت اس جزیرہ پر اور زیادہ ڈھیلی ہو گئی اور ہر چند ہارون الرشید کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی فوجی مہمیں یہاں روانہ کی گئیں لیکن مستقل قبضہ کا خیال کبھی نہیں کیا گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ بازنطینی اقتدار یہاں بہت بڑھ گیا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس جزیرہ کو تجارتی مرکزیت حاصل تھی اور عرب و عیسائی حکومتوں کے جہاز یہاں لنگر انداز ہوا کرتے تھے، سوا اسکے یہ

حیثیت بدستور قایم رہی اور سوائے اس کے کہ جس حکومت کا زیادہ اقتدار ہوتا تھا اس کے جنگی جہاز بھی یہاں رہتے تھے اور کوئی فرق کبھی پیدا نہیں ہوا۔

نائس فورس فوکس (NICEPHOROS PHOCS) کے بعد جس نے ۹۶۳ء سے ۹۶۹ء تک یہاں حکومت کی یہاں پھر بازنطینی حکومت کا قبضہ ہوگیا۔

اس کے بعد جب ۱۱۹۱ء میں رچارڈ اول کا جنگی بیڑہ ادھر سے گزرا تو اسحاق نامی ایک شخص یہاں حکمراں تھا۔ رچارڈ نے اس جزیرہ کو فتح کرکے ٹمپلرس کے ہاتھ فروخت کر دیا اور انھوں نے لوسگنان کے گائیڈ و کو دیدیا۔ اور ۴۰۰ سال تک یہاں فرنگیوں کی سلطنت قایم رہی۔ اس دوران میں یہاں بڑے بڑے گرجا اور قلعے تعمیر کئے گئے۔ یہ حکومت صلیبیین کی بڑی معاون تھی اور مصر و شام کی مملوک حکومت کے پہلو میں یہ زبردست خلہ کی حیثیت رکھتی تھی۔

مملوک حکومت کے بانی بیبرس اول نے ۶۶۵ھ (۱۲۶۷ء) میں ایک بیڑہ روانہ کیا لیکن یہ تباہ ہوگیا اس کے بعد وسط پندرھویں صدی عیسوی میں مملوکوں نے زیادہ اہتمام کے ساتھ اپنی گزشتہ شکست کا انتقام لینا چاہا اور متعدد لڑائیوں کے بعد مسلمانوں نے اس جزیرہ کو مفتوح کرلیا، لیکن مستقل قبضہ اب بھی نہیں کیا اور وہی باجگزارانہ حیثیت اس کی قایم رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں پھر مقامی حکومت برسر اقتدار ہوگئی۔ اور لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

اس کے بعد ترکوں کے زمانہ میں سلطان سلیم ثانی نے اس کو مفتوح کرنا چاہا اور آخرکار ترکی حکومت کا یہاں اعلان ہوگیا اور ۱۸۷۸ء تک برابر ان کا قبضہ یہاں قایم رہا۔ اس کے بعد جب اسی سال انگریزوں اور ترکوں کے درمیان معاہدہ ہوا تو یہ جزیرہ انگریزوں کے سپرد کردیا گیا اور برائے نام ترکوں کا اقتدار یہاں باقی رہا۔ چنانچہ اب یہ جزیرہ بالکل انگریزوں کے قبضہ میں ہے اور خوب آباد ہے۔

کریٹ (CRETE) کو عربی میں اقریطش کہتے ہیں۔ مسلمانوں نے اول اول جب بازنطینی حکومت سے جنگ شروع کی تو اسی سلسلہ میں اس جزیرہ پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا (۶۷۳ء) لیکن اس زمانہ کی تاریخ تقریباً تاریکی میں ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ قبضہ عارضی تھا۔ اس کے بعد ۸۲۵ء میں ابوحفص عمر بن عیسیٰ بن شعیب مستقلاً اس پر قابض ہوگیا۔ ابوحفص اس جماعت کا سردار تھا جس نے قرطبہ کے فرمانروا حکم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا اور جو شکست کھا کر بحر روم کے سواحل پر قزاقانہ حملے کیا کرتا تھا۔

ہر چند بازنطینی حکومت نے بہت کوشش کی کہ وہ پھر قابض ہو جائے لیکن برابر ۱۲۵ سال تک

مسلمانوں کا قبضہ اس پر قایم رہا - یہاں انھوں نے ایک نیا دارالحکومت بھی خندق کے نام سے تعمیر کیا جو بعد کو کنڈیا (CANDIA) ہوگیا اور رفتہ رفتہ سارا جزیرہ اسی نام سے موسوم ہوگیا -

۹۶۱ء میں نے بازنطینی جنرل نے کئی ماہ کے محاصرہ کے بعد اس جزیرہ کو فتح کرلیا - یہاں آخری مسلمان امیر (عبدالعزیز) قسطنطنیہ قید کرکے بھیج دیا گیا اور وہیں اس کا انتقال ہوا - قسطنطنیہ اسوقت تک مسلمانوں کے قبضہ میں نہ آیا تھا اور بازنطینی حکومت کا پایہ تخت تھا -

اس کے بعد جب قسطنطنیہ کو لاطینیوں نے فتح کیا، تو کریٹ [illegible] میں (VENETIANS) کے ہاتھ فروخت کردیا گیا -

اس کے بعد جب ترکوں کی فتوحات وسیع ہوئیں تو ادھر بھی انھوں نے توجہ کی اور آخرکار اس جزیرہ کا بڑا حصہ ۱۶۶۹ء میں ترکوں کے قبضہ میں آگیا اور ۱۷۱۵ء تک پورا جزیرہ ان کی حکومت میں شامل ہوگیا - ہر چند اس جزیرہ کی مدافعت میں تمام مغربی حکومتوں نے حصہ لیا تھا لیکن ترکوں کے مقابلہ میں وہ کامیاب نہ ہوسکے -

اس جزیرہ میں ترکوں کے قبضہ کے وقت بالکل عیسائی آبادی باقی تھی لیکن بعد کو فاتح قوم کا مذہب بھی بہت سے عیسائیوں نے اختیار کرلیا اور ان کا اقتدار اسقدر بڑھ گیا کہ حکومت بھی پریشان ہوگئی اور باوجود متعدد کوششوں کے ان کی بغاوتوں کو فرو نہ کرسکی -

۱۸۳۰ء میں جب لندن کانفرنس نے یونان کی آزادی و خود مختاری کو تسلیم کیا تو خیال تھا کہ یہ جزیرہ بھی اسی کو دیدیا جائے لیکن ایسا نہیں ہوا اور محمد علی پاشا (حاکم مصر) کو دیدیا گیا جسے ترکوں نے اپنی مدد کے لئے طلب کیا تھا - اس طرح ترکوں کا تعلق اس [illegible] بدستور قایم رہا لیکن مقامی بغاوتوں کا سلسلہ بھی اسی طرح جاری رہا اور بمشکل تمام کافی قربانیوں کے بعد [illegible] میں یہاں امن و سکون قایم ہوسکا -

جب ۱۸۷۷ء میں جنگ روم و روس ہوئی تو یہاں پھر بغاوت شروع ہوگئی اور سلطنت گورنمنٹ اس کو ملگئی، لیکن یہ تدبیر بھی مفید ثابت نہ ہوئی اور بدامنی کا دور دورہ برابر قایم رہا اور آخرکار دول یورپ نے مداخلت کرکے ترکوں کی حکومت کا یہاں بالکل خاتمہ کردیا -

---

عجائب و غرائب

بائیس سال قبل سامان حرب پر جتنی رقم صرف ہو رہی تھی وہ بھی غیر معمولی تھی لیکن اب باوجود ادعائے صلح کوشی جو کچھ صرف ہو رہا ہے اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

	سنہ ۱۴ء		سنہ ۳۶ء	
برطانیہ	۱۰۲۰۰۰۰۰۰۰	روپیہ	۱۳۳۰۰۰۰۰۰۰	روپیہ
امریکہ	۶۷۰۰۰۰۰۰۰	"	۱۹۵۰۰۰۰۰۰۰	"
فرانس	۳۶۰۰۰۰۰۰۰	"	۱۹۲۰۰۰۰۰۰۰	"
جرمنی	۱۲۶۰۰۰۰۰۰۰	"	۹۹۰۰۰۰۰۰۰	"
اطالیہ	۵۰۰۰۰۰۰۰۰	"	۹۶۰۰۰۰۰۰۰	"
جاپان	۲۶۰۰۰۰۰۰۰	"	۷۴۰۰۰۰۰۰۰	"

اسوقت دنیا میں ۲ کرور بچے (جن کی عمر ۶ سال سے ۲۰ سال تک کی ہے) جنگ کی تعلیم پا رہے ہیں (بعض قومیں ۵ سال کی عمر ہی سے فوجی تعلیم شروع کر دیتی ہیں اور بعض تین سال کی عمر ہی میں جنگی جھنڈا بچوں کے ہاتھ میں دیدیتی ہیں تاکہ ان کے اندر کھیل کا ذوق بھی جنگ ہی کے جذبہ سے شروع ہو۔

گزشتہ جنگ ختم ہونے کے بعد فرانس کی حکومت نے ایک محکمہ قایم کر دیا تھا تاکہ ان بموں کو زمین کے اندر ڈھونڈھے جو پھٹنے سے رہگئے تھے۔ چنانچہ گزشتہ ۱۸ سال سے یہ کام جاری ہے اور گاڑیوں پر گاڑیاں ان بموں کی بھیجی جا رہی ہیں۔ پچھلے چھ سال میں ۲۴۵۰۰۰ ٹن وزن کے بم زمین سے نکال کر حکومت کے پاس ضایع کرنے کے لئے بھیجے جا چکے ہیں اور ۱۶۷۰۰۰ وزن کے بھاری بم جو منتقل نہ ہو سکتے تھے وہیں ضایع کئے جا چکے ہیں۔ اس سے گزشتہ جنگ کی ہولناکیوں کا اندازہ کرنا چاہئیے۔

شنگھائی کے ہانگ کانگ بنک کے پھاٹک پر پیتل کے دو شیر نصب کئے گئے ہیں، لیکن گزشتہ دس سال کے اندر واہمہ پرست چینیوں نے ان شیروں کے پنجوں کو اسقدر مس کیا کہ اب وہ بالکل گھس گئے ہیں۔ چینیوں کا خیال ہے کہ یہ شیر بہت متبرک ہیں اور جو شخص ان کو چھو لیتا ہے اس کو بہت فلاح ہوتی ہے۔

تخت برطانیہ پر جب کوئی نیا بادشاہ بیٹھتا ہے تو تاج میں اسکے سر کے مطابق ضرور تبدیلی کی جاتی ہے۔

روسیوں نے اپنی داڑھیاں اُڑا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے اور ۱۵۰۰ احجام اس کام کے لئے زیر تربیت ہیں۔

حال ہی میں ایک جراثیم کش سرد شعاع دریافت ہوئی ہے جو عمل جراحی کے وقت مریض کے آس پاس ڈالی جاتی ہے اور اس سے فضا میں اُڑنے والے جراثیم از خود فنا ہو جاتے ہیں۔

جاپان کی آبادی ۱۹۳۵ء میں اتنی بڑھ گئی ہو کہ دنیا کا کوئی ملک اس اضافہ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، یعنی وہاں فی گھنٹہ ۲۴۰ پیدائش کا اور ۱۳۰ اموات کا اوسط پڑتا ہے۔ اسوقت جاپان کی آبادی سات کرور کے قریب ہے۔

کاغذ کی برساتیاں جنھیں کوئی خاص تیل ملکر طیار کیا جاتا ہی جاپان کے اندر بارہ بارہ آنے میں فروخت ہو رہی ہیں انکو لپیٹ کر نہایت چھوٹے پیکٹ میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ نہ ان میں شکن پڑتی ہے اور نہ وہ آسانی سے پھٹتی ہیں۔

اندازہ کیا جاتا ہے کہ دنیا نصف سے زیادہ جاہل ہے اور تعلیم کی موجودہ رفتار کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ہزار سال کے بعد یہی حال رہیگا، کیونکہ پیدائش جتنی جلد ہوتی ہے اتنی جلد تعلیم تو نہیں ہو سکتی۔

رنگون اور برما کے محکمۂ ڈاک نے وہاں کی پبلک سے درخواست کی ہے کہ براہ کرم آیندہ ڈاک کے ذریعہ سے انسانی سر نہ بھیجا کریں۔ وہاں دشمن کا سر کاٹ کر اس کے عزیزوں کے پاس بھیجنے کی رسم عام ہے۔

ٹریسٹ (اٹلی) میں ایک شخص درد معدہ کا مریض تھا۔ حال ہی میں اسکے پیٹ کا آپریشن ہوا تو اندر سے جو کچھ دستیاب ہوا اسکی فہرست ملاحظہ ہو۔ تیرہ کنجیاں۔ ایک ٹین کا ڈبہ کھولنے والا آلہ، تین سگار ہولڈر، تیرہ پنسلیں، پانچ فاونٹن پن، ایک چمچہ دو پنسل ہولڈر، چار قلم تراش، ایک سیفٹی ریزر کا دستہ، چند سوئیاں، ایک ٹکڑا کانچ کا اور پانچ سکے۔

افزائش حسن کے آلات میں ایک اور آلہ کا اضافہ حال ہی میں ہوا ہے، یہ تار کا حلقہ ہے جو ساری رات چہرہ پر چڑھا رہتا ہے اور صبح تک دونوں گالوں میں ہلکے سے گڑھے پیدا کر دیتا ہے۔

سرعت رفتار کے تازہ ترین اعداد و شمار یہ ہیں:۔ کشتی ۱۲۴ میل فی گھنٹہ۔ موٹر ۳۰۱ میل فی گھنٹہ۔ ہوائی جہاز ۴۴۲ اور بندوق کی نئی گولی ۳۶۰۰ میل فی گھنٹہ۔

جرمنی کے ڈاکٹر اڈانف نے منجمد پٹرول طیار کیا ہے جسے SOLENE کہتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں پنیر کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے اور ہوائی جہازوں اور موٹروں میں موم بتی کی طرح جلتا ہے، یہ رقیق پٹرول سے بہتر کام دیتا ہے۔

نیو یارک میں اسوشی ایٹڈ ہاسپٹل سروس کے نام سے ایک تنظیم قایم ہے جو فی گھر ساڑھے تین آنے روزانہ لیکر ۱۸ سال سے کم عمر کے تمام لڑکوں کا علاج مفت کرتی ہے اور دوائیں وغیرہ بھی اپنے پاس سے فراہم کرتی ہے۔ پھر یہ سب کچھ خیرات کے سلسلہ میں نہیں ہوتا۔ یہ تنظیم اپنے مصارف خود پورے کر لیتی ہے۔

امریکہ کے بعض مقامات میں ٹڈے بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور کھیتوں کو کھا جاتے ہیں۔ ایک کسان نے تین ترکی مرغیاں لیں اور شام کو کھیت میں چھوڑ دیا تاکہ وہ ان کیڑوں کو کھا جائیں، لیکن صبح کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ تینوں مرغیاں بالکل بے پروبال تھیں۔

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوجاتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مُفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچروپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)

بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (سعہ) سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد (۳۱)	فہرست مضامین مئی ۱۹۳۷ء	شمارہ (۵)

ملاحظات ———————— ۲

ابونواس ———— جلیل الرحمان اعظمی ———— ۹

بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں ———— ضیاءالدین احمد "برنی" ———— ۲۵

جوشؔ کی ایک شاعرانہ لغزش؟ ———— عندلیب شادانی ———— ۴۱

خُدا کا انصاف ———————— ۴۷

یوپی کا ایک نوجوان ہندو شاعر ———————— ۶۲

مکتوبات نیاز ———————— ۷۳

منظومات ———— اثر اکبرآبادی، عدمؔ، تمکینؔ، مضطرؔ، نبی احمد بریلوی - ۷۵

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری　　　　معاون:۔ جلیل الرحمان اعظمی

جلد (۳۱)	مئی ۳۷ء	شمار (۵)

ملاحظات

دستور جدید اور کانگرس

جس طرح انفرادی طور پر انسان کی زندگی میں بعض لمحات ایسے بھی آتے ہیں [illegible] انقلاب عظیم پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اسی طرح انسان کی اجتماعی زندگی میں بھی بعض ساعتیں ایسی آتی ہیں کہ قومی ذہنیت بدلدینے کی بڑی زبردست قوت ان کے اندر ودیعت ہوتی ہے۔ پھر اگر کوئی جماعت ان ساعتوں کی اہمیت کو سمجھکر ان سے فایدہ اُٹھالیتی ہے تو وہ زندہ رہتی ہے، ورنہ زمانہ کا زبردست پہیہ گھومتا ہوا آتا ہے اور ہمیشہ کے لئے اسے پامال کرکے چلا جاتا ہے... یہ ہے قدرت کا وہ قانون جسکے تحت اسوقت تک ہزاروں قومیں بنیں بگڑیں اور آیندہ بھی بنتی بگڑتی رہیں گی۔

یکم اپریل ۳۷ء کو ہندوستان میں دستور جدید کا نفاذ ہوتا ہے اور سارے ملک میں ایک عام ہڑتال کے ذریعہ سے نہایت خاموش مگر زبردست احتجاج اس دستور کے خلاف کیا جاتا ہے۔ گویا بالفاظ دیگر

یوں سمجھئے کہ اہل ملک دستورِ جدید کو ایک لعنت قرار دیکر اس کے توڑ دینے کا مطالبہ کرتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دستورِ جدید ہندوستان کے لئے پیامِ رحمت بنکر آیا ہے اور وہی ساعتیں اپنے ساتھ لایا ہے جب قوموں کی پرانی تاریخ مٹتی ہے اور اس کی جگہ نئی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے - بارہا دیکھا گیا ہے کہ ساحل تک پہونچنے والی کشتیاں وہی تھیں جن کا رُخ ہوا کے تھپیڑے نے اِدھر سے اُدھر کر دیا تھا۔

دستورِ جدید نے جس وقت قانون کی صورت اختیار نہ کی تھی اور صرف مسودہ کی حیثیت سے پارلیمنٹ میں زیرِ غور تھا، اسوقت بھی ملک کی ہر جماعت نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا، لیکن آخرکار وہ قانون بنکر رہا، کیونکہ حکومت جانتی تھی کہ اس ملک کی مخالفت ہی کیا جہاں اختلافِ مذہب کے دیوتا پر "وطنیت" کی قربانی چڑھائی جا چکی ہو اور اب کہ اس دستور کا نفاذ ہندوستان میں ہو چکا ہے، وہ باوجود ہماری بیزاری کے ہم پر مسلط رہے گا کیونکہ حکومت کو یقین ہے کہ "نزاعِ کفر و دین" مٹنے والی چیز نہیں اور اس لئے جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ خدا کا حقیقی مسکن مندر ہے یا مسجد، (جو کبھی نہیں ہونا) حکومت سے اسکے " LION'S SHARE " چھیننے کا کس کو یارا ہو سکتا ہے۔

سنہ ۱۹ء کے اصلاحات کے بعد ہندوستان کی سیاسی حالات کی تحقیق کے لئے سنہ ۲۷ء میں سائمن کمیشن آتا ہے جو یکسر غیر ملکی افراد پر مشتمل ہوتا ہے - ملک اس کمیشن کا بائیکاٹ کرتا ہے اور اس کی شایع کردہ رپورٹ کو عام طور پر نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے - یہ زمانہ لارڈ اروِن کی حکومت کا ہے جو یہاں کی سیاسی فضا کو دیکھ کر اعلان کرتے ہیں کہ ہندوستانی حکومت کا نصب العین ڈومنین اسٹیٹس (خود مختارانہ مقبوضاتی حیثیت) حاصل کرنا ہے، چنانچہ سنہ ۱۹۳۰ء میں جب ہندوستان جنگِ آزادی میں مصروف تھا، اس مسئلہ کو طے کرنے کے لئے گول میز کانفرنس کا انعقاد طے پاتا ہے لیکن وطن پرستوں میں سے کسی ایک کو مدعو نہیں کیا جاتا، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت برطانیہ خود اس سے مطمئن نہیں ہوتی اور دوسری گول میز کانفرنس میں گاندھی جی کو بھی نمایندۂ کانگرس کی حیثیت سے شریک کیا جاتا ہے، لیکن جب گاندھی جی ہندوستان واپس آتے ہیں تو یہاں کی فضا بہت مکدر نظر آتی ہے کیونکہ لارڈ اروِن کے جانشین لارڈ ولنگڈن پوری عسکری قوت کے ساتھ کانگرس کی جنگ آزادی کو مٹانے میں مصروف نظر آتے ہیں اور لارڈ اروِن اور گاندھی جی کے درمیان جو سمجھوتا ہوا تھا اس کو نظرانداز کرنے پر مُصر - آخرکار حکومت اور کانگرس کے درمیان پھر وہی حجابات حایل ہو جاتے ہیں اور اسی باہمی کشمکش و تنفر کے زمانہ میں تیسری گول میز کانفرنس کا

انعقاد ہوتا ہے اور ۳۲ء میں سفید کاغذ (WHITE PAPER) کے نام سے دستور جدید کا خاکہ بھی شایع ہوجاتا ہے جس کا عملدرآمد گزشتہ سال، مجلس مقننہ کے انتخاب سے شروع ہوتا ہے اور آخر کار یکم اپریل ۳۷ء سے دستور جدید کا باقاعدہ نفاذ بھی ہوجاتا ہے جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۳۵ء کے نام سے موسوم ہے۔

دستور جدید کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ واضعین دستور نے اپنی تمام قابلیت اس بات میں صرف کردی ہے کہ حریت پسند یا بالفاظ دیگر کانگریسی جماعت کے اقتدار و اثر سے اسے بہت بلند (فروتر؟) رکھا جائے۔ اسی لئے انھوں نے اول تو شرایط رائے دہندگی کو اتنا سخت بنایا کہ ۲۵ فی صدی سے زیادہ رائیں اہل ملک کی حاصل نہ ہوسکیں دوسرے ہر ہر جماعت کے لئے انتخاب (جداگانہ) کی شرط لگا کر، کانگریس کی کامیابی کو زیادہ ناممکن بنا دیا۔ الغرض جہاں تک محض دستور سازی کا تعلق تھا حکومت نے ہر ممکن خلا کو پُر کرلیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ملک کے صحیح جذبات کا اندازہ کرنے سے وہ بالکل قاصر رہی۔

لارڈ ولنگڈن کی سخت گیر حکومت نے ملک کی شورش کو دبا کر برطانوی پارلیمنٹ کو یہ سمجھنے کا موقعہ دیا کہ ہندوستان کی تحریک آزادی ہمیشہ کے لئے ختم کردی گئی یا ختم کردیجا سکتی ہے اور اسی پر اعتماد کرکے دستور جدید کا چیلنج ملک کو دیدیا گیا، درانحالیکہ حقیقت یہ نہ تھی اور اس حقیقت کا راز اسوقت کھلا جب گزشتہ انتخاب میں ہندوستان کے چھ صوبوں میں کانگریس نے نمایاں کامیابی حاصل کرکے حکومت کو دکھا دیا کہ حکومت اور دوسری مخالف قوتوں کی مخالفت کے باوجود ستر فی صدی سے زیادہ رائیں اہل ملک کی اسی نے حاصل کیں۔ انتخاب کے اس نتیجہ نے سب کی آنکھیں کھولدیں اور نہ صرف غیر کانگریسی جماعتیں بلکہ حکومت نے بھی اچھی طرح محسوس کرلیا کہ لارڈ ولنگڈن جس چیز کو اپنے پندار میں "جسد بیجاں" بنا کر چلدئے تھے، اس میں نہ صرف یہ کہ آثار حیات باقی ہیں بلکہ قوت مسابقت بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے ــــ پھر میرے نزدیک یہی وہ ساعت ہے جو ہندوستان کا مستقبل اپنے اندر لئے ہوئے ہے لیکن افسوس ہے کہ اس سے فایدہ اُٹھانے کی جو تدابیر اختیار کرنا چاہئے تھیں ان کو ہم اپنے جوش کامیابی میں نظر انداز کررہے ہیں۔ یہ بالکل درست ہے کہ کانگریس کا نصب العین دستور جدید کو توڑنا اور اس کی جگہ کسی ایسے دستور کا مطالبہ کرنا ہے جو صحیح معنے میں ہندوستان کو موجودہ دفتری اقتدار سے آزاد کرائے۔ سو اس مقصد کے حصول کی دوہی صورتیں تھیں، ایک یہ کہ دستور جدید کے نفاذ میں کوئی حصہ نہ لیا جاتا اور شروع سے انتخاب ہی کو ناقابل عمل بنا دیا جاتا، دوسری یہ کہ دستور جدید ہی کے قایم کردہ اصول پر آئینی جنگ کیجاتی اور رفتہ رفتہ اپنے مطالبات حاصل کئے جاتے ــــ کانگریس کی ایک جماعت (جو سوشلسٹ جماعت کے نام سے موسوم ہے) اول صورت کی حامی تھی لیکن چونکہ اکثریت اسکی نہ تھی اس لئے طے یہی پایا کہ کانگریس انتخاب میں حصہ لے اور اپنی اکثریت سے صوبوں کی حکومت پر اقتدار حاصل کرے، چنانچہ اس نے انتخاب

میں حصہ لیا اور ہندوستان کے چھ صوبوں میں نمایاں کامیابی حاصل کرکے حکومت اور حکومت پرستوں کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ کسی اور سوال کی گنجایش نہ تھی اور انتخاب میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اس کو عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہئے تھی، لیکن کانگرس کے ارباب حل و عقد میں پھر گفتگو شروع ہوئی کہ عہدے قبول کرنا چاہئے یا نہیں اور خدا خدا کرکے یہ بھی طے ہوا، لیکن مہاتما گاندھی نے جو ہمیشہ عین وقت پر کوئی نہ کوئی بدشگونی پیدا کر دینے کے عادی ہیں، یہ شرط لگا دی کہ پہلے گورنروں سے یہ اقرار لے لیا جائے کہ وہ کانگرس کی آئینی سرگرمیوں میں کوئی دخل نہ دیں گے اور اس کے بعد وزارتیں قبول کی جائیں — اگر اس سے گاندھی جی کا مقصود یہ ہوتا کہ اس طرح وہ وزارتیں قبول کرنے کی مخالفت کر رہے ہیں تو ہم اس کو ان کی شاطرانہ چال سمجھ کر خاموش ہو جاتے، لیکن لطف یہ ہے کہ وہ انتہائی سادگی سے یہ بھی فرماتے جاتے ہیں کہ انھوں نے یہ شرط عاید کرکے گورنروں سے کوئی ایسا اقرار نہیں چاہا تھا جو دستورِ جدید کے اقتضاء کے خلاف ہوتا۔ بہرحال اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ یعنی چھ صوبوں کے گورنروں نے جہاں کانگرس کی اکثریت تھی ایسا اقرارنامہ داخل کرنے سے انکار کر دیا اور دوسری جماعتوں کی وزارتیں مرتب کرکے کام شروع کر دیا۔ اب کانگرسی جماعت اس کی منتظر ہے کہ اسمبلیوں کے جلسے طلب کئے جائیں اور وہ ان وزارتوں کو توڑ کر حکومت کی راہ میں مشکلات حایل کر دیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان تدبیروں سے وہ دستورِ جدید کو ناقابل عمل ضرور بنا سکتے ہیں لیکن اس سے کوئی فایدہ نہیں اٹھا سکتے۔

اگر دستورِ جدید کو توڑنا ہی ان کا مقصود تھا تو اس کی صحیح تدبیر صرف یہ تھی کہ انتخاب میں بھی حصہ نہ لیا جاتا اور حکومت کے ضمیر میں یہ خلش پیدا کر دی جاتی کہ جو کچھ وہ کر رہی ہے ملک کی اکثریت کے خلاف کر رہی ہے، لیکن جب کانگرس نے انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت دیدی تو اس کے معنے صرف یہ تھے کہ اب وہ آئینی جنگ کرنا چاہتی ہے اور وزارتیں قبول کرکے جنگ کی یہی صورت اسے قایم رکھنا چاہئے تھی۔

یہ بالکل درست ہے کہ دستورِ جدید میں گورنروں کو اسقدر وسیع اختیارات دیدئے گئے ہیں کہ ان کی مرضی کے خلاف وزارتیں اور اسمبلیاں کچھ نہیں کر سکتیں، لیکن حصولِ اختیار اور استعمالِ اختیار میں بڑا فرق ہے اور اس لئے جب تک گورنروں کے طرزِ عمل سے یہ بات ثابت نہ ہو جاتی کہ وہ اپنے اختیارات کا بیجا استعمال کر رہے ہیں اسوقت تک کسی طرح مناسب نہ تھا کہ اس کا تاریک پہلو سامنے رکھ کر خواہ مخواہ گورنروں سے یہ کہا جاتا کہ "تم چھیڑو گے ضرور" — اس سے انکار ممکن نہیں کہ دستورِ جدید ہندوستان کی خواہش آزادی کو کسی طرح پورا کرنے والا نہیں اور یہ بھی بالکل درست ہے کہ صوبجاتی خودمختاری کی حیثیت ایک استبدادی حکومت سے زیادہ نہیں ہے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ اسکو آزادی ہندوستان کی طرف

پہلا قدم بتاتی ہے اور ہم کو اُسکے اسی بیان سے فایدہ اُٹھا کر دستور کی آمرانہ حیثیت کو توڑنا چاہئے۔ برطانوی قوم لاکھ خودغرض سہی، لیکن اسی کے ساتھ اسکی آئین پسندانہ ذہنیت اتنی زبردست ہے کہ سخت اشتعال کی حالت میں بھی وہ آئین کے حدود سے آگے نہیں بڑھتی یہاں تک کہ اگر وہ کوئی ظلم کرنا چاہتی ہے تو پہلے اس ظلم کا ایک قانون بنا دیتی ہے اس لئے اگر ہم تسلیم کر لیں کہ دستور جدید بکسر آئینی استبداد ہے تو بھی اس سے انکار ممکن نہ تھا کہ اسکے اندر بعض اُصولی باتیں یقیناً ایسی پائی جاتی ہیں، کہ اگر گورنر جا و بیجا اپنے اختیارات ذاتی استعمال کرنے لگیں تو ہم برطانوی حکومت کی نیت کو ضرور مجبوب کر سکتے ہیں۔ اس لئے اگر کانگرس آئینی جنگ کرنا چاہتی تھی تو اسکو بلا پس وپیش وزارتیں قبول کرکے اصطلاحات کا کام شروع کر دینا چاہئے تھا اور دیکھنا چاہئے تھا کہ گورنروں کا طرزِ عمل استعمال اختیارات کے باب میں کیا ہے۔ اگر وہ ان کا بیجا استعمال کرتے تو بیشک وزارتوں سے دست بردار ہو جانا چاہئے تھا اور یہ صورت علٰحدگی کی زیادہ شاندار اور زیادہ مفید ہوتی۔ لیکن وزارتیں قبول کرنے اور کام شروع کرنے سے قبل ہی یہ یقین کر لینا کہ گورنر ضرور ان کے کام میں حارج ہوں گے، اور کام کو ہاتھ نہ لگانا نہ صرف یہ کہ مصلحت و تدبیر کے منافی ہے بلکہ اس میں ایسا چھچھورا پن پایا جاتا ہے جو کانگریس کی سنجیدگی کو صدمہ پہونچانے والا ہے۔

یہ بحث کرنا کہ گورنر از روئے دستور جدید کوئی وعدہ کر سکتے تھے یا نہیں، سوائے اس کے کوئی معنی نہیں رکھتا کہ قانونی موشگافیاں کر کے فضول وقت ضایع کیا جائے کیونکہ اگر گاندھی جی یہ شرط عاید کرنے کے بعد بھی یہی سمجھتے تھے کہ گورنروں کے اختیارات خصوصی بدستور اپنی جگہ باقی رہتے ہیں تو پھر اس وعدہ کا لینا نہ لینا دونوں بیکار تھا اور اگر وہ یہ سمجھتے تھے کہ گورنر ایسا وعدہ کرنے کے بعد اپنے اختیارات خصوصی سے محروم ہو جائے گا تو یہ ان کی نادانی تھی۔

بہرحال اسوقت کانگرس کا یہ طرزِ عمل کسی طرح قرینِ عقل نہیں کہا جا سکتا اور یقیناً اس نے وزارتیں قبول نہ کر کے ملک کے اغراض و مقاصد کو کافی نقصان پہونچایا ہے۔ کانگرسی جماعتوں کے بجائے اسوقت جتنی غیر کانگرسی جماعتیں وزارت کی خدمات انجام دے رہی ہیں وہ بھی حتی الامکان ہندوستان کی اقتصادی پستی دور کرنے کی عملی تدابیر اختیار کر رہی ہیں اور اسوقت تک کسی گورنر نے ان کی راہ میں کوئی دشواری حایل نہیں کی اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اگر کانگرسی وزرا بھی عہدے قبول کر کے واقعی اصطلاحات کی طرف متوجہ ہوتے تو ان کو پوری آزادی دیجاتی۔ البتہ اگر ان کا مقصود صرف دستور کو توڑنا ہوا اور وہ بجائے تعمیری کاموں کے صرف تخریبی صورتیں اختیار کرنے کے لئے آنا چاہیں تو بیشک گورنر ان کو اس کی اجازت نہ دے گا اور نہ اس تدبیر سے ملک کو کوئی فوری فایدہ پہونچ سکتا ہے —— بہرحال اسوقت صورتِ حالات امید افزا نہیں ہے اور اگر اہل کانگرس کی یہی ذہنیت قایم رہی تو بظاہر قیام فیڈریشن کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ گاندھی جی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنی اس غلطی کا احساس ضرور ہے لیکن اسی کے ساتھ بات کی پچ بھی ہے اور اس وقت تک وہ

اس گتھی کو جو خود انھیں کی ڈالی ہوئی ہے سلجھا نہیں سکے۔ یہ حال تو ہوا ہندوؤں یا ان لوگوں کا جو کانگرسی کہلاتے ہیں اب رہگئیں دوسری جماعتیں جن میں مسلمانوں کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، سو ان کا یہ حال ہے کہ وہ کانگرس کی کامیابی سے چونکی تو ضرور ہیں لیکن ابھی تک آنکھیں ملنے سے انھیں فرصت نصیب نہیں ہوئی۔

اس سے قبل بھی ہم لکھ چکے ہیں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کو کانگرس میں شریک ہوکر کام کرنا چاہئے اور تمام وہ مسایل جن میں وہ حکومت کی مدد چاہتے ہیں کانگرس کے پلیٹ فارم پر طے ہونا چاہئے۔ کانگرس کسی مخصوص جماعت کی انجمن نہیں ہے بلکہ وہ سارے ہندوستان کی سیاسی مجلس ہے۔ میں نے بعض مسلمانوں کو کہتے سُنا ہے کہ کانگرس پر ہندو جماعت قابض ہے اور اسلئے انکے مطالبات پر غور کئے جانے کی وہاں کوئی صورت نہیں۔ یہ صحیح ہے لیکن کیا میں یہ سوال کرسکتا ہوں کہ ان کو کس نے منع کیا تھا کہ وہ یلغار کرکے کانگرس پر قابض نہ ہوجائیں، اور اب بھی اگر وہ اس پر آمادہ ہوجائیں تو کون انھیں روک سکتا ہے۔ جمعیتہ العلماء ہو یا مجلس احرار، مسلم لیگ ہو یا کوئی اور جماعت، اسوقت ان سب کا وجود بے معنی ہے اور مسلمان اگر کوئی سیاسی اہمیت حاصل کرسکتے ہیں تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ پوری اجتماعی قوت کے ساتھ وہ کانگرس میں حصہ لیں۔

نوادر ندوۃ العلماء مسلمانوں کے کلچر کی وہ خصوصیت جو کسی حال میں بھی ان سے منفک نہیں ہوئی، اعتمادِ ذات اور خودداری نفس تھی اور علماء سلف کے تذکروں میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں، لیکن اب ہمارے علماء کرام اور ان کے قایم کئے ہوئے اداروں کی عزتِ نفس کا جو عالم ہے اس کا اندازہ ناظم صاحب ندوۃ العلماء کے اس سپاسنامہ سے ہوسکتا ہے جو نواب صاحب رامپور کی خدمت میں ذریعۂ بقار حقیقت پیش کیا گیا ہے۔ اس کی آخری سطریں ملاحظہ ہوں:-

> "تمام ارکان ندوۃ العلماء ہز ہائینس حضور نواب صاحب بہادر کے دل سے شکرگزار ہیں اور بارگاہ رب العزت میں دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضور نواب صاحب ممدوح کو صحت و عافیت کے ساتھ عرصۂ دراز تک زندہ و سلامت رکھے اور ریاست رامپور کو سرسبز اور ابدالآباد تک قایم رکھے اور ترقیات عطا فرمائے۔ عبدالعلی۔ ناظم ندوۃ العلماء

ان الفاظ کو غور سے پڑھئے اور قطع نظر اس سے کہ ادبی حیثیت سے وہ حد درجہ طفلانہ ہیں، یہ دیکھئے کہ ان سے کتنی گدایانہ ذہنیت ٹپک رہی ہے۔ نواب رامپور نے احسان فرمایا ہو یا اپنا فرض ادا کیا ہو اس سے بحث نہیں، رقم تین سو کی ہو یا تین لاکھ کی یہ بھی خارج از گفتگو ہے۔ لیکن غور طلب امر صرف یہ ہے کہ کیا رسم تشکر اس سے زیادہ سنجیدہ و متین الفاظ میں ادا نہ کیجا سکتی تھی، کیا ندوۃ العلماء اصول ادب و انشاء سے اسقدر بیگانہ ہوگیا ہے کہ اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اجتماعی نقطۂ نظر سے رابطۂ عطا و قبول کی صورت، انفرادی رابطۂ عطا و قبول سے بالکل مختلف ہوا کرتی ہے۔ پھر سب سے

زیادہ حیرت اس امر پر ہے کہ یہ الفاظ جناب سید عبدالعلی صاحب (ناظم ندوۃ العلماء) کے قلم سے نکلے ہیں جو پیرزادہ ہونے کی حیثیت سے بخوبی واقف ہیں کہ بزرگوں کے یہاں تو بڑے سے بڑا احسان بھی "نذر" سے زیادہ حیثیت اختیار نہیں کرتا، چہ جائیکہ تین سو روپیہ کی حقیر رقم ــــ بہرحال یہ الفاظ گداگروں کے لئے تو موزوں ہو سکتے تھے لیکن ندوۃ العلماء کے شایان شان کسی طرح نہ تھے، پھر اگر یہ مذہبی و علمی ادارہ روپیہ فراہم کرنے کے لئے اسقدر نیچے گرنے کو بھی جائز سمجھتا ہے تو فرض کیجئے اگر کل میں پانسو روپیہ کی رقم ندوۃ العلماء کے خزانہ میں داخل کرنے کا وعدہ کرلوں تو کیا وہ اس سے زیادہ لجاجت آمیز دعائیہ قصیدہ ایک وفد کے ذریعہ سے میرے حضور میں پیش کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ یہ ایک تفنن ہے۔

اس سے قبل بھی یہ بات میرے کانوں میں پڑ چکی تھی اور ایک ہفتہ ہوا کہ پھر مجھے یہ اطلاع پہونچائی گئی کہ مولانا حبیب الرحمان خاں صاحب شروانی نے اپنی طرف سے ایک وظیفہ ندوہ کے اس طالب علم کے لئے مخصوص کر دیا ہے جو داڑھی بڑھانے میں دیگر طلبہ پر سبقت لیجائے۔ میں نے ناظم صاحب ندوۃ العلماء سے استفسار کیا کہ کیا واقعی یہ خبر صحیح ہے، لیکن جیسا کہ اس سے قبل ہمیشہ میرے سوالوں کا جواب خاموشی سے دیا گیا ہے، اس مرتبہ بھی اسی سکوت سے کام لیا گیا اور مجھے یہ سمجھنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا کہ یہ اطلاع غلط نہیں ہے ــــ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جس طالب علم کو یہ وظیفہ دیا جاتا ہے، ہر مہینے اس کی داڑھی کی پیمایش کی جاتی ہے اور غور کیا جاتا ہے کہ اس نے اضافۂ اقدس میں کتنی کامیابی حاصل کی ہے۔ بہرحال اس سے اور کوئی فایدہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر کسی وقت "حسن نسائی" کے ساتھ ساتھ "درازی ریش" کے مقابلہ کا بھی موقعہ آیا تو عورتوں کے عریاں و نامقدس حُسن کے سامنے، ندوہ کے طالب علم اپنی مقدس داڑھیوں کا "جوڑ پھڑکانے" میں غالباً ناکام نہ رہیں گے۔ یہ سبب ہے ہمارے علمی اداروں کی گری ہوئی ذہنیت اور یہ رہگیا ہے مفہوم مذہب و تعلیم مذہب کا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مسلمان داڑھیاں نہ رکھیں، میں اسکو بھی بُرا نہیں سمجھتا کہ ندوہ کے طلبہ کو داڑھی منڈوانے سے باز رکھا جائے لیکن اس کی بہترین تدبیر صرف یہ ہے کہ طلبہ کی ذہنیت میں ایسی تبدیلی پیدا کی جائے کہ وہ طمع یا خوف نہیں بلکہ واقعی شعار اسلامی کے جذبہ سے مجبور ہو کر خود اس حرکت سے باز رہیں۔ ورنہ اس سے کیا فایدہ کہ جب تک شروانی صاحب کے وظیفہ کی لالچ یا ناظم صاحب کے احتساب کا خوف باقی ہے اسوقت تک تو وہ داڑھی بڑھائیں گے لیکن جب تعطیلوں میں وہ دارالعلوم کی حدود سے باہر نکلیں تو سب سے پہلے یہ بوجھ ہلکا کرنے کے لئے انھیں نائی کی جستجو پیدا ہو۔

کاغذ کا مسئلہ اسوقت کاغذ نہ صرف یہ کہ بہت گراں ہوتا جاتا ہے بلکہ بازار میں آسانی سے ملتا بھی نہیں۔ یہاں لکھنؤ میں خود کاغذ کی مل ہے لیکن اس کو گورنمنٹ ہی کی فرمایش پوری کرنے سے فرصت نہیں ملتی، پبلک کے مطالبات کا کیا ذکر ہے ــــ

فلڈبی کا ٹُوداجو کاغذ کی طیاری میں صرف کیا جاتا ہے اس وقت دو چند سے زیادہ گراں ہو گیا ہے اور غالباً کئی سال تک یہی حالت رہے گی جس کا اثر رسایل و اخبارات پر بہت خراب پڑ رہا ہے اور پڑے گا۔

پبلک کے ذوق کو دیکھتے ہوئے اسکی جرأت تو کسی جریدہ کو نہیں ہو سکتی کہ وہ قیمت میں اضافہ کرے البتہ وہ یہی کر سکتا ہے کہ کاغذ ہلکے قسم کا استعمال کرے، چنانچہ اس ماہ نگار کی بعض کاپیاں بجائے ۲۴ پونڈ کاغذ کے ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر چھاپی گئی ہیں اور اگر روز افزوں گرانی کا یہی عالم رہا تو مجبوراً ہمیں بھی ناروے کے کاغذ پر اُتر آنا پڑے گا جسے پنجاب کے بعض رسایل اب استعمال کرنے لگے ہیں ــــ وہ لوگ جو صورت نہیں معنی و حقیقت کو دیکھتے ہیں ان سے تو نہیں لیکن جو صورت و سطح کے شایق ہیں اُن سے ضرور اپنی اس مجبوری کا اظہار کرنا ہے درانحالیکہ ظاہری حُسن و نمایش کے لحاظ سے نگار کبھی کوئی خصوصیت حاصل نہیں کرسکا، اور نہ اسوجہ سے کوئی اُس کا مطالعہ کرتا ہے۔

ابونواس

اور

اُس کی شاعری

ابونواس[1] کو پبلک میں روشناس کرنے اور اُس کے کلام پر فنی اعتبار سے نظر ڈالنے کا بہترین طریقہ تو یہ تھا کہ اُس کے اصناف کلام کا ایک معتد بہ حصہ نقل کیا جاتا اور اُس کی وہ خصوصیات بیان کی جاتیں جن میں وہ متفرد ہے اور وہ خوبیاں نمایاں کرکے دکھائی جاتیں جو اُس کے کلام کی خصوصیات ہیں پھر وہ جس مرتبہ کا شاعر ہے اُسی مرتبہ کے شعراء کا کلام پیش کرکے اُس کے کلام کا موازنہ کیا جاتا، تاکہ اس کے مرتبۂ شاعری کا صحیح اندازہ ہوسکتا

مگر یہ طریقہ ایک مضمون نگار کے لئے جس قدر دشوار ہے اُس سے زیادہ عربی زبان کی کس مپرسی اور کساد بازاری کے موجودہ عہد میں پبلک کے لئے غیر دلچسپ بھی ہے، اس لئے میں نے اُس کے کلام سے صرف اُسی حصہ کو منتخب کیا ہے جس سے ہر شخص لطف اُٹھا سکتا ہے۔

ابونواس کے کلام کا اگر تجزیہ کیا جائے تو مضامین کے اعتبار سے اُس کے کلام کا بڑا حصہ چار ابواب پر

---

[1] ابونواس کا نام "حسن بن ہانی" تھا، نواس عربی لفظ ہے جس کے معنے زلف کے ہیں، چونکہ ابونواس کے بڑی بڑی زلفیں تھیں اس لئے لوگ اُسے "ابونواس" یعنی زلفوں والا کہنے لگے۔ یہ کیفیت بعد میں اس قدر مشہور ہوئی کہ لوگ اُس کا اصلی نام بھول گئے۔

اُس کا باپ بصرہ کا رہنے والا تھا اُس نے ایک ایرانی عورت سے شادی کرلی تھی جس سے ابونواس پیدا ہوا، ولادت و وفات کی صحیح تاریخ بتانا مشکل ہے مگر زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ۱۴۵ھ میں پیدا ہوا اور ۱۹۵ھ میں اُس نے انتقال کیا

تقسیم ہو سکتا ہے، قصائد[1]، غزلیات[2]، خمریات[3]، ہزلیات، میں نے اپنے مضمون میں انھیں ابواب کے اقتباسات پیش کئے ہیں۔

گو اُس کے مجموعۂ کلام میں فخر و حماسہ، ادب و حکمت، مرثیہ اور ہجو وغیرہ پر بھی جستہ جستہ اشعار ملتے ہیں لیکن ان ابواب شاعری سے نہ ابونواس کو کچھ دلچسپی تھی اور نہ اُس میں وہ کوئی امتیازی شان رکھتا تھا، اس لئے میں نے اُس کے ذکر سے قصداً گریز کیا ہے۔

ابونواس کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اُسکی شاعری رندانہ عیش و طرب کی شاعری ہے۔ اُس میں والہانہ شیفتگی و دیوانگی پائی جاتی ہے، اُس کی زبان شستہ اور طرز بیان شگفتہ ہے، اُس کے الفاظ شیریں اور سریلے ہیں، استعارات و کنایات پر کیف اور وجد آور ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو، وہ اپنی معشوقہ کو مخاطب کر کے اپنی شدتِ محبت کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے:۔

احللتِ من قلبی ھواکِ محلّۃً	تو نے اپنی محبت میرے دل میں ایسی جگہ پہونچا دی ہے،
ما حلّھا المشروب والماکول	جہاں کھانے پینے کی چیزوں میں سے کسی کی رسائی نہیں

یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ محبت دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو گئی ہے، ابونواس کا یہ انداز بیان بالکل اچھوتا ہے

ملٹن، شاعری میں تین چیزیں ضروری سمجھتا ہے، سادگی، جوش اور حقیقت ابونواس کے کلام میں اگر بہ نظر غایر دیکھا جائے تو یہی چیزیں ملیں گی، اُس کے اشعار اُس کے جذبات و احساسات کی صحیح تصویر ہوتے ہیں وہ عیش و نشاط، شراب و کباب اور مختلف کیفیات زندگی کے ترانے گاتا ہے اور اپنے اشعار کے ذریعہ سے اپنے دلی کیفیات پیش کرتا ہے، جس میں کہیں شراب و کباب کا ذکر ہے، کہیں ہجر و فراق کے نالے، کہیں رندان قدح خوار کے لطیفے ہیں اور کہیں معشوق طرحدار کے چوچلے الغرض اُس کے اشعار اُس کے واردات قلبی کا صحیح عکس ہیں۔

ابونواس بہت آزاد خیال اور رند مشرب آدمی تھا، وہ مذہبی قید و بند سے قطعی آزاد تھا وہ جو کچھ کرتا تھا علانیہ کرتا تھا، اُس کا کوئی کام شرمندۂ ریاکاری نہ تھا، وہ رند خرابا تی تھا، شرابی تھا اور بالکل علانیہ، ملاحظہ ہو کہتا ہے:۔

الا فاسقنی خمراً وقل لی ھی الخمرُ	ہاں! مجھے شراب پلاؤ اور مجھ سے کہو کہ یہ شراب ہے۔
ولا تسقنی سراً اذا امکن الجھرُ	جب کھلم کھلا یہ سب کچھ ممکن ہے تو پھر چھپانے کی ضرورت کیا ہے

---

[1] یہ اور اُسکے بعد کے تمام آنے والے اشعار اور اُنکے متعلق علمار کے اقوال میں نے "دیوان ابی نواس" اور ایک مصری مصنف علامہ ابن منظور کی کتاب "تاریخ ابی نواس" سے نقل کئے ہیں، بار بار حوالہ دینا بے سود ہوگا، جسے دیکھنا ہو اصل دیوان اور تاریخ ابی نواس" کا مطالعہ کرے۔

وہ فطرۃً بڑا شوخ مزاج اور ظریف واقع ہوا تھا، اُس کو اپنی فحش گوئی میں بڑا لطف آتا تھا، اُسکے اس قسم کے اشعار گو اخلاق سے گرے ہوئے ہیں جسے کوئی متین اور سنجیدہ انسان پڑھنا بھی گوارا نہ کریگا لیکن اس میں شک نہیں کہ انھیں مفوات ولغویات میں جواہر پاروں کا ایک بیش بہا ذخیرہ بھی دفن ہے جسے مکروہ چیز سمجھ کر کوئی چھوتا تک نہیں۔

امرد پرستی عہد عباسیہ کے خصوصیات میں سے تھی، ابونواس چونکہ خود بہت ہی حسین اور خوبصورت تھا اس لئے ابتدا عمر سے شاہد بازی کے ساتھ ہی ساتھ خود ایاز بننے کا جو چسکا اُس کو پڑگیا تھا وہ کبھی نہ چھوٹا ملاحظہ ہو وہ اپنا ایک واقعہ خود ہی بیان کرتا ہے:۔

۱۔ ولقد ابیت علی السریر منعمًا ما بین غانیۃٍ وبین غلام	میں نے رات ایک دوشیزہ اور ایک لڑکے کے درمیان بڑے آرام سے گزاری۔
۲۔ فانیکہا ویَنِیکُنی وانیکہ الّذٖ من خلفٍ ومن قدّام	میں اُس دوشیزہ سے حاقت کر رہا تھا اور وہ لڑکا مجھ سے، میں آگے اور پیچھے دونوں طرف سے لطف اُٹھا رہا تھا

ٹالسٹائی کے نظریہ کے مطابق آرٹ کا کمال یہ ہے کہ وہ کسی مخصوص طبقہ کی ملکیت نہ ہو بلکہ اُسکا فیض عام وخاص، جاہل وتعلیم یافتہ، چھوٹے بڑے سب کے حق میں یکساں ہو، ابونواس کے کلام کا اگر آپ بنظر غائر مطالعہ فرمائیں تو آپ کو یہی چیز اُس میں ملے گی۔ اگر وہ ایک طرف شاہی درباروں میں بادشاہ، وزراء اور اُن کے مصاحبین کے لئے دہرآور تھا تو دوسری طرف میخانہ نائونوش کی گرما گرم مجلسوں میں پیرِ مغاں اور اُن کے یاران قدح خوار کے لئے بے انتہا نشہ آور، اگر وہ اپنے شاعرانہ اعجاز اور ادیبانہ کمال کی وجہ سے علماء وادباء کی محفلوں میں مقبول تھا تو جہلاء اور رندوں کی عیش گاہوں میں بھی سرور وکیف پیدا کرنے کے لئے اس کا کلام کم دلچسپ نہ سمجھا جاتا تھا۔

اگرچہ زمانہ نے اپنی بساط کے موافق ابونواس کی کافی قدر کی۔ اور بارہا دربار خلافت سے خلعت و انعامات بھی اُسے ملے، مگر جب اُس کی شاعری کے اعجاز کا اندازہ کیا جاتا ہے تو کہنا پڑتا ہے کہ یہ تمام قدردانی زیادہ سے زیادہ اُس پیرزال کی سی قدر دانی تھی جو ایک سوت کی انٹی لیکر یوسف کی خریداری کو مصر کے بازار میں آئی تھی۔

گو ابونواس کی ساری زندگی کا بڑا کارنامہ صرف اُس کی شاعری ہے تاہم اُس کے صرف اسی ایک کام نے عربی شاعری کو نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ زمانہ کتنی ہی کروٹیں بدلے، شام وسحر کی ہزارہا نیرنگیاں ظہور پذیر ہوں مگر اُس کے اشعار کی قدر وقیمت کسی طرح کم نہیں ہوسکتی۔

فنون شاعری میں کمال یہ عجیب بات ہے کہ ایران میں اُسوقت شاعر کے لئے مختلف علوم وفنون میں کامل ہونا ضروری تھا، چنانچہ وہاں کے تمام مشاہیر شعرا نامور علماء وفضلا تھے لیکن اس کے بالکل برعکس عرب میں وہی شعرا فن شعر کے امام اور پیشوا خیال کئے جاتے تھے جو جاہل تھے اور ایک حرف لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، شاعری اُن کی خمیر میں داخل تھی، نہ اُن کو عروض وقوافی کی ضرورت تھی اور نہ وہ فن بلاغت ومعانی سیکھنے کے محتاج تھے، بلکہ معانی وبیان، عروض وقوافی کی جتنی کتابیں آج ہم کو نظر آرہی ہیں وہ سب انھیں کے کلام سے ماخوذ ہیں۔

ابونواس کی تعلیم گو معمولی طور پر ہوئی تھی مگر شاعری میں اُس کو اس قدر قدرت حاصل تھی کہ جس مضموں کو چاہتا تھا بڑی خوبی سے ادا کر دیتا تھا، فلسفہ اور علم کلام کے اہم مسایل جسے جید علماء بڑے بڑے دفتروں میں بھی حل نہیں کر پاتے تھے ابونواس اپنے چند شعروں میں حل کر دیتا تھا، ملاحظہ ہو "جزء لایتجزیٰ" کا معرکۃ الآرا مسئلہ کس خوبی سے وہ اپنے ان دو شعروں میں حل کرتا ہے، وہ اپنی محبوبہ سے بیوفائی اور بے مروتی کی شکایت کرتا ہے اور کہتا ہے:۔

۱۔ ترکتِ منی قلیلاً من القلیل اقلاً،	تو نے اپنے دل میں میرے لئے بہت کم گنجائش رکھی۔
۲۔ یکاد لایتجزیٰ اقل فی اللفظ من "لا"	یہاں تک کہ "نہیں" سے بھی کم جس کا تجزیہ ممکن نہیں۔

دورِ عباسیہ کا مشہور امام نظام نے جب یہ شعر سنے تو پھڑک اُٹھا اور اُس نے ابونواس سے کہا خدا کی قسم تمہارے "اشعر الناس" ہونے میں کسے شبہ ہو سکتا ہے، جس مسئلہ میں ہم برسوں سر کھپاتے رہے اُسے تم نے جس خوبی سے ان دو شعروں میں حل کیا ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے۔

یہ مسئلہ اپنی جگہ پایۂ ثبوت کو پہونچ چکا ہے کہ جب کوئی چیز حد سے زیادہ ٹھنڈی ہوتی ہے تو تاثیر اُسکی گرم ہوتی ہے، دیکھئے ابونواس اس مسئلہ کو کتنے پاکیزہ طریقہ سے بیان کرتا ہے، کہتا ہے:۔

۱۔ قل لزهیر اذا احدا رشدا	زہیر سے کہدو کہ جب وہ کسی چیز کی تعریف کرے تو صحت کا خیال رکھے
اقلل او اکثر فانت مهذار	کمی کرو یا زیادتی دونوں صورتوں میں تمہارا اعتبار نہیں،
۲۔ سخنت من شدة البرودة حتی	تم شدت برودۃ کی وجہ سے اب گرم ہو گئے ہو
صرت عندی کانک النار	گویا اب تم میرے لئے آگ کی طرح ہو
۳۔ لایعجب السامعون من صفتی	سامعین میری اُس بات پر تعجب نہ کریں، اس لئے کہ
کذلک الثلج بارد حار	برف باوجودیکہ ٹھنڈی ہوتی ہے لیکن تاثیر اُس کی گرم ہے

ایک اور جگہ علم کلام کے اُس مسئلہ پر روشنی ڈالتا ہے، جس کا فیصلہ بدقسمتی سے ابتک نہیں ہوا یعنی

"صفت عین ذات ہے یا نہیں" وہ اپنی ایک پر جمال معشوقہ کی تعریف میں کہتا ہے جس کا نام بھی حسن اتفاق سے "حُسن" تھا۔

۱۔ ان اسم حُسن لوجھا صفۃٌ ولا اری ذا فی غیرہا اجتمعا	"حُسن" کا نام درحقیقت اُس کے چہرہ کی صفت ہے۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ اُسکے علاوہ کسی میں یہ بات نہیں پائی جاتی
۲۔ فہی اذا سُمّیت فقد وُصفت فیجمع الاسم معنیین معاً	یہ عجیب بات ہے کہ اُسکا نام جب "حُسن" رکھا گیا تو وہ اُسکے کے لئے صفت بھی بن گیا۔ اور اس طرح ایک ہی اسم میں دو معنی جمع ہو گئے

کلام میں فارسیت چونکہ ابونواس اپنی ماں کی طرف سے فارسی النسل تھا اس لئے شروع شروع اُس کے کلام میں عجمیت کا رنگ پایا جاتا تھا مثلاً وہ ایک جگہ شراب کی تعریف میں کہتا ہے :۔

۱۔ تدار علینا الکأس فی عسجدیۃ حبتہا بانواع التصاویر فارس	ہمارے سامنے سونے کے جام میں شراب پیش کی جارہی تھی جس میں مختلف قسم کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔
۲۔ قرارتہا کسریٰ وفی جنباتہا مہیً تدریہا بالقسی الفوارس	تہ میں کسریٰ کی تصویر تھی اور اُس کے پہلو میں بڑے بڑے شہسواروں کے فوٹو تھے جو تیر و کمان چلا رہے تھے۔

....

....

....

شعر گوئی کے اوقات جو لوگ شاعر ہیں وہ اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ بعض مرتبہ شعر گوئی کی مشق کے باوجود طبیعت میں ایسا انقباض پیدا ہو جاتا ہے جس کے بعد ایک شعر کہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

ذوالرمہ سے کسی نے دریافت کیا کہ جب تمہاری طبیعت کند ہوتی ہے تو تم شعر کیونکر کہتے ہو اُس نے کہا میں اُسوقت تنہائی میں بیٹھ کر اپنی کسی محبوبہ کو یاد کرنے لگتا ہوں۔

اخطل، ایسے حالات میں کسی پرفضا مقام پر سیر و تفریح کے لئے چلا جاتا تھا، اور شراب پی کر طبیعت میں روانی پیدا کرتا تھا۔

ابونواس عموماً ایسے اوقات میں شعر کہا کرتا تھا جب وہ بہت خوش دل و سرشار ہوتا تھا، پھر اُسوقت وہ اور بھی عمدہ شعر کہتا تھا جب کہ اسے کسی خاص صلہ کی توقع ہوتی تھی، اس کے علاوہ وہ جو کچھ کہتا تھا اُسے

خودپسند نہیں ہوتا تھا۔

شاعری میں ابونواس کا مرتبہ جس طرح متقدمین شعراء عرب میں امرا القیس کا مرتبہ مسلم ہے، اسی طرح مولدین میں ابونواس کے اعجاز کا کوئی منکر نہیں۔

علماء ادب نے زمانہ کے اعتبار سے عربی شاعری کو چار دوروں میں تقسیم کیا ہے، جاہلیین مخضرمیین اسلامیین، مولدین۔ جاہلیین سے مراد وہ شعراء ہیں جو ظہور اسلام سے قبل گزرے ہیں، اُن کا زمانہ تقریباً ڈیڑھ سو برس رہا ہے، اُن میں سے حسب ذیل مشہور گزرے ہیں:۔

امرا القیس، طرفہ بن عبد، زہیر بن ابی سلمی، عمرو بن کلثوم، عنترہ بن شداد، نابغہ ذبیانی، حارث بن حلزہ، عروۃ بن ورد، اعشیٰ اور مہلہل وغیرہ۔

وہ شعراء جنھوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں عہد پائے تھے "مخضرمی" کہلاتے ہیں، اُن میں سے حسان بن ثابت، نابغہ جعدی، کعب بن زہیر، لبید بن ربیعہ اور ابوذویب وغیرہ مشہور ہوئے ہیں۔

جن شعراء نے جاہلیت کا زمانہ نہیں پایا بلکہ عہد اسلام میں نشو ونما پائی اُن کو "اسلامی" کہتے ہیں جنمیں سے فرزدق، جریر، اخطل، بشار بن برد، کثیر، جمیل، نعمان بن بشیر، کمیت بن زید اور مسکین دارمی وغیرہ نامور گزرے ہیں۔

پھر جو شعراء عہد عباسیہ میں پائے گئے وہ "مولدین" کہلاتے ہیں، اُن میں سے ابوالعتاہیہ ابونواس، ابن المعتز، ابن الرومی، ابوالعلاء المعری، ابوفراس، ابوتمام، بحتری اور متنبی وغیرہ مشہور گزرے ہیں۔

ابونواس اسی چوتھے دور یعنی مولدین میں سے تھا، یہ مسئلہ ابتک طے نہ ہوسکا کہ عرب کا سب سے بڑا شاعر کون تھا، دراصل یہ کوئی آسان بات بھی نہ تھی، اس لئے کہ ہر شخص کا مذاق مختلف ہوتا ہے تاہم عام طور پر علماء ادب، متقدمین میں امرا القیس اور متاخرین میں ابونواس کو تمام شعراء عرب پر ترجیح دیتے ہیں۔

ابوتمام جو عہد عباسیہ کا بڑا زبردست شاعر اور ادیب گزرا ہے کہا کرتا تھا کہ "ابونواس اور مسلم بن ولید میرے لات وعزیٰ ہیں جن کی میں صبح و شام پرستش کرتا ہوں۔

ابوالعتاہیہ سے جو مولدین میں بہت بلند پایہ شاعر گزرا ہے کسی نے دریافت کیا کہ تمھارے نزدیک "اشعر العرب" کون ہے؟ اُس نے کہا سرزمین عرب کا سب سے بڑا شاعر جسکی مثال متقدمین اور متاخرین میں کہیں نہیں ملتی وہ ہے جسکے یہ اشعار ہیں۔

۱۔ اذا نحن اثنینا علیک بصالح	جب ہم تیری تعریف کرتے ہیں تو
فانت الذی نثنی وفوق الذی نثنی	تو ہی اسکا صحیح مستحق ہوتا ہے، اگرچہ تیری ہستی اُس سے بالاتر ہے

۲- وان جرت الالفاظ یوماً بمدحة لغیرک انساناً فانت الذی نعنی ،	اگر کبھی کوئی لفظ کسی دوسرے کی تعریف میں ہماری زبان سے نکل جاتا ہے تو اُس وقت بھی حقیقتاً ہمارا مقصود تیری ہی ذات ہوا کرتی ہے ۔

اُس شخص نے کہا یہ تو ابونواس کے شعر ہیں ابوالعتاہیہ نے جواب دیا - " ہاں ! ہاں ! ابونواس ہی اشعر العرب ہے "

ابوالعتاہیہ کہا کرتا تھا کہ میں نے زہد پر سولہ ہزار شعر لکھے ہیں جن کا ایک ثلث میں ابونواس کے صرف اس قصیدہ پر قربان کرنے کے لئے تیار ہوں :-

۱- الا رب وجہ فی التراب عتیق ویارب حسن فی التراب رقیق	ہاں ! بہت سے چہرے ہیں جو مٹی میں ملکر فرسودہ ہوگئے اور بہت سے حسن ہیں جو خاک میں ملکر ماند پڑ گئے
۲- فقل لقریب الدار انک راحل الیٰ منزل نائی المحل سحیق	اپنے پڑوسی سے کہدو کہ اب تم بھی ایسی منزل کی طرف کوچ کرنے والے ہو جو بہت دور دراز ہے۔
۳- وما الناس الا ہالک وابن ہالک وذو نسب فی الہالکین عریق	لوگ نہیں ہیں مگر نسلاً بعد نسلٍ ہلاک ہونے والے ، اور انھیں میں بڑے بڑے نسب والے بھی شامل ہیں۔
۴- اذا امتحن الدنیا لبیب تکشفت لہ عن عدو فی ثیاب صدیق	جب کوئی عقلمند دنیا کا امتحان کرتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دشمن ہے جو دوست کے لباس میں ملبوس ہے

ابوالعتاہیہ یہ آخری شعر اکثر پڑھا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ کوئی خود دنیا سے اُس کی تعریف پوچھے تو شاید وہ بھی اس سے اچھی تعریف نہ کر سکے۔

خلیفۂ مامون نے ایک مرتبہ اپنے درباریوں میں سے جن میں بہت سے علماء وفضلاء تھے دریافت کیا " بتائیے خلافت بنو ہاشم میں سب سے بڑا شاعر کون گزرا ہے ، ایک نے کہا سب سے بڑا شاعر وہ تھا جس نے یہ شعر کہا ہے :-

یا قبر معن کنت اول حفرۃ من الارض خطت للسماحۃ منزلا	اے معن کی قبر تو زمین کا پہلا گڑھا ہے جو جود و کرم کی منزل بنا دیا گیا۔

دوسرے نے کہا جی نہیں سب سے بڑا شاعر وہ تھا جس کا یہ شعر ہے ،

اشبہت اعدائی فصرت احبہم اذ کان حظی منک حظی منہم	تو (اے محبوبہ) میرے دشمنوں سے مل جل گئی اسلئے میں اُنسے بھی محبت کرنے لگا جب میری قسمت تجھ سے وابستہ ہی تو اُنسے بھی ہے

مامون نے کہا آپ لوگوں کا اُس شخص کے متعلق کیا خیال ہے جس کا یہ شعر ہے :-

یا شقیق النفس من حکم	اے وہ جو حکما میری شریک حیات ہے
نمت عن لیلی ولم انم	تو آج میری رات میں سو جا، میں نہ سوؤں گا

سب چلا اُٹھے کہ بیشک ابونواس اشعر العرب ہے۔

قصائد

یہ بات عربی شاعری میں طغرا امتیاز رہی ہے کہ وہاں شاعری کی ابتدا شریفانہ جذبات سے ہوئی ایران کی طرح مداحی اور خوشامد میں عربوں کی زبان نہیں کھلی۔ عرب ہمیشہ سے جنگ جو، بہادر مہماں نواز، سیر چشم، غیور اور بلند ہمت تھے، انھیں چیزوں کو وہ قصاید میں ادا کرتے تھے اور یہی اُنکی شاعری تھی۔

شاعری ایک طاقت ہے جو قوموں کو زیر و زبر اور ملک میں ہلچل ڈال سکتی ہے، وہ ایک قوت ہے جس سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں، بشرطیکہ اُس کا استعمال صحیح طور پر کیا جائے، شعراء عرب اکثر صاحب تیغ و علم ہوتے، وہ قصاید میں اپنے قومی معرکہ لکھا کرتے تھے وہ اول تو کسی رئیس یا بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ لکھتے نہیں تھے، اور اگر کوئی لکھتا بھی تھا تو واقعات سے ہرگز قدم آگے نہیں بڑھاتا تھا۔

سلامتہ بن جندل سے ایک رئیس نے کہا کہ میری تعریف میں قصیدہ لکھو، اُس نے فوراً جواب دیا "افعل حتی اقول" یعنی پہلے کچھ کرکے تو دکھاؤ۔

ابن میادہ نے بعض وجوہ کی بناء پر خلیفہ منصور کی مدح میں قصیدہ لکھا اور بغداد جانے کا ارادہ کیا تاکہ دربار میں جا کر سنائے، تھوڑی دیر کے بعد نوکر دودھ لیکر آیا اُس نے پیکر خدا کا شکر بھیجا اور کہا "جب تک مجھے یہ ملتا ہے مجھے منصور کی کیا ضرورت ہے"

شعراء عرب میں سب سے پہلا شخص جس نے کسی بادشاہ کی مدح میں قصیدہ لکھا، زہیر بن ابی سلمی ہے، اُس نے پہلے پہل ہرم بن سنان کی شان میں قصیدہ لکھ کر پیش کیا، زہیر کے بعد نابغہ ذبیانی نے سلاطین کی مداحی میں قصاید لکھنا شروع کئے، گو اس کی بدولت نابغہ اس قدر مالدار ہو گیا کہ سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھانا کھاتا تھا لیکن عرب میں اُس کی عزت جاتی رہی، نابغہ کے بعد اعشیٰ نے شاعری کو پیشہ بنالیا، وہ جا بجا مدح کرتا اور انعام لیتا پھرتا تھا، رفتہ رفتہ یہ مرض عام ہوتا گیا، دور عباسیہ میں عرب و عجم کے اختلاط نے اس شراب کو دو آتشہ سے سہ آتشہ بنا دیا حتی کہ قصیدہ اور کاسۂ گدائی دو مترادف الفاظ ہو گئے

ابونواس کو شاعری کے اس باب سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اسی وجہ سے اس خاص موضوع

میں اُس کے کلام کو کوئی نمایاں خصوصیت بھی حاصل نہ تھی تاہم اُس نے قصاید کے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے ہیں جن میں علو مضامین کے ساتھ ساتھ شاندار الفاظ، اچھوتی تشبیہیں اور نادر استعارات استعمال کئے گئے ہیں جو کہیں اور نظر نہیں آتے مثال کے طور پر اُس کا وہ قصیدہ ملاحظہ کیجئے جو اُس نے پابہ زنجیر سر دربار اُسوقت خلیفۂ امین الرشید کے سامنے پڑھا تھا جب وہ غضبناک بیٹھا ہوا اپنی خون آشام تلوار تول رہا تھا اور موت ابونواس کے سر پر کھیل رہی تھی، ملاحظہ ہو، کہتا ہے :-

۱- تذکّر امین اللّٰہ والعہد یُذکر
مقامی و انشا دیک والناس حضّرُ

اے امین ذرا میری حالت دیکھ اور اس بات کا خیال کر کہ میں تیرے اور سب کے سامنے کھڑا قصیدہ پڑھ رہا ہوں بیشک زمانہ ہمیشہ یاد رکھا جاتا ہے۔

۲- ونثری علیک الدر یا در ہاشم
فیامن رائی درّاً علی الدر ینثرُ

اے بنو ہاشم کے موتی! میں تجھ پر موتی بکھیر رہا ہوں، ہاں کوئی ہے جو دیکھے کہ موتی موتی پر بکھیرا جا رہا ہے۔

۳- ابوک الذی لم یملک الارض مثلہٗ
وعمّک موسی الصفوۃ المتخیّرُ

تیرا باپ وہ تھا جسکے برابر آج تک کوئی زمین کا مالک نہیں ہوا اور تیرا چچا موسیٰ تھا جو برگزیدہ اور ستودہ صفات تھا۔

۴- وجدّک مہدی الہدیٰ وشقیقہٗ
ابوامّک الادنیٰ ابوالفضل جعفرُ

اور تیرا دادا مہدی تھا اور اُس کا بھائی ابوالفضل جعفر تیرا نانا تھا۔

۵- ایا خیر مامول یرجّیٰ انا امرءٌ
اسیرٌ رہینٌ فی سجونک مقبرُ

اے وہ جسکی ذات سے بہترین امیدیں وابستہ ہیں، کیا میں ہی ایک ایسا گرفتار بلا ہوں جو تیری قید میں دفن ہوکر رہیگا۔

۶- مضت لی شہورٌ مذ حُبستُ ثلاثۃٌ
کانّی قد اذنبتُ ما لیس یغفرُ

مجھے گرفتار ہوئے تین ماہ گزر گئے، گویا میں نے ایسا گناہ کیا ہے جو بخشا نہیں جا سکتا۔

۷- فان کنت لم اذنب ففیم حبستنی
وان کنت ذا ذنب فعفوک اکبرُ

اگر میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے تو تو نے مجھے قید میں کیوں ڈال رکھا ہے اور اگر میں گنہگار ہوں تو تیرا عفو یقیناً اُس سے کہیں بڑا ہے۔

بات صرف یہ تھی کہ ایک مرتبہ ابونواس نے خلیفۂ امین کے چچا سلیمان بن ابی جعفر کی، نشہ کی حالت میں ہجو کہہ ڈالی جس سے امین سخت ناراض ہوگیا، پہلے تو اُس نے قید میں ڈالدیا، پھر بھی غصہ فرو نہ ہوا تو چاہا کہ سر دربار قتل کر ڈالے، اس لئے اُس نے ابونواس کو قید خانے سے بلوا بھیجا مگر اُس کا یہ فی البدیہہ قصیدہ سنکر ایوان شاہی تڑپ اُٹھا اور امین کا سارا غصہ کافور ہوگیا، اُس نے نہ صرف ابونواس کا قصور معاف کیا بلکہ شاہانہ انعام واکرام سے اُسے مالامال کردیا، شیریں بیانی اور حسن ادا کی مثال جو اس قصیدہ میں پائی جاتی ہے شعرائے عرب کے کلام میں کہیں نہیں ملتی۔

غزلیات

عام طور پر شاعری تغزل کے مترادف سمجھی جاتی ہے، شاعر کو معشوق چاہیئے اور شراب ارغوانی، بس یہی دونوں چیزیں اُس کی دُنیا ہیں اور انھیں دونوں پر اُس کی زندگی ہے عشق و محبت انسان کا خمیر ہے، اس لئے کوئی ملک اور کوئی قوم شاعری کے اس صنف سے خالی نہیں علمار نفسیات کا خیال ہے کہ اگر عشق و محبت کا جذبہ لوگوں میں نہ پایا جاتا تو شاعری کا وجود بھی دنیا سے ناپید ہوتا، سینہ جب تک حضرت دل کا کاشانہ ہے اُسوقت تک محبت جنسیہ کی خواہشات کا اُس میں پایا جانا ایک فطری امر ہے، عشق کی سحر آفرینی اور اُس کی ہمہ گیری کا اظہار عرب کا ایک شاعر اس طرح کرتا ہے:۔

طاف الھویٰ فی بلاد اللہ کلھم	محبت تمام دنیا میں چکر لگا آئی،
حتی اذا مر بی من بینھم وقفا	یہاں تک کہ جب میرے پاس پہونچی تو یہیں ٹھہر گئی۔

ایک دوسرے شاعر نے اس سے بھی زیادہ دلکش طریقہ سے اسی مضمون کو ادا کیا ہے، کہتا ہے:۔

اتانی ھواھا قبل ان اعرف الھویٰ	اس سے مجھے اُسوقت محبت ہوگئی جب میں نہیں جانتا تھا کہ
فصادف قلبًا فارغًا فتمکنا	محبت کیا ہے؟ اُس نے میرا بھولا بھالا دل پاکر قبضہ کر لیا۔

ہمارے فارسی شعراء کا معشوق چونکہ ایک بازاری خوبصورت لڑکا ہوتا ہے اس لئے وہ کبھی تو اُس کی تلاش میں دیر حرم کا سفر کرتے ہیں اور کبھی آتش فراق سے بیتاب ہوکر دین وایمان نذر بتخانہ کر بیٹھتے ہیں، اور بہ آواز بلند فرماتے ہیں "کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست"

مگر شعراء عرب کا معشوق عفت وعصمت کا حرم نشیں ہے، وہاں تک رسائی مشکل ہے، اُدھر کا رُخ کرنے سے پہلے تلواروں کا سامنا ہوگا، سیکڑوں سر کٹ جائیں گے، خون کی ندیاں بہ جائیں گی جاہلیت کے کسی شاعر کا شعر ہے:۔

دیار اللواتی دار ھُنّ عزیزۃٌ	محبوبہ، اُن گھروں میں چلی گئی جو بہت عزیز ہیں، اُن کی
بسمر القنا یحفظن لا بالتمائم،	حفاظت گندم گوں نیزوں سے کی جاتی ہے، تعویزوں سے نہیں

شعراء عرب کا دستور تھا کہ اگر اُن کی معشوقہ اُن سے بچھڑ کر کسی اور وادی یا صحرا میں چلی جاتی تھی تو وہ اُس زمانہ کو، جب وہ دونوں ایک جگہ بیٹھکر باتیں کیا کرتے تھے، اُس جگہ کو جہاں دونوں ملتے، چلتے تھے، اور اُسکی محبت بھری باتوں کو یاد کرکے دل ہلا دینے والے اشعار کہا کرتے تھے، چنانچہ معلقات سبعہ نیز شعراء جاہلیت کے دیگر دواوین کل کے کل اُن کے عشق و محبت کی طویل داستانیں ہیں جس میں انھوں نے اپنی اپنی معشوقہ کا جذبات سے اس درجہ لبریز ذکر کیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

یہ زمانہ جاہلیت کی داستان محبت کا حال تھا، یہی مذاق اسلام کے بعد والی دو صدیوں کے

شعراء کا بھی رہا، فرق صرف اتنا تھا کہ شعراء جاہلیت کی معشوقائیں اپنے اپنے عشاق کی دل سے چاہے جتنی قدر کریں مگر دلی جذبات کا اظہار عموماً بہت کم کرتی تھیں، اُس زمانہ میں بھی گو عورتیں بہت سی شاعرہ تھیں مگر وہ شعر و شاعری سے صرف اُس وقت کام لیتی تھیں جب اُن کا شوہر، باپ، بھائی یا کوئی اور عزیز مرجاتا تھا، اُسوقت وہ اُن کی موت پر نوحہ خوانی کرتی تھیں، اُن کی شجاعت، سخاوت، ایثار نفس اور ہمدردی کے کارنامے بیان کرتیں اور اُن کے دشمنوں کی تحقیر کرتی تھیں۔

اسلام کے بعد یہ ہوگیا کہ عاشقانہ جذبات ظاہر کرنے والے تمام شاعروں کی معشوقائیں اُنکے عشق کی قدر کرتیں، اُن کے والہانہ جوش و خروش کا جواب اپنے سوز و گداز بھرے ہوئے شعروں سے دیتیں، چنانچہ اس عہد کے اکثر عاشق و معشوق مثلاً جمیل و بثینہ، کثیر و عزہ، قیس بن ذریح اور لبنیٰ، مجنوں عامری اور لیلیٰ، عروہ بن خزام اور عفراء نصیب و زینب، وغیرہ سب ہی شعر و شاعری میں کمال رکھتے تھے، جن کے دیوان دونوں کے کلام کا مجموعہ ہیں۔

لیکن افسوس ہے کہ عرب و عجم کے اختلاط سے دور عباسیہ میں شعراء عرب کا یہ مذاق بدل گیا، اب ایران کی طرح اُن کا معشوق بھی امرد اور حسین لڑکا ہوتا تھا جو اکثر بازاری ہوتا تھا، وہ ہر ایک کو ہاتھ آشنا تھا، سیکڑوں سے تعلق رکھتا تھا، آج اگر وہ ایک سے ہمکنار ہے تو کل دوسرے سے ہم آغوش، کسی کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا ہے، کسی سے اشارے کنائے کرتا ہے اور کسی کو فریب آمیز نگاہوں سے اپنی جھوٹی محبت کا یقین دلاتا ہے۔

اس ایرانی مذاق کی داغ بیل گو پہلے سے پڑ چکی تھی لیکن ابونواس نے امین الرشید جیسے رند مشرب خلیفہ کے عہد میں اسے پایۂ تکمیل کو پہونچا دیا، چونکہ اُس کی عادتیں بچپن سے بگڑی ہوئی تھیں، اس لئے بغداد پہونچتے ہی وہاں کی سدا بہار زمین اور پر کیف تمدن نے اُس کے جذبات کو اور زیادہ مشتعل کردیا اور اُس نے شاعری کے اس باب کو خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔

ابونواس کو غزلیات میں امرء القیس کا مد مقابل بتایا جاتا ہے، اس میں شک نہیں کہ جہاں تک دونوں کے بلند مرتبہ اور قادر الکلام شاعر ہونے کا تعلق ہے یہ بالکل صحیح ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ دونوں رند مشرب واقع ہوئے تھے مگر جہاں تک ان دونوں کے مذاق کا تعلق ہے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

امرء القیس حسن نسائی کا دلدادہ تھا اور ابونواس عشق غلمان پر فریفتہ، وہ کبھی عنیزہ سے محبت کی چھیڑ چھاڑ کرتا ہے، کبھی ام حویرث اور ام رباب کی ہوس رانیوں کا تذکرہ کرتا ہے، کبھی دارۂ جلجل کی

نہایت شہوت پرستانہ ساعت کو یاد کرتا ہے اور کبھی اپنی معشوقہ کے لئے اپنے اونٹ کی پرلطف قربانی کا حال بیان کرتا ہے۔

ابونواس کی ساری داستان عشق دیکھ ڈالئے، جنان کے علاوہ آپ کو کوئی ایسی عورت نہ ملیگی جس سے اُس کو صحیح معنوں میں عشق ہوا ہو، اُس سے بھی وصال صرف اس لئے نہ ہو سکا کہ آپ اُس سے غیر فطری فعل کے طلبگار تھے، جسے جنان کی غیرت نے کسی طرح گوارا نہ کیا۔

غزلیات میں جریر کی شان بھی بہت نمایاں ہے لیکن زمانہ اور ملک کی آب و ہوا کا اثر ہر چیز پر پڑتا ہے، جریر عہد امویہ جیسے خشک اور روکھے دور کا شاعر تھا اور ابونواس عہد عباسیہ جیسے رنگین اور پرکیف زمانہ کی یادگار تھا، ظاہر ہے دونوں زمانوں میں جو فرق تھا وہی ان دونوں کے رنگ تغزل میں نمایاں ہے۔

معنی آفرینی اور حسن ادا میں ابونواس کو جو کمال تھا اُس کی مثال شعرائے عرب میں کہیں نہیں ملتی، علماء عرب کا قول ہے کہ "معانی زمین میں مدفون تھے جسے ابونواس نے نکال کر بکھیر دیا، ملاحظہ ہو وہ ایک پری تمثال معشوقہ کی تعریف میں کہتا ہے جو ننگی بیٹھی نہا رہی تھی اور آپ کہیں آڑ میں کھڑے اُس کے حسن سے لطف اُٹھا رہے تھے، جب اُس کی نظر ان حضرت پر پڑی تو اُس نے جلدی سے اپنے بال اپنے جسم سیمیں پر جو ہوا سے زیادہ لطیف اور پانی سے زیادہ شفاف تھا پھیلا لئے اور اس طرح اُس نے اپنے جسم تاباں کو بالوں کی تاریکی میں چھپا لیا۔ وہ کہتا ہے :-

۱- نضت عنها القميص لصب ماء فورد وجهها فرط الحياء	محبوبہ نے نہانے کے لئے قمیص اُتاری اور فرط شرم نے اُسکے گلاب جیسے رخساروں کو سرخ کر دیا
۲- وقابلت الهواء وقد تعرت بمعتدل ارق من الهواء	اُس نے کپڑے اُتار کر اپنے سڈول جسم سے جو ہوا سے زیادہ لطیف تھا گویا ہوا کا مقابلہ کیا۔
۳- ومدت راحة كالماء منها الى ماء معد في اناء	اُسنے اپنی ہتھیلی جو پانی سے زیادہ شفاف تھی، پانی لینے کے لئے بڑھائی جو برتن میں تیار رکھا تھا۔
۴- فلما ان قضت وطرا وهمت على عجل الى اخذ الرداء	جب وہ نہا چکی اور اُس نے جلدی سے چادر لینے کا ارادہ کیا۔
۵- رأت شخص الرقيب على التداني فاسبلت الظلام على الضياء	تو اُسنے اچانک ایک ایسے شخص کو دیکھا جو قریب ہی تاک میں کھڑا تھا اُسنے فوراً ہی تاریکی (یعنی بالوں کو) روشنی (یعنی جسم سیمیں) پر ڈال دیا

۶- وغاب الصبح منها تحت لیل
وظل الماء یقطر فوق ماء
گویا صبح کی روشنی رات کی تاریکی میں چھپ گئی، اُسکے شفاف جسم سے پانی کے قطرات اس طرح گر رہے تھے جیسے پانی پانی پر گر رہا ہو

۷- فسبحان الالٰہ وقد راها
کاحسن مایکون من النساء
پاک ہے وہ خدا جس نے ایسی ایسی خوبصورت عورتیں پیدا کی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ یہ واقعہ خلیفہ ہارون رشید سے تعلق رکھتا ہے، ابو نواس کو کچا چٹھا معلوم ضرور ہوگیا تھا جسے اُس نے ہارون رشید کی فرمائش پر نظم کرکے اُس کی خدمت میں پیش کیا تھا اور بہت کچھ انعام واکرام بھی حاصل کیا تھا، مگر علماء ادب اس سے انکار کرتے ہیں اس لئے کہ ابو نواس ہارون رشید کے عہد کا نہیں بلکہ امین کے دور کا شاعر ہے۔

بہر کیف واقعہ کا تعلق کسی سے بھی ہو یہاں دیکھنا صرف یہ ہے کہ ابو نواس معنی آفرینی اور حسن ادا میں کس مرتبہ کا شاعر تھا!!

یہ بالکل صحیح ہے کہ شاعر اپنے گرد وپیش کے حالات اور زمانہ ووقت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اگر ابن المعتز شاہی خاندان سے نہ ہوتا تو یہ شعر کبھی نہ کہہ سکتا۔

فانظر الیہ کزورق من فضۃ،
قد اثقلتہ، حمولۃ من عنبر
چاند کو دیکھو، گویا وہ ایک چاندی کی کشتی ہے، جو عنبر کے بار سے پانی میں دبی ہوئی ہے۔

ہلال دیکھ کر عنبر کے بار سے دبی ہوئی چاندی کی کشتی کی طرف خیال منتقل ہونا اُسی وقت ممکن ہے جب کسی نے ان چیزوں کو دیکھا بھی ہو۔ شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ درحقیقت اُس کی زبان نہیں بلکہ وہ اُس زمانہ اور ملک کی زبان ہوتی ہے جس میں وہ اور اُسکے خیالات وجذبات پل کر جوان ہوتے ہیں، ہومر اپنے وقت کے یونانیوں کی زبان تھا، شکسپیر اور ملٹن کا بھی یہی حال تھا، ورڈزورتھ کا فطرت پرست ہونا بھی اسی بناء پر تھا۔

ابو نواس بھی اپنے وقت اور زمانہ کے حالات سے متاثر ہوا بلکہ اُس رنگ میں اس طرح رنگ گیا جس میں کوئی دوسرا شاعر اُس کا شریک نظر نہیں آتا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ غیر فطری چیز کبھی حقیقت کا رنگ اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتی، امرد پرستی اور شاہد بازی پر ابو نواس نے خوب خوب طبع آزمائی کی ہے، مگر اُس میں وہ بات نہ پیدا کر سکا جو ایک فطری اور حقیقی عشق میں ہوتی ہے۔

حسن اتفاق سے وہ ایک مرتبہ جنان نامی ایک عورت کے عشق میں مبتلا ہوگیا، اور اس بری طرح سے کہ اُسے جنان کے علاوہ دین ودنیا کی کچھ خبر نہ رہی، اُس کے کلام کا یہ حصہ نہایت پاکیزہ، دلکش

اور پُر اثر ہے، یہاں ہم اُسی میں سے کچھ انتخاب پیش کرنا چاہتے ہیں۔

جنان جیسی خوبصورت اور پرجمال تھی ویسی ہی پڑھی لکھی عاقل اور سمجھدار عورت تھی، ایک مرتبہ وہ ابونواس کے مکان کی طرف سے گزری جہاں وہ اور اُس کے ساتھی بیٹھے ہوئے شراب پی رہے تھے جنان کو دیکھتے ہی ابونواس دل پکڑ کر رہ گیا، اُس کے ساتھیوں نے کہا "یہ کیا؟ اب کیا تم لڑکوں کو چھوڑ کر عورتوں پر جان دینے لگے؟" اُس نے کہا "ہاں! اب میں ایک ایسے چاند سے مکھڑے پر مرتا ہوں جس سے نظر ہی نہیں ملائی جاسکتیں، تم اگر غور سے اُسے دیکھو تو تمھیں تعجب ہوگا کہ وہ انسان ہے یا فرشتہ!!

پھر تو روز بروز اُس کا عشق بڑھتا گیا حتیٰ کہ وہ اپنا سب کچھ اُس کے پیچھے کھو بیٹھا، اُس کی شان میں ہزارہا شعر کہہ ڈالے بہتوں کی خوشامدیں کیں، کئی مرتبہ اُس کے پاس قاصد بھیجے، مگر جنان نے کبھی گالی اور کوسنے سے کم بات ہی نہیں کی، ابونواس کے لئے یہ تمام گالیاں اور کوسنے "جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا" کا مصداق تھیں، اُس کی گالیوں کے جواب میں جو اُس نے شعر کہے ہیں وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ ملاحظہ ہو، وہ کہتا ہے:-

۱- آتانی عنک سبک لی فسبی الیس جری بفیک اسمی فحسبی	مجھ تک تمھاری گالیاں پہونچیں، بسم اللہ اور دو، کیا میرے لئے یہ کم فخر کی بات ہے کہ تمھاری زبان سے میرا نام تو ادا ہوا
۲- وقولی ما بدا لک ان تقولی فما ذا کلہ الا لحبی	جو تمھارا جی چاہے کہو، میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ صرف محبت کی وجہ سے ہے۔
۳- فصار لہ الرجوع الی وصالی فما تہوین من تعذیب قلبی	ان باتوں کا انجام وصال ہوگا، تم میرا دل دکھانا معمولی بات نہ سمجھو،
۴- تشابہت الظنون علیک عندی وعلم الغیب فیما عند ربی	تمھیں میری طرف سے بہت سی بدگمانیاں ہوگئی ہیں، حالانکہ غیب کی باتوں کا علم صرف خدا ہی کو ہوسکتا ہے۔

جنان کے اعزا میں سے ایک شخص کا انتقال ہوا وہ دوسری عورتوں کے ساتھ وہاں کھڑی ماتم کر رہی تھی، ابونواس کو پتہ لگ گیا۔ یہ بھی فوراً پہونچا، مگر یہ منظر اُس سے دیکھا نہ گیا کہ جنان اپنے دست نازک سے جن میں ہلکی ہلکی مہندی لگی ہوئی تھی برابر ماتم کئے جا رہی ہے اس موقعہ پر جو اُس نے شعر کہے ہیں بلاغت کی جان کہے جانے کے مستحق ہیں۔ کہتا ہے:-

۱- یا قمراً ابرزہ ماتم یندب شجواً بین اتراب	اے وہ چاند جو ایک ماتمی جلسہ میں طلوع ہوا ہے اور جو اپنی سہیلیوں کے درمیان مصروف ماتم ہے۔

۲۔ یبکی فیذری الدر من نرجس
ویلطم الورد بعناب ،

اے وہ تو جو رو رہی ہے اور اپنی نرگسی آنکھوں سے موتی بہا رہی ہے، اور گلاب جیسے رخساروں پر اپنی مہندی لگی ہوئی انگلیوں سے طمانچے مار رہی ہے

۳۔ لاتبک میتاً حلّ فی حفرۃٍ
وابک قتیلاً لک بالباب ،

ایسے مردہ پر نہ رو جو گڑھے میں جا چکا ہے،
بلکہ اپنے اُس شہید محبت پر رو جو تیرے دروازہ پر پڑا ہے۔

ابونواس نے ایک مرتبہ سنا کہ جنان حج کے لئے جانے والی ہے، فوراً خود بھی روانہ ہوگیا، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی، اُسے سخت افسوس ہوا، اُس کو خیال تھا کہ شاید اس طرح زیارت ہوجائے دیکھئے وہ کہتا ہے :۔

۱۔ الم ترانّنی افنیت عمری ،
بمطلبہا ومطلبہا عسیرُ

کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ میں نے اپنی ساری عمر اُس کے حاصل کرنے کے لئے گنوا دی، مگر اُس کا ملنا بہت مشکل ہے

۲۔ فلما لم اجد سبباً الیہا ،
یقربنی واعیتنی امورُ

جب مجھے کوئی بھی ذریعہ ایسا نہ ملا جس سے میں اُسکے قریب تک پہونچتا اور حالات نے بار بار مجھے مایوس کیا۔

۳۔ حججتُ وقلتُ قد حجّت جنانٌ
فیجمعنی وایاہا المسیرُ

تو میں نے حج کیا اور دل میں خیال کیا کہ شاید جنان بھی کرے اور اس طرح ہم اور وہ دونوں یکجا ہو سکیں۔

اِدھر ابونواس کی جس قدر وارفتگی بڑھتی جاتی تھی اُسی قدر اُدھر جنان کو اُس سے نفرت زیادہ ہوتی جاتی تھی، اپنی بدنامی کے خیال سے وہ اس کو بری طرح گالیاں دیا کرتی تھی، ایک مرتبہ جنان نے لوگوں سے کہا "خدا اس جھوٹے مخنث کو سمجھے جو خواہ مخواہ مجھے بدنام کرتا پھرتا ہے" یہ بات بھی ابونواس کے دل کو بھاگئی دیکھئے کہتا ہے اور بہت خوب۔

۱۔ جنانٌ تسبنی ذکرت بخیرٍ
وتزعم اننی مذق خنیثٌ

جنان! خدا تیرا بھلا کرے، تو مجھے گالیاں دیتی ہے اور خیال کرتی ہے کہ میں مخنث نوجوان ہوں۔

۲۔ وانّ مودّتی کذبٌ ومینٌ
وانی للذی اھوی بثوثٌ

اور یہ کہ میری محبت جھوٹی اور پر فریب ہے
اور میں جس کو چاہتا ہوں اُسے رسوا کرتا ہوں۔

۳۔ وما صدقت ولا ردّ علیہا
ولکنّ الملول ھو النکوث

گو یہ بات سچ نہیں ہے لیکن میں اُسے جھٹلا نہیں سکتا
ہاں یہ سچ ہے کہ مایوس شخص عہد پر قائم نہیں رہ سکتا۔

۴۔ ولی قلبٌ ینازعنی الیہا
وشوق بین اضلاعی حثیث

ہائے کیا کروں، میرا دل اُسکے بارے میں جھگڑا کرتا رہتا ہے
اور شوق وصال میرے پہلو میں چھپا ہوا آنا کانی کرتا ہے۔

۵- رأیت کلفی بها و دوام عهدی
فملتنی کذا کان الحدیث

وہ میرے عشق اور میری ثابت قدمی کو دیکھتی ہے
مگر پھر بھی وہ مجھے مایوس کرتی ہے، کیا یہی بات ہونی چاہئے تھی؟

ابونواس نے زندگی سے تنگ آکر ایک مرتبہ جنان کو دھمکایا بھی اور کہا کہ اب بھی اگر تم میرے حال پر رحم نہ کھاؤگی تو بس میں جان دیدونگا اور میرا خون تمھاری گردن پر ہوگا، دیکھئے وہ اس مفہوم کو کتنے عمدہ طریقہ سے ادا کرتا ہے، وہ کہتا ہے:-

۱- جنانُ ان جدت یا مناى بما
آملُ لم تقطر السماء دما

جنان! اے میری جانِ آرزو، اگر تو نے وہ چیز مجھے بخش دی
جسکی میں امید لیکر آیا ہوں تو آسمان خون کے آنسو بہائیگا۔

۲- وان تماریں او تمادیت فی
منعک اصبح بقفرۃ رمما

اور اگر تو نے اب بھی شک کیا یا حرمانِ وصال کی مدت کچھ اور بڑھائی تو میں کسی جنگل میں جان دیکر بوسیدہ ہڈی بن جاؤنگا۔

کہا جاتا ہے کہ ان اشعار کا جنان پر بہت اثر ہوا، اور اس نے ابونواس کو بُرا بھلا کہنا چھوڑ دیا اور اُس سے کسی قدر مانوس بھی ہوگئی، پھر تو اس نے اور بھی ہاتھ پاؤں پھیلائے اور چاہا کہ شادی ہو جائے مگر ابونواس کی عادتیں اسدرجہ بگڑی ہوئی تھیں کہ خود اُسے اپنی حالت پر اعتماد نہ تھا اس لئے وہ اسکی شرط پر راضی نہ ہوا، اور جواب میں یہ اشعار اُس نے لکھ بھیجے:-

۱- یشارطنی الحبیب علی الشروط
ولستُ بما یشارط بالسخوط

محبوبہ میرے لئے شرطیں قایم کرتی ہے۔
حالانکہ میں ایسا نہیں ہوں کہ وہ مجھ پر کوئی مکروہ شرط لگائے

۲- اریٰ ترک اللواط علی عارٌ
لانی واحدٌ من قومِ لوط

میں ترک لواطت کو اپنے لئے باعث شرم سمجھتا ہوں
اس لئے کہ میں ہی اسوقت قوم لوط کا تنہا نمایندہ ہوں۔

(باقی)

سید جلیل الرحمان اعظمی

بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں

میرے محترم دوست لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر جلال۔ ایم۔ شاہ نے جو بمبئی کے سب سے بڑے اسپتال (جے۔ جے۔ ہاسپیٹل) میں سرکاری ماہر امراض جنسیہ کی حیثیت سے کئی برس سے اپنے فرائض منصبی ادا کر رہے ہیں، یہ مضمون "گرانٹ میڈیکل کالج میگزین" کے لئے تحریر فرمایا تھا چونکہ اُس میں ایسی شخصیتوں سے بحث کی گئی ہے جو نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ ساری دُنیا کے لئے باعث دلچسپی ہیں اور چونکہ اس میں بعض ایسی باتیں آگئی ہیں جو بجائے خود چھوٹی اور معمولی ہیں تاہم اُن سے انسانی سیرت پر بھی خاصی روشنی پڑ سکتی ہے، اس لئے میں اس کا ترجمہ اُردو داں طبقہ کے مطالعہ کے لئے "نگار" کے ذریعہ پیش کرتا ہوں۔ اگر ہمارے ملک کے دوسرے حضرات بھی ڈاکٹر جلال شاہ کی طرح اپنے "تاثرات" قلمبند کر دیں تو یقیناً بہت سے ایسے واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے آجائیں گے جو اس ملک کے نوجوانوں پر اچھا اثر ڈالے بغیر نہ رہیں گے۔ بہرحال امید ہے کہ یہ مضمون اُسی دلچسپی سے پڑھا جائے گا جس کا وہ مستحق ہے۔ مترجم

جب "گرانٹ میڈیکل کالج میگزین" کے اڈیٹر نے مجھ سے اس امر کی خواہش ظاہر کی کہ میں اُن کے رسالہ کے لئے کچھ لکھوں تو میرے دل میں یہ خیال آیا کہ زمانۂ گزشتہ میں دنیا کی بعض مشہور ترین شخصیتوں کے ساتھ میرے جو تھوڑے بہت خاکسارانہ تعلقات رہے ہیں، اُن کا ہلکا سا خاکہ ایک مضمون کی صورت میں کھینچ دوں جو اگرچہ رسالہ کے مقاصد سے براہ راست تعلق نہیں رکھتا تاہم ممکن ہے کہ قارئینِ کرام کے لئے عموماً اور موجودہ نسل کے طلباء کے لئے خصوصاً باعثِ دلچسپی ہو۔

میں اپنے تئیں خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنی زندگی میں بہت سے ایسے اشخاص سے ملنے کا موقع ملا ہے جو اُس وقت یا تو بام شہرت پر پہونچ چکے تھے یا بعد میں اپنے اپنے حلقہ میں عظیم الشان شہرت کے مالک بنے۔ یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ ایک دو کو چھوڑ کر باقی اکابر سے میرے تعلقات کی ابتداء اُس زمانہ

میں شروع ہوئی تھی جبکہ میں لندن میں طالبعلمانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ افسوس ہے کہ ان میں سے بعض کا انتقال ہو چکا ہے اور بعض سے پھر کبھی ملاقات نہ ہوئی۔ لیکن گزشتہ صحبتوں کی دل خوش کن یاد ہمیشہ میرے دل پر نقش رہے گی۔

گاما پہلوان اس مشہور و معروف پنجابی پہلوان نے دنیا کا چیمپین بننے کے لئے ۱۹۰۹ء میں زبسکو سے طاقت آزمائی کی تھی۔ کشتی وائٹ سٹی، لندن کے دنگل میں ہوئی تھی۔ اُس زمانہ میں چونکہ وائٹ سٹی میں انگلستان اور جاپان کی مصنوعات کی مشترکہ نمائش ہو رہی تھی اس لئے بہت سے جاپانی پہلوان بھی انگلستان میں موجود تھے جن کی کشتیاں روزانہ ہوا کرتی تھیں۔

گاما اور زبسکو کی کشتی شروع ہونے سے تھوڑی دیر قبل جاپانی پہلوان زبسکو کے پاس پہونچے اس سے مصافحہ کیا اور اُس کی کامیابی کے لئے دعاگو ہوئے۔ لیکن انھوں نے گاما کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔

جاپانیوں نے گاما سے جس کج خلقی کا برتاؤ کیا اُسے سمجھنے سے ہم قاصر تھے۔ لیکن اس واقعہ کے فوراً بعد ہی چند خوبصورت جاپانی لڑکیاں دنگل میں اُتریں اور گاما کی خدمت میں پھولوں کا تحفہ پیش کیا۔

یہ تمام کھیل پہلے ہی سے نہایت خوبصورتی کے ساتھ طے پا چکا تھا اور جیسا کہ ہمیں بعد میں بتایا گیا، اس سے کسی کی ہتک یا دل آزاری مقصود نہ تھی۔ کشتی برابر رہی اور دوسرے دن کے لئے ملتوی کر دی گئی۔ مگر زبسکو اُسی رات کو یہ بہانہ کر کے برّاعظم روانہ ہو گیا کہ "میری والدہ سخت بیمار ہیں"

میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں بہت سے پنجابیوں سے ملا ہوں لیکن میری اب تک کسی ایسے پنجابی یا کسی دوسرے شخص سے ملاقات نہیں ہوئی جسے اس بات کی ترغیب دی جا سکتی ہو کہ وہ اپنی طاقت اور کمالات کے متعلق خود اپنی زبان سے کچھ کہے۔ گاما فی الحقیقت پنجاب کا سچا، خاموش اور طاقتور انسان ہے اور چند سال قبل ہندوستان ہی میں زبسکو کو پچھاڑ چکا ہے۔

ڈاکٹر ڈیوڈسن یہ آرک بشپ آف کنٹربری تھے اور لیمبتھ پیلس میں جو کنٹربری کے لاٹ پادریوں کے رہنے کی تاریخی جگہ ہے، ہر "آیش ویڈنس ڈے" کو سال میں ایک مرتبہ نوآبادیوں اور غیر ملکوں کے طبی طلبا کو مدعو کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر ڈیوڈسن نہ صرف گرجا کے سب سے بڑے عہدیدار تھے بلکہ صحیح معنوں میں ایک بڑے مدبر اور فصیح البیان مقرر بھی تھے۔ جیسا کہ "لارڈز اسپری چوال" کا قاعدہ ہے، وہ دارالامرا میں کراس بنچوں پر بیٹھا کرتے تھے اور مباحث میں بھی بسا اوقات حصہ لیا کرتے تھے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ لیمبتھ پیلس میں انھوں نے ایک بے ضابطہ جلسہ میں ہمارے متعلق کہا کہ صرف ایک جلوس ایسا ہے جو تمام شاہانہ جلوسوں سے بھی زیادہ شاہانہ ہے جنھیں وہ دیکھ چکے ہیں اور

وہ جلوس طبی طلباء کا ہے جو درس دینے والے بڑے اسپتالوں کے وارڈوں اور گیلریوں میں اساتذہ کے پیچھے پیچھے نکلتا ہے۔

گاہ بگاہ وہ مجھے لیمبتھ پیلیس میں چائے اور ٹینس پر بلا کر میری عزت افزائی فرمایا کرتے تھے۔ ان آرک بشپ صاحب کو ہز مجسٹی جارج پنجم آنجہانی نے پیرریج کے درجے تک ترقی دیدی تھی۔ چند سال ہوئے اُن کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں نے آج تک کسی مذہب کے مذہبی پیشوا کو نہیں دیکھا جس میں اس عجیب و غریب شخص کی سی مذہبی رواداری موجود ہو اور جو اُن کی طرح دوسرے مذاہب کا دل سے احترام کرتا ہو۔

مہاراجہ گائیکواڑ، بڑودہ

ہز ہائینس مہاراجہ گائیکواڑ بھی دوسرے ہندوستانی والیان ریاست کے ساتھ ملک معظم جارج پنجم آنجہانی کی تقریب تاجپوشی کے موقع پر ۱۹۱۱ء میں انگلستان تشریف لائے تھے۔ اُس زمانہ میں میں "انڈین گلڈ آف سائنس اینڈ ٹیکنولوجی" جس کا صدر دفتر مانچسٹر میں تھا، کی لندن برانچ کا آنریری سکریٹری تھا۔ گلڈ کی کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ ہندوستانی والیانِ ریاست سے عطیات وصول کرنے کی غرض سے ان کی خدمت میں پہونچا جائے۔ چنانچہ ہم نے قرعوں کے ذریعہ فیصلہ کیا کہ کون کون شخص کہاں جائے۔ میرے نام ہز گائیکواڑ نکلا۔

میرے تمام دوستوں نے دوسرے والیان ریاست سے ملاقات کرنے یا اُن سے عطیہ لینے کی جتنی بھی کوششیں کیں، وہ سب کی سب ناکام رہیں۔ لیکن ہز ہائینس گائیکواڑ نے بہت جلد ملاقات کا وقت مقرر فرما دیا اور ازراہ نوازش مجھسے ملنے کی خواہش ظاہر فرمائی۔ ملاقات کے دوران میں انھوں نے فرمایا کہ "میرے پاس تمام اُمور پر بحث کرنے کے لئے وقت نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ اپنے گلڈ کے بارے میں متعلقہ کاغذات میرے پاس چھوڑ جائیں تو میں فرصت کے اوقات میں اُن کا مطالعہ کرلوں گا۔ مگر عطیہ صرف اُس صورت میں دوں گا اگر مجھے اطمینان ہوگیا کہ گلڈ حقیقی معنوں میں ہندوستان کی خدمت کر رہا ہے۔"

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد ہز ہائینس کے پاس سے ۱۰۰ پونڈ کا چک موصول ہوگیا۔

ہز ہائینس کا ہمیشہ سے یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ وہ اپنے تمام اُمور کو کاروباری عجلت اور پورے انہماک کے ساتھ انجام دیا کرتے ہیں اور مذکورۂ بالا واقعہ اگرچہ بجائے خود بہت ہی معمولی ہے تاہم اُسنے اُس وقت ہمارے نوجوان دماغوں کو بہت متاثر کیا تھا۔

مسز اینی بیسنٹ

مسز اینی بیسنٹ نے ۱۹۱۱ء میں لندن اسلامک سوسائٹی کی زیر سرپرستی ایک جلسۂ عام میں تقریر کی تھی جس کی صدارت کی عزت مجھے نصیب ہوئی تھی۔ اُن کی تقریر کا موضوع تھا کہ "اسلام نے دُنیا کو کیا فایدہ پہونچایا ہے"

اپنی نہایت ہی شاندار تقریر میں انھوں نے تعدد ازدواج کے مسئلہ پر پوری وضاحت کے ساتھ بحث کی اور بتایا کہ یہی وہ ایسا اسلامی شعار ہے جس پر مغربی مصنفین نے غالباً سب سے زیادہ لے دے کی ہے جگہ کی قلت مجھے اجازت نہیں دیتی کہ میں ان کی تقریر پر تفصیلاً تبصرہ کروں۔ لیکن میں صرف اتنا کہنے پر قناعت کروں گا کہ اس موضوع پر اُن کی خداداد لسانی کا یہ اثر ہوا کہ مجمع کی بہت سی غیر شادی شدہ لڑکیاں رونے اور چیخیں مارنے لگ گئی تھیں۔

مسز بیسنٹ سے میری ملاقات میرے عزیز دوست دوارکا ناتھ تیلنگ کی وساطت سے ہوئی تھی یہ صاحب جسٹس تیلنگ آنجہانی کے صاحبزادے تھے۔ دوارکا ناتھ گرانٹ میڈیکل کالج میں نہ صرف میرے ہمعصر تھے بلکہ نہایت گہرے دوستوں میں تھے۔

دو سال قبل جب مسز اینی بیسنٹ کا انتقال ہوا تو اُس وقت مسز موصوفہ کی راکھ دریائے گنگا کے مقدس پانی میں بہانے کی غرض سے لیجانے کی عزت انھی دوارکا ناتھ کو حاصل ہوئی تھی۔

میجر شاہ مرزا بیگ میجر شاہ مرزا بیگ (دکھن) اپنے زمانہ کے بہترین پولو کھیلنے والے تھے اور دنیا کا کوئی پولو میچ ایسا نہ تھا جس میں انھیں شامل نہ کیا جاتا ہو اس لئے کہ عام خیال یہ تھا کہ وہ دُنیا کے چار بہترین کھلاڑیوں میں سے ایک ہیں۔ ایک مرتبہ وہ کاؤنٹ ڈی ماڈری کی ٹیم میں جس کا نام "ٹائیگرز" تھا، کھیل رہے تھے جس کے دیکھنے والوں میں ہز رائل ہائینس ڈیوک آف کناٹ بھی تھے۔ ٹورنامنٹ کے آخری کھیل میں تو مرزا نے کمال ہی کر دیا۔ میچ کے بعد ڈیوک آف کناٹ نے ازراہِ نوازش شاہ مرزا بیگ کو خاص طور سے بلا بھیجا اور فرمایا کہ "میری بیٹی شاہزادی پیٹریشیا مجھ پر زور ڈال رہی ہیں کہ میں اُن سے آپ کا تعارف کرادوں۔"

ٹیم میں مرزا کی پوزیشن سب سے اول رہی اور اُن کا کھیل اس قدر شاندار تھا کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ پولو اور ٹینس میں ان کے کمال سے قطع نظر کرتے ہوئے وہ بہت ہی خوبصورت شخصیت کے مالک تھے جس کی وجہ سے اُن کے ہزارہا دوست اور مداح پیدا ہوگئے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں انکی بے وقت موت جو پولو کھیلنے کے دوران میں ایک حادثہ کی وجہ سے ہوئی، اُن کے احباب کے وسیع حلقہ کے لئے سخت صدمہ کا باعث ہوئی تھی۔ ۱۹۱۹ء میں جب ہم نے مصر کی "ڈبل آرمی ٹینس چیمپین شپ" جیتی تو اُسوقت مجھے مرزا کا "پارٹنر" بننے کی عزت نصیب ہوئی تھی۔

مسز نائیڈو مسز نائیڈو اپنی دلآویز شاعری کی بدولت جسے صرف ایک سروجنی ہی لکھ سکتی ہے، کافی شہرت حاصل کرچکی تھیں اس سے بہت عرصہ قبل کہ مجھے لندن میں اُنسے ملنے کی

عزت حاصل ہوئی ہو - ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ جب وہ لندن تشریف لائیں تو سلطنت متحدہ انگلستان و آیرلینڈ کے شعرا نے چیدہ اصحاب کی موجودگی میں مسٹر یٹس کی زیر صدارت اُن کی خدمت میں ہدیۂ تحسین پیش کیا۔ لندن کے ویسٹ اینڈ بازار میں جب کبھی مسز نائیڈو سودا سلف خریدنے کی غرض سے نکلتی تھیں، ایسے مواقع پر بسا اوقات میرے ذمہ ان کی حفاظت کی خدمت سپرد ہا کرتی تھی تاکہ وہ جیساکہ وہ خود فرمایا کرتی تھیں، ضرورت سے زیادہ روپیہ صرف نہ کردیا کریں۔ گھر پہنچنے کے بعد وہ مجھے اچھی اچھی چیزیں کھلائے بغیر نہ بھیجتیں کہ مبادا میں دوبارہ حاضر نہ ہوں۔

ڈاکٹر انصاری خوش قسمتی سے میں ڈاکٹر انصاری سے سنہ ۱۹۰۱ء سے واقف ہوں۔ میری اُن کی پہلی ملاقات لندن میں ہوئی تھی جبکہ وہ ایڈنبرا یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرچکے تھے اور میں ابھی "سینٹ بارتھولومیوز ہاسپٹل" میں طالبعلمانہ زندگی بسر کررہا تھا۔

اُس زمانہ میں وہ لندن کے چیرنگ کراس ہاسپٹل میں ہاؤس سرجن مقرر ہوگئے تھے۔ اس اسپتال کے ساتھ ایک تعلیمی درسگاہ بھی ملحق ہے اور میرا خیال ہے کہ میرا یہ بیان صداقت پر مبنی ہے کہ انصاری اُن ابتدائی چند ہندوستانیوں میں سے تھے جو لندن کے کسی درس وتدریس دینے والے اسپتال میں ہاؤس سرجن کی حیثیت سے مقرر ہوئے ہوں۔

بہرحال آج بھی درس دینے والے اسپتالوں میں بالخصوص لندن کے اسپتالوں میں ہاؤس سرجن کے عہدہ پر لوگوں کی للچائی ہوئی نظریں پڑتی ہیں اور مجھے خوب یاد ہے کہ انصاری کے دوستوں اور مداحوں نے جن میں زیادہ تر ہندوستانی ڈاکٹر اور طلبا تھے، اس واقعہ کی یاد میں "چیرنگ کراس ہاسپٹل" کے قریب ہی "اسٹرینڈ" کے ایک نہایت فیشن ایبل ریسٹورنٹ میں انھیں ڈنر پر مدعو کیا تھا۔

میزبانوں میں میں ہی اُن کا سب سے پرانا دوست تھا اور اس لئے اس شام کو جام صحت تجویز کرنے کا فرض بھی میرے سپرد تھا۔ چونکہ طلبا میں میں سب سے زیادہ "سینیر" تھا اس لئے ڈنر کے موقع پر صدارت کی ذمہ داری بھی میرے ہی ضعیف کندھوں پر ڈالدی گئی تھی۔

انصاری میری دائیں جانب بیٹھے تھے اور ڈاکٹر سی۔ اے۔ ایڈیسن، ایم۔ ڈی، ایف۔ آر۔ سی۔ ایس ایم۔ پی جو انصاری کے زبردست مداحوں میں تھے اور اُسوقت بارتھولومیو میں علم التشریح کے لکچرر تھے، میری بائیں جانب تھے۔ یہ صاحب سب سے پہلی بار انصاری سے لندن کی "نیشنل لبرل کلب" میں ملے تھے جس کے یہ دونوں حضرات ممبر تھے۔

یہ میری پہلی تقریر تھی اور اگر دوران ڈنر میں مجھے اپنے قریب بیٹھنے والوں سے شاباشی اور اخلاقی

امداد نہ ملتی تو یقیناً میں بالکل ناکام رہتا اور ایک فقرہ بھی زبان سے ادا نہ کر سکتا۔

لیکن اس پہلی تقریر پر مجھے سب سے زیادہ شاباشی انصاری ہی نے دی۔ اس بنا پر مجھے یقین ہوتا ہے کہ میں نے پورے تیس سیکنڈ میں اچھی خاصی تقریر کی ہوگی۔

میرا معمول تھا کہ میں ہر ہفتہ سہ پہر کو "چیرنگ کراس ہاسپٹل" میں انصاری سے ملنے کے لئے اُن کی قیامگاہ پر جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ شام کے وقت ہم "اسٹرینڈ" میں سیر و تفریح میں مشغول تھے کہ شام کے ایک اخبار کے پوسٹر پر ہماری نظر پڑی جس میں جلی حروف میں یہ الفاظ درج تھے "برطانوی ڈاکٹروں کے ساتھ شدید بے انصافی"۔ میں نے اخبار خرید لیا اور میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ سارا مضمون میرے دوست انصاری سے متعلق تھا جس میں لندن کے ایک بڑے اسپتال میں بہ حیثیت ہندوستانی کے اُن کے تقرر پر شدید نکتہ چینی کی گئی تھی اور اس پر زور دیا گیا تھا کہ ایسی اسامیاں ہمیشہ نوجوان برطانوی ڈاکٹروں سے پُر کی جانی چاہیں۔

ذاتی طور پر انصاری اسپتال میں بیحد ہر دلعزیز تھے اور اُن کے رفقائے کار نے اُن کے تقرر پر اخباری نکتہ چینی کے خلاف سخت غصہ کا اظہار کیا تھا۔ اس واقعہ کے ایک دو دن بعد "چیرنگ کراس ہاسپٹل" کی "گورننگ کونسل" کے چیرمین کی جانب سے ایک دفتری اعلان شائع کیا گیا جس میں یہ بات واضح کی گئی تھی کہ "انصاری کا تقرر محض قابلیت کی بنا پر کیا گیا ہے اور برطانوی اسپتالوں کے لئے وہ دن نہایت افسوسناک دن ہوگا اگر ہاؤس سرجنوں کی اسامیوں کا اعلیٰ اسامیوں میں شمار نہ رہیگا اور اگر قابلیت کے معیار کے سوائے اور جذبات کا لحاظ رکھا جائے گا"۔

جس زمانہ میں انصاری ہاؤس سرجن تھے، اُسی زمانہ کا یہ واقعہ ہے کہ میں اُن کے یہاں ڈنر پر مدعو تھا۔ جب ڈنر ختم ہوگیا تو انھوں نے خلافِ توقع مجھے نہایت قیمتی سگاروں کا ایک بکس پیش کیا اور فرمایا کہ "میرے پاس ایسے بکس ایک درجن ہیں جن میں سے میں نے تمھارے لئے چھ بکس محفوظ کر دئے ہیں جو تمھیں قسط وار ملتے رہیں گے"۔

انگلستان میں سگار ایک مہنگی عیاشی شمار کیجاتی ہے اور قدرتی طور پر میں یہ جاننے کے لئے بیتاب تھا کہ اتنی دولت اُن کے ہاتھ کیسے لگی۔

آخرکار یہ راز خود بخود کھُل گیا اور مجھے معلوم ہوگیا کہ اس تحفہ کی بھیجنے والی مس ماڈ ایلین ہیں جو اُس زمانہ میں عریاں رقصوں کی وجہ سے دنیا بھر میں نمایاں شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ اُن کی خادمہ کسی سڑک کے حادثہ میں بری طرح زخمی ہوگئی تھی اور اسپتال میں لائی گئی تھی جہاں انصاری نے اپنے وارڈ میں اسکا

کامیابی کے ساتھ علاج کیا تھا مس ماڈ ایلین نے تحفہ کے ساتھ ایک مختصر رقعہ بھی بھیجا تھا جس میں ان کی اُن تھک کوششوں کا شکریہ ادا کیا گیا تھا جو انھوں نے مریضہ کی بحالی صحت کے لئے کی تھیں رقعہ کے آخر میں اُن سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اپنے فنی کمال کے اعتراف میں جس کا اظہار خادمہ کے علاج کی صورت میں ہوا تھا، اس حقیر تحفہ کو قبول فرمائیں۔

جو لوگ انصاری سے بہ حیثیت ڈاکٹر کے اُن کی مابعد کی زندگی میں ملے ہیں، وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ مذکورہ بالا اعتراف کے وہ پورے طور پر مستحق تھے اور یہ کہ ملک بھر کے بیشمار مریض، بالخصوص غریب طبقوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص نہ صرف انھیں اپنا چہیتا ڈاکٹر خیال کرتے تھے بلکہ ہر اعتبار سے انھیں اپنا دوست سمجھتے تھے۔

ڈاکٹر انصاری اگر چاہتے تو آسانی کے ساتھ بڑی دولت کما سکتے تھے۔ لیکن وہ قدرت کے یہاں سے مختلف فطرت لیکر آئے تھے اور انھوں نے اپنے فنی فرائض کی شریفانہ بجا آوری میں اس خیال کو کبھی اپنے دل میں آنے نہیں دیا کہ وہ روپئے پیسے کے لئے سب کچھ کر رہے ہیں۔ غریب مریضوں کے اُس اژدہام کے ساتھ بھی جو دہلی میں ان کے گھر کے مطب میں دیکھنے میں آتا تھا، اُن کی وہی روش اور توجہ تھی جو امراء، روسا اور والیانِ ریاست پر مبذول کی جاتی تھی۔

"چیئرنگ کراس ہاسپٹل" میں اپنی میعادِ عہدہ پوری کرنے کے بعد انصاری "لاک ہاسپٹل" میں اور اس کے بعد "سینٹ پیٹرز ہاسپٹل" لندن میں "ریزیڈنٹ میڈیکل آفیسر مقرر ہو گئے تھے۔ اس کے کچھ دنوں بعد انھوں نے اڈنبرا سے ایم ڈی کی ڈگری حاصل کی اور پھر ایم۔ سی۔ ایچ کی۔

میرا خیال ہے کہ انصاری ۱۹۱۲ء میں ہندوستان واپس آگئے تھے۔ اس زمانہ میں اُنکی خواہش تھی کہ دہلی میں ایک عام اسپتال تعمیر کریں جہاں فیس ادا کرنے والے مریضوں کے ساتھ ساتھ مفت دوا پانے والے مریضوں کا بھی علاج کیا جا سکے۔ لیکن یہ اسکیم بارور نہیں ہوئی اس لئے کہ ہندوستان پہونچنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد انھیں "آل انڈیا میڈیکل مشن" کے سردار کی حیثیت سے منتخب کر لیا گیا تھا اور یہ اپنا اسپتال لیکر بہت جلد ترکی روانہ ہو گئے جو اُن دنوں دول بلقان کی متحدہ طاقتوں سے نہایت بہادری کے ساتھ مصروف جنگ تھا۔

مولانا محمد علی مرحوم ہی زیادہ تر اس جنگی اسپتال کے قیام کے ذمہ دار تھے اور اس کے لئے انھوں نے سارے ہندوستان سے روپیہ اکھٹا کیا تھا۔

اس اسپتال نے جو سارے کا سارا ہندوستانیوں پر مشتمل تھا، ترکی بیماروں اور زخمیوں کیلئے

نہایت مفید خدمات انجام دی تھیں۔ جنگِ بلقان کے اختتام پر یہ مشن ہندوستان واپس آگیا۔

ٹرکی سے واپسی پر انصاری رفتہ رفتہ سیاسیات میں داخل ہوتے گئے۔ کچھ عرصہ تک انھوں نے خلافت کمیٹی کے ذریعہ خالص اسلامی سیاسیات سے تعلق رکھا لیکن جلدی ہی وہ کانگریس میں شامل ہو گئے، جس کے وہ زمانہ مابعد میں پریسیڈنٹ بھی منتخب ہوئے — میں انصاری کی پبلک زندگی کے متعلق رائے دینے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ ہماری قسمت میں یہ لکھا تھا کہ ہم مختلف راہوں پر گامزن رہیں۔

ہم دونوں کبھی کبھی ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ آخری مرتبہ میری ان سے ملاقات بمبئی میں ہوئی تھی جبکہ آنریبل سر علی محمد خاں دہلوی نے جو اُسوقت لیجسلیٹو اسمبلی کے صدر تھے، اُن کی آمد کے موقع پر ایک ڈنر پارٹی دی تھی۔ ہمارے عقلمند میزبان نے انصاری کی اور میری نشستیں پاس پاس رکھی تھیں اور جب ہم ملے اس وقت ہم نے زیادہ تر لندن ہی کے زمانۂ قیام کی گزری ہوئی دلچسپیوں کے بارے میں گفتگو کی اور اُس دور کے بےشمار چھوٹے چھوٹے واقعات کا بچپن کی مسرت کے ساتھ تذکرہ کیا جو اگرچہ بجائے خود معمولی تھے مگر ہمارے لئے وہ اپنے اندر خاص دلچسپی رکھتے تھے اس لئے کہ اُن کی خوشگوار یاد آج بھی ہمارے دلوں کو مسرور کرتی ہے۔

میں سیاسی آدمی نہیں ہوں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ہمارے سیاست دانوں میں وہ لوگ جو سیاسی خیالات میں ان سے اختلافِ رائے رکھتے تھے، سب سے پہلے اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں گے کہ انھوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ معاشرتی تعلقات میں سیاسی اختلافات کو غلبہ پانے کی کبھی اجازت نہیں دی۔

اپنے بیشمار مشاغل میں مصروف رہنے کے باوجود انھیں اپنے پیشہ کے ساتھ جو شغف تھا، اُس میں کبھی بھی ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ وہ علم طب کی ترقیوں سے پوری طرح واقف رہتے تھے بلاشبہ ان کا شمار اس پیشہ کے مسلمہ لیڈروں میں ہوتا تھا۔ انصاری "آل انڈیا میڈیکل کانفرنس" کے صدر بھی منتخب ہوئے تھے جس کا اجلاس بمبئی میں ۱۹۳۳ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس کانفرنس میں ہم دونوں کی ملاقات ہوئی تھی اور یہیں پہلی بار انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ انھیں دل کی طرف سے تشویش رہا کرتی ہے۔

اُن کی سرگرمیاں اب ختم ہو گئی ہیں، لیکن مختلف میدانوں میں اُن کے عظیم الشان کارناموں، اُن کی جاذب شخصیت، اُن کی بےغرضانہ دوستی، اُن کی اعلیٰ دماغی قابلیت، اُن کی خاکساری اور تواضع، اُن کی حب الوطنی، اُن کی وسیع النظری اور فرقہ وارانہ تعصبات سے اُن کی حیرت انگیز بریت،

غریب اور دکھی پبلک کے ساتھ ان کا شغف اور پیار، یہ سب باتیں عرصۂ دراز تک ایک ایسی زندگی کی یاد دلاتی رہیں گی جو اپنی قوم اور ملک کی خدمت میں بسر ہوئی اور جو آنے والی نسلوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دے گی۔

مولانا محمد علی مرحوم

ایک سہ پہر کو مولانا اور میں "ویسٹ منسٹر" میں اکھٹے جا رہے تھے "کیکسٹن ہال" سے گزرتے وقت ہمیں معلوم ہوا کہ وہاں حقوق طلب عورتوں کی طرف سے جلسہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ سیدھے ہم اندر چلے گئے، لیکن وہاں پہونچنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ سارے جلسہ میں ہمارے سوائے اور کوئی مرد نہیں۔ کچھ دیر بعد صدر جلسہ مسز پنکھرسٹ نے جو اُس زمانہ میں حقوق طلب عورتوں کی تحریک کی پریسیڈنٹ تھیں، مولانا محمد علی سے تقریر کے لئے درخواست کی۔ مولانا نے درخواست کو قبول فرما لیا اور عورتوں کو ووٹ دئے جانے کی تائید میں ایک نہایت معرکۃ الآرا تقریر فرمائی۔

جلسہ کے بعد سارا مجمع ڈاؤننگ اسٹریٹ کے مکان نمبر ۱۰ پر گیا تاکہ وزیر اعظم سے ملاقات کرے مسز پنکھرسٹ جلوس کی سردار تھیں اور ان کی خواہش پر ہم دونوں نے ان کی حفاظت کی خدمات انجام دیں۔ "ڈاؤننگ اسٹریٹ" پہونچکر ہم برطانوی وزیر اعظم کی سرکاری قیام گاہ پر پہونچے مسز پنکھرسٹ نے دروازہ پر دستک دی جسے ایک ملازم نے کھولا اور اطلاع دی کہ مسٹر ایسکوئتھ گھر میں موجود نہیں ہیں۔ یہ سنتے ہی مسز پنکھرسٹ نے اُس عمارت کی سیڑھیوں پر سے اپنے متبعین کے سامنے تقریر شروع کر دی جس سے مجمع میں کافی جوش پیدا ہو گیا یہاں تک چند عورتوں نے کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے، تھوڑی دیر بعد پولیس آن پہونچی اور جلوس کے بڑے سرداروں کو جن میں مسز پنکھرسٹ بھی تھیں، گرفتار کر لیا۔

میں نے اپنی زندگی میں بہت سے ہیجان آور مناظر دیکھے ہیں، لیکن جس جوش و خروش اور ندرت کا مشاہدہ میں نے اس جلوس میں کیا، اُس کا مقابلہ کوئی نظارہ نہیں کر سکتا۔

مولانا محمد علی کا سارا دن انگلستان کی مقتدر ہستیوں سے ملاقاتیں اور بحثیں کرنے میں گزر جاتا تھا لیکن دن بھر کی مشقت کے بعد وہ نہایت مہربانی اور اخلاص کی بنا پر میرے لئے نصف گھنٹہ مخصوص فرما دیا کرتے تھے۔ اس اثنا میں سنجیدہ مضامین پر بحث کرنے کی مناہی تھی اور ہم لڑکپن کی مسرت کے ساتھ شہر کے واقعات حاضرہ پر تبصرہ کیا کرتے تھے۔ مولانا دنیا کے اُن وسیع القلب اشخاص میں سے تھے جن سے ملاقات کی عزت مجھے نصیب ہوئی اور میں نے ہمیشہ ان کی دوستی کی قدر و منزلت

کی جس کی یاد آج بھی میرے ماضی کے نہایت قیمتی خزانوں میں شمار ہوتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں جب ہم سب کی بدقسمتی سے مولانا کا انتقال ہوگیا، اُسوقت جنازہ میں شرکت کرنے والوں میں میں بھی تھا۔

مسز سوکھی موجودہ نسل کے لوگوں میں یہ مینیکا کے نام سے مشہور ہیں اور جب ہم پہلی مرتبہ لندن میں ملے ہیں تو اگرچہ وہ زمانہ اُن کی نوعمری کا تھا تاہم بہ حیثیت آرٹسٹ کے وہ جس شہرت کی آج مالک ہیں، اس کے آثار اُسیوقت ظاہر ہو چکے تھے۔

لندن میں وہ مس لیلا رائے کے نام سے مشہور تھیں اور ہندوستانیوں کے وہاں جتنے جلسے ہوا کرتے تھے، وہ اُن سب کی روح رواں تھیں۔ اُسوقت وہ ایسی مکمل رقاصہ نہ تھیں جیسی آج کل ہیں لیکن اُس زمانہ میں بھی وہ وایولن بجانے میں سننے والوں کی طرف سے خراجِ تحسین وصول کیا کرتی تھیں۔

ایک مرتبہ انھوں نے مہاراجہ گائیکواڑ کے اعزاز میں استقبالیہ جلسہ منعقد کیا۔ تفریحی ناٹک کے طور پر انھوں نے تاریخ ہند کا ایک ایسا باب لیا جو اسلامی دور سے متعلق تھا اور جسے نہایت دلآویزی کے ساتھ اسٹیج کیا گیا تھا۔ ہمایوں کا پارٹ ادا کرنے کے لئے میرا انتخاب کیا گیا تھا اور مجھے خوب یاد ہے کہ کھیل کے بعد انھوں نے مجھے دل کھول کر شاباشی دی تھی۔

مجھے بعد میں یہ معلوم کرکے بیحد مسرت ہوئی کہ ان کی نگاہِ انتخاب میرے ایک دوست پر پڑی اور وہ انجام کار مس لیلا رائے سے مسز سوکھی بن گئیں۔

گزشتہ المپک کھیلوں میں جو برلن میں منعقد ہوئے تھے، انھوں نے فنِ رقص کا جو مظاہرہ کیا، وہ چونکہ زمانۂ حال کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے اس لئے میں اُسے نظر انداز کرتا ہوں

جی۔ کے۔ گوکھلے آنریبل مسٹر جی۔ کے۔ گوکھلے آنجہانی اور سر فیروز شاہ مہتا دونوں کو لندن کی "انڈین یونین سوسائٹی" نے ایک ساتھ ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ اُس زمانہ میں میں سوسائٹی کا صدر تھا۔ اپنے معزز مہمانوں کا جام صحت تجویز کرتے وقت میں نے جسارت کرکے یہ بھی بتایا کہ ہندوستان کو مارلے منٹو اصلاحات کے بارے میں جو اُسوقت پارلیمنٹ کے سامنے زیر بحث تھیں کیا پالیسی اختیار کرنی چاہئے۔

مسٹر گوکھلے نے جواب میں نہایت خوش خلقی کے ساتھ میری تجاویز کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ جب وقت آئے گا وہ اُن پر پوری توجہ مبذول فرمائیں گے۔ مگر سر فیروز شاہ مہتا نے جو ترکی ٹوپی زیب سر کئے ہوئے تھے، مجھے سختی سے ڈانٹا اور فرمایا کہ "ہم بوڑھے اپنا وقت ضایع نہیں کر رہے ہیں بلکہ نفس معاملہ پر پوری طرح غور و خوض کر رہے ہیں"۔

پنڈت جواہرلال نہرو

جب لندن میں میری ملاقات پنڈت جواہرلال نہرو سے ہوئی، اسوقت وہ "انرٹمپل" میں تعلیم پا رہے تھے۔ اپنے مخصوص دوستوں کے حلقہ میں وہ "جو" کے نام سے مشہور تھے۔

وہ کسی قدر شرمیلے واقع ہوئے تھے اور کھچے کھچے سے رہتے تھے اور آسانی سے دوست نہیں بنتے تھے، بلکہ ہم میں سے جن کو وہ اپنی دوستی سے نوازتے تھے، اُن کے سامنے وہ اپنا کلیجہ تک نکالکر رکھ دیتے تھے۔

ان کے پسندیدہ خط وخال، ان کی دلوں پر قبضہ کرلینے والی مسکراہٹ، ان کے اچھے قطع کردہ کپڑے اور سجے ہوئے کمرے، ان کی شاہانہ مہماں نوازیاں اور ان کی دلچسپ بذلہ سنجیاں اور سب سے بڑھ کر اُن کا قابل تقلید ذاتی کیرکٹر اُن تمام اشخاص کی یاد سے بھلایا نہیں جا سکتا جنھیں اُس دور دراز زمانہ میں اُن کی دوستی کا شرف حاصل تھا۔

وہ لندن کے مشہور "کوئنز کلب" کے ممبر تھے جہاں کی کورٹوں میں ہم بسا اوقات ٹینس کھیلا کرتے تھے، مجھے کہنا پڑتا ہے کہ ذاتی طور پر مجھے اس امر کی کبھی توقع نہ تھی کہ پنڈت جواہرلال نہرو سیاسی زندگی کو اختیار کرلیں گے اگرچہ یہ عیاں تھا کہ وہ صرف اُس پیشہ کو اختیار کریں گے جس سے انھیں دلچسپی ہوگی۔ اس طرح میرے لئے یہ امر بھی تعجب انگیز تھا کہ ڈاکٹر خاں صاحب کیونکر سیاسیات میں دخیل ہوگئے۔ وہ اور میں گرانٹ میڈیکل کالج میں ہم سبق تھے اور بعد میں لندن میں ملکر ہمیں بہت مسرت ہوئی — پنڈت جواہرلال نہرو ہم دونوں کے گہرے دوست تھے۔

خان جیسا کہ ہم انھیں محبت سے پکارا کرتے تھے، اکی ٹیم میں "سینٹ ٹامسیز ہاسپٹل" کی طرف سے نمایندگی کرتے تھے اور ہر اعتبار سے اسپورٹسمین (کھلاڑی) تھے۔

لندن میں میرے ایک چچا کا انتقال ہوگیا اور ایسے وقت میں اپنے گھر سے دور رنج وغم سے نڈھال ہو رہا تھا، میں خان صاحب کی برادرانہ شفقت اور محبت کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

پرنس لچ ناؤسکی

جنگ عظمیٰ چھڑنے سے قبل قیصر نے جرمنی کے اس زبردست شخص کو لندن میں اس غرض سے سفیر بناکر بھیجا تھا کہ وہ انگلستان اور جرمنی کے دوستانہ روابط کو ترقی دے۔

ابتدائے جولائی کی ایک رات کا ذکر ہے کہ میرے ایک رشتہ دار نے شہزادہ لچ ناؤسکی اور اس کی حسین بیوی کو "رٹز ہوٹل" میں کھانے کی دعوت دی۔ میں بھی مہمانوں میں شامل تھا۔ ڈنر کے بعد ناچ ہوا اور اُس شام کو میں نے شہزادی کے ساتھ متعدد بار رقص کیا۔ اس شہزادی کی شخصیت

میں کمال کی جاذبیت بھری ہوئی تھی اور یہی وجہ ہے کہ لندن میں بہت جلد اُن کے دوستوں کا دائرہ وسیع ہو گیا۔

جب علی الصبح پارٹی ختم ہوئی تو جرمن سفیر اور ان کی بیوی نے ازراہِ تلطف مجھ سے فرمایا کہ "ہمارے ساتھ سفارتخانہ چلو اور وہاں قہوہ پینے کے بعد اپنے گھر چلے جانا" یہ دعوت ایسی تھی جسے میں نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔

کمرۂ سفارت میں ہم بہت دیر تک گفتگو میں مشغول رہے اور غالباً کوئی مضمون ایسا نہ تھا جس پر ہم نے تبادلۂ خیالات نہ کیا ہو۔ رخصت ہوتے وقت میرے میزبان اور ان کی بیوی نے ظریفانہ لہجہ میں فرمایا کہ "اب چین کے ساتھ جا کر سو جاؤ۔ یورپ کا امن خطرہ میں نہیں ہے"

مگر اس واقعہ کے ایک ہی مہینہ بعد جنگ عظمیٰ چھڑ گئی اور دنیا جنگ کی تلخ حقیقت سے دوچار ہو گئی جرمن سفیر اور ان کی بیوی کو اعلان جنگ کے بعد انگلستان سے واپس جانا پڑا۔ میں بھی ان لوگوں میں تھا جو "کارلٹن ہاؤس ٹیرس" میں جرمن سفارت سے "خدا حافظ" کہنے کے لئے گئے تھے۔

جب میں جرمن سفارتخانے سے باہر نکل رہا تھا، ٹھیک اُسی وقت وزیر اعظم انگلستان مسٹر ایسکوئتھ کی بیوی بھی اسی مقصد سے وہاں داخل ہو رہی تھیں، اور عین اُسوقت جبکہ میں ٹیکسی میں بیٹھنے کو تھا، میرے قدیم اور عزیز دوست توفیق پاشا بھی جو اُس زمانہ میں لندن میں ترکی سفیر تھے رخصت ہونے والے مدبر اور اُن کی بیوی سے آخری ملاقات کرنے کے لئے تشریف لا رہے تھے۔

توفیق پاشا کو بھی چند دن بعد لندن چھوڑ کر جانا پڑا اس لئے کہ ترکی بھی شریک جنگ ہو گیا تھا۔ توفیق پاشا ترکی کے مشہور ترین مدبروں میں شمار ہوتے تھے۔ ابھی حال ہی میں میں نے دلی افسوس کے ساتھ اُن کے انتقال کی خبر پڑھی۔ مرحوم مجھ سے عزیزانہ شفقت سے پیش آتے تھے اور ہمیشہ جلال پاشا کہکر پکارا کرتے تھے۔

توفیق پاشا کے مکان پر میری دنیا کے جن بعض مشہور ترین لیڈروں سے ملاقات ہوئی، انہیں سے ایک انور پاشا تھے اور دوسرے ڈاکٹر سن یٹ سن۔

اول الذکر بلا شبہ دنیا کے نہایت خوبصورت اور وجیہ شخص تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ ایک زبردست اور جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے۔ ان میں کچھ ایسا جادو بھرا تھا کہ ان کی شخصیت کسی لحاظ سے بے نظیر کہی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر سن یٹ سن کئی سال قبل لندن کے مڈل سکس اسپتال میں طالب علم رہ چکے تھے اور

بعد میں کئی مرتبہ اُن کا لندن آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ انھوں نے چین کی شہنشاہیت کا خاتمہ کرنے اور اس کی بجائے جمہوریت قایم کرنے کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ ابھی یہ طالب علم ہی تھے کہ ایک شب کو بہت رات گئے وہ لندن کے چینی سفارتخانہ کے پاس سے گزرے۔ سفارت خانہ کے عملہ نے انھیں پکڑ لیا اور کئی دن تک انھیں محبوس رکھا۔ لیکن ایک ملازم کی امداد سے وہ اس قابل ہو گئے کہ ڈاکٹر کینٹلی کو اپنی گرفتاری کی اطلاع دے سکیں جو "مڈل سکس ہاسپٹل" میں سن یٹ سن کے زمانۂ طالب علمی میں پروفیسر تھے۔ ڈاکٹر کینٹلی فوراً برطانوی وزارت خارجہ میں گئے اور سکریٹری کے ذریعہ چینی حکومت کے نام ایک "ضروری یادداشت" بھیجی جس کا نتیجہ سن یٹ سن کی رہائی کی شکل میں نکلا۔ رہائی کے بعد وہ کئی سال تک لندن میں مقیم رہے۔

زمانۂ حال کی تاریخ جاننے والوں سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ چین کی تاریخ کے بدلنے میں انھوں نے کتنا نمایاں حصہ لیا ہے۔ چینی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جانے پر جب وہاں جمہوریت قایم ہوئی تو یوآن شی کے اُس کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔ سن یٹ سن پس پردہ رہ کر کام کرنا زیادہ پسند کرتے تھے مگر رائے عامہ نے یوآن شی کے کی وفات پر انھیں مجبور کیا کہ وہ صدارت کی ذمہ داری قبول کریں۔ چنانچہ کئی سال تک اپنے ملک کی مخلصانہ خدمت کرنے کے بعد وہ راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔

تمام چینی قوم نے رضاکارانہ چندہ کر کے اُن کی قبر پر ایک شاندار مقبرہ تعمیر کیا جو ثبوت ہے اس امر کا کہ انھوں نے اپنے پیارے ملک کی کسقدر شاندار خدمت انجام دی تھیں۔

مہاتما گاندھی

اگست ۱۹۱۴ء میں جب جنگِ عظیم چھڑی ہے تو اُسوقت مہاتما گاندھی انگلستان ہی میں تھے جس مشن پر وہ وہاں تشریف لائے تھے وہ بلا شبہ ہندوستان کے باہر برطانوی نوآبادیوں بالخصوص جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی ناقابلِ اطمینان پوزیشن سے متعلق تھا۔ وہ ابھی برطانوی سلطنت کے دارالسلطنت لندن میں اُن کی خاطر مصروف جنگ تھے کہ تمام سلطنت کو یکایک موت وحیات کی ایسی کشمکش میں شریک ہونا پڑ گیا جو تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتی جو چار سال کی طویل اور صبر آزما مدت تک جاری رہی اور جس کے اثرات سے ابھی تک نہ صرف یورپ بلکہ تمام دنیا پورے طور پر عہدہ برآ نہیں ہوئی۔

انگلستان کے اعلانِ جنگ کر دینے پر مہاتما گاندھی نے بیمار اور زخمی ہندوستانیوں کے لئے اپنی خدمات وقف کر دیں۔ انھیں لندن میں رنگروٹ بھرتی کرنے کے لئے اسٹیشن کھولنے کی سرکاری اجازت مل گئی اور انھوں نے سلطنت متحدہ برطانیہ کے مقیم ہندوستانیوں کے نام اپیل بھیجی

اور انسے " ایمبولنس کور" میں شریک ہونے کی درخواست کی۔ کچھ عرصہ بعد انڈین والنٹیرز ایمبولنس کور" کی حیثیت سے اس کا نام گزٹ میں چھپا، لیکن ہم اسے محبت کی بنا پر آئی۔ وی۔ اے۔ سی کہکر پکارا کرتے تھے۔ لفٹنٹ کرنل سی۔ بیکر۔ آئی۔ ایم۔ ایس اس کور کے کمانڈنگ آفیسر مقرر ہوئے۔

بہت سے ہندوستانیوں نے جن میں زیادہ تر طلبا تھے، مہاتما کی آواز پر لبیک کہا میں نے بھی دوسرے طلبا کی طرح مطالعہ کو عارضی طور پر خیر باد کہدیا تھا اور پرائیویٹ حیثیت سے کور میں شامل ہوگیا تھا۔

مہاتما گاندھی جن کے ساتھ بسا اوقات ہز ہائینس آغا خاں بھی ہوتے تھے، " ریجنٹ پارک" میں رنگروٹوں کی پریڈ دیکھنے کی غرض سے تشریف لایا کرتے تھے کبھی کبھار وہ " پولی ٹیکنک انسٹیٹیوٹ" میں بھی وزٹ (معائنہ) کے لئے آیا کرتے تھے جہاں ہمیں فرسٹ ایڈ اور ایمبولنس کے کام کی تعلیم دی جاتی تھی۔

مہاتما گاندھی کو بلاشبہ پہلے سے ایمبولنس کے کام سے واقفیت تھی جسے انھوں نے جنگ بوئر کے دوران میں میدانِ جنگ میں حاصل کیا تھا وہ پریڈ کے موقع پر اور بے ضابطہ جلسوں میں بھی اکثر اوقات تقریریں کیا کرتے تھے اور جس انسانی خدمت میں ہم مصروف تھے، اس کی عظمت ہمارے ذہن نشین کرایا کرتے تھے اور درحقیقت یہ وہ شریفانہ فعل ہے جو ذات پات کی قیود سے بالاتر ہے اور جو اسقدر اعلیٰ ہے کہ ہمیشہ ہماری بہترین کوششوں اور توجہات کا مرکز بن سکتا ہے۔

مہاتما گاندھی کے ہمت افزا الفاظ سے ہمیں اپنے کام میں ہمیشہ ترغیب و تحریص ملتی رہتی تھی اور ان کی وجہ سے ہم میدانِ جنگ میں اور زیادہ اہم خدمات بجالانے کے قابل ہوجایا کرتے تھے۔ یہ ہماری ابتدا تھی اس لئے کہ اصل کام وہ تھا جو ہمیں بعد میں میدانِ جنگ میں کرنا پڑا۔

کیمپ میں نہایت سخت ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد ہمیں اصل خدمت کا موقع فرانس میں ہندوستانی فوج کے پہونچنے سے چند دن قبل ملا۔ میں اتفاق سے اُس پہلے گروہ میں شامل تھا جو " نیٹلے ہسپتال" بھیجا گیا جہاں " رایل وکٹوریہ ہاسپٹل" کا ہندوستانی شعبہ زخمیوں اور بیماروں کے لئے کھولدیا گیا تھا۔ ہمارے پہونچنے کے بعد ہی زخمیوں کی آمد شروع ہوگئی۔

نیٹلے میں ہمارے افسروں میں لفٹنٹ کرنل۔ پی۔ شارمین، میجر آر۔ ایچ نٹ جو حال ہی میں حکومت بمبئی کے سرجن جنرل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ہیں، میجر سی۔ ایل۔ ڈن اور میجر جے۔ ایچ۔ میکڈانلڈ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

ہز مجسٹی ملک معظم جارج پنجم آنجہانی اور ہز رایل ہائینس ڈیوک آف کناٹ بھی نیٹلے میں کبھی کبھار بیاروں اور زخمیوں کی مزاج پرسی کے لئے تشریف لے آیا کرتے تھے۔ میں نے ۱۹۱۵ء میں کورسے استعفادیدیا تاکہ بارتھولومیو میں اپنے مطالعہ کو ختم کرلوں۔

شریف حسین ہز مجسٹی شاہ حسین والی حجاز نہایت دلچسپ شخصیت کے مالک تھے اور جنگ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مجھے اُن سے ملکر بیحد مسرت ہوئی۔

جو ہندوستانی سپاہی "اجپشن ایکس پیڈیشنری فورس" میں تھے اور مصر، فلسطین، شام اور ٹرکی میں جنگی خدمت بجالارہے تھے، اُن کی ایک بہت بڑی پارٹی کے ساتھ مجھے ۱۹۱۹ء میں حج زیارت کی غرض سے حجاز بھیجا گیا۔ میجر سی۔ ایل۔ پورٹر جدہ تک ہماری پارٹی کے انچارج رہے۔ میں اس جماعت کا سینیر میڈیکل آفیسر تھا جو تقریبًا ۲ ہزار افسروں اور سپاہیوں پر مشتمل تھی۔

جدہ میں میں "آفیسر کمانڈنگ" اور "سینیر میڈیکل آفیسر" کے متحدہ عہدہ کے فرایض ادا کر رہا تھا حالانکہ میری پوری ملازمت محض ۲½ سال کے قریب تھی۔

مکہ معظمہ کے دروازہ پر ہز رایل ہائینس امیر فیصل نے جو بعد کو عراق کے بادشاہ بنے، ہمارا استقبال کیا۔ اس مقدس شہر میں ہمارے پہونچ جانے کے بعد ہز مجسٹی شریف حسین نے بھی اپنی وزٹ سے ہمیں سرفراز فرمایا۔ حجاز کے دوران قیام میں وزیر جنگ جنرل قسوتی پاشا ہمارے آرام و آسایش کا خیال رکھتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اُن سے بہتر میزبان ملنا مشکل ہے۔

جیسا کہ قاعدہ ہے حج کے اختتام پر بادشاہ نے فریضۂ حج کی مسرت بخش تکمیل کی خوشی میں ایک دربار منعقد فرمایا۔ مجھے اور میرے ساتھی افسران کو شاہی خاندان کے افراد یعنی بادشاہ کے چاروں بیٹوں امیر علی، امیر فیصل، امیر عبداللہ (جو آجکل شرق اردن کے بادشاہ ہیں) اور امیر زید کے قریب ہی نشستیں دی گئیں۔

دربار میں ایک عرب نے بادشاہ کی اجازت سے چند اشعار سنائے جو عید الضحیٰ کی مبارک تقریب پر لکھے گئے تھے۔ لیکن جیسا کہ بعد کو معلوم ہوا، ان اشعار کا تعلق اس تقریب سے مطلق نہ تھا بلکہ وہ کلیۃً بادشاہ کی ذات سے متعلق تھے اور اُن میں شروع سے آخر تک سوائے جھوٹی تعریفوں کے اور کچھ نہ تھا جب نظم پڑھی جاچکی تو عرب شاعر نے اسے نہایت ادب و احترام کے ساتھ آگے بڑھکر بغرض شرف قبولیت خدمت شاہی میں پیش کیا۔

ہز مجسٹی نے اُسوقت تمام حضار دربار پر نظر ڈالی اور میرے ہاتھ میں مصری کوڑا دیکھکر جلدی سے

میری طرف لپکے اور کوڑا چھین کر نہایت بے دردی سے اس عرب کو پیٹنا شروع کر دیا۔ ہز مجسٹی غصہ سے کانپ رہے تھے مگر اُسے برابر مارتے جا رہے تھے اور پوچھتے جاتے تھے کہ "آج کے دن تو نے مجھ جیسے خاطی انسان کی تعریف کرنے کا ناقابل معافی گناہ کیوں کیا حالانکہ یہ دن وہ ہے کہ آج سوائے خدا کی ذات کے اور کوئی تعریف کا سزاوار نہیں"۔

واپسی پر جب ہم جدہ پہونچے ہیں تو وہاں میری ملاقات ایک مشہور و معروف شخص (کرنل لارنس) سے ہوئی جس کے ساتھ میں بہت دیر تک گفتگو کرتا رہا۔ بعد کو ہماری دوسری ملاقات شام میں ہوئی۔

عربی زبان میں ایک کہاوت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "سوائے لارنس کے اور کوئی شخص سر پٹ اونٹ پر نہیں چڑھ سکتا"۔

یہ سچ ہے کہ لارنس سے میری ملاقات صرف دو مرتبہ ہوئی، لیکن اس کی صاف گوئی، سچائی، اور محبت کا میرے دل پر اس قدر گہرا اثر ہوا کہ جب کچھ عرصہ قبل میں نے تکلیف دہ حالات میں اُسکے انتقال کی خبر اخبارات میں پڑھی تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے کسی عمر بھر کے دوست کا انتقال ہو گیا۔

ضیاء الدین احمد برنی"

جوش کی ایک شاعرانہ لغزش؟

میں جوش صاحب سے واقف نہیں، نہ وہ مجھے جانتے ہیں، اس لئے کسی کا یہ سمجھنا کہ میں نے سطور ذیل ان کی حمایت میں سپرد قلم کی ہیں، سوءظن کے سوا اور کسی شے سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ میرا مقصد ایک خالص ادبی مسئلہ پر روشنی ڈالنا ہے اور بس۔ جولائی ۱۹۳۲ء میں یورپ سے واپسی کے بعد جب میں لکھنؤ پہونچا تو سب سے پہلے جس چیز کے دیکھنے کی مجھے خواہش ہوئی وہ رسالہ ''نگار'' تھا۔ جولائی کا ''نگار'' میں نے دیکھا۔ اس میں جوش صاحب کی ایک نظم پر جناب نیاز نے تبصرہ کیا ہے اور آخری شعر کی تنقید پورے دو صفحے پر تمام ہوئی ہے۔ شعر یہ ہے:-

نگاہ روبرو، اے روح نعمت داریں ہوش باش کہ یزداں شکار ہیں ہم لوگ

نیاز صاحب کا بیان ہے کہ ''جناب جوش کو اپنے اس شعر پر بہت ناز ہے اور غالباً ایک اسی شعر کیلئے ساری نظم لکھنے کی زحمت گوارا کی گئی ہے۔ اگر واقعی ان کا یہ پندار صحیح ہو تو بھی اس کا امتیاز انھیں حاصل نہیں ہوتا کیونکہ اقبال اسی خیال کو بہت پہلے اس طرح ظاہر کر چکا ہے کہ:-

یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ''

نیاز صاحب کا یہ اعتراض تو نفس مضمون کے متعلق ہے۔ اب رہنے شعر کے الفاظ۔ اس کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''سب سے بڑی غلطی جوش نے ''یزداں شکار'' کی ترکیب استعمال کرنے میں کی ہے۔ انھوں نے اس ترکیب سے وہی مفہوم پیدا کرنا چاہا ہے جو اقبال کے مصرع سے پیدا ہوتا ہے لیکن یہاں معنی بالکل اُلٹے ہو گئے۔ جوش سمجھتے ہیں کہ ''یزداں شکار'' کے معنی ''یزداں کو شکار کرنے والے'' کے ہیں۔ درانحالیکہ اس کے معنے ہوئے ''شکار یزداں'' کے یعنی ''وہ جسے یزداں نے شکار کیا ہو''۔

جوش کی ترکیب غلط ہونے کے دو بڑے سبب نیاز صاحب نے بیان کئے ہیں:-

(۱) چونکہ لفظ شکار کسی مصدر سے مشتق نہیں اور نہ وہ اسم فاعل کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اسلئے

اس سے یہی شکار کرنے والے کے کبھی نہیں آتے اور (یزداں شکار) اس معنی میں استعمال کرنا جس میں جوش نے استعمال کیا ہے بالکل غلط ہے۔

(۲) چونکہ شکار اسم ہے اس لئے دوسرے اسم کے ساتھ اس کی نسبت دو ہی صورتوں سے ہو سکتی ہے یعنی صفت و موصوف کی حالت میں یا مضاف و مضاف الیہ کی حالت میں۔ ظاہر ہے کہ یہاں نسبت صفت و موصوف کی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے لامحالہ مضاف و مضاف الیہ کی نسبت ماننا پڑے گی اور وہ بھی مقلوب اور اس صورت میں "یزداں شکار" کے معنی سوائے "شکار یزداں" کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتے جو جوش کے مفہوم و مدعا کا بالکل ضد ہے۔"

نیاز صاحب کا یہ کہنا یقیناً درست ہے کہ لفظ شکار کسی مصدر سے مشتق نہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ شکار اسم ہے۔ لیکن ان کا یہ خیال صحیح نہیں کہ وہ کبھی اسم فاعل کے معنی میں مستعمل نہیں ہوتا۔ میرا خیال تھا کہ اس قسم کی ترکیبیں اساتذہ کے کلام میں میری نظر سے گزری ہیں لیکن اس وقت کوئی ایسا شعر مجھے یاد نہ تھا جو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ چند روز ہوئے کہ دوران مطالعہ میں اس قسم کے اشعار مجھے مل گئے جن سے قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ "پیمبر شکار" جس معنی میں جوش نے استعمال کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

امیر خسرو علیہ الرحمہ (جن کی شاعرانہ بزرگی اور زباندانی کو اہل زبان نے بھی تسلیم کیا ہے چنانچہ خانِ شہید بن سلطان غیاث الدین بلبن نے جب اُن کا کلام شیخ سعدی کو بھیجا تو شیخ نے اس کی بہت تحسین کی اور لکھا کہ یہ جوہر قابل قدردانی کے لائق ہے۔[1] دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرۂ شعراء میں لکھا ہے کہ امیر الغ بیگ امیر خسرو کے خمسہ کو نظامی کے خمسہ پر ترجیح دیتے تھے) اپنی مشہور مثنوی "آئینۂ سکندری" میں جہاں سکندر کی بزم آرائی کی تصویر کھینچی ہے، خوبانِ بزم کی تعریف میں لکھتے ہیں:

صنوبر قدانے چو گلنار تر — بر خسارہ خوں کردہ گل را جگر

ہمہ نازپرورد و نازک خرام — مہ نیمہ و آفتاب تمام

مسلسل بسے دل بگیسوئے شاں — معلق جہانے بہر موئے شاں

نہفتہ بعنبر گل خویش را — نظر بستہ چشم بداندیش را

بہ بازی از نرگس پر خمار — خدنگ افگنان و فرشتہ شکار

ظاہر ہے کہ آخری شعر میں "فرشتہ شکار" کی وہی ترکیب ہے جو جوش کے شعر میں "پیمبر شکار" کی ہے

---

[1] شعر العجم شبلی۔ جلد دوم۔ تذکرہ شیخ سعدی۔

اور خسروؔ نے "فرشتہ شکار" کے معنی فرشتہ کو شکار کرنے والے ہی کے لئے ہیں جو نیازؔ صاحب کے نزدیک "بالکل غلط" ہے۔

اگر کسی کے نزدیک قواعد صرف و نحو کی رو سے یہ ترکیب صحیح نہیں تو صرف و نحو کے وہ قواعد انہی کو مبارک رہیں۔ جوشؔ کے لئے طوطیِ ہند کے کلام سے استناد کرنا بالکل کافی ہے۔ اور اس مثال کے بعد کسی دوسرے استدلال کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تاہم تلاش و جستجو سے اس قسم کے اور شواہد بھی مل سکتے ہیں۔ چنانچہ کسی استاد کا شعر ہے:۔

بزیرِ کنگرۂ کبریاش مردانند — فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

حسنِ اتفاق سے اس شعر میں خود "پیمبر شکار" موجود ہے اور اس کے وہی معنی ہیں جو جوشؔ نے سمجھے ہیں یعنی "پیمبر کو شکار کرنے والا"۔ غالباً اس مثال کے بعد نیازؔ صاحب کو جوشؔ کی غلط فہمی پر اصرار نہ ہوگا اور وہ تسلیم کر لیں گے کہ جوشؔ نے یزداں شکار کی ترکیب استعمال کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔

"پیمبر شکار" کے علاوہ اس شعر میں ایک اور مرکب "فرشتہ صید" بھی موجود ہے جس کی ترکیب پیمبر شکار جیسی ہے اور جس کے معنی فرشتہ شکار یا فرشتہ کو شکار کرنے والے کے ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ "شکار" کے علاوہ "صید" بھی ایک ایسا لفظ ہے جو شکار کی طرح اسم فاعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور کیا عجب کہ تلاش سے اس قسم کی اور مثالیں بھی دستیاب ہو جائیں۔

نیازؔ صاحب کا خیال ہے کہ جوشؔ کا زیرِ بحث شعر اقبالؔ کے اس مصرعہ سے ماخوذ ہے:۔

یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

یہ قیاس صحیح ہو یا نہ ہو لیکن بظاہر خود اقبالؔ نے یہ خیال فارسی کے اس شعر سے لیا ہے:۔

بزیرِ کنگرۂ کبریاش مردانند — فرشتہ صید و پیمبر شکار یزداں گیر

"پیمبر شکار" اور "یزداں بکمند آور" میں اتنا قریبی تعلق یقیناً نہیں ہے جتنا "یزداں گیر" اور "یزداں بکمند آور" میں ہے۔ لہٰذا اگر یہ مضمون جوشؔ کا زادۂ طبیعت نہیں تو اقبالؔ کو بھی اس کی مالکیت کا حق نہیں پہونچتا۔ اگرچہ خود میرے نزدیک یہ بالکل ممکن ہے کہ جوشؔ اور اقبالؔ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی کہیں سے اخذ نہ کیا ہو بلکہ وہ صورت واقع ہوئی ہو جسے اصطلاح میں توارد کہتے ہیں۔

عندلیب شادانی

(نگار) یہ مقالہ ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم۔ اے، پی ایچ ڈی کا ہے جو ڈھاکہ یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر ہیں اور اس زبان کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔

لفظ "ٹھوکا" کے اس مخصوص طریق استعمال کے جواز میں امیر خسرو یا کسی اور ہندی شاعر کے کلام سے سند پیش کر دینا، ممکن ہے ان کے لئے باعث اطمینان ہو، لیکن میں کسی غلطی کو اس لئے کبھی صحیح نہیں سمجھ سکتا کہ وہ ایک سے زاید آدمیوں نے کی ہے۔ غلطی ہمیشہ غلطی رہے گی خواہ اس کا مرتکب کتنا ہی بڑا انسان کیوں نہ ہو۔

کسی ترکیب یا لفظ کے صحیح استعمال کا علم صرف دو طریقوں سے ممکن ہے، ایک یہ کہ اس زبان کی لغت اور قواعد سے مدد لیجائے یا پھر یہ کہ مستند اہل زبان کے کلام میں جستجو کی جائے۔ از روئے لغت و قواعد تو ہمارے فاضل مقالہ نگار بھی اس کی غلطی کے قایل ہیں، رہا اہل زبان کے کلام سے استناد سو افسوس ہے کہ وہ اس میں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔

امیر خسرو کے علم و فضل سے کسی کو انکار نہیں اور فارسی دانی کے لحاظ سے ان کا وہ مرتبہ ہے جو ہندوستان میں اس وقت تک کسی کو حاصل نہیں ہوا، لیکن وہ اہل زبان یقیناً نہ تھے اور فارسی محاورہ کے استعمال کے باب میں ہندی نژاد ہونے کی حیثیت سے ان کا کلام بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی غلطی و لغزش تسلیم کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ رہتا ہوں بشرطیکہ مجھے کوئی سمجھا دے، البتہ غلط کو صحیح باور کر لینے کی یہ وجہ کہ کسی اور بڑے شخص نے بھی یہی غلطی کی ہے، میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی اور نہ آئے گی۔ شاعری میں ایک عنصر معنی کا ہوتا ہے، دوسرا الفاظ و محاورات کا۔ پھر جس حد تک معنی کا تعلق ہے اس میں عرب و عجم، ایران و ہندوستان کی قید نہیں ہر شخص دوسرے سے بڑھ جانے کا مدعی ہو سکتا ہے، لیکن جب سوال زبان کا آئے گا تو اہل زبان کے مقابلہ میں، غیر اہل زبان کی اپیل رد کرنا ہی پڑے گا۔

مثلاً اقبال کو لیجئے کہ معانی کے لحاظ سے ان کی فارسی شاعری کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ ایران میں اس وقت کوئی ان کا مقابل نظر نہیں آتا، لیکن زباندانی کے لحاظ سے نہ اقبال نے کبھی اس پر فخر کیا اور نہ اس باب میں ان کا کوئی شعر سنداً پیش کیا جا سکتا ہے۔

انگریزی زبان کو لیجئے کہ خود ہندوستان کے اندر کیسے کیسے ماہر اس کے موجود ہیں، اور کیسی کیسی بلند پایہ تصانیف ان کی پائی جاتی ہیں، لیکن ان کی عظمت محض مفہوم و معنی کے لحاظ سے ہے جس وقت صحت زبان کا کوئی جھگڑا پیدا ہوگا تو استناداً انگلستان ہی کے کسی مصنف کا کلام پیش کیا جائیگا۔

یہی حال خسرو کا تھا کہ اپنی بے پناہ و غیر معمولی ذہانت سے انھوں نے فارسی کہا، عربی و سنسکرت میں بھی شاعری کی، لیکن کیا آپ کسی اہل عرب یا ہندی نژاد شاعر کے سامنے ان کا کلام رکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں

کہ خسرو کی عربی زبان اور ہندی بھاگا کا مرتبہ وہی ہے جو تمھاری زبان کا۔

امیر خسرو کے باپ ترک تھے ایرانی نہ تھے، ماں بھی ان کی ہندی تھیں، ایرانی نہ تھیں وہ خود پیدا ہوئے یہیں اور کبھی ایران میں رہنے کا اتفاق نہ ہوا، اس لئے ان کے کلام کو فارسی زبان کی صحت میں استناداً پیش کرنا کیونکر درست ہو سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مفہوم و معنی کی بلندی اور تنوع کلام کے لحاظ سے ان کا مرتبہ اس قدر بلند تھا کہ ہندوستان کیا ایران و عرب میں بھی کوئی ان کا مثل مشکل سے پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر یہ دعوے کیا جائے کہ ان کا کلام غلطیوں سے پاک تھا (اور غلطیاں بھی زبان کی!) تو معاف فرمایئے میں اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں۔ امیر خسرو جب خود اپنے کلام پر نگاہِ انتقاد ڈالتے ہیں تو ان کو متعدد غلطیاں نظر آتی ہیں اور وہ ان کا اعتراف بھی ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:۔ چوں بسپر و طرز ہر سوادم پس شاگردم نہ اوستادم۔ لیکن ہمارے فاضل مقالہ نگار اس باب میں امیر خسرو کے کہنے پر بھی اعتماد نہیں کرتے، اور اسے امیر خسرو کی شاعرانہ انکساری تصور فرماتے ہیں۔

مولانا شبلی مرحوم نے امیر خسرو کی شاعری کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اس میں کلام نہیں کہ نہایت ہی حُسنِ ظن سے لکھا ہے (اور اس میں شک نہیں کہ خسرو کی مجمع کمالات ذات اسی حسنِ ظن کی مستحق تھی) تاہم وہ بھی اتنا لکھنے پر مجبور ہو ہی گئے کہ :۔

لیکن لغزشیں کون بتائے، یہ کس کا منھ ہے، ہم دبی زبان سے صرف اسقدر کہہ سکتے ہیں "کہ بعض کلام میں لفظی رعایت بہت ہے جو ضلع جگت کی حد تک پہونچ گئی ہے اور بعض جگہ بالکل تکلف و آورد ہے"

مولانا شبلی کا دبی زبان سے یہ کہنا ہی سب کچھ کہہ ڈالنا ہے اور اگر وہ قدامت پرست طبقہ کے انسان نہ ہوتے اور خیال کی آزادی انھیں رائے عامہ سے زیادہ عزیز ہوتی، تو شاید وہ زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بتا سکتے کہ خسرو کے یہاں کیا کیا اور کس کس قسم کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔

میں خود خسرو کا بڑا مداح ہوں اور ان کو ہندوستان کا بہترین شاعر سمجھتا ہوں، لیکن یہ حسنِ ظن ان کی طرف کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی میں نے قائم نہیں کیا کہ ان کا کلام کُلیۃً اغلاط سے پاک ہے یا یہ کہ اگر کوئی غلط بات ان کی زبان سے نکل جائے تو میرا فرض ہے کہ اسے صحیح سمجھوں۔

اگر ہمارے دوست بجائے خسرو کے حوالہ دینے کے خود اپنی ذاتی رائے کی بنا پر اس ترکیب کی صحت کا دعوے کرتے تو میں زیادہ قدر کرتا کیونکہ اس سے کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے

ہیں تقلیدنہیں ہے بلکہ اجتہاد ہے استمساک بالغیرنہیں بلکہ اعتمادعلی النفس ہے، لیکن ان کے منھ سے یہ سُنکرکہ "موطن ہندکے کلام سے استنادکرنا کافی ہے اور اس کے بعدکسی دوسرے استدلال کی ضرورت باقی نہیں رہتی، مجھے افسوس بھی ہوا اور حیرت بھی۔ افسوس اس لئے کہ ہم لوگوں کی یہ مرعوب ہوجانے والی ذہنیت مذہب سے گزرکراب ادبیات تک پہونچ گئی ہے اور حیرت اس لئے کہ یہ بات ایسے شخص کے منھ سے نکلی ہے جوعرصہ تک آزادی فکروخیال اور حریت رائے وضمیرکی پرستش کرنے والے ملک میں زندگی بسرکرچکا ہے۔

ہمارے عزیز دوست نے استناداً ایک شعر اور پیش کیا ہے لیکن اس کا پتہ نہیں چلا سکے کہ کس کا ہے۔ اگر یہ شعر واقعی کسی مستند ایرانی شاعر کا ہے توبیشک۔ مجھے اس ترکیب کی صحت میں کوئی شک نہیں ہوسکتا، لیکن تاوقتیکہ اس کا اطمینان نہ ہوجائے مجھے حق حاصل ہے کہ اپنی رائے پر بدستورقایم رہوں۔

مجھے امید ہے کہ جناب شادآنی اپنی جستجوکوبرابر جاری رکھیں گے اور اگرکوئی شعر واقعی قابل استناد نظر آجائے تو مجھے مطلع فرمائیں گے لیکن یہ پھرعرض کردوں گا کہ جستجوکا میدان ایران ہی ہو اور ایران میں بھی وہ طبقہ جو واقعی زبان کے لحاظ سے خاص مرتبہ رکھتا ہے مولانا روم کی مثنوی یا اسی قسم کی اور تصانیف سے اگرکوئی استناد انھوں نے پیش کیا تو وہ قابل قبول نہ ہوگا۔

خُدا کا انصاف

(ڈرامہ)

ان فتاوی کی بنا پر جو اکابر علمائے اسلام نے اڈیٹر نگار کے استفتاء پر تحریر فرمائے تھے اور جنوری ۳۱ء کے نگار میں شایع ہوئے تھے

استفتاء کا مفہوم یہ تھا :-

"ایک پابند صوم و صلوٰۃ مسلمان ہے لیکن زندگی اس کی مکر و فریب میں بسر ہوتی ہے ۔ دوسرا کافر برہمن ہے جو رات دن مورتیوں کی پوجا پاٹ کرتا ہے لیکن اخلاق کے لحاظ سے نہایت پاکیزہ انسان ہے ۔ ان دونوں میں کون ناجی ہے اور کون ناری"

اس استفتاء کی نقلیں ۳۲ علمائے کرام کو بھیجی گئی تھیں ، جن میں سے سولہ نے جواب دیا ۔ ان پر انتقادی نظر ڈالتے ہوئے میں نے ایک نوٹ لکھا تھا جو یہاں درج کیا جاتا ہے ، اس سے معلوم ہوگا کہ علمائے اسلام کا نظریہ نجات کیا ہے :-

ان جوابات کو اگر ان کی مختلف ذہنیتوں کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے ، تو انکو چار علٰحدہ علٰحدہ قسموں میں جدا کیا جا سکتا ہے ۔ ایک وہ ضعیف و کمزور یا مصلحت اندیش ذہنیت جو کسی قسم کا جواب دینا پسند نہیں کرتی ، دوسری وہ جسے ہم "مذبذبین" کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں تیسری وہ جس کا تعلق "راسخون" سے ہو اور چوتھی وہ جو بالکل غیر جانبدار رہنا چاہتی ہے اور عدم علم کا اعتراف کرتی ہے ۔

اول الذکر ذہنیت کی مثال آپ کو صرف ایک مولانا اشرف علی صاحب کے جواب میں نظر آئے گی کہ انھوں نے نہ صرف جواب دینے سے احتراز کیا بلکہ اس کی بھی کوشش کی کہ ان کی شخصیت کا پتہ نہ چلے ، کیونکہ انھوں نے جواب میں اپنے دستخط ثبت فرمائے اور نہ مقام درج کیا جس سے کچھ سراغ مل سکتا لیکن شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ لفافہ کی اوپر ڈاک خانہ ایک مہر بھی ثبت کر دیتا ہے اور حقیقت یہ ہے

کہ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو پتہ چلانا مشکل تھا کہ کس بزرگ کی تحریر ہے۔ کب لکھی گئی اور کہاں سے آئی ؟
اس کے بعد جو جواب دیا گیا ہے اس کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے کہ :-

"سوال تفتیش طلب ہے جو تحریر سے خالی از تکلف نہیں۔ ایسے سوال کا جواب زبانی ہو سکتا ہے"۔

مولانا نے غالب کے انداز میں کوئی ادق شعر تصنیف فرمایا ہے جس کے بعض درمیانی حصے متروک محذوف ہیں۔ اور اپنے نزدیک ایسا مسکت جواب دیا ہے کہ شاید ہی اس سے زیادہ کوئی بلیغ جواب فریق ثانی کو اس درجہ تکمیل کے ساتھ ساکت کر سکتا ہو۔

مولانا کا مدعا اس جواب سے غالباً یہ ہے کہ اس استفسار یا استفتار پر بعض تنقیحیں (عدالتی نہیں بلکہ دینی و مذہبی) قایم ہونا چاہیے اور ان تنقیحوں کے قایم کرنے میں انھیں تکلف ہے تکلیف کا اندیشہ ہے، اس لئے ایسے سوال کا جواب زبانی ہو سکتا ہے، کیونکہ نہ کوئی شخص لکھنؤ سے تھانہ بھون جانے کی زحمت اختیار کرے گا۔ اور نہ مولانا کو جواب دینے کی مصیبت میں مبتلا ہونا پڑے گا یہی وہ "نادک فرمائی" ہے، جو سوداؔ کے زمانہ میں صرف "مرغ قبلہ نما" کو تڑپا دیتی تھی، لیکن اب "حطیم کعبہ" کو متزلزل کر رہی ہے۔

شکر ہے کہ اس ذہنیت کی مثال مجھ کو تمام جوابوں میں صرف ایک ہی ملی اور وہ بھی ایک ایسی ہستی کی طرف سے جو شاید مسایل روزہ نماز سے زیادہ کسی ایسے استفسار کا جواب دینے کی اہل نہیں ہے۔ جو فلسفۂ مذہب سے متعلق ہو یا جو کسی اصولی گفتگو کی طرح ڈالنے والا ہو۔

باقی تین ذہنیتوں میں سے وہ ذہنیت جس کو میں نے "راسخون" میں داخل کیا ہے یا جدید سیاسی اصطلاح میں قدامت پسند یا کنسرویٹو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، حسب ذیل حضرات کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے۔

"قاضی صاحب بھوپال۔ مفتی صاحب رام پور۔ مفتی صاحب حیدر آباد۔ مولانا حسین احمد صاحب مفتی دیوبند۔ مولانا نثار احمد صاحب مفتی آگرہ۔ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب۔ مولانا احمد سعید صاحب دہلی۔ مولانا محمد عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی۔ مولانا سید سلیمان شاہ پھلواروی۔ مولانا عبدالحکیم صاحب صدیقی لکھنؤ۔ مولانا محمد عبدالعزیز صاحب۔ مولانا محمد سجاد صاحب"۔

ان حضرات نے نہایت صفائی اور پورے رسوخ و یقین کے ساتھ حکم لگایا ہے کہ مسلمان چاہے کچھ کرے بہر حال اُسے ناجی ہونا ہے۔ بشرطیکہ ایمان پر اس کا خاتمہ ہوا اور بت پرست کا فر کتنا ہی اچھے اخلاق کا کیوں نہ ہو اس کا ناری ہونا یقینی ہے۔ غیر جانبدار یا اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنے والی ذہنیت مولانا عبدالستار لاہوری اور مولانا احمد احمدی کے جوابات سے ظاہر ہوتی ہے، اول الذکر نے صاف طور پر لکھا ہے کہ ناری اور ناجی ہونے کے متعلق وہ "لب کشائی" نہیں کر سکتے اس کا علم مالک الملک کو ہے۔

اسی طرح ثانی الذکر صاحب نے صفائی کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ اس کو خدا بہتر جانتا ہو کہ کون ناری ہو اور کون ناجی۔
اب صرف ایک جواب مولانا سید سلیمان ندوی کا رہ گیا، جس کو میں نے مذبذب ذہنیت کے نام سے موسوم کیا ہے، کیونکہ وہ جواب شروع کرتے ہیں ان الفاظ سے کہ :-
"دونوں ناری ہیں" اور ختم کرتے ہیں اس "لیکن" پر جس میں مسلمان کے بخشے جانے اور کافر کے نہ بخشے جانے کا امکان ظاہر کیا ہے۔ ایک شخص کے لئے دشوار ہے کہ ان دونوں رایوں میں سے کس کا اعتبار کرے اور کس کو صحیح جواب خیال کرے۔

افراد ڈرامہ

طاہرہ - ایک نوجوان لڑکی
بلقیس - ایک جوان عورت
حسیب الدین - ایک مرد
سدا سکھ - برہمن
ضرغام الدین ،، ایک مسلمان پیر
کتبائیل - فرشتۂ حساب کتاب (فرضی نام)
کیکائیل - فرشتۂ میزان (فرضی نام)

(میدان حشر، دوپہر کا وقت، آفتاب سوا نیزے بلند - آدمیوں کا مضطرب ہجوم - ہر طرف شور و ہنگامہ - ایک بلند ٹیلے پر میزان عدل قایم ہے اور کیکائیل آبنوسی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ قریب ہی کتبائیل دوسری کرسی پر متمکن ہیں پشت پر سیکڑوں ماتحت فرشتے قسم قسم کے آلات ضرب لئے ہوئے کھڑے ہیں سامنے کروروں انسان اپنا اپنا نامۂ اعمال لئے ہوئے برہنہ سر، برہنہ پا، گریبان چاک، پریشاں حال، سر سے پاؤں تک پسینے میں غرق، بدحواس منہ کھولے کبھی فرشتوں کو دیکھتے ہیں اور کبھی میزان عدل کو۔)

ایک غیبی مہیب آواز ——— "سدا سکھ حاضر ہے"

(آواز کی ہیبت سے ہر شخص کانوں میں انگلی دے لیتا ہے اور تھوڑی دیر بعد مجمع کو چیرتا پھاڑتا ایک معمر انسان پھٹی ہوئی دھوتی اور تار تار کرتے میں نمودار ہوتا ہے، مونچھیں بڑی بڑی، داڑھی منڈی ہوئی، سر صاف لیکن چندیا پر ایک لمبی چوٹی۔ پیشانی پر مٹے ہوئے قشقہ کا نشان، بائیں ہاتھ میں ایک لپٹا ہوا کاغذ جو سیاہی سے لپا ہوا ہے)

کتبائیل ــ (بلند غضبناک آواز سے)، ادھر آ، سامنے

(سدا سکھ کانپتا، لرزتا آگے بڑھتا ہے اور سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا ہے)

کتبائیل ــ (اور زیادہ کرخت آواز سے) اپنا نام بتا،

سدا سکھ ــ (کانپتے ہوئے) مجھے سدا سکھ کہتے تھے

کتبائیل ــ (ہونھ) تو مسلمان تھا یا ہندو

سدا سکھ ــ حضور خود جانتے ہیں کہ میں کیا تھا

کتبائیل ــ (جبیں بہ جبیں ہوکر) مردود، ہم تو جانتے ہی ہیں تو کیا تھا، لیکن ہم تیری زبان سے سننا چاہتے ہیں، خود تجھ سے تیرے کفر کا اعتراف چاہتے ہیں۔ بول،

سدا سکھ ــ (ہاتھ جوڑکر) سرکار، تھا تو میں ہندو ہی

کتبائیل ــ تو کسکی پرستش کرتا تھا،

سدا سکھ ــ بھگوان کی۔

(لاحول ولا قوۃ کا ایک شور فرشتوں کی صف سے بلند ہوتا ہے اور انکے گرزوں سے خود بخود چنگاریاں اُڑنے لگتی ہیں)

کتبائیل ــ یہ کون تھا اور تو اُس کی پرستش کیوں کرتا تھا۔

سدا سکھ ــ یہ خدا تھا، خدا کا ایک نام تھا میری زبان میں

کتبائیل ــ (طعن آمیز لہجہ میں) خدا کا نام تھا! تیری زبان میں!، ہونھ۔ کیا تو کہہ سکتا ہے کہ خدا کے نو دو نہ ناموں میں یہ نام بھی شامل تھا اور کیا تجھے معلوم نہ تھا کہ سوائے عربی زبان کے کسی اور زبان میں خدا کا نام لینا ناجائز قرار دیدیا گیا تھا۔

سدا سکھ ــ میں عرب میں پیدا نہ ہوا تھا اس لئے نہ میں عربی زبان سے واقف تھا اور نہ خدا کے "نو دو نہ" ناموں سے میرے مکان کے پاس ایک مسلمان مولوی صاحب رہتے تھے۔ وہ ضرور مجھ کو کبھی کبھی سمجھایا کرتے تھے کہ بھگوان کا نام نہ لیا کرو یہ کفر ہے، "اللہ اللہ" کہا کرو۔

کتبائیل ــ (حیرت وغصہ سے) اور پھر بھی تو نے کہنا نہ مانا، حد ہے تیرے کفر کی۔ اچھا تو مسلمان مولوی کی اس نصیحت کا کیا جواب دیتا تھا

سدا سکھ ــ کچھ نہیں، یہی کہ خدا کا کوئی نام نہیں، جس نام سے پکارو وہ سُن لیتا ہے، وہ سب کا مالک ہے، ہندو بھی اسی کے بندے ہیں اور مسلمان بھی، یہ جھگڑے صرف اسی دنیا کے ہیں،

وہاں صرف کام پوچھا جائے گا، نام نہیں۔

(کتبائیل اور کیکائیل ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں)

کتبائیل ۔ (ہونھ) اچھا اگر تو بھگوان کو خدا ہی سمجھ کر پکارتا تھا تو پھر مندر میں جاکر پتھروں کی پوجا کیوں کرتا تھا، کیا تو انھیں خدا نہ سمجھتا تھا۔

سدا سکھ ۔ میں نے پتھر کی مورتیوں کو خدا سمجھ کر کبھی ان کی پوجا نہیں کی، بلکہ صرف دھیان گیان کے لئے ایک ٹھکانا بنا لیا تھا تاکہ خیال اِدھر اُدھر نہ بٹے۔

کتبائیل ۔ کیا مسجد میں جاکر تو دھیان گیان نہ کر سکتا تھا، کیا خدا کی یاد وہاں ممکن نہ تھی؟

سدا سکھ ۔ اُن مولوی صاحب نے بھی مجھ سے ایک دفعہ یہی بات کہی تھی،

کتبائیل ۔ پھر تو نے کیا جواب دیا۔

سدا سکھ ۔ میں نے کہا کہ مولوی صاحب اس کے جواب میں میں بھی یہی کہہ سکتا ہوں کہ کیا مندر میں خدا کی یاد نہیں ہو سکتی۔ محراب کے سامنے سجدہ میں گر کے اللہ اللہ کرنا اور مورتیوں کے آگے جھک کر بھگوان نام جپنا ایک ہی ہے۔ میں نے اُن سے یہ بھی پوچھا تھا کہ پتھر کا عبادت کے درمیان میں آ جانا ہی بُرا ہے تو پھر آپ لوگ کیوں حج میں حجرِ اسود کو چومتے ہیں۔ یہ سنکر وہ مرنے مارنے کو طیار ہو گئے اس لئے میں چپ ہو گیا اور اُن سے معافی چاہ لی۔

کتبائیل ۔ اللہ رے، تیری دیدہ دلیری کہ تو نے مقدس حجرِ اسود کا ذکر اپنی ناپاک زبان سے کیا اور اپنی مورتیوں کے ساتھ اس کو ملا دیا۔ خیر معلوم ہو گیا کہ تو ازلی کافر و مشرک ہے اور اس کا خود تو نے اقرار کیا۔ اب یہ بتا کہ تو نے اپنی دنیاوی زندگی کس طرح بسر کی۔

سدا سکھ ۔ صبح پوجا کر کے کھیت پر چلا جاتا تھا، وہاں ہل چلاتا تھا، غلہ بوتا تھا، کاٹتا تھا، اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ محنت کر کے پالتا تھا۔ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، کسی کو ستایا نہیں سب کے درد دکھ میں شریک رہا، جو خدمت مجھ سے ہو سکتی تھی اس سے کبھی دریغ نہ کرتا تھا۔ قرض کبھی کبھی ضرور لیتا تھا لیکن ادا بھی کر دیتا تھا، البتہ ایک قرض ادا نہ ہو سکا میں بیمار تھا اور میری بیوی نے اپنا ایک زیور بیچ کر میرا علاج کیا تھا، میں نے اس سے کہا تھا کہ میں تیرا یہ قرض ضرور ادا کر دوں گا، لیکن افسوس ہے کہ میں اسی بیماری میں مر گیا اور یہ بار میرے سر رہ گیا، اگر وہ معاف کر دے گی تو خیر ورنہ اس کی جو سزا چاہے مجھے دی جائے حاضر ہوں۔

کتبائیل — جو کچھ تو نے بیان کیا اس کا کیا ثبوت ہے۔
سدا سکھ — ساری دنیا سامنے موجود ہے، آپ خود پوچھ لیجئے کہ کسی کو مجھ سے کوئی شکایت ہو یا نہیں
(ایک خلا شگاف آواز بلند ہوتی ہے کہ "سدا سکھ کے خلاف جس کو
جو کچھ کہنا ہے سامنے آئے"۔ دیر تک اس کی گونج قایم رہتی ہے اور
پھر اس کو دہرایا جاتا ہے، لیکن کوئی شخص سامنے نہیں آتا)
کتبائیل — (کافی انتظار کے بعد) اپنا نامۂ اعمال کھول اور پڑھ اس میں کیا لکھا ہے۔
سدا سکھ — (نامۂ اعمال کھول کر غور سے دیکھتے ہوئے) یہ تو بالکل سیاہ ہے اور سوائے کفر و شرک کے
اور کچھ اس میں نظر ہی نہیں آتا۔
کتبائیل — (ماتحت فرشتوں سے خطاب کر کے) لیجاؤ اس کو میزان عدل کی طرف۔
(چند فرشتے آتے ہیں اور دھکا دیتے ہوئے اسے کیکائیل کی طرف لیجاتے ہیں)

(۲)

(وہی منظر، وہی مقام اور وہی وقت)

غیبی آواز — ضرغام الدین حاضر ہے۔

(ضرغام الدین - ادھیڑ عمر کے آدمی - لمبی داڑھی - مونچھ منڈی ہوئی -
پیشانی پر چمکتا ہوا نشان سجدہ کا۔ بائیں ہاتھ میں جریب، داہنے میں
نامۂ اعمال لئے ہوئے نمودار ہوتے ہیں)

کتبائیل — "تمہارا کیا نام ہے"

(مجمع میں ہلچل پیدا ہو جاتی ہے اور متعدد مرد عورت لوگوں کو چیرتے پھاڑتے
سامنے آتے ہیں)

سب — (ایک آواز سے) انصاف، انصاف،
کتبائیل — ہائیں، یہ کیا ہنگامہ ہے، تم لوگ کیا چاہتے ہو،
سب — (ایک آواز سے) ہم انصاف چاہتے ہیں اور ضرغام الدین کے خلاف۔
کتبائیل — (تعجب سے) ضرغام الدین - مولوی ضرغام الدین کے خلاف۔ وہ شخص جس نے کبھی ایک
وقت کی نماز قضا نہیں کی، جس نے کبھی ایک روزہ ترک نہیں کیا، جس نے اپنی عمر میں
پچیس حج کئے اور ہر سال متعدد قربانیاں کیں

ب — "ہاں، ہاں اسی کے خلاف"
کنتبائیل — اچھا، تو ہر شخص علٰحدہ علٰحدہ کہے جو اسے کہنا ہے۔

(ایک عورت آگے بڑھتی ہے)

عورت — میرا نام طاہرہ ہے، میرا باپ ضرغام الدین کا مُرید تھا اور خاصہ دولتمند آدمی تھا، میں اسکی اکلوتی بیٹی تھی، میرے باپ کو یہ ہر سال اپنے ساتھ حج چلنے کی ترغیب دیا کرتا تھا، لیکن وہ کسی نہ کسی مصروفیت کی وجہ سے نہ جا سکتا تھا۔ جب وہ بہت ضعیف ہو گیا تو اس خیال سے کہ معلوم نہیں آیندہ سال تک جیوں یا مروں، اس نے اس مولوی سے کہا کہ "میں امسال آپ کے ساتھ جانے کے لئے طیار ہوں" اس نے سوچکر کہا کہ "میں تو اس مرتبہ تمھارا ساتھ نہ دے سکوں گا کیونکہ میں نے رات کو خواب دیکھا ہے کہ آنحضرت سرورِ کائنات تخت پر تشریف فرما ہیں اور فرماتے ہیں کہ نور محمد کو میرے پاس بھیجدو۔ میں نے عرض کیا حضور مجھے بھی حاضری کی اجازت ہو، ارشاد ہوا کہ نہیں تم وہیں رہو اور نور محمد کے گھر کی حفاظت کرو" سو بھئی میرا جانا تو ناممکن ہے اور تمھارا ٹھہرنا کسی طرح درست نہیں۔ میرے باپ نہایت جاہل سیدھے شخص تھے وہ یہ خواب سنکر مسرت سے اُچھل پڑے اور اسی دن سے اپنے جانے کی طیاریاں شروع کر دیں۔ چونکہ میری ماں کا کئی ہزار کا زیور موجود تھا اور گھر میں کوئی دوسرا محافظ نہ تھا اس لئے وہ چلتے وقت زیور اور مجھے دونوں کو اس مولوی کے سپرد کر گئے اور کہہ گئے کہ اگر میں واپس نہ آ سکوں تو میری بیٹی کو دیدیا جائے۔

(کہتے کہتے وہ ٹھہر گئی اور سارے مجمع کی نگاہیں ضرغام الدین پر پڑنے لگیں جو خاموش سرنگوں کھڑے ہوئے تھے)

کنتبائیل — "پھر کیا ہوا"
طاہرہ — جب میرا باپ حج کے بعد واپس نہ آیا تو مجھے فکر ہوئی کہ کیا بات ہے، ضرغام الدین سے کئی بار پوچھا اس نے یہ کہکر ٹالدیا کہ آتا ہو گا، آخر کار میرے محلہ کا ایک آدمی کچھ عرصے کے بعد واپس آیا اور میرے باپ کے دو خط لایا ایک میرے نام کا اور دوسرا ضرغام الدین کے نام۔ میرے خط میں لکھا تھا کہ میں بیس دن سے بیمار ہوں اور مجھ میں کوئی حالت باقی نہیں رہی اگر یہ خط تمھیں ملے تو سمجھ لینا کہ میں مرگیا اور اپنا زیور پیر صاحب سے لیکر کسی مناسب جگہ جہاں تم پسند کرو شادی کر لینا۔ اپنے پیر کو بھی اس نے یہی لکھا تھا کہ زیور میری لڑکی کو دیدیا جائے

کتابئیل ۔ (بات کاٹ کر) پھر زیور تجھے ملا یا نہیں
طاہرہ ۔ اسی سے پوچھئے کہ وہ کس شرط پر زیور دینا چاہتا تھا۔
کتابئیل ۔ کیا شرط تھی۔
طاہرہ ۔ کہتا تھا کہ میرے ساتھ شادی کرلو
کتابئیل ۔ پھر تو نے شادی کی یا نہیں
طاہرہ ۔ نہیں
کتابئیل ۔ کیوں
طاہرہ ۔ مجھے اس کی صورت پسند نہ تھی، اس کی سیرت سے نفرت تھی، میں جانتی تھی کہ اس کے گھر میں اسکی بیوی موجود ہے اور یہ کس کس طرح اس کو تکلیفیں پہونچاتا ہے، میں سمجھتی تھی کہ صرف زیور کی وجہ سے میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے اور اس کے بعد وہ گھر سے نکالدیگا پھر سو بات کی ایک بات یہ کہ یہ بڈھا کھوسٹ تھا اور میری عمر زیادہ سے زیادہ اٹھارہ سال کی تھی
کتابئیل ۔ "پھر کیا ہوا"
طاہرہ ۔ یہ ہوا کہ اس نے زیور دینے سے انکار کر دیا اور میں اس صدمہ سے بیمار ہو کر دق میں مبتلا ہوگئی اور اپنے باپ کے مرنے کے چھ مہینے بعد ہی اس مولوی کو دعائیں دیتی ہوئی دُنیا سے رخصت ہوگئی۔

کتابئیل ۔ (ضرغام الدین سے) کیوں کیا کہتے ہو۔ کیا اس عورت کا بیان صحیح ہے۔
(ضرغام الدین خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا)

کتابئیل ۔ کوئی فریادی اور ہے؟
ایک نوجوان ۔ (آگے بڑھکر) حضور، میں بھی ایک فریاد لایا ہوں۔
کتابئیل ۔ کہو کیا کہتے ہو
نوجوان ۔ میرا نام حبیب الدین ہے، میں ہندوستان کی خلافت کمیٹی کا سکرٹری تھا اور مولانا ضرغام الدین کمیٹی کی طرف سے دورہ کرنے برما بھیجے گئے تھے وہاں ان کو سیٹھ جمال نے دس ہزار روپیہ کے دس نوٹ دئے لیکن انھوں نے واپس آکر داخل نہیں کئے اور نہایت افسوسناک لہجہ میں بیان کیا کہ رنگون میں کسی نے جیب سے نکال لئے۔ میں نے سیٹھ جمال سے نوٹوں کے نمبر منگوائے اور خفیہ جانچ کی تو معلوم ہوا کہ اس شخص نے وہ تمام

نوٹ ایک ایک کر کے اپنے وطن میں بھنائے اور ایک پختہ مکان اسی رقم سے طیار کرایا
چنانچہ میں درخواست کرتا ہوں کہ اس سے خیانت کا مواخذہ کیا جائے اور جو حویلی
اس نے طیار کی تھی اس کے گلے میں ڈالدیجائے تاکہ اس کے بوجھ سے یہ ہر وقت پستا
اور کراہتا رہے۔

کتابئیل ۔ (خاموش) سزا کی تجویز کسی بندہ کا کام نہیں، اس کا فیصلہ خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسکو
چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے اور جس کو نہیں چاہتا نہیں کرتا۔ (بلند آواز سے) اور کسی
کو کچھ کہنا ہے۔

ایک عورت ۔ (آگے بڑھکر) مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔

کتابئیل ۔ بول، کیا کہتی ہے۔

عورت ۔ میرا نام بلقیس ہے، میرا شوہر اس کا مرید تھا اور فرشتہ سے کم معصوم اسے نہ سمجھتا تھا۔

کتابئیل ۔ (فرشتہ کے ساتھ معصومیت کی نسبت سنکر کن انکھیوں سے لیکائیل کی طرف دیکھتے ہوئے)
تو کیا یہ فرشتوں کی طرح معصوم نہ نکلا۔

عورت ۔ فرشتوں کی معصومیت کا حال تو مجھے دنیا میں بھی معلوم نہ تھا اور یہاں بھی اس کا کوئی
تجربہ ابھی تک نہیں ہوا۔
پہلے آپ میری پوری بات سُن لیجئے، پھر خود فیصلہ کیجئے گا کہ وہ آپ سے زیادہ معصوم
تھا یا آپ اس سے زیادہ معصوم ہیں۔

کتابئیل ۔ (خشونت کے ساتھ) جلدی کہہ جو کچھ کہنا ہے۔

عورت ۔ مجھے اطمینان سے کہنے دیجئے، غصہ نہ کیجئے، فرشتوں کے پیارے چہروں کے لئے یہ
چیز موزوں نہیں۔ ہاں، تو اس نے ایک دن مجھ سے کہا کہ "چلو تمھیں بھی پیر صاحب
کے پاس لے چلوں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ کیا اُس کو مرید نہ کراؤ گے"۔ میں محلہ کی عورتوں
سے پیر صاحب کا سارا حال سُن چکی تھی اس لئے دل نہ چاہتا تھا، لیکن اپنے شوہر کے
اصرار سے مجبور ہو گئی۔ آخر کار ایک دن بعد نماز عشا وہ مجھے لے گئے اور حجرہ کے اندر
چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ پیر صاحب لیٹے ہوئے تھے، مجھے دیکھتے ہی "سبحان اللہ سبحان اللہ"
کی تسبیح پڑھنے لگے اور بولے تیرا کیا نام ہے۔
شرم کے مارے میں پسینے پسینے ہوئی جاتی تھی اور سمٹی ہوئی پیچھے سرکتی جا رہی تھی،

میں نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے پھر پوچھا اور ذرا سخت لہجہ میں میں نے بادلِ ناخواستہ نام بتایا، وہ اُٹھ بیٹھے اور اپنا ہاتھ بڑھا کر کہا کہ ہاتھ باہر نکال، میں آج تجھے اپنے حلقہ میں داخل کرتا ہوں۔ میرا شرم کے مارے بُرا حال تھا کیونکہ اسی دن میں نے منہدی لگائی تھی اور اس کی سرخی چڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن ادھر سے پھر اصرار ہوا اور مجبوراً اپنا کانپتا ہوا ہاتھ میں نے آگے بڑھا دیا۔ انھوں نے میرے ہاتھ کو فوراً دبوچ لیا اور کچھ پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتے جاتے تھے اور میرا ہاتھ مسلتے جاتے تھے، ہاتھ مسلتے جاتے تھے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جاتے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں، سر جھکا لیا اور غیرت و شرم سے مجھ پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

آدھ گھنٹے کے بعد جب میرے ہاتھ کی حالت بالکل نچوڑے ہوئے کپڑے کی طرح ہو گئی تو اسے چھوڑ دیا اور میری گردن کی طرف ہاتھ بڑھا کر دونوں شانے پکڑ لئے، میں نے چاہا کہ اُٹھ کر بھاگ جاؤں لیکن اول تو وہ گرفت ایسی نہ تھی کہ میں آسانی سے پیچھا چھڑا لیتی اور دوسرے یہ کہ جاتی بھی تو کہاں، آگے یہ شیطان تھا اور پیچھے دیوار، حجرہ کا دروازہ بند تھا اور میرے احمق شوہر مجھ سے دور گھر میں بیٹھے "دعائے گنج العرش" پڑھ رہے تھے۔ میں نے مجبوراً اسے بھی برداشت کیا لیکن جب اس کے ہاتھ شانے سے ہٹ کر نیچے سینہ کی طرف پہونچنے لگے تو مجھ سے ضبط نہ ہوا اور میں کھڑی ہو گئی اور جتنی گالیاں میں دے سکتی تھی سب سُنا دیں۔

جب گھر واپس آئی تو میرا بُرا حال تھا اور میرے شوہر ہنوز وظیفہ میں مصروف تھے۔ میں نے پہلے تو ارادہ کیا کہ سارا حال کہدوں لیکن یہ سمجھ کر کہ اسے کبھی یقین نہ آئے گا، خاموش ہو رہی اور پھر کبھی نہیں گئی۔ اس کو میرے شوہر نے انتہائی گستاخی سمجھ کر مجھے بُرا بھلا بھی کہا، اور مارا بھی لیکن میں نے اس طرف کا رخ پھر کبھی نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ میرے اور شوہر کے درمیان مغایرت بڑھتے بڑھتے نفرت میں تبدیل ہو گئی اور آخرکار ایک دن اس نے اسی شیطان کے کہنے سے مجھے طلاق دیدی اور میری معصوم بچی مجھ سے چھین کر مجھے باہر نکالدیا میرے ماں باپ غریب تھے وہ بھی صبر کر کے بیٹھ رہے اور میں اپنی بچی کو یاد کرتے کرتے ایک سال کے اندر ہی ختم ہو گئی۔

کتبائیل ۔ (ضرغام الدین سے مخاطب ہو کر) کیوں تمہارا کیا جواب ہے۔

(ضرغام الدین بدستور خاموش رہا)

کتابئیل ـــ (بلند آواز سے) کوئی اور فریادی ؟

(دفعتہً متعدد آدمی آگے بڑھنے لگے اور یہ کشمکش خطرناک صورت اختیار کرنے لگی)

کتابئیل ـــ (یہ ہنگامہ دیکھ کر) اچھا، اب میں کسی کی فریاد سننا نہیں چاہتا کیونکہ نجات کا تعلق ان باتوں سے نہیں ہے بلکہ صرف معتقدات سے ہے اور اس لئے میں سب سے پہلے اس مسئلہ کو طے کرنا چاہتا ہوں۔ (ضرغام الدین سے)۔ بولو تمہارا مذہب کیا تھا۔

ضرغام الدین۔ "اسلام"

کتابئیل ـــ تم خدا کو ایک سمجھتے تھے۔

ضرغام ـــ ایک بالکل ایک۔ وحدہٗ لاشریک لہٗ

کتابئیل ـــ انبیاء و رسل کے قائل تھے

ضرغام ـــ ایسا قائل کہ بغیر ان کا نام لئے ہوئے کوئی کام نہ کرتا تھا۔

کتابئیل ـــ تم کتب سماوی، حیات بعد الموت، عذاب قبر، منکر نکیر، برزخ، حشر و نشر، دوزخ و جنت کو برحق جانتے تھے۔

ضرغام ـــ برحق نہ جانتا تو آج باوجود اتنی سیاہ کاریوں کے نجات کی طرف سے مطمئن کیونکر ہو سکتا تھا۔

کتابئیل ـــ تم کو اس میں کوئی شک تو نہ تھا کہ حوّا آدم کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئیں اور شیطان کے دھوکے میں آکر انھوں نے گیہوں کھایا اور جنت سے نکالے گئے۔

ضرغام ـــ شک کیسا ؟ میں نے تو اپنی ساری زندگی اسی افسوس میں بسر کر دی کہ اگر آدم و حوّا سے یہ غلطی نہ ہوتی تو عدن میں چین سے پڑے پڑے ہر وقت میوے نہ کھایا کرتے۔

کتابئیل ـــ کیا تم، نبی آخر الزماں کے معجزۂ شق القمر کو تسلیم نہ کرتے تھے۔

ضرغام ـــ نبی آخر الزماں تو خیر رسول خدا تھے میں تو امت محمدی کے ہر ہر ولی کو صاحب کشف و کرامات جانتا تھا اور دور کیوں جائیے خود مجھ سے بھی بعض کرامتیں ظاہر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

کتابئیل ـــ طوفان نوح کے بابت تمہارا کیا عقیدہ تھا

ضرغام ـــ یہی کہ وہ ایک بڑھیا کے تنور سے اٹھا اور سوائے حضرت نوح اور ان کے ساتھیوں کے سب کو ڈبو دیا۔

کتابئیل ـــ حضرت موسیٰ نے جب مصر کے جادوگروں کے سامنے اپنا عصا زمین پر ڈالا تو کیا ہوا۔

ضرغام — وہ اژدہا بنکر جادوگروں کے تمام سانپوں کو نگل گیا

کتبائیل — اُور جب انھوں نے دریائے نیل پر عصا مارا تو ——"

ضرغام — (جلدی سے بات کاٹ کر) دریا پھٹ گیا، بنی اسرائیل آسانی سے گزر گئے لیکن فرعون جب گزرنے لگا تو پانی کے دھارے پھر ملگئے اور وہ اپنے لشکر سمیت غرق ہوگیا۔

کتبائیل — حوران بہشت کے متعلق تمھارا یہ عقیدہ تھا کہ وہ صرف خیالی چیزیں ہیں اور حقیقت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔

ضرغام — استغفراللہ، میں نے عبادتیں ہی اس لئے کی تھیں کہ یہاں حوریں ملیں گی، میں تو انسے ملنے کی امید پر خدا جانے کتنے چلے دریا میں ننگے کھڑے ہو کر کھینچ چکا ہوں اور آپ پوچھتے ہیں کہ میں انھیں خیالی چیز تو نہیں سمجھتا تھا، خوب!

کتبائیل — کیا تمھیں یقین نہ تھا کہ بھلائی برائی سب خدا کی طرف سے ہے۔

ضرغام — یہ یقین نہ ہوتا تو دنیا میں اتنے گناہ کرنے کی جرأت ہی کیونکر ہوتی۔

کتبائیل — اس کا کیا مطلب!

ضرغام — یعنی میں سمجھتا تھا کہ جو کچھ میں کرتا ہوں وہ سب خدا کی مرضی سے ہے اور اس کی مرضی کے خلاف کرنے پر میں قادر نہیں

کتبائیل — اور ہاں ہم فرشتوں کے متعلق تمھارا کیا عقیدہ تھا۔

ضرغام — میں آپ لوگوں کو نورانی مخلوق سمجھتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ آپ جو صورت چاہیں اختیار کر سکتے ہیں، نظام کائنات سب آپ ہی حضرات کے ذریعہ سے ہوتا تھا اور آپ میں سے ہر ایک کسی خاص خدمت پر مامور تھا، میں آپ کو معصوم بھی سمجھتا تھا یعنی یہ کہ آپ نہ مرد ہیں نہ عورت۔

کتبائیل — معتقدات کے لحاظ سے تمھارے جواب واقعی ایسے ہیں کہ تمھارے گناہوں کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی، تاہم چونکہ جزا و سزا کی تعیین میرا فرض نہیں ہے اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ فیصلۂ خداوندی تمھارے حق میں کیا ہو اس لئے تم جاؤ پہلے میزان میں اپنا نامۂ اعمال وزن کراؤ اور وہاں سے پل صراط پر جاؤ کہ آخری فیصلہ وہیں ہوتا ہے۔

(مولانا ضرغام میزان عدل کی طرف اکڑتے ہوئے بڑھتے ہیں)

---

(۴)

[وہی وقت ، وہی منظر، میزان عدل کے پاس سداسکھ اور مولانا ضرغام دونوں اپنا اپنا نامۂ اعمال لئے کھڑے ہیں۔

کیکائیل — (بھاری آواز سے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے) تم اپنے اپنے اعمال علٰحدہ علٰحدہ وزن کرانا چاہتے ہو یا ایک ساتھ۔

ضرغام — میں اس کا مطلب نہیں سمجھا

سداسکھ — میں بھی نہیں سمجھا

کیکائیل — یعنی ایک صورت تو وزنِ اعمال کی یہ ہے کہ ہر شخص کا نامۂ اعمال الگ الگ میزان میں رکھکر دیکھا جائے کہ پلڑا جھکتا ہے یا اوپر اُٹھتا ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ ایک پلڑے میں ایک کا نامۂ اعمال رکھا جائے اور دوسرے میں دوسرے کا اور پھر دیکھا جائے کہ کون جُھک جاتا ہے۔

ضرغام — (ذرا تن کر) یہ آپ نے کیا فرمایا، کجا یہ کافر، کجا میں مردِ مسلمان، میرے اعمال سے اسکے اعمال کو کیا نسبت،

سداسکھ — سچ ہے، میرے اعمال سے ان کے اعمال کو نسبت،

کیکائیل — لیکن مناسب یہی ہے کہ دونوں ایک ساتھ رکھ کر تول لئے جائیں، کیونکہ اس طرح سب کو معلوم ہوجائے گا کہ کفر و اسلام میں کیا فرق ہے۔

ضرغام — (مسکراتے ہوئے) بالکل درست فرمایا آپ نے، یہی صورت بہتر ہوگی

کیکائیل، فرشتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ان میں سے دو فرشتے دونوں کا فردِ اعمال لینے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔ ایک فرشتہ مولٰنا ضرغام کے سامنے جاکر اپنے ہاتھ مودبانہ پھیلا دیتا ہے اور وہ اپنا نامۂ اعمال اس پر انتہائی تبختر کے ساتھ رکھدیتے ہیں۔ دوسرا فرشتہ سداسکھ کے قریب جاتا ہے پہلے اسکی طرف گھورتا ہے اور پھر انتہائی غصہ و نفرت کے ساتھ ایک خنجر کی نوک اس کے نامۂ اعمال میں چبھو کر اُٹھا لیتا ہے اور ہاتھ کو جسم سے دور رکھے ہوئے اس طرح لیجاتا ہے گویا وہ کوئی سخت نجس چیز ہے۔

دونوں فرشتے میزان کی طرف جاتے ہیں اور داہنے پلڑے میں مولانا ناصر غام کی فرد رکھ دیتے ہیں اور بائیں میں سدا سکھ کی - دفعتہً بایاں پلڑا اوپر اٹھنا شروع ہوتا ہے اور داہنا جھکنا - یہاں تک کہ مولانا ناصر غام کے اعمال حسنہ کے وزن سے زمین چرچرانے لگتی ہے اور "سبحان اللہ" کا نعرہ فرشتوں کی صفوں سے بلند ہوتا ہے -

(۴)

میدان حشر کا وہ حصہ جس کے آگے دوزخ و جنت کے حدود شروع ہوتے ہیں - سامنے پل صراط قایم ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے - اس کے نیچے نہایت عمیق و وسیع غاروں کا سلسلہ ہے جن سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں اور ماورائے پل صراط حد نظر تک نخلستانوں کے آثار نظر آرہے ہیں، جہاں سے فردوس کا آغاز ہوتا ہے - اس میدان کے ایک گوشہ میں بہت سے جانور کھڑے ہوئے ہیں، جن میں زیادہ تر دنبے، بھیڑیں اور بکریاں ہیں، اونٹ بھی نظر آتے ہیں لیکن کم ---- ہجوم سے مولانا ناصر غام اور سدا سکھ نکل کر سامنے آتے ہیں -

ایک فرشتہ ---- (ان سے مخاطب ہوکر) تم دونوں کا حساب و کتاب ہوچکا، میزان عدل میں فرد عمل تل چکی اور کارکنان قدرت کی طرف سے جو اطلاع عرش کبریائی تک پہونچائی جانی تھی وہ پہونچا دی گئی۔ اب وقت فیصلہ کا ہے جو صرف خدا کے ہاتھ میں ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تم دونوں میں سے کس کو مستحق نجات قرار دیتا ہے اور کس کو لایق سزا، وہ مالک و مختار ہے اور اس سے کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا کہ جزا و سزا کے اصول اس نے کیا مقرر فرمائے ہیں - بہرحال یہ سامنے پل صراط ہے اب تم آگے بڑھو اور اس سے محفوظ گزر جانے کی کوشش کرو، اگر تم اس میں کامیاب ہوگئے تو سبحان اللہ کیا کہنا وہ سامنے بہشت ہے اور اس کی تمام ناقابل قیاس لذتیں، اگر تم ناکام رہے تو کہنے کی ضرورت نہیں، آگ کے شعلے غاروں سے بلند ہوتے ہوئے تمہیں بھی نظر آرہے ہوں گے -

سدا سکھ ---- (کانپتا، لرزتا ہوا) اگر نجات کا انحصار اسی پل صراط سے گزر جانے پر ہے اور بہشت ان مہیب غاروں کو عبور کرنے کے بعد ہی مل سکتی ہے تو میں درخواست کروں گا کہ

مجھے یہیں سے اُٹھا کر آپ جہنم میں ڈال دیجئے، کیونکہ پُل صراط سے گزرنا کسی کے امکان میں نہیں ہے خاص کر میں کہ دنیا میں ایک دن بھی میں نے جمناسٹک کی مشق نہیں کی نہ تار اور رسّی پر چلنا سیکھا۔

فرشتہ۔ (غصہ سے) بدتمیز کافر خاموش رہ تجھے کیا خبر کہ مسلمانوں کے لئے یہی پل صراط ایک وسیع سڑک بن جاتی ہے اور وہ کس شان کے ساتھ اس سے محفوظ گزر جاتے ہیں۔ (ضرغام الدین سے مخاطب ہوکر) بولو تم کیا کہتے ہو۔

ضرغام الدین۔ بیشک درست فرمایا آپ نے، دیکھئے میں ابھی اس کو عبور کرکے دکھاتا ہوں۔ (جانوروں کی طرف منہ کرکے) اے میری قربانی کے جانورو، چلو آگے بڑھو اور مجھے پُل صراط پہ لے چلو کہ اسی دن کے لئے میں نے تمہارا خون بہاکر تم پر احسان کیا تھا۔

جانوروں کے جھنڈ سے درجنوں، دُنبے اور بکرے دوڑتے ہوئے ضرغام الدین کے سامنے آجاتے ہیں اور وہ ان میں سے ایک نہایت موٹے تازے دُنبے کا انتخاب کرکے اس پر سوار ہوجاتا ہے اور پُل صراط کی طرف چل پڑتا ہے۔ سدا سُکھ حیران و پریشان اس منظر کو دیکھ رہا ہے اپنی بےبسی و بیکسی پر آنسو بہا رہا ہے۔ دفعتاً ایک فرشتہ نمودار ہوتا ہے اور کشاں کشاں اسے پل صراط کی طرف لیجاتا ہے۔ [illegible] نہایت تیز چمک کے ساتھ تڑاتڑ کی آواز پیدا ہوتی ہے اور سب کی نگاہیں دیکھتی ہیں کہ مولانا ضرغام بجلی کی رفتار سے پُل صراط کو عبور کرتے چلے جا رہے ہیں اور سدا سُکھ کا جسم ہر قدم پر ٹکڑے ٹکڑے ہوکر پل صراط سے نیچے غاروں کے اندر گر رہا ہے۔

ضرورت ہے

۱۲ء فروری تا جون۔ اگست و نومبر ۲۳ء مارچ اپریل اگست و دسمبر ۲۴ء ستمبر ۲۵ء جنوری۔ اگست اکتوبر، نومبر و دسمبر ۲۶ء مارچ تا مئی، ستمبر تا دسمبر ۲۷ء فروری۔ جولائی تا دسمبر ۲۸ء جنوری، فروری۔ اپریل تا جولائی۔ ستمبر تا دسمبر ۳۰ء جنوری، اپریل تا جولائی۔ دسمبر ۳۱ء جنوری، اپریل و مئی۔ ۳۲ء اپریل۔ ۳۳ء جون۔ اگست و دسمبر ۳۴ء جنوری، فروری، اگست و نومبر ۳۵ء اکتوبر۔

مینیجر نگار

یو-پی کا ایک نوجوان ہندو شاعر

"فراق" گورکھپوری

ایک زمانہ تھا کہ میری زندگی کی تنہائیوں کا دلچسپ ترین مشغلہ صرف شعر پڑھنا تھا، اس کے بعد شعر کہنے کا دور آیا اور کافی عرصہ تک مجھ پر مسلط رہا، لیکن ان دونوں زمانوں میں کوئی زمانہ اس احساس سے خالی نہ گزرا کہ اگر شاعری ہماری حیاتِ دنیاوی کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری نہیں ہے تو کم از کم اسے ایک نوع کی وجدانی تسکین کا ذریعہ یقیناً ہونا چاہئے ـــ اور اگر یہ بات بھی اسے حاصل نہ ہو تو پھر "ایں دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولیٰ -

یہ تھا وہ احساس جو شاعری ترک کرا کے آہستہ آہستہ مجھے "انتقادِ شاعری" کی طرف لے گیا، اور اسی کا ہو کر رہ گیا- یہاں تک کہ آج اکثر حضرات خیال کرتے ہیں کہ شاید میں اپنے سوا کسی کو شاعر سمجھتا ہی نہیں، حالانکہ حقیقت اسکے بالکل برعکس یہ ہے کہ میں سوائے اپنے ساری دنیا کو شاعر سمجھنے کے لئے طیار ہوں بشرطیکہ میں دنیا کی شاعری میں وہ چیز نہ پاؤں جس نے مجھ سے میری شاعری ترک کرائی-

میں شاعری میں کیا چاہتا ہوں؟ اس کا جواب بہت مشکل ہے اور اگر اسے شاعری نہ سمجھا جائے تو میں کہوں گا کہ میں اس میں "وہ کچھ چاہتا ہوں جسے میں بتا نہیں سکتا"۔

شاعری "دل کا معاملہ" ہے اور دنیا میں اتنے مختلف "دل" اور ان کے اتنے مختلف جذبات ہیں کہ اس کے متعلق کوئی نظریہ "مسلمات" کی حیثیت سے پیش کرنا تو ممکن نہیں، لیکن اس سے شاید کسی کو انکار نہ ہو کہ شاعری صرف تاثرات کی زبان ہے اور اس کے بعد پھر یہ گفتگو کوئی معنی نہیں رکھتی کہ ان تاثرات کی نوعیت کیا ہے چہ جائیکہ "اخلاقیات" و "مذہبیات" وغیرہ کی بحث چھیڑنا کہ اسے تو شاید کوئی پیغمبر بھی گوارا نہ کرے اگر وہ شعر کہنے پر آجائے۔

بعض کا خیال ہے کہ شاعری اور آرٹ دو علحدہ علحدہ چیزیں ہیں ـ میں یہاں آرٹ اور اس کی

ہمہ گیری سے متعلق اظہار خیال کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ لیکن اسقدر عرض کرنا ضروری ہے کہ آرٹ تو خیر بہت لطیف چیز ہے شاعری "مادیات" سے بھی جدا ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ انسان کے لطیف ترین "نازک ہائے خیال" وہ ہیں جو اس نے فلسفۂ حیات و فلسفۂ مذہب کے متعلق پیش کئے ہیں علی الخصوص ہندو مذہب اور ہندو فلسفۂ حیات۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ دنیا میں "بت پرستی" رواج پا کر رہی اور خدا کا تصور بغیر "عرش و کرسی" کے ذکر کے ممکن نہ ہوا۔ شاید یہی وہ نقطۂ نظر تھا جس کو غالب نے یوں ظاہر کیا ہے۔

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

سو دیکھنے کی چیز یہی ہے کہ "دشنہ و خنجر" کے الفاظ سے واقعی "ناز و غمزہ" کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے یا نہیں اور اسی کا نام شاعری ہے جسے اگر "آرٹ" سے علحدہ کر دیا جائے تو اس کے "تصوف" ہو جانے میں تو شک ہی نہیں اگر بدقسمتی سے وہ "مجذوب کی بڑ" کا مرتبہ نہ پا سکی۔

الغرض شاعری کی اصل روح چاہے کچھ ہو لیکن اس روح کو ہم جس جسم کے اندر دیکھتے ہیں وہ میری رائے میں صرف الفاظ کا "رکھ رکھاؤ" ہے۔ یہاں اس منطقی بحث کی ضرورت نہیں کہ جس چیز کا نام "رکھ رکھاؤ" ہے وہ خود الفاظ سے علحدہ ایک چیز ہے اور اسی لئے جب میں کسی شاعر کے کلام پر انتقادی نگاہ ڈالتا ہوں تو اس سے بحث نہیں کرتا کہ اس کے جذبات کیسے ہیں بلکہ صرف یہ کہ اس نے ان کے اظہار کرنے میں کیا اسلوب اختیار کیا ہے اور وہ ذہن سامع تک ان کو پہونچانے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں بیان خواہ حسن و عشق کا ہو یا "نہر کی پن چکی" کا اس سے غرض نہیں، دیکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ واقعی الفاظ سے ادا ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ اور پھر چونکہ میں اسی دنیا کا آدمی ہوں جہاں الفاظ کا "شرمندۂ معنی" ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے اور اس دنیا کے علاوہ میں کسی اور ایسی دنیا کا قایل نہیں ہوں جہاں "معنی" "شرمندۂ الفاظ" نہیں ہوتے، اس لئے میں یہی چاہتا ہوں کہ کم از کم شاعری اسی "پُر معصیت" دنیا کی کی جائے کیونکہ "معصومیت" کا تصور محض "لڑکپن" ہے اور شعر نام ہے "جوانی" کا۔

یہاں ایک لطیفہ یاد آگیا۔ میرے ایک دوست ہیں جو کسی وقت شعر کا نہایت اچھا ذوق رکھتے تھے، لیکن اب تصوف کی طرف مایل ہو گئے ہیں اور مجھ سے بہت خفا رہتے ہیں، کیونکہ میرے نزدیک شاعری کو تصوف سے متعلق کر دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی خوبصورت عورت سے شادی کر لی جائے کہ اس کے بعد "حسن و عشق" دونوں کا "صفایا" ہے، نہ عورت عورت رہ جاتی ہے، نہ مرد مرد۔

ایک دن فرمانے لگے کہ "تم نہیں سمجھ سکتے تصوف اور اس کی شاعری کتنی بلند چیز ہے" اسکی ابتدائی منزل "ترکِ دنیا" ہے اور پھر "ترکِ عقبیٰ" و "ترکِ مولیٰ" سے گزر کر "ترکِ ترک" کے مرتبہ تک پہونچ جاتی ہے۔ تمہاری شاعری تو "ترکِ دنیا" سے بھی نیچے ہے اور تصوف کی شاعری کی ابتدا "ترکِ ترک" سے ہوتی جہاں "خیالِ ترک" بھی ترک کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہے وہ "دلِ بے مدعا" جسپر شاعر نے ہمیشہ سر دھنا لیکن پایا نہیں اور صوفی شاعر نے اسے پہلے ہی قدم پر پالیا۔

میں نے کہا کہ میرے نزدیک شاعری کی ایک منزل اور اس سے بھی بلند ہے پوچھا "وہ کیا" میں نے کہا کہ نام تو اس کا مجھے معلوم نہیں لیکن نمونے ایک دو ضرور پیش کر سکتا ہوں مثلاً :-

جیسے ٹوٹی دریا کی کلائی زلف الجھی بام میں ۔۔۔ مورچہ مخمل میں دیکھا آدمی یا دام میں

فرمانے لگے "یہ تو بالکل مہمل ہیں" میں نے کہا کہ آپ کا "ترکِ ترک" اس سے زیادہ مہمل ہے اِس رنگ کے شاعر کو ہم زیادہ سے زیادہ مسخرا کہہ سکتے ہیں، لیکن آپ کی اس "ترکیات" والی شاعری کو تو سوائے حماقت کے اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ رہگیا دلِ بے مدعا سو حضرت وہ آپ ہی کو مبارک رہے، مجھے تو ایسا دل دیجئے جس میں سوائے مدعا کے کچھ نہ ہو اور اسی کیساتھ کسی معشوقہ پری تمثال کو سامنے بٹھا کر چلے جائیے پھر دیکھئے کہ "وصل وصل" کا رنگ زیادہ چوکھا رہتا ہے یا "ترکِ ترک" کا۔ اس میں شک نہیں کہ "ذہن رسا" فطرت کی بڑی پاکیزہ ودیعت ہے جو انسان کو عطا ہوئی ہے، لیکن اگر اسمیں بے اعتدالی پیدا ہو جائے تو پھر انسان انسان تو رہتا نہیں، یہ اور بات ہے کہ وہ صوفی ہو جائے یا اس سے بھی بڑھکر خدا بن بیٹھے۔

ایک صاحب نے مجھ پر اعتراض کیا کہ باوصف تصوف سے اسقدر بیگانہ ہونے کے میں بیدل کی شاعری کا کیوں دلدادہ ہوں جو کہ سیر تصوف ہے۔ میں خاموش رہا کیونکہ ان کو یہ سمجھانا بہت مشکل تھا کہ بیدل کی شاعری تو ایک خاص قسم کی شاعری ہے اور اسی لئے جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اس کے لئے الفاظ وہ ایسے استعمال کرتا ہے کہ یا تو وہ خود ہمیں اس فضا میں لیجاتے ہیں جہاں کے وہ الفاظ ہیں یا پھر خود اس فضا میں آکر ہمارے ذہن کو متاثر کرتے ہیں جہاں کی باتیں ہماری سمجھ میں آجاتی ہیں۔ مجاز کو بیدھڑک "حقیقت" کہدینا اتنا مرغوب نہیں۔ جتنا "حقیقت" کو بھی مجاز کے رنگ میں ظاہر کرنا۔

سو یہ بالکل غلط ہے کہ میں تصوف کے رنگ سے متنفر ہوں، یہ ضرور ہے کہ شاعری کا خون تصوف کے ہاتھ سے مجھے پسند نہیں۔ اور میرا ہر شاعر سے خواہ وہ کسی رنگ کا ہو صرف یہ مطالبہ ہے کہ وہ خیال

اگر دانی ... شاعر

چاہے ظاہر کرے لیکن یہ دیکھے کہ اس کے الفاظ سے وہ پوری طرح ادا بھی ہوتا ہے یا نہیں، اسکے بعد مرتبہ اسلوب بیان کا ہے جس کی بلندی و نزاکت کے لحاظ سے شعر اُن خصوصیات کی حدود میں آتا ہے جو ہم کو اس بات کے سمجھنے میں مدد دیتی ہیں کہ یہ شعر میر کا ہے یا سودا کا، مومن کا ہے یا غالب کا، اور جن سے ہم شعر کے خوب اور خوب تر ہونے پر حکم لگاتے ہیں۔

دورِ حاضر اس میں شک نہیں کہ ترقی سخن کا دور ہے اور مغربی تعلیم نے ذہنیت انسانی کو اتنا وسیع و بلند کر دیا ہے کہ ہم کو ہر جگہ اچھے اچھے سخنگو نظر آ رہے ہیں، لیکن اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ ان میں کتنے ایسے ہیں جن کے شاندار مستقبل کا پتہ ان کے حال سے چلتا ہے تو یہ فہرست بہت مختصر ہو جائے گی۔ اتنی مختصر کہ اگر مجھ سے کہا جائے کہ میں بلا تامل ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر دوں تو میری زبان سے فوراً فراق گورکھپوری کا نام نکل جائے گا۔

فراق جن کا نام رگھوپتی سہائے ہے گورکھپور کے رہنے والے ہیں اور ہر چند اردو شاعری کا ذوق انھیں ورثتاً ملا ہے لیکن ان کا مخصوص "رنگِ سخن" خود انھیں کی ذاتی چیز ہے، جس کے ابتدائی نشو و نما یا تدریجی ارتقاء پر میں کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا، کیونکہ میں ان کے ابتدائی حالات سے بالکل ناواقف ہوں ابتداءً میں نے اول اول ان کو یہیں لکھنؤ میں دیکھا تھا جبکہ وہ گریجویٹ ہو چکے تھے، اس کے بعد کانپور کے سناتن دھرم کالج سے تعلق پیدا کر لیا اور وہیں سے وہ انگریزی ادب میں ام۔ اے کی سند حاصل کر کے الہ آباد یونیورسٹی چلے گئے جہاں اب بھی وہ زبانِ انگریزی کے اُستاد کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

لکھنؤ کی متعدد ملاقاتوں میں، میں نے یہ اندازہ تو کر لیا تھا کہ یہ شخص غیر معمولی ذہین (GENIUS) ہے لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ اس کا ایک قدم نہایت مضبوط پتھر پر قائم ہے اور دوسرا ایسی متزلزل چٹان پر کہ ذرا سا اشارہ گرا دینے کے لئے کافی ہے، لیکن چونکہ یہ خوش قسمتی سے ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اس لئے اس مہلک لغزش سے بچ گئے اور اب میں انھیں نہایت استحکام کے ساتھ بلند چوٹی پر چڑھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

لکھنؤ میں جب کبھی مجھے ان کے اشعار سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا، میں نے ان کے ذوق کی پاکیزگی کو بین طور پر محسوس کیا، لیکن یہ بات کبھی میرے ذہن میں نہ آئی تھی کہ وہ مستقبل میں اس کو فن کی حیثیت سے اختیار کر لیں گے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے فراق کو کسی سے تلمذ حاصل نہیں ہے اور ایسا شخص جو ہر رنگ میں کہنے کی صلاحیت رکھتا ہے، حقیقتاً کسی کا شاگرد ہو بھی نہیں سکتا اور نہ ایسا ہی وجہ ہے کہ اگر ہم اسوقت بعلوم

کرنا چاہیں کہ فراق کا اصل رنگ کیا ہے تو ہم کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتے۔
ان کا میلان وہی ہے جو مصحفی کا تھا کہ جس رنگ کو لیا اپنا بنا لیا اور ذہین و بیقرار طبیعت رکھنے والے شاعروں کو اکثر و بیشتر اسی نیرنگی میں مبتلا پایا گیا ہے علی الخصوص اس وقت جب فطرت کے ساتھ ساتھ ان کا اکتساب بھی کام کرنے لگتا ہے۔ تاہم بہ لحاظ انداز بیان اگر ان کو "مومن اسکول" میں شامل کیا جاسکے تو شاید زیادہ موزوں ہوگا۔
میں پہلے ظاہر کرچکا ہوں کہ شاعری کے لئے الفاظ کا انتخاب، اور طرز ادا دو نہایت ضروری چیزیں ہیں لیکن اگر اسی کے ساتھ خیال بھی پاکیزہ ہو تو کیا کہنا۔ اس کو دو آتشہ، سہ آتشہ جو کچھ کہئے کم ہے۔ پھر چونکہ فراق کے کلام میں ان تینوں کا اجتماع ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اسے "قدر اول" کا مرتبہ نہ دیا جائے۔
یہ بالکل درست ہے کہ فراق کے کلام میں اسقام بھی پائے جاتے ہیں، یعنی نہ وہ فنی غلطیوں سے یکسر پاک ہے اور نہ بیان کی ژولیدگیوں سے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ شاعرانہ روح اُن کے ہر ہر شعر سے ظاہر ہوتی ہے اور وہ مخصوص والہانہ انداز جو غزل کی جان ہے کسی جگہ ہاتھ سے چھٹنے نہیں پاتا۔ فراق اب شاید مشاعروں کی طرحوں پر بھی غزلیں لکھتے ہیں اور "فرمائشی شعر گوئی" کے لئے بھی طیار ہوجاتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ مشق سخن کے لئے یہ طریق کار مفید ہو، لیکن شاید "پاکیزگی سخن" کا اقتضاء کچھ اور ہے چنانچہ جس وقت ہم فراق کی طرحی و غیر طرحی غزلوں کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہم کو دونوں میں بین فرق محسوس ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مغنی کی وہ حیثیت جب وہ تنہائی میں بیٹھ کر صرف اپنے آپ کو خوش کرنے کے لئے گنگناتا ہے، اُس حیثیت سے بہت مختلف ہوتی ہے جب اس کا مقصود صرف دوسروں کو خوش کرنا ہوتا ہے۔
میں نے ابھی ظاہر کیا کہ فراق کی شاعری میں مومن کا رنگ غالب ہے، لیکن قبل اس کے کہ میں فراق کا کلام پیش کرکے اس کی وضاحت کروں، خصوصیات مومن کا مختصراً ظاہر کردینا ضروری ہے۔
مومن کی تنہا وہ خصوصیت جس میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں، اس کے انداز بیان کی بلاغت ہے، جس طرح ایک مصور کے حسن ذوق کا پتہ چلانے کے لئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس نے کس زاویہ سے تصویر لی ہے۔ اسی طرح ایک شاعر کے حُسن بیان پر حکم لگانے کے لئے ہم کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس خیال کا "خط رفتار" کیا ہے اور اس نے اپنا تیر کس گوشہ سے چلایا ہے۔ اور اسی کی جدت و ندرت پر کلام کی خوبی کا انحصار ہے، جو مومن کا حصہ کہلاتی ہے۔ انداز بیان کی ندرت غالب کے یہاں بھی ہے اور کبھی کبھی یہ دونوں ایک دوسرے سے اسقدر مل جاتے ہیں کہ امتیاز دشوار ہوجاتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ مومن

جو کچھ کہتا ہے وہ بہت ڈوب کر کہتا ہے اور غالب کی حیثیت صرف "گاہ گاہ غوطہ زنی" کی حد سے آگے نہیں بڑھتی۔ دوسری خصوصیت مومن کی اس کی فارسی ترکیبوں کی حلاوت ہے اور تیسری یہ کہ اسکی شاعری اسی دنیا کی ہے، اسی دنیا کے انسانوں کی ہے اور اسی "عالم آب وگل" کے جذبات و احساسات سے تعلق رکھتی ہے۔ اور غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فراق کی شاعری میں یہ تینوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی انداز بیان میں بھی ندرت ہے اور فارسی ترکیبیں بھی وہ بہت شگفتہ استعمال کرتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ کارزمیں سے ہٹ کر وہ آسمان پروازی میں مبتلا نہیں ہوتے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:-

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں لیکن اس ترک محبت کا بھروسہ بھی نہیں

مضمون نیا نہیں ہے لیکن سلاست الفاظ اور سادگی بیان کے ساتھ محبت کی اس خاص کیفیت کو (جس سے ہر شخص واقف ہے لیکن ادا نہیں کر سکتا) ایسے سہل ممتنع انداز میں ظاہر کر دینا، یہ ہے اس شعر کی جان جس سے سننے والا فوراً متاثر ہو جاتا ہے۔

اسی زمین کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو:-

مدتیں گزریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

دوسرے مصرعہ کے بیساختہ پن اور ردیف و قافیہ کے خوبصورت صرف نے شعر کے مفہوم کو حد درجہ دلنشیں بنا دیا ہے۔ محبوب کے یاد آنے اور نہ آنے کے متعلق حسرت موہانی کا مشہور شعر ہے:-

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اور حقیقت یہ ہے کہ اس پر ترقی بہت دشوار تھی، لیکن فراق نے زاویۂ بیان بدل کر اس میں اک نئی کیفیت پیدا کر دی۔ (لیکن ادائے بیان، ندرت خیال، بیساختگی اور اثر آفرینی کے اعتبار سے حسرت کا شعر فراق کے شعر کے سامنے)

اسی غزل کا ایک شعر خالص مومن کے رنگ کا دیکھئے:-

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست آہ، اب مجھ سے تجھے رنجش بیجا بھی نہیں

مہربانی اور محبت کے نازک فرق کو "رنجش بیجا" کے ذکر کے بعد اس انداز سے بیان کرنا شاعری کا کمال ہے اور فراق کا صرف یہ ایک شعر ان کے پاکیزگی ذوق کی اتنی زبردست شہادت ہے کہ اس کے بعد کسی اور استدلال کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بڑی ضرورت اس امر کی ہے کہ فطرت انسانی اور اسکے مختلف مظاہر کا وسیع مطالعہ کیا جائے۔ تعبیرات میں دلکشی پیدا کرنے کے لئے فراق کی کامیابیاں اس باب میں ملاحظہ ہوں، لکھتے ہیں:-

نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی زندگی اچٹی ہوئی نیند ہے دیوانے کی

بیانِ زندگی کے سلسلہ میں دیوانے کی اچٹی ہوئی نیند کی طرف ذہن کا منتقل ہونا اور پھر اسکی توضیح کرتے ہوئے یہ کہہ جانا کہ "نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی" انتہائے بلاغت ہے۔ چند اور تعبیرات ملاحظہ ہوں:۔

قید کیا رہائی کیا، ہے ہمیں میں ہر عالم　　چل پڑے تو صحرا ہے، رک گئے تو زنداں ہے

اللہ رے اضطراب کہ جس اضطراب کا　　موجِ فنا بھی اک اثر ناتمام ہو

اس بحرِ محبت میں اے دل ڈوبنے والے بچتے ہیں　　پانی کو گزرنے دے سر سے پھر دیکھ کہ بیڑا پار بھی ہے

اپنے چل پڑنے کو صحرا اور ٹھہر جانے کو زنداں قرار دینا۔ اسی طرح فنا کو "اضطراب ناتمام" سے تعبیر کرنا اور سر سے پانی گزر جانے کو بیڑا پار ہو جانا کہنا، معمولی متخیلہ کا کام نہیں۔ ایک اور لطیف شعر اسی رنگ کا دیکھئے

خواب گاہ میں تیری ہم ہیں نیند کے جھونکے　　اک سکون بے پایاں ہستی پریشاں ہے

فراق کی ایک بالکل نئی تخئیل ملاحظہ ہو:۔

کہاں کا وصل، تنہائی نے شاید بھیس بدلا ہے　　ترے دم بھر کے آجانے کو ہم بھی کیا سمجھتے ہیں

محبوب کے دم بھر آجانے کی یہ تعبیر کہ شاید تنہائی نے بھیس بدلا ہے، ہندی شاعری کی چیز ہے اور اردو شاعری میں میری نگاہ سے کہیں نہیں گزری خالص وارداتِ محبت اور کیفیاتِ حسن و عشق کے بھی چند اشعار سن لیجئے:۔

غرضکہ کاٹ دئے زندگی کے دن اے دوست　　وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

نثارِ پرسشِ غم کے میں کیا کہوں آخر　　کہ تجھ سے اب وہ مری سرگرانیاں نہ رہیں

تو نہ چاہے تو تجھے پا کے بھی ناکام رہیں　　تو جو چاہے تو غمِ ہجر بھی آساں ہو جائے

پردۂ یاس میں امید نے کروٹ بدلی　　شبِ غم تجھ میں کمی تھی اسی افسانے کی

پہلا شعر میر کے رنگ کا ہے اور ان تمام خصوصیات کا حامل ہے جو عشقِ بلند کام کے سوز و گداز میں پائی جاتی ہیں۔

دوسرے شعر میں صرف "پرستشِ غم" کو سرگرانیوں کے دور ہو جانے کا باعث قرار دینا اُن تاثرات سے متعلق ہے جو "کارو بارِ محبت" میں غریب عاشق کو ہمیشہ پیش آتے رہتے ہیں۔
تیسرے شعر میں فلسفۂ ہجر و وصال پر بالکل نئے انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے اور چوتھا شعر اپنے مفہوم کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔ غم کے بقا کا تعلق حقیقتاً امید سے ہے نہ کہ یاس سے۔ کیونکہ یاس کی انتہا سکون ہے اور غم کے منافی۔ اندازِ بیان نے اس خیال کو بہت زیادہ لطیف صورت دیکر پیش کیا ہو۔
محبت کی بیقراری بڑی پُرلطف چیز ہوتی ہے اور عاشق ہمیشہ اس کے قیام کی کوشش کرتا رہتا ہو لیکن اسی کے ساتھ کبھی کبھی گھبرا کر وہ ضبط و غم کے متاع کی طرف بھی ہاتھ بڑھا دیتا ہے، جس کا ردِ عمل اور زیادہ تباہ کن ہوتا ہے۔ اس خیال کو فراق نے جس خوبصورتی سے ادا کیا ہے وہ شاذونادر ہی کہیں نظر آتی ہے۔ لکھتے ہیں:-

فریبِ صبر کھا کر موت کو ہستی سمجھ بیٹھے   نہ آیا بیقراری کو حیات جاوداں ہونا

اسی غزل میں ایک نہایت نازک تخییل ملاحظہ کیجیے:-

ہر آوازِ جرس پر اک صدائے بازگشت آئی   یہ ہے ہے اسقدر بھی خیر، یاد رفتگاں ہونا

آوازِ جرس کی صدائے بازگشت کو "یادِ رفتگاں" کہنا بڑا اساوی (ETHERIAL) تخییل ہے۔
ایک اور شعر اسی زمین کا یہ ہے:

ابھی اک "پرتوِ حسنِ خیال یار باقی ہے"   ابھی آیا نہیں فرقت کو دردِ رایگاں ہونا

پہلا مصرعہ فراق کا نہیں ہے، بلکہ یہ ادنیٰ تغیر غالب کا ہے، لیکن فراق نے دوسرا مصرعہ لگا کر اسے بالکل اپنا بنا لیا۔ اور غالب سے زیادہ حسن کے ساتھ۔ فرقت کو صرف اس لئے "دردِ رایگاں" نہ کہہ سکنا کہ پرتوِ حسنِ خیالِ یار ہنوز باقی ہے، نہایت لطیف بات ہے۔
شعراء نے "حسنِ مجرد" کے خیال کو مختلف پیرایوں سے ظاہر کیا ہے، لیکن فراق کا اندازِ بیان ملاحظہ ہو:-

بہار چند روزہ کو بہار جاوداں کردے   قیود رنگ و بو سے کچھ الگ کرنے گلستاں کو

تکرارِ الفاظ سے معنی میں حسن پیدا کرنا بہت کافی مشق چاہتا ہے۔ فراق کے کلام میں بعض نمونے اس رنگ کے نہایت پاکیزہ پائے جاتے ہیں:-

ایک کو ایک کی خبر منزلِ عشق میں نہ تھی   کوئی بھی اہلِ کارواں شاملِ کارواں نہ تھا

بے خبری ظاہر کرنے کی یہ تعبیر کرنا کہ گویا "اہلِ کارواں" کارواں میں شامل ہی نہ تھے بڑا لطیف

انداز بیان ہے۔ اسی غزل کا مقطع ہے:۔

پھر بھی سکونِ عشق پہ آنکھ بھر آئی بار ہا گو غمِ ہجر بھی فراقؔ کچھ غمِ جاوداں نہ تھا

دوسرے مصرعہ میں فراق کا رنگِ تقطیع سے گرتا ہے، لیکن شعر اپنے مفہوم کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔
فراقؔ نے بعض غزلیں ایسی لکھی ہیں، جو شروع سے اخیر تک مرصع ہیں مثلاً ایک غزل ملاحظہ ہو:۔

یہ کہئے کل کوئی بے اختیار روتا تھا وہ اک نگاہ سہی، کیوں کسی کو دیکھا تھا
کسی کے ہاتھ نہ آیا سوائے غفلت، ہوش ہر اک کو اپنے سے بیگانہ وار جینا تھا
کچھ ایسی بات نہ تھی تجھ سے دور ہوجانا یہ بات الگ اور تھی کہ رہ رہ کے درد ہوتا تھا
نہ پوچھ سود و زیاں کاروبارِ الفت کے دگر نہ یوں تو نہ کھونا تھا کچھ نہ پانا تھا
اگا رہیں وہ ترے حسنِ بے نیاز کی آہ میں تیری بزم سے جب نا اُمید اُٹھا تھا
ہر ایک سانس ہے تجدید یاد ایام گزر گیا وہ زمانہ جیسے گزرنا تھا
کہاں یہ چوک ہوئی تیرے بیقراروں سے زمانہ دوسری کروٹ بدلنے والا تھا
نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی یقیں نہ کوئی امید مگر ہمیں تو ترا انتظار کرنا تھا

غالباً یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ رنجوریِ محبت کے بیان میں جس کیفیت و سادگی، جس سلاست و حلاوت کی ضرورت ہے وہ کسقدر تکمیل کے ساتھ ان شعروں میں پائی جاتی ہے۔

اب اور چند متفرق اشعار سن لیجئے:۔

اب اور اسے وہم و گماں ہے سکوتِ ناز وہ سن چکے فسانۂ غم ہم سنا چکے
گزرے گا ہو کے شہرِ خموشاں سے آج کون سو مرتبہ چراغِ لحد جھلملا چکے

دل چاہتا ہے وعدۂ جاناں کو استوار اے وائے عشق میں بھی اگر انتظام ہو

گردشِ آسماں سے ڈرتا ہوں بڑھ چلا تیرا اعتبار بہت

کھلے رازِ دل تو یہ دیکھنا کہ دہن سے شعلے بھڑک اُٹھے یہ نہ پوچھ پھوٹ کے ہونگے کیا جو فراقؔ چھالے زباں کے ہیں

آتشِ عشق بھڑکتی ہے ہوا سے پہلے ہونٹ جلتے ہیں محبت میں دعا سے پہلے

اسے فراقؔ انھیں پاکے ہم یہ کہتے ہیں سوچیے تو مشکل ہے دیکھئے تو آساں ہے

جلوۂ حسن نثارِ غم پنہاں کردے عشق توفیق جو دے وصل کو ہجراں کردے

ہستی کو تیرے درد نے کچھ اور کردیا یہ فرقِ مرگ وزیست تو کہنے کی بات ہے
یوں تو ہزار درد سے روتے ہیں بدنصیب تم دل دکھاؤ وقتِ مصیبت تو بات ہے

ہاں بتادے مجھے وہ رابطۂ ترکِ طلب جس سے آجائے مجھے تیری تمنا کرنا

یہ ایسے اشعار ہیں کہ اگر کسی خوش ذوق انسان کے سامنے پڑھ دئے جائیں اور اس کو یہ نہ بتایا جائے کہ ان کا کہنے والا کون ہے تو وہ انھیں دہلی کے دورِ متاخر کے کسی شاعر کا کلام سمجھے گا، جبکہ غزلگوئی صرف جذبات و تاثرات کے اظہار کا نام تھی، ہرچند موجودہ دور بھی بڑی حد تک اسی اصول کا پابند ہے لیکن اندازِ بیان اس کا کچھ اور ہے۔ پہلے معنی آفرینی کی طرف اتنی زیادہ توجہ نہ کی جاتی تھی اور اس کا سبب صرف یہ تھا کہ "احساساتِ محبت" صنعت سے بیگانہ تھے۔ اب لوگوں میں "احساسِ محبت" بجائے "وقوفِ احساس" زیادہ ہے، اس لئے اس کی باریکیاں تو زیادہ کامیابی کے ساتھ پیش کرسکتے ہیں لیکن "کیفیت" پیدا کرنے میں اسقدر کامیاب نہیں ہوتے۔

فراقؔ کی شاعری میں "احساس" و "وقوفِ احساس" دونوں بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں، اس لئے ان کے یہاں معنی آفرینی کے ساتھ ساتھ کیفیت و حلاوت کی بھی کمی نہیں اور وہ فتادگی و دالہانہ ادا بھی ہرجگہ موجود ہے، جو محبت کا لازمی نتیجہ اور غزل کی جان ہے۔

فراقؔ نے اپنے ایک خط میں خود اپنی غزلگوئی کے متعلق عجیب وغریب تنقید کی ہے وہ لکھتے ہیں:-

"جس طرح رونے سے کچھ نہیں ہوتا اور پھر بھی آنسو نکل ہی آتے ہیں، اسی طرح غزل سے ہوتا کیا ہے، اگر مجبوریاں اور مایوسیاں جھکمارنے پر آمادہ کرہی دیتی ہیں"

سو آپ فراقؔ کا سارا کلام پڑھ جائیے، یہ محبت کی "مجبوری و مایوسی" بقدرِ مشترک اسکے ہر شعر میں نظر آئے گی اور یہی وہ چیز ہے جس نے ان کی غزلگوئی کو دوسرے نوجوان شعراء کے تغزل سے متمایز کردیا ہے۔

فراقؔ کے کلام میں جا بجا ندرتِ بیان اس حد تک ہوگئی ہے کہ وہ کچھ اجنبی سی ہوتی ہے

آتی ہے۔ اس کا سبب مغربی لٹریچر کی وسعت مطالعہ ہے، جس سے فراق کا متخیلہ متاثر ہو کر بغیر کسی قصد و ارادہ کے بعض بعض جگہ انداز بیان کی بالکل نئی راہیں اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ اجنبیت کسی جگہ پیدا ہونے نہیں پاتی اور سوائے اس کے کہ ذہن انسانی مطالعۂ عمیق کی طرف مجبور ہو کوئی ناگوار الجھن پیدا نہیں ہوتی۔

الغرض فراق کی غزلگوئی کا مستقبل مجھے بہت درخشاں نظر آتا ہے اور اگر انھوں نے اپنے اس فطری ذوق کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی توجہ فن کی طرف بھی صرف کر دی تو اس دور کے باکمال شعراء کی صف میں نمایاں جگہ حاصل کر لینا بالکل یقینی ہے۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ ان کی ایک بالکل تازہ غزل موصول ہوئی جسے میں اپنے انتقاد پر مہر توثیق کی صورت سے یہاں درج کئے دیتا ہوں:۔

نیرنگ حسن یار ترے بس میں کیا نہیں
لطف و کرم تو مانع جور و جفا نہیں ۔۔۔ آہ

جن کی صدائے درد سے نیندیں حرام تھیں
نالے اب انکے بند ہیں، تونے سنا نہیں؟

کس درجہ پردہ دار طلسم نگاہ ہے
اس بزم میں کسی کو کسی کا پتا نہیں

میرے سکوت یاس پر اتنا نہ ہو ملول
مجھ کو خدا نخواستہ تجھ سے گلا نہیں

نیرنگئ امید کرم ان سے پوچھئے
جن کو جفائے یار کا بھی آسرا نہیں

تھا حاصل پیام ترا اے نگاہ ناز
وہ راز عاشقی جسے تو نے کہا نہیں

اللہ درد عشق کی غیرت کو کیا ہوا
اتنا بھی بے نیاز وہ جان وفا نہیں

میں شاد کام دید بھی محروم دید بھی
ہوتا ہے جب وہ سامنے کچھ سوجھتا نہیں

ہر گردش نگاہ ہے دور حیات نو
دنیا کو جو بدل نہ دے وہ مے کدہ نہیں

اس رہگذار پر ہے رواں کاروان عشق
کوسوں جہاں کسی کو خود اپنا پتا نہیں

بس اک پیام نرگس مستانہ ہے فراق
مجھ کو دماغ کاوش لطف و جفا نہیں

مکتوبات نیاز

صدیقی ۔ نامۂ خلوص کا شکریہ ۔ آپ نے اپنی "کاوشِ ذہن آزما" کی صراحت نہیں کی، لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ ایسے ذہین نوجوانوں کے دلوں میں کیا ہیجان و تلاطم برپا رہتا ہے

"گزر چکے ہیں یہ لیل و نہار ہم پر بھی"

دیکھئے آپ صحیح و تندرست ہو چکے ہیں اور اب اپنی بیماری کا ذکر اس طرح نہ کیجئے گویا آپ کسی گناہ کا کفارہ ادا کر رہے ہیں ۔ زندگی نام صرف جوانی کا ہے اور شاید ہوسرانی کا بھی، پھر وہ جتنی زیادہ گریز پا ثابت ہو اتنی ہی زیادہ عزیز ہونی چاہئے ۔ خیام کا فلسفہ مجھے اتنا زیادہ پسند نہیں جتنا اس کا عمل (اگر واقعی اس نے کبھی بادہ خواری کی تھی) اس لئے

دراں مقام کہ ساقی قدح بگرداند

چرا سخن رود از خضر و آبِ حیوانش

جب تک تعلق کاروبارِ فطرت سے رہے میں شاعری کا زیادہ قائل نہیں لیکن ایک ذرا باغیانہ روح اپنے اندر پیدا کر لیجئے پھر دیکھئے کہ مدارِ زیست سوائے شاعری کے اور کیا رہ جاتا ہے ۔ اس سے میری مراد وہ "استغنائے نفس" ہے جو "دیہیم شاہانہ" کے ساتھ ساتھ عرفی کی زبان سے "گدا کلاہ نمد کج نہاد" کہلوائے بغیر نہ رہ سکا ۔ بیدل اس چیز کو یوں ظاہر کرتا ہے :-

خونے بجگر جمع کن و رنگ بروں آ

اس کا رنگ زیادہ گہرا ہے اور اسی لئے اس میں ہلکا سا تشاؤم (PESSIMISM) پیدا ہو گیا ہے

آپ غالب کی زبان میں اسے یوں سمجھئے

صد رنگ گل بہ جلوہ برآید ز نوکِ خار

جلال اسیر اس سے بھی بڑھ گیا ۔ کہتا ہے ۔

میز نم بر سر گلے تا خارے از پا می کشم

بہرحال مدعا یہ کہنا ہے کہ اب آپ ایسی باتیں کرنا چھوڑ دیجئے جن سے دوسروں کا دل دُکھے (خود آپ کو اگر کوئی لطف اس میں آتا ہے تو آیا کرے) آپ اگر خود کسی سے محبت کرنا پسند نہیں کرتے تو دوسروں کی محبت کا امتحان آپ کیوں اس طرح لیتے ہیں، میں جانتا ہوں کہ محبت کئے جانے کی لذت سے آپ بیخبر نہیں ہیں اور اسی لئے یہ لنترانیاں ہیں — نوعمری میں ایسی پختہ کارانہ باتیں کرنا بھی میرے نزدیک لنترانی ہی کی ایک قسم ہے۔

آپ کی نظم کا ایک ایک شعر مستقل صحیفہ ہے — مئی کے نگار میں شایع ہوگی۔ مینی تال آنے کا بظاہر کوئی امکان نہیں، لیکن مطمئن رہئے میں لکھنؤ کی گرمیوں میں بھی آپ کو نہ بھولوں گا۔

مکرمی - مضمون پہونچا - شکریہ - واقعی آپ نے بہت کاوش کی ہے لیکن میں اس "جلوۂ برقِ شرابِ گاہ گاہی" کا قایل نہیں — یعنی

یا تو بیگانے ہی رہئے ہو جیئے یا آشنا

اور آشنا رہنے کی صورت یہ ہے کہ میرے مستقل حلیف ہو جایئے - فرمایئے کیا ارادہ ہے۔ جاپان والا مضمون تو کہیں گم ہوگیا۔ فتوائے کفر والے پرچے اب نہیں ملسکتے ختم ہوگئے - جالستان میں دو ایک مضمون شامل ہیں - ایک جلد مکتوبات کی روانہ کی جاتی ہے۔

گرامی نامہ کا شکریہ - اچھا ہوا آپ راولپنڈی آگئے - ابھی سے یہ خیال دل میں گدگدی پیدا کرر ہا ہے کہ

من و کوہِ مریؔ و انجمستانے

عدم صاحب ملیں تو جتنی شکایتیں بے توجہی کی ممکن ہیں وہ سب میری طرف سے کر دیجئے - دیکھئے جب کسی کا گریبان دسترس سے دور ہوتا ہے تو بے کسی کا یہ عالم ہو جاتا ہے۔

"نگار" کے پُرانے پرچے

حسب تفصیل ذیل دفتر میں موجود ہیں اور علاوہ محصول اس قیمت پر ملسکتے ہیں جو اُن کے آگے درج ہے:-

(سنہ ۲۲ء) ستمبر ۴؍ - (سنہ ۲۳ء) مئی ۴؍ - (سنہ ۲۴ء) جنوری - فروری و اگست ۴؍ فی پرچہ - (سنہ ۲۶ء) جنوری، جون، اکتوبر و نومبر ۴؍ فی پرچہ (سنہ ۲۸ء) اپریل - مئی و جون ۴؍ فی پرچہ - (سنہ ۳۱ء) جولائی - اگست - ستمبر - اکتوبر - نومبر و دسمبر ۲؍ فی پرچہ - (سنہ ۳۲ء) جنوری (غالب نمبر) ۱۲؍ - فروری تا دسمبر علاوہ اپریل ۴؍ فی پرچہ - (سنہ ۳۴ء) فروری جولائی و اکتوبر ۴؍ فی پرچہ ۴؍ (سنہ ۳۵ء) جنوری (اُردو شاعری نمبر) عا؍ -

مینجر نگار - لکھنؤ

تخلیقِ غم

جب مکمل عرش پر دُنیا کا خاکہ ہو چکا — جب مرتب بزمِ فطرت کا صحیفا ہو چکا
خاک کے ذروں میں پیدا ہو چکی تابندگی — جب چمن کا پھول رنگ و بو کا تارا ہو چکا
اُٹھ چکے جب راز کے پردے حریمِ ناز سے — بارگاہِ عشق میں جب حُسن رسوا ہو چکا
چاندنی سے جب برسنے لگ گئیں سرمستیاں — یعنی جب بہتا ہوا پانی بھی بادا ہو چکا
لیکر انگڑائی جب اُٹھ بیٹھی عروسِ بیخودی — جب محبت کے نشیمن میں اُجالا ہو چکا
جب فرشتے زندگی کے گیت گانے لگ گئے — جب جنوں ویرانیوں میں جلوہ فرما ہو چکا

کارفرمائے حقیقت کی نگاہِ تبصرہ
لینے آئی اپنی دنیا کا مکمل جایزہ

تھی مگر دنیا کے چہرے پر ابھی سب بے رونقی — مسکراتے پھول کے دل میں بھی تھی افسردگی
ماہ و انجم کی ضیا پر ایک مضحک تبصرہ، — یاسمن کی بزم میں تھی جگنوؤں کی روشنی
بند لب غنچے ابھی وابستۂ اسرار تھے — بیہشی کا رنگ لے لیتی تھی اکثر بیخودی
عشق کی بدمست راتوں میں تھی کچھ بے کیفیاں — حسن کی رنگیں سحر پر کچھ گراں تھی زندگی
چاند کی خاموش کرنوں میں تھا اک مہمل سکوت — رات کی روماں نوازی میں نہ تھی کچھ دلکشی
بادہ سامانیِ نرگس میں تھی بے معنی نشاط — سرد نغموں سے بھری تھی زندگی کی بانسری

مختصر یہ ہے کہ یہ عالم ابھی عالم نہ تھا
یعنی اس ہنگامۂ عشرت میں جزوِ غم نہ تھا

غم ہوا پیدا ارسورج کی کرن کے ساتھ ساتھ — نالہ جاگا نغمہ ہائے انجمن کے ساتھ ساتھ
خشکیاں سوکھی زباں کی طرح بل کھانے لگیں — تتلیوں کے سائے میں جوئے چمن کے ساتھ ساتھ
زندگی نے جا کے ویرانوں میں بھی اک سانس لی — غربت ایجاد ہی ہوئی عیشِ وطن کے ساتھ ساتھ
اشک میں پیدا ہوا چنگاریوں کا سوز و ساز — داغ کا رشتہ ہوا ہر پیرہن کے ساتھ ساتھ
درد اک نادیدہ نشتر بنکے لہراتا ہوا — چبھ گیا دل میں خمارِ انجمن کے ساتھ ساتھ

فکر نے اک آہنی پنجے میں جکڑا ذہن کو　　یاس ابھر آئی جبیں کی ہر شکن کے ساتھ ساتھ
کشمکش جب داخل آداب ہستی ہو گئی
کام کی دنیا یہ انسانوں کی بستی ہو گئی

غم نے چاہا آئنہ دل کا چمکتا ہی رہے　　غم نہ ہو تو بزم ہستی میں اندھیرا ہی رہے
غم نے چھینے ہیں مقدر سے ہلاکت کے چلن　　غم نہ ہو تو ماد تو کی جنگ برپا ہی رہے
غم نے بھڑکا کر بجھایا سخت کوشی کا چراغ　　غم نہ ہو تو دل مثال شمع جلتا ہی رہے
غم نے بزم قدس میں دل کو دیا اذن سکوں　　غم نہ ہو تو آسماں نظروں کا پردا ہی رہے
غم نے کی دنیا میں تکمیل مذاقِ بیخودی　　غم نہ ہو تو عاشقی وقفِ تمنا ہی رہے
غم نے قایم کر دیا ربطِ جبینِ آستاں　　غم نہ ہو تو حسن کا ہر رنگ رسوا ہی رہے
غم خوشی کے نور میں لپٹا ہوا اک تیر ہے
غم کتاب آدمیت کی نئی تفسیر ہے

فضل الدین اثر اکبرآبادی

غزل

عشق نے روح کو جب، درد سے آباد کیا　　ذوقِ گفتار کو آمادۂ فریاد کیا
عشق اور عقل کا مخلوط کرشمہ ہے بشر　　خوب تعمیر یہ مجموعۂ اضداد کیا
اب میری حالتِ غمناک یہ کڑھنا کیسا　　کیا ہوا مجھ کو اگر آپ نے برباد کیا
حادثہ ہے، مگر ایسا تو المناک نہیں!　　یعنی اک دوست نے اک دوست کو برباد کیا
یاد کرنے سے کیا گو کہ بہت ہی پرہیز　　پھر بھی دیوانوں کی مانند اُسے یاد کیا
ہم نہ پیتے کبھی اے ساقیِ بے فیض مگر　　تیری مخمور نگاہوں نے کچھ ارشاد کیا
بات جو تم نے کبھی سوز سے لبریز کہی　　واہ کیا تذکرۂ دردِ خدا داد کیا
بر ربطِ غالب و مومن کی صدا آتی ہے
از سر نو وہ فسوں کس نے پھر ایجاد کیا

عدم

اعترافِ شکست

بیخبر تھا نیند کی آغوش میں سارا جہاں
دے رہی تھی رات نغموں کی زباں میں لوریاں

جوگیا کی مست دھن میں گا رہی تھی خامشی
نیند اپنے راگ سے برسا رہی تھی خامشی

چاند کا سیماب گوں دریا ترنم ریز تھا
کاروانِ انجم سیمیں تبسم ریز تھا

چاندنی اور چاند تاروں پر یہ ہوتا تھا گماں
بحرِ سیمیں کشتیٔ زر گنگا جمنی مچھلیاں

وادیوں میں شوخیاں دکھلا رہی تھی چاندنی
پہلوئے کہسار میں شرما رہی تھی چاندنی

یہ تو سب کچھ تھا سو تھا طرفہ ستم یہ بھی ہوا
پاس کے اک پیڑ پر ظالم پپیہا بول اٹھا

ہوکے برہم رہ گیا عقل و خرد کا بندوبست
وہ مثل صادق ہوئی دیوانہ را ہوئے بس است

آشنا سی کوئی شے سینے کو برمانے لگی،
دل سے اٹھ اٹھ کر لبوں تک آنچ سی آنے لگی،

دل کی دنیا یک بیک لینے لگی انگڑائیاں
آنکھ کے پردوں پہ کچھ پھرنے لگیں پرچھائیاں

ہلکی ہلکی چٹکیاں دل میں کوئی سے لینے لگا
گرتے پڑتے کشتیٔ امید پھر بہنے لگا

بیخودی و بیہشی کی موج لہرانے لگی
ہوش و ادراک و خرد کو نیند سی آنے لگی

پڑ گئی اک جان سی دل کے شکستہ ساز میں
منتقل ہونے لگی ہر سانس اک آواز میں

رفتہ رفتہ سانس کی آوازیں آہیں بن گئیں
اک مرقعِ عہدِ ماضی کا نگاہیں بن گئیں،

آنکھ میں آکر دھواں آہوں کا پانی بن گیا
اور یہ پانی نویدِ زندگانی بن گیا

کشتگانِ جبر سارے مرتے مرتے جی اٹھے
یعنی سب ارمانِ دل ایک ایک کرکے جی اٹھے

دلمیں ہوک اٹھی لبوں پر شورِ فریاد آگیا
بھولنے کی جسکے کوشش تھی وہی یاد آگیا

اے مرے یاد آنے والے اے مرے دل کے مکیں
اے ربابِ زندگی کے نغمۂ کیف آفریں

سعیٔ ترکِ عشق بھی ہے اک نہفتہ رازِ عشق
انتہائے بیخودی اور ابتدائے نازِ عشق

جانِ جسمِ زار سے بیزار ہے تیرے بغیر
آ، کہ میری زندگی دشوار ہے تیرے بغیر

تو بھلانے والی شئے ہے بھولنے کی شے نہیں
مئے نہو گر دشمنِ تمکیں تو وہ مے مے نہیں

مان جا پیماں شکن ظالم خدارا مان جا
مان جا، واللہ تو جیتا میں ہارا مان جا

دعوت

بیا کہ لیلیٰ فطرت ہے محوِ ناز ہنوز
نشاطِ روح ہے رعنائیِ مجاز ہنوز

یہ سبزہ زار یہ چشمے یہ آسماں یہ زمیں
مری نظر میں ہیں اک عکس جلوۂ رنگیں
کہ دیدہ ہائے دلِ رازداں ہیں باز ہنوز

شفق کے رنگِ خیالی پہ جان دیتا ہوں
میں حسنِ ماہ کو نذر اک جہان دیتا ہوں
رہینِ سجدہ ہے میرا سرِ نیاز ہنوز

فضول ہے مرے مسلک میں گفتگوئے دیں
کہ سن رہا ہوں پرندوں کا نغمۂ شیریں
نصیبِ گوش ہے صد لذتِ نماز ہنوز

ابھی ہے روح میں اک کیف کا اثر باقی
نیازِ عشق کی بخشی ہوئی نظر باقی،
زبانِ دل پہ نہیں داغِ حرص و آز ہنوز

ابھی ہے نشترِ یادِ حبیب وجہِ تپش
درونِ روح فراوانیِ متاعِ خلش
ہے صرفِ آہِ جنوں زا شبِ دراز ہنوز

ابھی ہے دفترِ کنز و ہدایہ سب بے معنی
ابھی ہے گفتگوئے زہدِ خشک لایعنی
ہر اک نفس ہے مرا وقفِ سوز و ساز ہنوز

جنونِ قلب میں جامہ دری کی ہو قوت
پتنگِ عقل اڑانے کی ہے ابھی ہمت
نثار تجھ پہ ہے رعنائیِ مجاز ہنوز

ازل سے غزنوی صرفِ اضطراب ہوں میں
تلاشِ حسن میں ڈوبا ہوا شباب ہوں میں
مری نگاہ میں ہے صورتِ ایاز ہنوز

ہوئی جو چشمِ کرم میرے حال کے شامل
رہا نہ دیر و حرم کی گرفت کے قابل
ہے وقفِ دید مری چشمِ امتیاز ہنوز

خدا کرے کہ یہ ہدیہ قبول ہو جائے
سرورِ طائرِ دل کو حصول ہو جائے
ہے رہنِ گرسنگی حرصِ شاہباز ہنوز

مضطر شاہجہانپوری ایم۔ اے

وادیِ ایمن میں

تعالی اللہ یہ صحرا یہ وادی اور یہ منظر
جدھر جاتی ہیں نظریں، بجلیاں سی کوند جاتی ہیں
کھڑی ہے یادگارِ اشتیاقِ حضرتِ موسیٰ
جو اُن کے جلوۂ صد رنگ پر قربان جاتی ہیں
جہاں اُنکے جمالِ حُسن کا پرتو جھلکتا ہے
جو بعد موت بھی زندہ رہے جینا اُسی کا ہے
یہ ایمن، اور یہ وادیِ سینا کیا تماشا ہے
وہ کوہِ طور جس پر بجلیاں جلووں کی کوندی تھیں
مذاقِ ابن عمراں اب کہاں ملتا ہے انساں کو
پہاڑ اب بھی تمنائی ہیں جلوہ گاہ بننے کے
درختوں سے ٹپکنے کو بہت مضطر ہیں انگارے
تجلی آشنا، اللہ کا پیارا نہیں کوئی
الٰہی میری آنکھوں کو مذاقِ چشمِ موسیٰ دے
گرا دے بجلیاں مجھ پر حیات افروز جلووں کی
وہ گرمیِ محبت آج پھر کر دے عطا مجھ کو
اگر بجلی نہیں ہے میرے ظرفِ تنگ کے قابل
کلیم اللہ کا منصب اگر اب مل نہیں سکتا،
مسیحا ہو نہیں سکتا کہ موسیٰ ہو نہیں سکتا
اب اس دشتِ مقدس سے میں خالی ہاتھ کیا جاؤں
یہاں تو بجلیاں بھی بھیک میں انساں کو ملتی ہیں
پلادے وہ سبو دو آتشہ میخانے سے اپنے
جلادے میرے سامانِ خودی کو پھونک دے مجھکو
ملادے خاک کر کے خاک میں وادیِ ایمن کو
مجھے آنکھوں میں اپنی اہلِ عالم مثلِ سرمہ رکھیں

ہزاروں آئینہ خانے جڑے ہیں ایک پتھر پر
یہیں تو برقِ جلوہ نے کیا تھا طور خاکستر
نیاز و ناز کے افسانے کہتا ہے ہر اک کنکر
حیاتِ جاوداں ملتی ہے اُنکو دہر میں اللہ
وہاں تو ہر نظر تپتا ہے ہر چھوٹا بڑا پتھر
ہے جو چوٹ برقِ حسن کی سینہ اسی کا ہے
یہاں تو ذرے ذرے کو انا الحق کا دعویٰ ہے
پھر اس کو آتشِ جلوہ سے جل جانے کا سودا ہے
اب اس وادی میں جلووں کا بھکاری کون آتا ہے
مگر حُسنِ ازل کو انتظارِ چشمِ موسیٰ ہے
فضا کو اضطرابِ مقدمِ مہمانِ سینا ہے
وہی ہے انجمن، اور انجمن آرا نہیں کوئی
برہنہ پا مجھے اُس طور کی چوٹی پہ پہونچا دے
مرے ذوقِ تپش کو دعوتِ وادیِ سینا دے
ہر ہر رگ میں دلِ مضطر کی اک شعلہ سا بھڑکا دے
سوادِ طور پر اک مشعلِ جلوہ ہی چمکا دے
تو شمعِ طور کا پروانہ بنجانے کا سودا دے
جو تو چاہے تو دیوانہ ترا کیا ہو نہیں سکتا
ید بیضا عنایت کر کہ چمکاتا ہوا جاؤں
یہاں آ کر میں کیوں محرومِ انوار و ضیا جاؤں
کہ جس کے نشے سے بزمِ جناں تک جھومتا جاؤں
تمنا ہے کہ اب جاؤں تو بے برگ و نوا جاؤں
شعاعِ نور بنکر تیرے جلووں میں سما جاؤں
مری مٹی بھی سرمہ کی طرح اہلِ نظر رکھیں

(نجم احمد بریلوی)

آیندہ جنوری ۳۸ء کا "نگار"

دو چند ضخامت کے ساتھ صرف ایک موضوع پر شایع ہوگا

اور موضوع بھی وہ جو نہایت اہم ہے — یعنی — اسلامی ہند کی تاریخ

اڈیٹر نگار کے قلم سے

تاریخ تین یا چار قسطوں میں مکمل ہو جائیگی اور اسکی پہلی قسط جنوری ۳۸ء کے نگار میں شایع ہوگی۔ اسلامی ہند کی تاریخ بالکل جدید اصول پر نہایت کاوش و تحقیق سے لکھی گئی ہے اس میں تمام تاریخی ماخذوں کی حقیقت سے بھی بحث کی گئی ہے اور ان مقامات کی جغرافی تحقیق بھی اس میں پائی جاتی ہے جن کا نام تو تاریخوں میں نظر آتا ہے لیکن انکی تعیین بہت کم کیگئی ہے

"اڈیٹر نگار کا بے مثل تاریخی کارنامہ"

اگر دیکھنا ہو تو جنوری ۳۸ء کا "نگار" ضرور حاصل کیجئے اور اپنے حلقۂ احباب میں بھی اسکے خریدار پیدا کیجئے۔ قیمت فی کاپی دو روپیہ — نگار کے سالانہ خریداروں کو اسی سالانہ چندہ میں ملیگا۔ ششماہی خریدار اس رعایت سے فایدہ نہ اُٹھا سکیں گے۔

منیجر نگار

اسفارِ موسیٰ علومِ جدیدہ کی روشنی میں

(ملاحدۂ عہدِ حاضر کے نقطۂ نظر سے)

توریت یا بائبل کے ابتدائی پانچ صحیفے "پنج اسفار موسیٰ" (Pentateuch) کہلاتے ہیں۔ ان کے متعلق عرصہ تک لوگوں کا اعتقاد یہ رہا ہے (اور اب بھی بعض جماعتیں اسی اعتقاد پر قایم ہیں) کہ ان کے مصنف حضرت موسیٰ تھے۔ حالانکہ یہ اسفار ان کے صدیوں بعد مرتب ہوئے ہیں اور حضرت موسیٰ کو ان کی ترتیب و تصنیف سے کوئی واسطہ نہ تھا

لیکن اگر اہل مذاہب کا اصرار ہے کہ نہیں یہ اسفار وقعی نتیجہ ہیں الہام خداوندی کا جسکی بناء پر حضرت موسیٰ کو اپنے موت و دفن کا حال بھی قبل از وقت معلوم ہوگیا تھا تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ان الہامات کی ذمہ داری تمام تر حضرت موسیٰ پر عاید ہوتی ہے، یا بالفاظ دیگر خود ذات ربانی پر جس نے اپنے ایک نبی کی زبان سے ان حقیقتوں کو ظاہر کیا

مذاہب کی بنیاد دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے مظاہر قدرت اور حوادثِ طبیعی کے سمجھنے کی کوشش نہ کی ہو اور کوئی نہ کوئی توجیہہ و تاویل اس نے مقرر نہ کی ہو۔ لیل و نہار کا ظہور موسموں کا تغیر، مینھ کا برسنا، اولوں کا گرنا، بجلی کی چمک، سمندروں کا مد و جزر، زلزلہ و طوفان وغیرہ متعدد ایسے مناظر تھے جنھیں انسان اولین نے خوف و استعجاب کے ساتھ دیکھا اور اس کی مختلف تاویلیں اس نے کیں، لیکن اس کی کوئی تاویل اس احساس سے خالی نہ تھی کہ یہ سب کچھ کسی غیبی قوت کا کام ہے جسکے مقابلہ میں انسان عاجز ہے، پھر چونکہ اس قدرت کا تخیل وہ خود اپنے مادی وجود اور اپنے تاثرات سے علیحدہ ہو کر قایم نہیں کر سکتا تھا، اس لئے اس نے سمجھا کہ وہ قوت بھی وہی جذبات رکھتی ہوگی جو خود انسان کے اندر پائے جاتے ہیں، یعنی اس کو غذا کی بھی خواہش ہوتی ہوگی، اسے غصہ بھی آتا ہوگا، وہ خوش بھی ہوتی ہوگی، اس لئے اس نے سوچا کہ تمام وہ حوادث طبیعی جن سے انسان کو نقصان پہونچتا ہے۔ اسی قوت کا غصہ ہے اور وہ مظاہر جن سے انسان کو فایدہ پہونچتا ہے اس قدرت کی خوشنودی کے علامات ہیں۔ پھر چونکہ انسان کو قوت غیبی کے اس غصہ سے بہت نقصان پہونچا کرتا تھا اور اس کی خوشنودی سے

فایدہ، اس لئے اس نے سوچا کہ قدرت کی حصول خوشنودی کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنا چاہئے چنانچہ اس نے خیال کیا کہ جس طرح انسان عاجزی و خوشامد، دعوت و ضیافت، تحفہ و ہدیہ سے خوش ہوتا ہے اسی طرح یقیناً وہ قوت بھی خوش ہوتی ہوگی اور یہ ہے اصل بنیاد طاعت و عبادت، اور روزہ و قربانی کی گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ عبادت کے تمام مراسم کی بنیاد صرف اس اعتقاد پر قایم ہے کہ تمام کاروبارِ انسانی کسی اور قوت کے ہاتھ میں ہیں اور وہ اگر چاہے تو واقعات و حوادث کی رفتار و ترتیب کو بھی بدل سکتی ہے یعنی اگر اس قوت کی خوشامد کی جائے، اس کو قربانی دیکر خوش کیا جائے تو وہ طوفان کو بھی روک سکتی ہے، ژالہ باری کو بھی ملتوی کر سکتی ہے، آتش فشاں پہاڑوں کی آگ کو بھی سرد کر سکتی ہے، زلزلوں کو بھی دور کر سکتی ہے، اور اپنے لطف و عنایت سے جس کو چاہے بے انتہا خوشحال اور جس کو چاہے پامال بھی کر سکتی ہے۔ الغرض اُس بُت پرست کافر سے لیکر جو مورتیوں کی پوجا کرتا ہے، اس یزداں پرست تک جو خدا کا ایک غیر مادی بلند تخیل اپنے سامنے رکھتا ہے، سب کی طاعت و پرستش کا اصل مقصود، خدا یا غیبی قوت کو خوش رکھنا ہے تاکہ خود اس کی خوشحالی یا نجات متیقن ہوجائے

عہد تاریخ یا ایجاد تحریر سے قبل مذاہب عالم کی یقیناً مختلف و متعدد صورتیں پائی جاتی ہوں گی، جن کا صحیح علم ہم کو حاصل نہیں، لیکن پھر بھی باوجود اس کے کہ علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ ساتھ مذاہب کے مفہوم، خدا کے تصور اور عبادات کی نوعیت میں بہت کچھ اصلاح و تغیر ہوگیا ہے، یہ خیال ابتک اسی عہد تاریک کے مذاہب کا چلا آرہا ہے کہ خدا طاعت و عبادت سے خوش ہوتا ہے اور نظام کائنات کی رفتار کو جب چاہے بدل سکتا ہے، چنانچہ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس وقت کا بلند ترین مذہب بھی عبادت و قربانی کے وجوب اور معجزہ و کرامات کے صدور و امکانِ صدور کے عقیدہ سے خالی نہیں ہے

قرونِ مظلمہ میں جب ذہن انسانی نے علوم و فنون کی بنیاد نہ ڈالی تھی، مذہب بالکل سادہ حیثیت رکھتا تھا اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ انتہائی عقیدت و رسوخ کے ساتھ ہر ان ہونی بات کو ہونی اور ہر محال کو ممکن سمجھ کر خواب کی سی زندگی بسر کر رہا تھا، لیکن جب رفتہ رفتہ لاکھوں سال تک گرم و سرد، نشیب و فراز، کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد اس نے سوسائٹی کے اصول بنائے، بُرے بھلے میں حدِ فاصل قایم کی اور ابتدائی علوم و فنون کی طرح ڈالی تو اس ذہنی تغیر کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے معتقدات مذہبی کو بھی منظم کیا اور کوشش کی کہ مذہبی ادارے بھی ذہنی اداروں کے دوش بدوش چلتے رہیں، لیکن افسوس ہے کہ اس میں اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی

چاہئے تو یہ تھا کہ جوں جوں انسان کو عقل آتی جاتی وہ مذہب کے ان تمام معتقدات کو جو صرف

اس کے جہل و جذبۂ خوف و استعجاب سے پیدا ہوئے تھے ترک کرتا جاتا، لیکن جو عقیدہ لاکھوں کروڑوں سال سے نسلاً بعد نسلٍ خون میں منتقل ہوتا چلا آرہا تھا اس کا دور کرنا واقعی بہت مشکل تھا، اس لئے اس نے بجائے اس کے کہ مذہب کو عقل کی کسوٹی پر کس کر اس کے کھرے کھوٹے ہونے کا حکم لگاتا، خود عقل کو کھینچ تان کر مذہب پر منطبق کرنے لگا، اور یہی وہ سب سے بڑی غلطی تھی جس نے مذہب کی بنیادیں متزلزل کردیں، کیونکہ کاروبارِ عقل کا تعلق صرف تجربات انسانی سے ہے اور اس لئے اس کی کوئی حد متعین نہیں ہوسکتی، ہوسکتا ہے کہ وہی چیز جسے آج عقل انسانی پتھر کہتی ہے کل ہیرا کہنے لگے، وہی تاویل جو آج اس کے نزدیک یقینی ہے کل متزلزل ہوجائے۔ بنابراں اگر مذہب کے متعلق بھی تاویلات عقلی کا سلسلہ برابر جاری رہا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اس کے حدود کبھی متعین نہ ہوسکیں گے اور ایک نہ ایک دن اس قلادہ کو گردن سے اُتار پھینکنا ہی پڑے گا

مذہب کی بنیاد یا بیک گرونڈ صرف کورانہ تقلید ہے اور اس میں استعمال عقل کی مطلق گنجایش نہیں سمجھ کی بحث آئی اور مذہب رخصت ہوا اس لئے کسی مذہب والے کا یہ دعویٰ کرنا کہ اس کا مذہب ہمیشہ اور ہر زمانہ میں عقل کا ساتھ دینے کے لئے طیار ہے گویا دوسرے الفاظ میں یہ کہنا ہے کہ اس کے مذہب کے اُصول و عقاید ابھی متعین ہی نہیں ہوئے

پھر چونکہ عقل کی کرشمہ آرائیاں اور اسی کے ساتھ الحادزائیاں اسوقت زیادہ تر مغرب ہی میں دیکھی جاتی ہیں اس لئے سب سے زیادہ اہل کلیسا ہی کو اس کی فکر پڑی ہے کہ وہ اپنی الہامی کتابوں کے الہامی معتقدات و تعلیمات کو علم کے حملے سے بچائیں اور اس کے تتبع میں ایشیائی مذاہب والوں کی طرف سے بھی یہ حرکات مذبوحی کبھی کبھی دیکھنے میں آجاتی ہیں۔ کچھ زمانہ سے مغرب میں عقل و مذہب کی جنگ بہت شدید ہوگئی ہے، یہاں تک کہ امریکہ میں تو بعض جماعتیں ایسی پیدا ہوگئی ہیں جو مسیح کے وجود کی بھی قایل نہیں ہیں اور بائبل کی تعلیم کو دماغی نشو ونما کے منافی ظاہر کرکے مدارس کے نصاب سے اس کو بالکل خارج کردینے پر تلی ہوئی ہیں۔ پھر چونکہ اس دورِ آزادی میں اہل کلیسا یہ تو کر نہیں سکتے کہ بزورِ شمشیر اس تحریک کو دبا سکیں اس لئے وہ عقل کا مقابلہ کرنے کے لئے عقل ہی سے کام لینے لگے ہیں، یعنی بائبل کی جن تعلیمات کو لغو و مہمل قرار دیا جاتا ہے وہ انھیں علمی حقایق کی صورت سے پیش کرنا چاہتے ہیں، درانحالیکہ مذہب کا کام نہ علمی گتھیاں سلجھانا ہے اور نہ فنی نظرئے پیش کرنا

توریت کے بتائے ہوئے بہت سے عقاید ایسے ہیں جو مذاہب مابعد میں بھی پائے جاتے ہیں، اسلئے "اسفار موسیٰ" کی تعلیمات پر جو شبہات وارد ہوتے ہیں ان کا تعلق کسی ایک مذہب سے نہیں بلکہ متعدد

مذاہب سے ہو جاتا ہے اور اس طرح بہ حیثیت مجموعی یہ بحث ایک عام مذہبی و علمی تصادم کی بحث ہو جاتی ہے جس پر تمام اہل مذاہب کو غور کرنا چاہیئے

کیا اسفارِ موسیٰ الہامی تھے

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اسفار کے مصنف حضرت موسیٰ ہی تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تعلیمات انھوں نے کہاں حاصل کیں۔ اہل مذاہب کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کو یہ سب کچھ الہام خداوندی کے ذریعہ سے معلوم ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے کہ ہم کن باتوں کو الہامی کہہ سکتے ہیں اور کن کو نہیں۔

فرض کیجئے کہ آج ایک شخص یہ دعوےٰ کرے کہ نظریۂ ارتقاء اس پر الہام ہوا ہے تو کیا ہم اسکو یقین کریں گے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ نظریہ ڈاروِن نے پیش کیا تھا اور اس مدعی الہام کو اس کا علم یقیناً ڈاروِن ہی کی تصانیف سے ہوا ہوگا۔ یا فرض کیجئے خود ڈاروِن یہ کہے کہ نظریۂ ارتقاء کا علم اس کو خدا کی طرف سے ہوا ہے تو کیا ہم اس کو صحیح سمجھیں گے جبکہ لامارک بہت پہلے اس نظریہ کو پیش کر چکا تھا۔ الغرض الہام کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی ایسی بات سے متعلق ہو جس کا علم لوگوں کو پہلے حاصل نہ تھا۔ ورنہ اس کو کوئی شخص الہام تسلیم نہ کرے گا۔

اب حضرت موسیٰ کے بتائے ہوئے اساسی اعتقاداتِ تخلیق عالم کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ بجنسہٖ یہی خیال مصری کاہنوں کا بھی تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ (۱) خدا نے اصل مادہ کو ہیولیٰ کی صورت میں پیدا کیا (۲) خدا نے اس مادہ کو ایک مخصوص ہیئت میں تبدیل کیا (۳) خدا نے لفظ "کُن" کہکر پیدا کیا اور (۴) آفتاب کی تخلیق سے پہلے خدا نے روشنی پیدا کی۔

پھر چونکہ حضرت موسیٰ فرعون کی لڑکی کے متبنّیٰ تھے اور ایک شاہزادہ کے سے حقوق و مناصب انھیں حاصل تھے اس لئے ظاہر ہے کہ مصری روایات، مصری عقاید مذہبی اور مصری ادبیات و فلسفہ سے وہ بخوبی واقف رہے ہوں گے اور جس وقت انھوں نے اصلاح قوم کا کام شروع کیا تو بہ ادنیٰ تغیر یہی عقاید بنی اسرائیل کے سامنے پیش کر دئے۔ پھر اگر یہ عقاید واقعی الہامی ہوں بھی تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ان کا الہام حضرت موسیٰ پر نہ ہوا تھا بلکہ مصری کاہنوں یا ان سے بھی قبل اُن لوگوں پر ہوا تھا جنھوں نے سب سے پہلے ان عقاید کو پیش کیا۔ اب آیئے تخلیق کائنات کے عقیدہ پر علمی نقطۂ نظر سے بھی غور کریں کہ اس میں کس حد تک صداقت پائی جاتی ہے۔

مسئلہ تخلیق عالم

اسفارِ موسیٰ میں بتایا گیا ہے کہ "سب سے پہلے خدا نے آسمان و زمین پیدا کئے"۔ "پیدا کرنے" کا مفہوم کیا ہے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے "آسمان و زمین"

کو کسی خاص مادہ سے بنایا کیونکہ عدمِ محض سے کسی شے کا وجود میں آنا ممکن نہیں، پھر اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مادہ کہاں سے آیا، اور اگر وہ خود کسی اور مادہ سے پیدا ہوا تو اس مادہ کا وجود کیونکر ممکن ہوا الغرض آخر میں آپ کو کوئی چیز علت العلل یا علتِ اولیٰ کی حیثیت سے تسلیم کرنا پڑے گی جو ازلی و ابدی ہے اگر یہ کہا جائے کہ علت العلل صرف خدا کی ذات ہے تو بہ لحاظِ قوت ہونے کے تو ہم اس کو صحیح مانتے ہیں لیکن مادی اشیاء کے وجود کے لئے پہلے کسی مادہ کی تخلیق ضروری قرار پائے گی اور اس طرح خدا اور مادہ دونوں کو قدیم ماننا پڑے گا جو اہل مذاہب کے عقیدہ کے منافی ہے۔

اب دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھئے۔ اگر خدا نے کائنات کو پیدا کیا تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے تعیین وقت ضروری ہوگی، یعنی کوئی زمانہ ایسا ضرور ماننا پڑے گا جب کائنات کا وجود نہ رہا ہوگا اور پھر اس کے بعد یہ سب کچھ ظاہر ہوا ہوگا۔ اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وجود کائنات سے قبل خدا کیا کرتا تھا۔ کوئی چیز موجود نہ تھی کہ وہ اس کا خیال کرتا ہوگا، کوئی واقعہ ظاہر نہ ہوا تھا کہ وہ اس کا تصور کرتا ہوگا، پھر کیا یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک غیر محدود فراستِ مطلق ایک غیر محدود عدمیت کی حالت میں پائی جائے۔

خدا اپنی تمام صفات کے ساتھ ازلی و ابدی مانا جاتا ہے اس لئے اس کی صفتِ تخلیق بھی قدیم ہے اور چونکہ تخلیق بغیر مخلوقات کے متعین نہیں ہو سکتی اس لئے خالق و مخلوق دونوں کو قدیم ماننا پڑے گا جو مذاہب عالم کے عقیدہ کے بالکل خلاف ہے۔

الغرض اسفارِ موسیٰ میں تخلیق عالم کی جو صورت بیان کی گئی ہے وہ وہی ہے جو بابل کی مٹی کی تختیوں پر مصر کی قدیم یادگاروں پر اور ہندوستان کے پرانے مندروں میں منقوش تھی اور اس سے زیادہ اسوقت کچھ کہا بھی نہ جا سکتا تھا، کیونکہ ذہن انسانی اس سے زیادہ سمجھنے اور سمجھانے کی اہلیت ہی نہ رکھتا تھا، اب رہا ایسی باتوں کو الہامی قرار دینا، سو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ باتیں جو لوگوں کی سمجھ میں نہ آسکیں ان کو قابل قبول بنانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ سب سے پہلے انھیں یہ یقین دلایا جائے کہ تم بیوقوف ہو تمھاری عقل محدود ہے اور تم بہت سی باتیں نہیں سمجھ سکتے اور پھر اس کے بعد ان باتوں کو خدا کی طرف منسوب کر دیا جائے، چنانچہ دنیائے مذاہب میں مولویوں، پنڈتوں، راہبوں، موبدوں، پیروں، فقیروں کے اقتدار و تسلط کا سبب صرف یہی تھا اور ہے کہ وہ مذہبی عقاید و تعلیمات کو منجانب اللہ بتاتے ہیں اور جب کوئی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی ہے، تو اس کی عقل کو ناقص بتاتے ہیں، اپنے آپ کو فرستادۂ خدا ظاہر کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ خدا کے عذاب سے بھی ڈراتے جاتے ہیں۔ درانحالیکہ دیکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ جن باتوں کو ملہمات ربانی کہا جاتا ہے وہ صحیح ہیں یا نہیں اگر ہیں تو یہ ضرور نہیں کہ

ہر سچی بات الہام ہی کے ذریعہ سے معلوم ہو اور عقل انسانی اس کو نہ معلوم کرسکے اور اگر غلط ہیں تو ان کو الہام و وحی سے تعبیر کرنا درست نہیں ہوسکتا۔

حیرت ہے کہ تعلیمات خداوندی صرف انھیں لوگوں کے لئے ہوں جو بیوقوف ولایعقل ہیں یا جو اپنے آپ کو احمق سمجھتے ہیں، اور عقل سے کام لینے والوں کا حصہ ان میں سوائے دوزخ کے اور کچھ نہ رکھا جائے۔ الغرض مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ مذہبی عقاید کی بنیاد انسان کے صرف وہ گزشتہ تاثرات ہیں جو عہد وحشت میں اس پر طاری ہوئے تھے، اور وہی عقاید بہ ادنیٰ تغیر رفتہ رفتہ تمام ممالک و اقوام میں پھیل گئے اور ان کی اشاعت کرنے والی جماعتوں نے جنھیں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اس الہام و وحی کے خیال کو بدستور قایم رہنے دیا کیونکہ ان کے منصب دینی کی حفاظت اسی صورت سے ممکن تھی، چنانچہ تخلیق کائنات کے مسئلہ کو بھی یہودیوں نے الہام خداوندی ہی بتایا اور "اسفار خمسہ" کو جن کا تعلق نہ حقیقتاً موسیٰ سے تھا نہ الہام خداوندی سے (بلکہ مصریوں کے قدیم روایات مذہبی سے) خدا سے منسوب کرکے ان کو سماوی حیثیت دیدی۔

تخلیق عالم کے سلسلہ میں دوسری بات "اسفارِ موسیٰ" میں یہ درج ہے کہ "خدا نے روشنی پیدا کی اور تاریکی سے اُسے جُدا کیا"، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریکی و روشنی دو مادی چیزیں ہیں جو ایک دوسرے سے مخلوط تھیں اور پھر خدا نے ان کو ایک دوسرے سے جدا کیا۔ حالانکہ تاریکی نام صرف فقدان روشنی کا ہے، جس طرح برودت فقدان حرارت کا اور نورِ مطلق یا حرارتِ مطلق کا کوئی ایسا تصور جو تاریکی یا برودت کے خیال سے جدا ہو، ممکن نہیں، ہم کو ان کیفیات کے صرف مدارج کا علم حاصل ہوتا ہے نہ کہ علی الاطلاق فی نفسہٖ ان چیزوں کا۔ فرض کیجئے کہ ہم کسی پہاڑی کی چوٹی پر چلے جائیں اور وہاں پارہ صفر سے بھی ۲۰ درجے نیچے ہو تو اس کے معنے یہ نہ ہوں گے کہ ہم نے برودتِ مطلق کا علم حاصل کرلیا کیونکہ ان مقامات کے لحاظ سے جہاں پارہ ۴۰ درجے صفر سے نیچے ہے یہ حالت زیادہ گرم کہلائے گی۔ الغرض روشنی اور تاریکی مادی چیزیں نہیں ہیں کہ ایک کو دوسرے سے علٰحدہ کیا جاسکے اور اس لئے "اسفار خمسہ" کے اس بیان کو الہامی قرار دینا درست نہیں، کیونکہ اگر ہر صحیح بات کا الہامی ہونا ضروری نہیں لیکن ہر الہامی بات کا صحیح ہونا ضروری ہے۔ یہاں تک جو کچھ بیان ہوا (یعنی آسمان و زمین کا پیدا کیا جانا اور نور و تاریکی کا ایک دوسرے سے علٰحدہ ہونا) پیر کے دن کی باتیں تھیں، اب منگل کو کیا ہوا اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

آسمان کی حقیقت

"اسفارِ موسیٰ" میں بتایا گیا ہے کہ اس کے بعد "خدا نے کہا کہ پانیوں (سمندروں) کے درمیان فلک پیدا ہوجائے اور ہر ایک پانی کو دوسرے پانی سے علٰحدہ کردے

چنانچہ فلک پیدا ہو گیا اور ایک پانی دوسرے پانی سے علیحدہ ہو گیا"
"فلک" سے کیا مراد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد فضائے بسیط ہے، لیکن یہ بات بالکل ناقابل قبول ہے کہ فضائے بسیط "پانیوں" میں تقسیم پیدا کر دے، یعنی پانی کا ایک حصہ فضا کے اوپر رہے اور دوسرا اس کے نیچے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت عام خیال یہی تھا کہ آسمان یا فلک ایک ٹھوس چیز ہے جس پر خدا متمکن ہے اور پانی کا ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ اسی لئے جب امساک باراں ہوتا تھا تو لوگ دعائیں مانگتے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ خدا اس فرشتہ کو جس کے سپرد پانی کی نگرانی ہے حکم دیگا اور وہ آسمان سے مینھ برسا دے گا۔ چنانچہ طوفان نوح کا آنا بھی اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "آسمانی کھڑکیاں کھولدی گئیں اور دُنیا ڈوب گئی،،

آسمان کو ٹھوس چیز سمجھنے کا ثبوت توریت کی اور متعدد آیتوں سے بھی ملتا ہے مثلاً موسیٰؑ نے جب یعقوبؑ کا خواب بیان کیا تو اس کے الفاظ یہ تھے۔ "اس نے خواب دیکھا کہ ایک سیڑھی قایم ہے جسکا نچلا حصہ زمین پر ہے اور سرا آسمان تک پہونچا ہوا ہے اور فرشتے اس پر چڑھ اُتر رہے ہیں"

اسی طرح برج بابل کے متعلق تحریر ہے کہ جس وقت لوگ اس کی تعمیر میں مصروف تھے، خدا اُترا اور اس نے ان لوگوں کی ایک زبان کو مختلف زبانوں میں تبدیل کر دیا، تاکہ ایک دوسرے کی بات نہ سمجھ سکے اور برج تعمیر نہ ہو سکے۔

الغرض توریت سے ثابت ہوتا ہے کہ موسیٰ کے زمانہ میں آسمان کو چھت کی طرح ٹھوس اور مادی چیز سمجھا جاتا تھا اور یہی عقیدہ متبعین مسیحؑ کا بھی تھا چنانچہ عیسیٰؑ کا آسمان پر خدا کے پاس چلا جانا اسی بنا پر تسلیم کیا جاتا تھا۔

اب علوم جدیدہ نے آسمان و زمین کی حقیقت کو جس وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اس کا علم سب کو ہے اور غالباً کوئی متنفس ایسا نہیں جو آسمان کو ٹھوس چیز سمجھتا ہو۔ دوربینوں نے کائنات کی غیر متناہی فضاء بسیط کو ثوابت و سیارے سے معمور ہونا ثابت کر دیا ہے اور علم الجو نے یہ امر بایۂ تحقیق تک پہونچا دیا ہے کہ چند میل سے زیادہ کوئی شخص اوپر جا نہیں سکتا کیونکہ وہاں تنفس کے لئے آکسیجن موجود نہیں ہے اور اتنی سخت سردی پائی جاتی ہے کہ انسان وہاں پہونچتے ہی یخ بستہ ہو جائے اس لئے ظاہر ہے کہ اسوقت اسفار موسیٰ یا دوسری مذہبی کتابوں کے ایسے بیانات جن سے آسمان کا ٹھوس چیز ہونا ظاہر ہوتا ہے، کیونکر قابل قبول ہو سکتے ہیں اور ان کو الہامی ظاہر کر کے ہم

"کتب مقدسہ" کی کیا حرمت و عزت قایم کر سکتے ہیں

سمندروں سے زمین کا ظہور اس کے بعد اسفار موسیٰ میں درج ہے کہ خدا نے پانی کو سمٹنا شروع کیا تاکہ زمین ظاہر ہو، چنانچہ پانی سمٹنا شروع ہوا، زمین ظاہر ہوئی اور نباتات اُگ کر پھول، پتی اور پھل لے آئے، اور یہ سب کچھ ایک ہی دن میں ہو گیا۔ (یہ واضح رہے کہ ابھی تک آفتاب کی تخلیق نہیں ہوئی تھی)

پھر اس زمانہ میں جبکہ یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ زمین گول ہے، آفتاب کے گرد طواف کرتی ہے، اس میں کشش ثقل کا قانون جاری و ساری ہے، کوئی ذیحیات بغیر آفتاب کی حرارت کے نہ پیدا ہو سکتا ہے اور نہ زندہ رہ سکتا ہے کیونکر پانی کے سمٹنے اور تخلیق آفتاب سے قبل ہی نباتات پیدا ہونے پر یقین لایا جا سکتا ہے۔

اس "ایک دن" کی تاویل اہل مذاہب کی طرف سے یہ کیجاتی ہے کہ اس سے مراد ۲۴ گھنٹے نہیں ہیں بلکہ ایک طویل زمانہ و مدت مقصود ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ تخلیق نباتات کے لاکھوں کروروں سال بعد جانور پیدا کئے گئے (کیونکہ اسفار موسیٰ میں پانچویں دن جانوروں کا پیدا کیا جانا ظاہر کیا ہے) اور اس صورت میں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جب جانوروں کا وجود ظہور میں نہ آیا تھا تو نباتات پیدا کرنے کی غرض کیا تھی

جدید علم طبقات الارض کی رُو سے زمین کے پانچ دور تسلیم کئے گئے ہیں اور ہر دور کروروں سال کا مانا گیا ہے، پہلے دور میں Algae[1] اور Vertebrates[2] کی پیدائش ہوئی دوسرے دور میں مچھلیاں پیدا ہوئیں اور وہ درخت جو پھل پھول نہیں لاتے تھے۔ تیسرے دور میں صنوبر کے جنگل اور رینگنے والے جانور پیدا ہوئے، چوتھے دور میں پھل پھول لانے والے درخت اور دودھ پلانے والے جانور پیدا ہوئے اور پانچویں دور میں انسان

اول تو اس جدید تحقیق کو غلط قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ وہم و قیاس کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اکتشافات علمی و جستجوئے آثار کا نتیجہ ہے، لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ یہ سب ظن و قیاس ہے تو بھی اسفار موسیٰ کے بیان سے زیادہ دلنشین ہے، کیونکہ وہ اُصول قدرت اور ہمارے موجودہ

---

[1] آبی پودھے جن کے جڑ نہیں ہوتی اور صرف پانی اور ہوا سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں

[2] اس سے مراد بغیر سر کے وہ حشرات ہیں جو ریڑھ کی گُریاں تو رکھتے ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے ملی ہوئی نہیں ہوتیں

تجربات کے بالکل منافی معلوم ہوتا ہے اور یہ ٹھیک نوامیس فطرت کے مطابق ہے

قدرت کے نظام میں "بیکار و غیر مفید" چیز کوئی نہیں پائی جاتی، یعنی جب تک اس کا مصرف نہ پیدا ہو، وجود میں نہیں آتی، اس لئے اسفارِ موسیٰ کے بیان کے مطابق سب سے پہلے نباتات کا پیدا کیا جانا بغیر اس کے کہ اس کا کوئی مصرف وجود ہو، کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا

قدرت نے نباتات و حیوانات کی پیدائش میں ہمیشہ توازن قایم رکھا ہے اور دونوں کی تخلیق اپنے ساتھ ہی ساتھ کی ہے، پھر جوں جوں ایک کے حال میں تغیر پیدا ہوتا گیا ویسے ہی دوسرے میں تبدیلی ہوتی گئی، اس لئے یہ کہنا کہ پہلے نباتات پیدا کئے گئے اور اس کے لاکھوں کروروں سال بعد حیوانات وجود میں آئے، بالکل اصول قدرت کے منافی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے عرصہ تک نباتات کا بیکار پڑا رہنا فطرت نے کیوں گوارا کیا

آفتاب و ماہتاب کی تخلیق اسفارِ موسیٰ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آفرینش کے چوتھے دن "خدا نے دو روشنیاں پیدا کیں ایک بڑی روشنی دن پر حکمرانی کرنے کیلئے دوسری ضعیف روشنی رات پر حکمرانی کے لئے اور اسی کے ساتھ اس نے ستارے بھی پیدا کئے"۔

اس بیان سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ آفتاب کے حجم سے یقیناً بالکل آگاہ نہ تھے ؟ آپ ایک دائرہ پانچ انچ قطر کا بنائیے اور اس کے پہلو میں سوئی کی نوک چبھو دیجئے پھر اس سوراخ اور دائرہ میں جو نسبت ہوگی وہی نسبت تقریباً زمین و آفتاب میں ہے - یقیناً وہ اس سے بالکل بے خبر تھے کہ آفتاب کا قطر ۸ لاکھ ۶۰ ہزار میل کا ہے اور اس کے چاروں طرف پانچ ہزار میل کا موٹا آتشیں غلاف چڑھا ہوا ہے جس میں ہر وقت سو میل فی سکنڈ کے حساب سے آتشیں ہوائیں چلتی رہتی ہیں اور جس کے سامنے دوزخ کی گرمی کی بھی کوئی حقیقت نہیں - وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ہر لمحہ آفتاب سے اتنی ہی حرارت پیدا ہوتی رہتی ہے جتنی گیارہ ارب ٹن کوئلہ کو مشتعل کرنے کے بعد حاصل ہو سکتی ہے - وہ اس سے بھی واقف نہ تھے کہ زمین کا حجم آفتاب کے مقابلہ میں $\frac{1}{1000000}$ سے زیادہ نہیں ہے - یعنی اگر آفتاب کے دس کرور ٹکڑے کئے جائیں تو زمین کا حجم اس ایک ٹکڑے کے برابر ہوگا - وہ یہ بھی نہ جانتے تھے کہ نظام شمسی میں اور کتنے سیارے شامل ہیں جو اسی آفتاب کے جدا شدہ اجزا ہیں - وہ ان حقایق سے بھی بے خبر تھے کہ سیارۂ مشتری کا قطر ۸۵۰۰۰ میل کا ہے اور اقمار چہار گانہ کے ساتھ وہ اپنے طور پر ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے گردش کرتا ہے - اسی طرح وہ سیارۂ زحل کے حلقوں اور اس کے آٹھ چاندوں سے بھی آگاہ نہ تھے اور ان کو کوئی علم اس بات کا نہ تھا کہ نظام شمسی کے تمام سیارے جن میں اکثر زمین کے وجود

سے بہت زمانہ قبل پائے جاتے تھے آفتاب ہی کے اجزاء ہیں اور وجود آفتاب سے قبل ان کا کہیں وجود ہی نہ تھا۔

وہ سمجھتے تھے کہ آفتاب کا قطر تین چار فٹ سے زیادہ نہیں ہے اور چاند کا قطر اس کا نصف ہے اور زمین کے مقابلہ میں یہ دونوں بہت حقیر ہیں اس زمانہ کے الہامی لٹریچر میں اور بھی ایسی روایتیں پائی جاتی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ فلکیات سے یہ لوگ کس قدر بیگانہ تھے، چنانچہ کتاب یوشع میں ایک جگہ لکھا ہے کہ آفتاب دن بھر ٹھہرا رہا تاکہ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لے لیں" مذہب اسلام میں بھی ایکبار آفتاب کے پلٹ آنے کا ذکر بطور معجزہ کے پایا جاتا ہے، حالانکہ اس کا غیر ممکن ہونا ظاہر ہے

حضرت موسیٰؑ کا زمانہ حضرت عیسیٰؑ سے صرف ۱۵۰۰ سال پہلے کا ہے لیکن حیرت ہے کہ انھیں فلکیات کا علم اتنا بھی حاصل نہ تھا جتنا چینیوں کو عیسیٰؑ سے ڈھائی ہزار برس قبل حاصل تھا۔ چین کی تاریخی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب عطارد، مریخ، مشتری و زحل کا اجتماع ہوا تو وہاں کے بادشاہ چونہیو نے اسے ایک نئے عہد کا آغاز قرار دیا۔ اور مسٹر بیلی نے اس کی تصدیق کی ہے کہ ان سیاروں کا اجتماع یقیناً مسیح سے ۲۴۴۹ سال قبل ہوا تھا۔

قدیم چینی نہ صرف سیاروں کی گردش سے واقف تھے بلکہ سورج گرہن کا زمانہ بھی متعین کر دیتے تھے۔ چنانچہ شاہ چوکانگ کے زمانہ میں دربار کے دو نجومی (ہو اور ہی) صرف اس لئے قتل کر دئے گئے کہ انھوں نے اس سورج گرہن کا زمانہ نہیں بتایا جو ۲۱۶۹ قبل مسیح میں پڑا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ چینی دربار کے نجومیوں کا فرض تھا کہ وہ کسوف و خسوف کے اوقات متعین کرتے رہیں۔ الغرض اسفارِ موسیٰ میں تخلیق کائنات اور نظام عالم کا جو تخیل پیش کیا گیا ہے وہ حد درجہ طفلانہ ہے اور اہلِ کلیسا نے ہمیشہ بزورِ شمشیر ان عقاید کو رائج کرنا چاہا، چنانچہ اب سے ایک صدی قبل مشہور ماہر طبیعیات مسٹر بفون کو فرانس کے کلیسا نے مجبور کیا کہ وہ اپنے نظریوں کی غلطی کا اعتراف کرے کیونکہ وہ موسیٰ کے بتائے ہوئے بیان آفرینش کے خلاف تھے۔

اسفارِ موسیٰ میں ستاروں کی تخلیق کا حال صرف ان پانچ لفظوں میں بیان کیا گیا ہے کہ "خدا نے ستارے بھی بنائے"، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ عالم سیارگان کی وسعت اور ان کے نظام گردش کی پیچیدگی سے قطعاً آگاہ نہ تھے۔ اور ان کو کوئی علم حاصل نہ تھا کہ:-

۱- سب سے قریب واقع ہونے والا ستارہ بھی ہم سے ۲۱ ارب میل دور واقع ہے اور وہ بجائے خود ایک آفتاب ہے جو اپنی ذاتی روشنی سے منور ہے۔

۲- اس کے بعد کا ستارہ ۷۳ ارب میل کی دوری پر ہے۔
۳- وہ ستارہ جسے سیریس کہتے ہیں ایک آفتاب ہے جو ہمارے آفتاب سے ۲۶۸۸ گُنا زیادہ بڑا ہے، اس کا نظام شمسی ہمارے نظام شمسی سے بہت زیادہ وسیع ہے اور ۸۲ ارب میل دور واقع ہے۔
۴- قطب شمالی سے ۲۹۲ ارب میل دور واقع ہے۔
۵- ستارۂ کیپیلا کی روشنی کو ہم تک پہونچنے میں ۷۲ سال درکار ہوتے ہیں۔
۶- بعض ستارے فضا میں اتنی دور واقع ہیں کہ ان کی روشنی ۵۰ لاکھ سال سے پہلے ہم تک نہیں پہونچ سکتی۔
اگر کہا جائے کہ پیغمبروں اور کتب الہامی کا مقصد فلکیات کی تعلیم دینا نہ تھا کہ وہ ان مباحث میں پڑتیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرے سے ان باتوں کے ذکر ہی کی کیا ضرورت تھی اور اگر ذکر کیا تھا تو پھر اس کو بالکل صحیح و درست ہونا چاہئے تھا۔

وحوش و طیور اور انسان کی تخلیق کہا جاتا ہے کہ پانچویں دن (جمعہ کو) خدا نے حکم دیا کہ "پانی سے ذیحیات متحرک جانور پیدا ہوں اور طیور، جو فضا میں اُڑتے پھریں"، چنانچہ خدا نے پانی سے وھیل مچھلی اور دیگر متحرک جانور پیدا کئے اور اسی طرح چڑیاں پیدا کیں۔ چھٹے دن اس نے مویشی اور حشرات الارض پیدا کئے اور ساتویں دن انسان کو اپنی شکل میں پیدا کیا۔

ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے پہلے آبی جانور اور طیور پیدا کئے، اس کے بعد خشکی کے جانوروں کی تخلیق کی اور پھر انسان کی۔ کہا جاتا ہے کہ لفظ "دن" سے ۲۴ گھنٹے کا دن مراد نہیں ہے بلکہ ایک طویل مدت مقصود ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر واقعی مقصود زمانۂ ممتد ظاہر کرنا تھا تو اس کے لئے دن کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا جو انسانی گفتگو میں نہایت محدود و مختصر زمانہ کیلئے بولا جاتا ہے۔ جس طرح دن کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اسی طرح کوئی اور ایسا لفظ بھی استعمال ہو سکتا تھا، جس سے طویل زمانہ ظاہر ہوتا، اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اہل مذاہب کی اس تاویل کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان چیزوں کی پیدائش ارتقائی صورت سے ہوئی تھی یا دفعتاً، یعنی مخلوقات نے تدریجاً آہستہ آہستہ تغیرات قبول کر کے یہ صورت اختیار کی تھی یا ان کی پیدائش اس طرح ہوئی تھی جیسے اچانک کوئی چیز ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اگر صورت تدریجی ارتقار کی تسلیم کی جائے جیسا کہ اہل سائنس کا خیال ہے تو پھر اس کے لئے کوئی خاص اُصول متعین کرنا پڑے گا، حیات و بقار حیات کا کوئی نظریہ تسلیم کرنا ہوگا اور اس لحاظ سے اسفارِ موسیٰ کا یہ بیان آفرینش بہت ناقص قرار پاتا ہے۔

جیسا کہ ہم اس سے قبل ظاہر کر چکے ہیں، اور اگر یہ سب کچھ دفعتاً، اچانک ظہور میں آگیا اور آسکتا تھا تو پھر اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ خدا آج یہ چیز پیدا کرتا اور دوسرے دن وہ چیز، یہاں تک کہ پورے چھ دن (یا چھ جُگ) اس میں صرف ہو جاتے، وہ دفعتاً تمام مخلوقات کو مع ان کے تمام مختلف انواع و اجناس کے دفعتاً بھی پیدا کر سکتا تھا اور یہی کرنا چاہئے تھا۔

اب انسان کی تخلیق کے متعلق اس بیان پر غور کیجئے کہ "اس نے انسان کو اپنی شکل میں پیدا کیا"۔ یعنی شکل کا یہ تشابہ کوئی مادی حیثیت رکھتا تھا یا غیر مادی۔ اسفار موسیٰ کے اور بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تشابہ مادی تھا کیونکہ خدا کا جو تصور ان میں پیش کیا گیا ہے، وہ یکسر مادی ہے۔ مثلاً یہ کہ "خدا ٹھنڈے وقت باغ میں ٹہلتا تھا"۔ "آدم و حوا اس کی آواز سنتے تھے"۔ "موسیٰ اس سے ہمکلام ہوتے تھے" وغیرہ وغیرہ۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ موسیٰ کا خدا ہاتھ پاؤں، کان، زبان وغیرہ سب کچھ رکھتا تھا اور ان سے وہی کام لیتا تھا جو انسان لیتا ہے، یعنی وہ چلتا پھرتا تھا، بولتا تھا، سنتا تھا، غصہ ہوتا تھا، پچھتاتا تھا، انتقام لیتا تھا، نفرت کرتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔

تصورِ خدا کی اس لغویت کو دیکھ کر بعض اہل مذاہب نے "شکل کے تشابہ" کو اخلاقی معنی میں لیا ہے یعنی "خدا کا انسان کو اپنی شکل میں پیدا کرنا" یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ خدا کے اخلاقی ہیولیٰ کی صورت سے پاک و مقدس پیدا کیا گیا۔

لیکن یہ تاویل اس سے بھی زیادہ رکیک ہے کیونکہ اول تو تقدس کا تعلق صرف انسان کے افعال و کردار سے ہے، وہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ علحدہ پیدا کر کے کسی سے وابستہ کر دیجائے اور اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کی تردید خود "آدم و حوا" کے اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ انھوں نے جنت میں گناہ کیا اور وہاں سے نکالے گئے، اگر انسان کی تخلیق مقدس و معصوم ہوئی تو وہ معصیت کا مرتکب کیوں ہوتا اگر یہ کہا جائے کہ یہ تشابہ، ذہنی یعنی متعلق بہ عقل و فراست تھا تو اسکی تردید انسان کی ان حماقتوں سے ہوتی ہے جو اس سے روز سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ بہر حال یہ سب تاویلات نا ممکن ہیں ورنہ اسفارِ موسیٰ کے مطالعہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کا یہ تشابہ خدا سے بالکل مادی و جسمانی حیثیت رکھتا تھا، اور اس کی لغویت ظاہر ہے۔

اب تخلیق انسان کے متعلق غور کیجئے کہ وہ کیونکر عمل میں آئی۔ آیا وہ تدریجی ارتقاء و بقاء اصلح کے قانون کے ماتحت عمل میں آئی یا اس طرح کہ پہلے ایک پتلا بنایا جس کی ہڈیاں، اعصاب، رگیں، دل و دماغ جگر، پھیپھڑا، معدہ وغیرہ سب مٹی کے تھے اور پھر اس پتلے میں روح پھونکدی گئی تو موجودہ صورت

گوشت، پوست، خون وغیرہ کی پیدا ہوگئی۔

جس وقت ہم حیات حیوانی کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نہایت ادنیٰ حالت سے ترقی کرکے آہستہ آہستہ انسانی صورت اختیار کی ہے۔ سب سے ابتدائی حالت کے جاندار کا نام اہل سائنس نے مونر (Moner) رکھا ہے، یعنی ایک ایسی ذیحیات مخلوق جس میں کوئی عضو نہ پایا جاتا تھا۔ وہ ایک لیسدار چیپی سی مخلوق تھی جو نہ ہاتھ پاؤں رکھتی تھی، نہ معدہ، نہ اس کے منھ تھا نہ کوئی اور عضو، وہ اپنے ماحول سے غذا حاصل کرتی تھی اور ماحول سے متاثر ہونے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

اگر ہم اس نظریہ کو صحیح مان لیں تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس لیسدار چیپی مخلوق میں آہستہ آہستہ اعضاء کی تشکیل شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ عضلات، اعصاب، گوشت و استخوان وغیرہ بنکر انسان وجود میں آیا۔

اگر اس نظریۂ ارتقاء کو آپ اپنے دماغ سے نکالدیں تو تاریخ حیوانی کے تمام واقعات ایکدوسرے سے غیر مربوط ہو جاتے ہیں اور کوئی دوسری صورت تخلیق انسانی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ (باقی)

(نوٹ) آیندہ ماہ اسی سلسلہ میں آدمؑ و حواؑ کی پیدائش، باغ عدن سے ان کا نکالا جانا، طوفان نوح، برج بابل، معجزات حضرت موسیٰؑ اور دیگر مذہبی معتقدات سے بحث کی جائے گی

ضرورت ہے

سنہ ۲۲ء فروری تا جون۔ اگست و نومبر سنہ ۲۳ء مارچ۔ اپریل اگست و دسمبر سنہ ۲۴ء ستمبر سنہ ۲۵ء جنوری۔ اگست۔ اکتوبر، نومبر و دسمبر سنہ ۲۶ء مارچ تا مئی۔ ستمبر تا دسمبر سنہ ۲۷ء فروری۔ جولائی تا دسمبر سنہ ۲۹ء جنوری۔ فروری اپریل تا جولائی، ستمبر تا دسمبر سنہ ۳۰ء جنوری۔ اپریل تا جولائی۔ دسمبر سنہ ۳۱ء جنوری۔ اپریل و مئی سنہ ۳۲ء اپریل سنہ ۳۳ء جون۔ اگست و دسمبر سنہ ۳۴ء جنوری، فروری، اگست و نومبر سنہ ۳۵ء اکتوبر۔ مینجر نگار

ایک راہبہ کے خطوطِ محبت

یہ خطوط ایک پرتگالی راہبہ میرین کے ہیں جسے مارشل شمیل کے تغافل نے بہت دل شکستہ کر دیا
تھا۔ مارشل شمیل ۱۶۶۳ء میں کپتان کی حیثیت سے افواجِ فرانس کے ساتھ پرتگال گیا اور وہیں
اس نے میرین کے معصوم دل کو دامِ محبت میں گرفتار کر لیا۔ شمیل کے حالات نہایت تفصیل سے
ملتے ہیں لیکن بدنصیب میرین کے متعلق اس سے زیادہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پرتگال کے ایک متوسط الحال
خاندان کی تعلیم یافتہ لڑکی تھی، اس نے عمر کا ابتدائی حصہ ایک عیسائی خانقاہ میں بسر کیا اسی خانقاہ میں
یہ دردِ محبت اس نے مول لیا اور شاید اسی خانقاہ میں اسکا انتقال ہوا۔

شمیل ۱۶۷۰ء کے قریب فرانس آیا اور یہاں کی دلفریبیوں میں محو ہو کر بہت جلد میرین کو بھول
گیا۔ اس نے ولیم پرنس آف آرینج کا نہایت کامیابی سے مقابلہ کیا اور عظیم الشان فوجی خدمات کے صلہ
میں شمیل کو ۱۷۰۳ء میں مارشل اور ۱۷۰۵ء میں Knight of the Order
۱۷۱۵ء میں ۷۹ سال اس عالمِ رنگ و بو میں بسر کرنے کے بعد شمیل نے پیرس میں انتقال کیا۔

خیال ہوتا ہے کہ شمیل نہایت خوبصورت رہا ہوگا لیکن سینٹ سائمن کی یادگار مطبوعہ ۱۷۸۹ء
کے مندرجۂ ذیل الفاظ اس خیال کی تردید کرتے ہیں "شمیل کریہہ منظر فربہ اندام اور سخت غبی تھا۔
اس کو دیکھ کر یا اس کی گفتگو سن کر یہ سمجھ میں نہیں آسکتا تھا کہ Love Letters of
a Portuguese nun کی عالی دماغ مصنفہ کو اس کی کیا ادا پسند آگئی۔"

ظاہر ہے کہ ایسے غیر شاعر انسان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ ان خطوط کو (جو دل شکستہ
میرین نے اسے پرتگال اور فرانس بھیجے تھے) محفوظ رکھتا مگر بھلا ہو اس کی خود نمائی کا جس نے اسے
یہ جواہر پارے مختلف دوستوں کو دکھانے پر آمادہ کیا اور بالآخر یہ جواہر منثور اس کے ایک ادیب دوست
سیلین مصنف (False clelia) کی وساطت سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

اس میں شبہ نہیں کہ پرتگالی راہبہ کے خطوط میں تکرارِ مضامین اور انتشارِ خیال موجود ہے مگر

دل کی بستی لٹ جانے کے بعد ان باتوں کا ہوش رہتا کسے ہے؟ ایک مشہور فرانسیسی ادیب نے کیا خوب بات کہی ہے کہ ان خطوط کی اصلیت ہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ بقول (Dorat) ان خطوط میں عورت کے دلی جذبات جس طرح پیش کئے گئے ہیں اس کی مثال ملنا دشوار ہے۔

یورپ کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں ان خطوط کا ترجمہ موجود نہ ہو اور آج میں نگار کی وساطت سے ان کو اُردو داں اصحاب کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

طالب صفوی

مکتوب اول

تو کیا یہ ممکن ہے کہ تم مجھ سے خفا ہو جاؤ اور میں اس حال میں کہ تم سے محبت کرنے کی مدعی ہوں، تمھارے لئے تکلیف کا باعث بنوں؟ آہ، میری شکایت تو سوائے محبت کے اور کچھ نہ تھی مگر جس محبت کو تم محبت نہ سمجھو وہ محبت ہو کیونکر سکتی ہے؟ لیکن میں اظہار شکایت کے بعد منفعل کیوں ہوں؟ اگر میں شکایت نہ کرتی تو تمھیں یہ شبہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ مجھے تمھارے تغافل کی کوئی پروا نہیں ہے۔

میری یہ حالت ہے کہ میں اپنے دل سے صرف اس لئے خفا ہوں کہ وہ اپنی تمام کیفیات چشم و زبان کے ذریعے سے ظاہر ہی نہیں کر سکتا اور تمھاری یہ کیفیت ہے کہ ذرا ذرا سی بات مجھ سے چھپاتے ہو۔

جب میری آنکھوں سے محبت کی نرمی ظاہر ہوتی ہے تو دل کے جوش و خروش کو عدم ترجمانی کی شکایت ہوتی ہے اور جب دل کا جوش و خروش آنکھوں سے جھلکنے لگتا ہے تو محبت کی لطافت شکوہ سنج ہوتی ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ چشم و زبان کے بینا اور گویا قاصد بھی میرے جذبات بے پایاں کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتے اور تمھارا یہ حال ہے کہ مجھے غیر سمجھ کر معمولی معمولی باتیں بھی مجھ سے چھپاتے ہو آخر تم یہ کیوں کرتے ہو؟ کیا تمھیں اس کا احساس نہیں ہے کہ تمھارے عدم اعتماد کی وجہ سے مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے؟ لیکن مجھے اتنی کرید کیوں ہے میں تمھارے دل کی گہرائیوں کا حال کیوں دریافت کرنا چاہتی ہوں جہاں تغافل و بے مہری کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ شاید تمھارا کھنچا کھنچا رہنا بھی لطف سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ تم یہ نہیں چاہتے کہ زیادہ ربط ضبط میں مجھے رفتہ رفتہ تمھاری بے مہری کا حال معلوم ہو جائے۔

تم نے شروع میں اپنی سنگ دلی کا اظہار کیوں نہ کیا تاکہ میں اپنے دل کو بھی تمھارے دل کی طرح

بنانے کی کوشش کرتی ؟ مگر تم تو برابر محبت کا اظہار کرتے رہے اور جب تم نے دیکھ لیا کہ میرے تن کا دل دامِ محبت سے نہیں نکل سکتا بلکہ یوں کیوں نہ کہوں کہ نکلنے کی کوشش بھی نہیں کر سکتا تو تم کھل کھیلے اور میری محبت کا جواب تغافل سے دینے لگے۔

مجھے کل اس بات کا احساس ہوا کہ تم نہایت جلد باز ہو لیکن مجھے یقین واثق ہے کہ تم اظہار غیظ و غضب کے علاوہ اظہار محبت میں کبھی بھی عجلت سے کام نہ لوگے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ کل ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر چلا جانے والا عجلت پسند انسان اسی مجنونانہ عجلت سے واپس نہ آئے گا لیکن پورا ایک دن گزر گیا اور مجھ سے بے سبب روٹھنے والا شخص اب تک مجھے منانے نہیں آیا۔ ظالم محبت نے تیرا کیا قصور کیا ہے جو تو اسے اپنے گوشۂ قلب میں جگہ دینے کے لئے آمادہ نہیں ؟

لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں اسی سزا کی مستحق تھی۔ جب میرا دل تمہارا ہو چکا تو اسے تمہاری مرضی کے خلاف اظہار تمنا کا کیا حق تھا ؟ ہاں ہاں مجھے اعتراف ہے کہ قصور میرا تھا اور تمھیں سزا دینے کا پورا اختیار حاصل تھا۔ کیوں یاد ہے تمھیں وہ دن جب میں نے کہا تھا کہ اب ہم دونوں ایک دوسرے سے کبھی نہ ملیں اور تم نے میرے اس ارادے کی پرزور تائید کی تھی ؟ کیا سچ مچ تمہارا ابھی یہی منشا تھا خیر اپنا ذکر چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ کیا تم دراصل یہ سمجھتے تھے کہ میں تم سے ملنا نہیں چاہتی ہوں ؟ میں تمہاری سرد مہری اور بے وفائی کو نظر انداز کر سکتی ہوں لیکن یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ تم مجھے بے وفا سمجھو میری محبت اتنی پاکیزہ ہے اور میرا معیارِ عشق اتنا بلند کہ مجھے تمہاری خوشی اور خفگی کی بھی پروا نہیں میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میں اپنی محبت کی نظر میں سبک سر نہ ہوں اور تم کو بدگمانی کا موقع نہ دوں اگر تم مجھ سے بدگمان ہو کیونکر سکتے ہو ؟ کیا میری رفتار گفتار اور کردار سے میری الفت کا اظہار نہیں ہوتا ؟

اکثر ایسا ہوا ہے کہ تم آئے اور میں نے اپنے چہرے سے صرف اس لئے قلبی جذبات مسرت کا اظہار نہیں ہونے دیا کہ تمہاری آنکھیں اس وقت مجھے ضبط کا حکم دے رہی تھیں۔ اگر تم نے میری اس عظیم الشان قربانی کی قدر نہیں کی تو تم نے نہ صرف مجھ پر بلکہ اپنے اوپر بھی ظلم کیا ہے۔

میرا عشق اتنا بے لوث ہے کہ میں یہ دعا بھی نہیں مانگتی کہ تم مجھے مجھ سے زیادہ چاہنے لگو کیونکہ اس صورت میں تمھیں عشق کے مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا اور محبوبیت کے ناز و انداز ختم ہو جائیں گے۔

تمہارا خیال تھا کہ تمہارے عشق نے میرے جذبات الفت کو بیدار کیا لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرے سوز و گداز نے تمہارے دل میں عشق کی آگ روشن کی مگر خدا کے لئے اس اعتراف الفت و اظہار عجز پر مغرور ہو کر اور زیادہ سنگدل نہ ہو جانا۔ آؤ اور مجھے منا کر یہ بات ثابت کر دو کہ میں نے

سب کچھ کھونے کے بعد بھی کچھ بھی نہیں کھویا۔

مکتوب دوم

اسے حسد نہ سمجھنا حقیقت یہ ہے کہ کل ہم جس عورت سے ملے تھے وہ نہایت بدصورت تھی اور اس کا اندازِ رقص نہایت مکروہ تھا۔ خدا جانے (Count de Cugne) نے اس کی اتنی تعریف کیوں کی اور نہ معلوم تم سے اتنی دیر اس کے پاس بیٹھا کیونکر گیا؟ چہرے سے تو بالکل بے کیف معلوم ہوتی تھی مگر تم کہتے ہو کہ اس نے نہایت پرلطف گفتگو کی۔ آخر وہ "پرلطف" گفتگو تھی کیا؟ کیا آپ کی کسی فرانسیسی محبوبہ کا ذکرِ خیر ہو رہا تھا یا پھر خود بدولت نے خود ان بی صاحبہ کو پسند فرما لیا تھا کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ محبت کے ذکر کے علاوہ اتنی دیر تک کسی اور موضوع پر گفتگو نہیں کی جا سکتی۔

مجھ سے بھی کل آپ کے نو وارد فرانسیسیوں نے کچھ دیر تک "پرلطف گفتگو" کی۔ کیا قسم سے جو کوئی لفظ توجہ سے سنا ہو بلکہ سچ پوچھو تو انھیں کی بک بک جھک جھک کی وجہ سے کل ساری رات سر میں درد رہا۔ میں خود بے غیرت بنکر اپنے دردِ سر کا ذکر نہ کرتی تو شاید تمھیں خبر بھی نہ ہوتی کیونکہ تم تو غالباً انھیں بی صاحبہ کی مزاج پرسی میں مصروف ہوگے جن کے ساتھ کل شب کو محوِ رقص تھے۔ خدا جانے تمھیں اس کم بخت کی کیا ادا پسند ہے؟ کیا وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے؟ کیا وہ تمھیں مجھ سے زیادہ چاہتی ہے؟ ناممکن ہے کہ وہ یا کوئی اور تمھیں مجھ سے زیادہ چاہ سکے۔

تمھیں یاد ہوگا پہلی ملاقات کے بعد میں نے ہی ربط ضبط بڑھانے کی کوشش کی تھی تم جانتے ہو کہ محبت کے کھیل میں میں سب کچھ تم پر نثار کر چکی ہوں اگر اس فرانسیسی عورت نے مجھ سے زیادہ ایثار کیا ہو تو خود میں کہوں گی کہ تم مجھے چھوڑ کر اس کے ہو جاؤ۔ مجھے تمھاری خوشی اپنی مسرت سے کہیں زیادہ عزیز ہے۔ بلکہ میری تو یہ رائے ہے کہ تم اس کو میرا یہ خط دکھا دو اور اس سے کہو کہ میرا تن من مجھ پر فدا ہے۔ میرا خاندان نہایت معزز ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ میں ایسی بدصورت بھی نہیں ہوں اس لئے اگر تم اسے میرا خط دکھاؤ گے تو اس پر یقیناً اچھا اثر پڑے گا۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں اس وقت حسد سے اندھی ہو رہی ہوں، میں معترف ہوں کہ کل شب کے طرزِ عمل سے میں تمھیں نہایت بے وفا سمجھنے لگی ہوں لیکن اس کے باوجود میرے دل میں تمھیں تم ہو مجھے لیڈی فریڈرو سے نفرت ہے کہ اس نے کل تمھیں کیوں بلایا مجھے لیڈی کیسٹرو سے بغض ہے

کیونکہ اسی کی شادی میں تم نے اس فرانسیسی چڑیل کے ساتھ رقص کیا تھا میں موجد رقص سے متنفر ہوں میں کائنات سے تنگ ہوں میں خود اپنی ذات سے بیزار ہوں لیکن میرے جذبات نفرت کی یہ مجال نہیں ہے کہ تمھاری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ سکیں۔ تم کچھ بھی کیوں نہ کرو میں تم سے متنفر نہیں ہو سکتی۔ اگر میں تمھارا سر خدانکردہ اس فرانسیسی عورت کے قدموں پر دیکھوں جب بھی مجھ کو تم میں کچھ ایسی خوبیاں نظر آئیں گی جو بس تمھیں میں نظر آسکتی ہیں۔

میرا دل تمھاری تعریف سُنکر خوش ہوتا ہے لیکن تعریف کرنے والوں سے میں جلتی ہوں میرے سامنے کوئی شخص تمھاری تعریف کرے اور مجھے یقین ہوجائے کہ تم اس معرف سے بہ نسبت میرے زیادہ خوش ہو تو دل چاہتا ہے کہ تعریف کرنے والے کا منہ نوچ لوں مگر اس کے باوجود میں یہ چاہتی ہوں کہ اور لوگ بھی تمھارے ان اوصاف کی تعریف کریں جن کی میں دل دادہ ہوں۔ مجھے اس فرانسیسی قطامہ سے شدید نفرت ہے لیکن اگر مجھے یقین ہوجائے کہ وہ تم کو مجھسے زیادہ خوش رکھ سکتی ہے تو میں خود تمکو اس سے ملنے پر آمادہ کرنے کے لئے طیار ہوں۔ محبت کتنے متضاد جذبات کی حامل ہوتی ہے!

اگر تم کو بھی مجھ سے محبت ہوتی تو خیر میری تو زندگی سنور جاتی مگر تم کو بھی وہ روحانی لطف حاصل ہوتا جو اس تغافل اور سرد مہری میں ممکن نہیں۔

باور کرو کہ تم کو میرے برابر کوئی چاہ نہیں سکتا ہے اور اس لئے تم صرف میرے ساتھ رہکر خوش رہ سکتے ہو۔ اگر تم کو کسی اور عورت سے محبت ہوجائے تو مجھے رشک نہیں ہوگا بلکہ تم پر بے انتہا رحم آئیگا اس لئے کہ نہ میرے سوا کوئی اور تمھاری پر معنی نظروں کا مطلب سمجھ سکتا ہے اور نہ میرے علاوہ کوئی اور تمھاری ناز برداری کر سکتا ہے۔

ہمیں محبت کر کے خوش رہ سکتے ہیں اور ہمیں جانتے ہیں کہ محبت کے آئین و آداب کیا ہیں۔

یقین کرو اگر خدانکردہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے بجائے کسی اور سے محبت ہوتی تو اب تک کبھی کے گھٹ گھٹ کے مر چکے ہوتے! ـــ

مکتوب سوم

آخر تم کب تک نربن واپس نہیں آؤ گے؟ کیا تمھیں اس کا احساس نہیں ہے کہ تمھیں گئے ہوئے پورے دو دن ہو گئے اور مجھے دو پہاڑ سی راتیں تمھارے ہجر میں بسر کرنا پڑیں؟

تمھارا مقصد صرف یہ تھا کہ میرا تن تمھارے ہجر میں جاں بلب ہو جائے۔ اگر تم میری موت کے خواہاں ہو تو عجب نہیں میں خود بھی اپنی جان سے بیزار ہو جاؤں میں کبھی نہ تم سے مطمئن ہو سکی ہوں اور نہ اپنی ذات سے تم جب خلاف معمول افسردہ ہوتے ہو تو مجھے یہ شبہ ہوتا ہے کہ تم مجھ سے اُلجھتے ہو لیکن جب تم ضرورت سے زیادہ خندہ پیشانی سے کام لیتے ہو تو مجھے یہ شک ہوتا ہے کہ کہیں یہ خوشی کسی اور وجہ سے تو نہیں ہے۔

میں جانتی ہوں کہ تم قصبے سے دو قدم کے فاصلے پر ہو مجھے یقین ہے کہ تم اپنے فرائض منصبی کی وجہ سے رکے ہوئے ہو مجھے تسلیم ہے کہ اگر تم یہاں ہوتے جب بھی میں اپنے بھائی کی علالت کی وجہ سے تم سے نہیں مل سکتی تھی لیکن اس دل کو کیا کروں کہ کسی طرح مانتا ہی نہیں، مجھے معلوم ہے کہ تمھارے کیمپ میں حوا کی کوئی بیٹی موجود نہیں ہے اور مجھے رقابت کا کوئی اندیشہ نہیں مگر اس کا کیا علاج کہ میرا بدگمان دل تمھاری ہر محبوب شے کو خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان میری نظر میں رقیب بنا دیتا ہے۔

مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ مصنوعی جنگ کا مظاہرہ تمھارے پتھر دل کو محبت کی لطافتوں سے بے نیاز نہ کردے۔ کہیں تم اس لئے تو اس مظاہرے میں شریک نہیں ہوئے ہو کہ تم اپنے دل کو میری مفارقت کا عادی بنانا چاہتے تھے؟ اگر یہ بات ہے تو یقین مانو کہ مجھے نازنینان فرنگ سے کہیں زیادہ ان کلموہی توپوں سے رشک ہے۔

میں یہ نہیں چاہتی کہ تم ہر وقت میرے پہلو سے لگے بیٹھے رہو میرا یہ منشا نہیں کہ تم میرے لئے اپنی نوکری چھوڑ دو میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم میری وجہ سے میدان جنگ کا منھ دیکھنا چھوڑ دو میں جانتی ہوں کہ تم مرد بچے ہو اور تمھارا کام میدان جدال و قتال میں سرخرو ہونا ہے مجھے تمھاری شہرت اپنی محبت سے زیادہ عزیز ہے لیکن میری یہ تمنا ضرور ہے کہ میری طرح تم کو بھی ہجر کی تلخی محسوس ہو۔

کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ مجھ کو تمھارے رنج سے خوشی ہوگی۔ اگر مجھے یقین ہو جائے کہ تم کو میرے فراق سے تکلیف ہوتی تو میں خود تم کو سمجھا بجھا کر اس عارضی فراق کی اہمیت کم کر دوں گی۔

پھر آخر میری آرزو کیا ہے؟ یہ میں خود بھی نہیں جانتی ہوں! شاید میری تمنا یہ ہے کہ جتنا میں تمکو چاہتی ہوں اتنا ہی تم مجھکو چاہنے لگو مگر یہ تمنا پوری ہو کیونکر سکتی ہے؟

میرے منتشر خیالات سے پراگندہ دماغ نہ ہونا اس لئے کہ یہ تمھارے ہی ہجر کا نتیجہ ہیں۔ اگر جنون تمھاری محبت کا دوسرا نام ہے تو میں اس فرزانگی سے باز آئی جس سے جذبۂ محبت میں کوئی کمی واقع ہو۔

تم یقیناً عقلمند ہو اور میں بھی اغلباً بیوقوف نہیں ہوں مگر میں یہ نہیں چاہتی ہوں کہ عقل ہمارے دلوں پر حکومت کرے ہمارے دل عقل و خرد سے بیگانہ محبت کے محکوم بن سکتے ہیں اور بس۔ اچھا

سچ کہنا اس عارضی فراق کا تم پر بھی کچھ اثر ہوا؟ آخر کہاں تک نہ اثر ہوگا تم یقیناً اتنے بیوفا نہیں ہو۔ تم نے سامان سرب دیکھ کر سرد آہیں بھری ہوں گی کیونکہ یہی کم بخت جنگ تو اس فراق کا باعث تھی۔ مجھے یقین ہے کہ جب تم واپس آؤ گے تو لوگ کہیں گے کہ اس سفر میں تم کچھ کھوئے کھوئے سے رہے۔ اب رہی میری حالت سو اگر میرا بھائی بیمار نہ ہوتا اور لوگ میری بہکی بہکی باتوں کو بھائی کی محبت پر محمول نہ کرتے تو شاید اب تک راز عشق افشا ہو گیا ہوتا۔

میرا چہرہ اس تین دن کی مفارقت میں اتر گیا ہے مگر مجھے امید ہے کہ یہ پژمردگی تمھاری نظر میں حسن و شباب کی تازگی سے کہیں زیادہ محبوب ہوگی۔

اور اچھا جو خدا نکردہ مجھے تم سے چھ مہینے علٰحدہ رہنا ہو تو میرا کیا حال ہو؟ میں بتاؤں؟ مجھ پر ذرا بھی اثر نہو! اس لئے کہ اس طویل مدت کے اختتام سے پہلے ہی میں مر چکی ہوں گی۔

سنو! گلی میں کچھ شور ہو رہا ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ یہ تمھاری آمد کا شور وغل ہے۔ ہائے اللہ کیا کروں! اگر یہ تمھاری آمد کی دھوم دھام ہے اور میں اپنے بھائی کی علالت کی وجہ سے تم کو نہ دیکھ سکی تو فرط شوق سے جاں بلب ہو جاؤں گی اور اگر تمھارے علاوہ کوئی اور آرہا ہے تو افراط یاس و حرماں سے جاں بر نہ ہو سکوں گی!

مکتوبِ چہارم

تو کیا تم ہمیشہ بے مہری سے کام لو گے؟ کیا تمھارے پتھر دل کو محبت کی لطافت بھی موم نہیں بنا سکتی؟ تمھارے تغافل آمیز جمود کو تمھاری بے حسی کو تمھاری بے پروائی کو کیونکر دور کیا جائے؟ کیا میں سچ مچ تمکو چھوڑ کر کسی اور سے محبت کرنے لگوں؟ لیکن میرا دل اس بات کو قبول کیسے کر سکتا ہے؟ کل شب کو میں نے دیدہ و دانستہ ڈیوک آلمیڈا کی معیت قبول کی میں عمداً کھانے کی میز پر اس کے پاس بیٹھی میں نے جان بوجھکر تمھارے جلانے کے لئے اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کیں مگر تم پر کوئی اثر نہ ہوا!

کہیں اس کے یہ معنے تو نہیں ہیں کہ تم کو دراصل میری رتی برابر بھی پروا نہیں ہے کہیں اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ تم کو مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں ہے؟ میں صرف اس خیال سے کانپ اٹھتی ہوں کہ تم مجھے ایک مرد سے مصروف راز و نیاز دیکھ کر بھی متاثر نہیں ہوتے! ہاں ہاں تمھیں یقیناً مجھ سے محبت نہیں ہے۔ میں عشق کے کیف وکم سے اتنی اچھی طرح واقف ہوں کہ ہر اس جذبہ کے متعلق جو میرے

جذبات سے مختلف ہو کہہ سکتی ہوں کہ اس جذبے کو جذبات محبت سے دور کا لگاؤ بھی نہیں ہے۔
بعض اوقات سچ مچ دل یہ چاہتا ہے کہ کسی اور سے محبت کرنے لگوں، مگر تمھارے سوا دل لینے والا ہے کون؟ کل شب کو تمھارے برتاؤ نے میری نظر میں تمھاری خوبیوں کو کم کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود تم میں لاکھوں ایسی خوبیاں دکھائی دیتی تھیں جو بس تمھیں میں نظر آسکتی ہیں۔ اور تو اور تمھارے تغافل پر بھی پیار آرہا تھا۔ کیا میرے غصے کا دوسرا نام عجز محبت تو نہیں؟
مجھے اس وقت بھی یہی فکر ہے کہ کسی طرح اپنے دل کو یہ سمجھاؤں کہ کل شب کو تمھاری بے پروائی ہی قرینِ مصلحت تھی اور سچ پوچھو تو تھا بھی یہی۔ میرا بھائی تمھاری ہر نقل و حرکت کو غور سے دیکھ رہا تھا اور اگر تم ڈیوک آلمیڈا سے رقابت کا اظہار کرتے تو یقیناً افشائے رازِ عشق کا خدشہ تھا۔ مگر سنو تو کیا تم اظہار رشک و رقابت کا کام زبان کے بجائے آنکھوں سے نہیں لے سکتے تھے؟ ممکن ہے کہ ڈیوک آلمیڈا کو اس خاموش پیغام کا احساس نہ ہوتا مگر میں تو سمجھ جاتی۔ میں نے دیدہ و دانستہ کئی مرتبہ تمھیں آنکھ ملا کر دیکھا مجھے اعتراف ہے کہ تمھاری آنکھوں سے محبت ٹپک رہی تھی مگر کیا وہ اظہار محبت کا وقت تھا؟ مجھے ایک غیر مرد سے باتیں کرتے دیکھ کر تمھاری آنکھوں سے رشک و رقابت غیظ و غضب کی آگ برسنا چاہئے تھی۔ تم کو میری ہر بات کی تردید کرنا چاہئے تھی تم کو معمولی معمولی باتوں پر مجھ سے لڑنا چاہئے تھا تم کو میرے سامنے میرے جلانے کیلئے کسی حسین عورت سے پیار محبت کی باتیں کرنا چاہئے تھیں غرض کسی نہ کسی طرح اظہار رشک و غم کرنا چاہئے تھا۔ مگر تم نے کیا کیا؟ میرے اس ہاتھ کو جو تھوڑی دیر پہلے تمھارے رقیب کے ہاتھ میں تھا محبت سے پکڑ لیا اور یوں مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے لگے جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی! تمھاری بے حسی دیکھ کر تو مجھے یہ خیال آنے لگا تھا کہ کہیں تھوڑی دیر بعد تم مجھے ڈیوک آلمیڈا کی منظور نظر بن جانے پر مبارکباد نہ دو۔ اے ظالم، کہیں رسمِ اُلفت کو یوں بنایا جاتا ہے؟ — تمھیں اس کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا کہ محبت کہتے کسے ہیں اور مصائبِ عشق میں کیا لطف پنہاں ہوتا ہے؟ تمھیں اس کا احساس ہی نہیں ہے کہ وہ شکاری جسکے ہاتھ میں تغافل کا حربہ ہوتا ہے زخمی صید سے زیادہ مجروح ہوتا ہے اس لئے کہ اس کا دل محبت کی عظیم ترین نعمت سے محروم ہوتا ہے — مجھے اپنی وارفتگی اتنی عزیز ہے کہ میں یہ منظور کر سکتی ہوں کہ تمھیں پھر کبھی نہ دیکھوں مگر یہ منظور نہیں کر سکتی کہ تم آؤ اور میں اپنے والہانہ جذبات کا اظہار نہ کر سکوں — کبھی میری وارفتگی سے بھی سبق لو کبھی حزم و احتیاط بے مہری و تغافل کو چھوڑ کر عشق کی دیوانی دنیا کی بھی سیر کرو اسوقت تمھیں معلوم ہوگا کہ تم ابتک کتنی بڑی نعمت سے محروم تھے۔

(باقی)

طالب صفوی

مسائلِ زر جدید روشنی میں[1]

زر کی ماہیت

(۱)

آپ ہر روز روپیہ اور زر دیکھتے اور استعمال کرتے ہوں گے ۔ لیکن کیا کبھی آپ نے خیال کیا کہ اس زر سے کتنے مسایل متعلق ہیں اور اس کی کمی بیشی سے دنیا میں کیسے کیسے سیاسی و اقتصادی انقلابات پیدا ہو جایا کرتے ہیں ۔ آپ نے اُردو شاعری میں حسب ذیل قسم کے اشعار تو اکثر مطالعہ فرمائے ہوں گے ؎

پیسہ ہی رنگ روپ ہے پیسہ ہی مال ہے ‏ پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

لیکن آپ نے زر کے مفہوم ۔ زر کی ماہیت ۔ زر کے مصرف ۔ تعدادِ زر کے نظریئے ۔ زر کی بہم سانی اور مطالبہ کے عدم توازن کے ہولناک نتائج ۔ زر کی تعداد اور بہم رسانی کو ایک ضابطہ میں رکھنے کے طریق اور معیارِ زر وغیرہ کے متعلق بہت کم سُنا ہوگا ۔ اس لئے آئیے ہم آج کی صحبت میں انہی مسائل کا بتفصیل تجزیہ و مطالعہ کریں ـــ آپ میں سے جو اقتصادیات کے طالبعلم ہیں اُن کے لئے بھی میری

---

[1] میں اس مضمون کے لئے اپنے محترم اُستاد پروفیسر اندر موہن کپور بی اے آنرز ایم ایس سی (اکونامکس) لندن ۔ آف پنجاب یونیورسٹی کا مرہون منت ہوں ۔ خیالات اُنہی کے ہیں لیکن طرز بیان میرا ہے ۔ بعض مقامات پر میں نے اُن سے اختلاف بھی روا رکھا ہے ۔ علاوہ ازیں میں نے ذیل کے مصنفین کی گرانقدر کتب سے بہت استفادہ کیا ہے :۔
ٹاؤزگ[1] ۔ مل[2] ۔ سڈوگ[3] ۔ کینز[4] ۔ جیونز[5] ۔ کیبنز[6] ۔ مارشل[7] ای تھامس[8] ۔ فوسٹر اینڈ کیچنگ[9] ۔ روبرٹسن[10] ہنہ فلاٹ[11] ۔ کیسل[12] ۔ اینڈرسن[13] ۔

باتیں اکثر و بیشتر نئی ہوں گی کیونکہ کالجوں میں بالعموم قبل از جنگ واقعات کی تعلیم پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اور جو اصحاب معاشیات سے بیگانہ ہیں اُن کے لئے تو بہر حال یہ سب مباحث نئے ہوں گے اور شاید اُن کو شروع شروع میں یہ مضمون غیر دلچسپ بھی محسوس ہو لیکن دلچسپی پیدا کر لینا آپ کے اختیار میں ہے صرف غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کچھ عرصہ کے بعد آپ کو ان مسائل میں اتنی دلچسپی پیدا ہو جائے کہ ایک نہایت دلآویز، حیرت خیز رومان کی طرح یہ بھی آپ کی نیند حرام کر دے۔

قبل از جنگ مصنفین کے خیالات

سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ زر ہے کیا؟ بہت ممکن ہے کہ آپ میں سے اکثر کہہ دیں کہ وہی جس کے ذریعہ سے ہم روز اشیاء خریدتے اور بیچتے ہیں۔ لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ یہی جواب قبل از جنگ کے مصنفین نے اکثر جگہ اپنی کتابوں میں دُہرایا ہے اور اس کا ثبوت ہم آگے چل کر پیش کریں گے۔

فی الحال ہم دیکھتے ہیں کہ زر کی ماہیت کے متعلق قبل از جنگ اور مابعد جنگ مصنفین کے خیالات میں کیا تغیر رونما ہوا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ کس طرح آہستہ آہستہ بیشتر مصنفین کے خیالات کی تغلیط ہوئی ہے اور کس طرح اب بھی جس نتیجہ پر بعض ماہرین پہونچے ہیں وہ درست نہیں ہے۔

قبل از جنگ معاشیین میں سے مل۔ ٹاؤزگ۔ جیوِن۔ کنن اور رسڈوگ مشہور ہیں جن کے خیالات زر کی ماہیت کے متعلق درج ذیل ہیں :۔

(۱) زر انتقال مال کے لئے ایک آلہ ہے۔ (مل)

(۲) مبادلۂ اشیاء کو معرض عمل میں لانے کے لئے زر ایک ذریعہ ہے۔ (ٹاؤزگ)

(۳) زر کو ہم ایک چلتی پھرتی چیز کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ ایک ایسی رائج الوقت چیز ہے جس کو مبادلہ کیلئے منتخب کر لیا گیا ہے۔ (جیوِن)

(۴) اپنی سادہ شکل میں زر ایک ٹھوس ذریعۂ مبادلہ ہے۔ (کینن)

(۵) میرا خیال ہے کہ بہت سے مقاصد کے لئے بیگ ہاٹ کی طرح ہمیں زر کا مفہوم صرّافہ کے "زر رائج" تک محدود رکھنا چاہئے اور اس کے معنی "عام ذریعہ مبادلہ" ہی لینے چاہیں (سڈوگ)

مابعد جنگ مصنفین کی تحریرات

مابعد جنگ مصنفین کے نزدیک زر محض ذریعۂ مبادلہ نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے جو ذیل کی تحریرات سے واضح ہے :۔

(۱) جس چیز کو ہم وقتی طور پر بطور ذریعہ مبادلہ استعمال کرتے ہیں اُسے ہم زر کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ قوت خرید کا خزینہ ہے۔ لیکن اگر زر کا یہی مفہوم ہو تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ براہ راست مبادلہ کے

زمانہ سے ہم تاحال نہیں گزر چکے ہیں۔ زر حقیقی کا اطلاق صرف ایسے زر پر ہو سکتا ہے جو "حساب وکتاب کے زر" کا کام دے یعنی جس کے ذریعہ سے قرضوں، قیمتوں اور عام قوتِ خرید کا اظہار کیا جائے۔ زر وہ ہے جس کی ادائیگی سے معاہداتِ قرض اور معاہداتِ قیمت پورے کئے جائیں اور جس کی شکل میں عام قوتِ خرید جمع کی جائے ــــ" (کینز)

(۲) "۔۔۔۔۔ 'زر' مترادف ہے 'زرِ رائج' کے اور اس لئے اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو ہر جگہ اور ہر وقت کسی اشیاء اور خدمات کے خریدنے اور تجارتی معاہدات کے پورا کرنے کے لئے بطور ایک ذریعہ کے مروّج ہیں۔" (مارشل)

(۳) زر ایک شے ہے جو متراضئی عوام بطور ایک پیمانۂ قدر **Standard of Value** اور دوسری اشیاء کے درمیان "ذریعہ مبادلہ" قرار دے لیا گیا ہے۔ (ای۔ تھامس)

(۴) "زر سے مراد معاشین کسی ایسی شے کو لیتے ہیں جو

(ا) **اشیاء اور خدمات کے مبادلہ میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی ہے۔**

(ب) اس ارادہ سے باقاعدہ طور پر قبول کرلی جاتی ہے کہ دوسروں کا مطالبہ پورا کرنے میں استعمال کی جا سکے گی۔

(ج) رسمی طور پر اُس کی ماہیت یا تعداد بغیر کسی تفتیش و تحقیقات کے منظور کرلی جاتی ہے۔

(د) دینے والے کی ساکھ پر بغیر کسی حوالہ کے وصول کرلی جاتی ہے ان تمام باتوں پر حاوی ہونے والی شے کو ہم زر کہتے ہیں۔" (فوسٹر اینڈ کیچنگ)

(۵) "کوئی چیز جو معاہدات کی تکمیل اور قرضوں کی ادائی کے لئے بالعموم قبول کرلی جاتی ہے اُس کو زر کہتے ہیں۔ (ہیلفرڈٹ)

(۶) ہم اصطلاح "زر" کسی ایسی شے کے لئے استعمال کریں گے جو مال و متاع کی قیمت کے بدلہ میں یا کسی اور تجارتی معاہدہ کی تکمیل کے لئے قبول کرلی جائے۔" (رابرٹسن)

زر کی تعریف منطقی اُصول سے مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے کہ زر قبل از جنگ محض ایک ذریعہ مبادلہ متصور ہوتا تھا۔ لیکن مابعد جنگ معاشین نے زر کو علاوہ ایک ذریعہ مبادلہ کے معیارِ قدر اور پیمانۂ قیمت بھی قرار دیا ہے۔ لیکن یہ تمام توضیحات منطق کے "اُصول" پر پوری نہیں اُترتیں۔ کیونکہ علم منطق کی رو سے تعریف یا توضیح کے لئے جنس و فصل کی تعیین

ضروری ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں " انسان ایک معاشری حیوان ہے" اب اس میں فصل کیا ہے ؟ یعنی وہ چیز کیا ہے جو انسان کو حیوان سے جدا کرتی ہے ؟ اس کا معاشری ہونا ہے۔ اسی طرح انسان کی جنس کیا ہے ؟ یہ کہ وہ حیوان ہے۔ اگر اسی اصل کو مدنظر رکھ کر مندرجہ بالا توضیحات کو پرکھا جائے تو زر کی گزشتہ توضیحات منطقی اُصول پر پوری نہیں اُترتیں۔

اکثر مصنفین نے زر کی تعریف اُس کے (Functions) یا مصرف کے ذریعہ سے کی ہے درانحالیکہ کسی چیز کا فایدہ یا استعمال اُس کی تعریف نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر ہم کہیں کہ کرسی وہ ہے جس پر بیٹھا جاتا ہے" تو یہ کرسی کی قاطع اور یقینی تعریف نہیں ہوگی۔ کیونکہ دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن پر بیٹھا جا سکتا ہے۔

اسی طرح جب یہ مصنفین کہتے ہیں کہ زر وہ چیز ہے جس کے ذریعہ سے مبادلہ اشیاء سرانجام پاتا ہے۔ تو اول یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ " وہ چیز" کیا ہے ؟ دوسرے یہ کہ مبادلہ تو اور ذرائع سے سرانجام پا سکتا ہے۔ تو کیا وہ سب زر ہیں ؟ مثلاً مبادلت تو چک یا ہنڈی کے ذریعہ سے بھی ہو سکتی ہے تو کیا چک یا ہنڈی زر ہیں ؟

بدیہی طور پر نہیں کیونکہ یہ چیزیں تو خود محتاج ہیں کہ اُن کو روپیہ یا زر کی شکل میں ظاہر کیا جائے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ یہ چک اتنے روپیہ یا پونڈ کا ہے اسی طرح یہ ہنڈی اتنی قیمت کی ہے۔ پھر جب بھی دو چیزوں کا آپس میں تبادلہ کیا جائے گا تو اُن میں سے ایک ضرور ذریعۂ مبادلہ قرار پائے گی کیونکہ ایک چیز دیکر دوسری لی گئی۔ یعنی ایک شئے ذریعہ بنی دوسری کے حصول کا۔ تو کیا اس طرح ہر ہر چیز زر ہے ؟ اگر یہ بات نہیں تو سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو زر کو اُس کی ہم شکل چیزوں سے ممیز و ممتاز کرتا ہے ؟

اب اگر غور کیا جائے تو زر انسان کی تین ابتدائی حاجتوں (کپڑا - روٹی - مکان) کو براہ راست پورا نہیں کر سکتا۔ مثلاً ہم زر کو نگل کر اپنی بھوک نہیں مٹا سکتے۔ یا ہم زر کو بطور ملبوسات استعمال نہیں کر سکتے جو چیز ہم کر سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ ہم زر کے ذریعہ سے ان احتیاجات کو پورا کرنے کے لئے اشیائے ضروری خرید سکتے ہیں پس اس سے ثابت ہوا کہ زر ایک (Instrumental Good) یا آلۂ متاع ہے۔ یہ تو ہوا زر کا منطقی Genus یا جنس۔ اب سوال یہ ہے کہ زر کا Differencia - یعنی فصل کیا ہے ؟ یعنی وہ کیا کام ہے جو زر کرتا ہے لیکن ہنڈیاں۔ چک اور دیگر تمسکات قرض نہیں کر سکتے ؟

زر کا منفرد کام اگر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ زر کا اولین مصرف دوسری تمام چیزوں کی قیمت

معلوم کرنا یا اُن کی قدر (Value) کا اندازہ لگانا ہے اور یہ کام ایسا ہے جو تمسکات اور ہنڈیاں وغیرہ نہیں کر سکتیں کیونکہ یہ کاغذات تو خود محتاج ہیں کہ ان کی قدر و قیمت متعین کی جائے۔ دوسرے جب ہم دو چیزوں کا تبادلہ کرتے ہیں تو میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اُس میں سے ایک صرف دوسری شے کی ہی قیمت معلوم کر سکتی ہے لیکن زر ایسی شے ہے جو ہر وقت اور ہر جگہ تمام دیگر اشیاء کی قیمت کا تعین کر سکتی ہے۔ پس پیمائش قدر (Measurement of Value) زر کا اصلی کام ہے۔ ذریعہ مبادلہ ہونا ثانوی امر ہے کیونکہ کوئی چیز مبادلت کا ذریعہ نہیں بن سکتی جب تک اُس کی قیمت کسی معیار پر معلوم نہ کی جائے اور یہ "معیارِ قدر" زر ہی ہے۔

زر اپنا یہ سب سے اہم کام اُس وقت بھی انجام دیتا ہے جب کوئی مبادلت نہ ہو رہی ہو مثلاً فرض کیجئے میرے پاس ایک زمین ہے۔ آج کل اُس کی قیمت ایک ہزار روپیہ ہے لیکن دس برس کے بعد بوجہ ملکی خوشحالی اور عام ترقی کے اُس کی قیمت دو ہزار روپیہ ہو جاتی ہے۔ اب مجھے حق پہونچتا ہے کہ میں اپنے رجسٹر میں زمین کی قیمت دو ہزار روپیہ درج کر لوں۔ یہاں کوئی مبادلت یا خرید و فروخت نہیں ہوئی۔ پھر بھی زر نے اپنا سب سے اہم کام یعنی "پیمائش قدر" انجام دیا ہے۔ اگر زر نہ ہوتا تو قیمت کا تعین کیسے ہوتا؟

اسی طرح جب ہم کسی باغ یا عمارت کی قیمت کا اندازہ لگاتے ہیں تو ہم کوئی "تبادلہ اشیاء" نہیں کرتے۔ پھر بھی زر اپنا سب سے اہم فریضہ انجام دیتا ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس باغ یا عمارت کی قیمت دس لاکھ روپیہ ہے۔

ان تمام باتوں کو مدنظر رکھ کر اگر ہم زر کی منطقیانہ تعریف کرنا چاہیں تو ہم کہیں گے "زر وہ آلاتی متاع ہے جس کے ذریعہ سے تمام دیگر معاشی اموال کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔"

زر کو ذریعہ مبادلہ قرار دینے سے اُلجھن

میں اِس کا منکر نہیں ہوں کہ زر "ذریعہ مبادلہ" ہے یقیناً زر سے مبادلت آسان ہو جاتی ہے۔ لیکن اسے زر کا اولین فریضہ اور صرف اولی قرار دینا اور اسی کو لیکر زر کی توضیح و تجدید کرنا کئی علمی اُلجھنوں کا باعث ہوا ہے۔ مثلاً جو لوگ زر کے ذریعہ مبادلہ ہونے پر بہت مُصر ہیں وہ "زر" اور "کاغذاتِ قرض" کو مترادف قرار دیتے ہیں اور اُن میں کوئی فرق نہیں کر سکتے۔ اُن کا خیال ہے کہ چونکہ ہنڈیاں۔ چیک اور تمسکات بھی ذریعہ مبادلہ ہیں اور ان کی تعداد میں فرق آجانے سے اشیاء کی قیمتوں پر وہی اثر پڑتا ہے جو زر کی تعداد میں فرق آجانے سے پڑتا ہے اس لئے بنیادی طور پر زر اور کاغذاتِ قرض ایک ہی شے

ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ کاغذاتِ قرض صرف اُسی وقت اپنا کام سرانجام دیتے ہیں جب اُن کی قیمت زر کی صورت میں متعین کر لی جاتی ہیں۔ آپ چک دیکر ایک شے خرید سکتے ہیں لیکن چک کو ذریعہ مبادلہ بنانے سے قبل زر اپنا اصلی کام کر چکا ہوتا ہے یعنی مشتری و بایع نے اُس شے کی قیمت کا اندازہ بصورت زر کرکے آپس میں سمجھوتا کر لیا ہوتا ہے۔

پس یہ اُلجھن دور ہوسکتی ہے اگر ہم زر کو ایک "ذریعۂ پیمایش قیمت" قرار دیکر اُسے تمسکات اور ہنڈیوں وغیرہ سے ممیز کرلیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کاغذاتِ قرض کی تعداد یا مطالبہ میں کمی یا بیشی واقع ہونے سے عام اشیاء کی قیمتوں پر وہی اثر پڑے گا جو زر کی تعداد یا مطالبہ میں کمی یا بیشی ہونے سے پڑتا ہے۔ مثلاً جس طرح اگر زر کی تعداد میں اضافہ ہوجائے تو اُس کی وقعت کم ہوجاتی ہے اور اشیاء کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اسی طرح اگر کاغذات قرض کی تعداد زیادہ ہوجائے تو اُن کی وقعت کم ہوجائے گی اور عام اشیاء کا نرخ چڑھ جائیگا لیکن کاغذاتِ قرض بہرحال زر کے بدل ہیں اور بدل اصل نہیں ہوسکتا۔ پس اس لحاظ سے اِن دونوں میں تمیز کرنا ضروری ہے جو اسی وقت ہوسکتی ہے۔ جب ہم زر کا اولین فریضہ اور ممیز نشان "معیار قدر" قرار دیں۔

یہاں یہ ذکر کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زر کی صحیح ماہیت نہ سمجھنے کی وجہ سے معاشین "زر" یعنی Money اور "زرِ رائج" یعنی Currency میں کوئی فرق نہیں کرسکتے قبل از جنگ مصنفین نے تو ان الفاظ کو مترادف سمجھ کر استعمال کیا ہے لیکن مابعد جنگ مصنفین نے "زر" کو "زرِ رائج" سے ذرا زیادہ وسیع معنوں میں لیا ہے مثلاً اُن کا خیال ہے کہ "زرِ رائج" سے مراد صرف نوٹ۔ چک اور ہنڈیاں ہیں کیونکہ یہ ایک محدود حلقہ میں (صرف ملکی حدود میں) مروج ہوسکتی ہیں لیکن "زر" جس سے وہ ٹھوس سکّہ کے معنی لیتے ہیں وسیع حلقہ میں "رواں" ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ تمیز چنداں صحیح معلوم نہیں ہوتی کیونکہ تمسکات۔ ہنڈیاں اور دیگر کاغذاتِ قرض بھی اب بین الاقوامی طور پر منظور کر لئے جاتے ہیں نیز حلقۂ اثر کی تحدید کسی محققانہ تجزیہ کا باعث نہیں بن سکتی۔ پس جو چیز بھی رواں ہوگی وہ کرنسی یا زرِ رائج کہلائے گی اور صرف وہ "آلاتی متاع" جو اشیاء کی قیمتوں کا معیار ہے زر کہلائے گا۔

زر کا مصرف قبل از جنگ زر اور مالیات کی کتابوں میں ایک معتد بہ حصہ کتاب کا زر کے مصرف کے بیان کے لئے وقف کیا جاتا تھا۔ لیکن اب چونکہ زر کی اصل ماہیت واضح ہوچکی ہے، اسلئے اس موضوع پر بہت کم لکھا جاتا ہے۔ مثلاً کینن۔ کیسنز۔ فوسٹر اینڈ کیچنگ۔ رابرٹسن اور لیہ فلڈٹ وغیرہ

ایسے جدید ماہرین مالیات نے اپنی تصنیفات میں زر کے مصرف پر کوئی باب نہیں لکھا۔ دراں حالیکہ قدیم ماہرین معاشیات کی کتابوں میں صفحوں کے صفحے اس موضوع پر موجود ہیں مختصر طور پر زر کے بیان کردہ کام مندرجۂ ذیل ہیں:۔

۱۔ زر معیارِ قدر یا پیمانۂ قیمت ہے۔

۲۔ زر مبادلت کو آسان کرتا ہے۔

۳۔ زر مقروضات کی آخری ادائگی کا ذریعہ ہے

۴۔ زر قوتِ خرید کے انتقال میں کام آتا ہے

۵۔ زر خزینۃ القدر ہے وغیرہ وغیرہ۔

ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ زر ذریعہ مبادلہ اس لئے بنتا ہے کہ وہ معیار قدر ہے یہی حال نمبر ۲۔ ۳ و ۴ کا ہے۔ نمبر ۵ بالکل فضول ہے کیونکہ زر خزینۃ القدر نہیں ہو سکتا۔ قدر تو دو چیزوں کے درمیان ایک نسبت کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ نسبت یا رشتہ کو کسی شے میں خزانہ کے طور پر جمع نہیں کیا جا سکتا۔ پس زر کا اصلی کام صرف پیمائشِ قدر ہے اور باقی تمام مصرف اسی کی شاخیں ہیں۔

اچھے زر کی مبینہ خصوصیات انیسویں صدی کے معاشیین نے اس موضوع پر بہت بحث کی ہے کہ عمدہ زر کے خواص کیا ہونے چاہئیں اور وہ کونسی دھات میں بدرجۂ اتم وجود ہیں مثلاً اُن کے خیال میں اچھے زر کی خصوصیات مندرجۂ ذیل ہیں:۔

۱۔ عام مقبولیت ۔ اُن کے خیال میں زر کی "ذاتی قدر" (Intrinsic Value) بھی ہونی چاہئے تاکہ لوگ اُس کو بخوشی اپنی چیز کے مبادلہ میں قبول کر لیں کیونکہ سونے اور چاندی میں یہ صفت بدرجۂ اتم موجود ہے اس لئے وہ زمانۂ قدیم سے بطور زر مستعمل ہوتے رہے ہیں۔

۲۔ ثبات قدر ۔ یعنی زر کی قدر جلد جلد بڑھتی گھٹتی نہیں رہنی چاہئے ورنہ صرافہ میں اضطراب پھیل جائیگا اور لوگ قیاسات کے مذموم مشغلہ میں مصروف ہو جائیں گے۔

۳۔ نقل پذیری ۔ یعنی زر ایسا ہونا چاہئے کہ اُسے جہاں چاہیں بہ آسانی لیجا سکیں اس کے لئے زر کی جسامت اور وزن کے مقابلہ میں قدر زیادہ ہونی چاہئے ورنہ جسیم اور وزنی شے کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا نہایت دشوار ہوگا۔

۴۔ بے زوالی ۔ یعنی زر کی قیمت میں بوجہ موسم یا تبدیلی مکان وغیرہ کوئی فرق نہیں آنا چاہئے۔ اسلئے زر ایک موزوں دھات ہے۔

۵- یک جنسی - یعنی اس کی اصل یا ذاتی صفت ہمیشہ یکساں ہو مثلاً سونا خواہ وہ کسی کان کا ہو صاف کرنے کے بعد ایک ہی ہوتا ہے۔ اس لئے سکہ بنانے کے لئے موزوں دھات ہے۔ لیکن چمڑہ اور لکڑی وغیرہ کی سینکڑوں اقسام ہوسکتی ہیں اس لئے وہ زر کے لئے مناسب نہیں۔

۶- سہم پذیری - یعنی اگر ہم زر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کردیں تو اُن سب کی قیمت بڑے ٹکڑے کے مساوی ہو مثلاً اگر ایک تولہ سونا ہو تو اُس کی قیمت پینتیس روپیہ ہے اور اگر اُس کو کاٹ کر نصف کردیں تو ہر ٹکڑہ کی قیمت ساڑھے سترہ روپیہ ہوگی۔ لیکن ہیرے جواہرات میں یہ بات نہیں ہے۔ اگر انکی تسہیم کی جائے تو قیمت بہت کم ہوجاتی ہے۔ پس زر کے لئے عمدہ دھات میں سہیم پذیری کی صفت ہونا ضروری ہے۔

۷- شناخت پذیری - زر ایسا ہونا چاہئے کہ وہ فوراً دوسری اشیاء سے ممتاز ہوجائے اور کھوٹے کھرے کا پتہ لگ جائے۔

۸- ڈھلنے کی صفت - یعنی اُس کو سکہ کے لئے موزوں طریق سے ڈھالا جاسکے۔ اور قطع و برید سے محفوظ رکھنے کے لئے اُس پر نقش و نگار ڈالے جاسکیں اور تصدیق کے لئے شاہی مہر وغیرہ ثبت کی جاسکے۔

کیا زر خزینۃ القدر ہے

اب اگر غور کیا جائے تو متذکرہ بالا جملہ صفات اُنیسویں صدی کے اس غلط نظریہ پر مبنی ہیں کہ زر کے لئے باطنی قدر کا رکھنا ضروری ہے اور یہ خیال محض اس لئے پیدا ہوا کہ پرانے معاشیین زر کی صحیح تعریف و تحدید سے ناواقف تھے۔

ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ زر کا اہم ترین فریضہ پیمائش قدر ہے اور ظاہر ہے کہ پیمائش کیلئے کسی قیمتی پیمانے کا ہونا ضروری نہیں۔ مثلاً جب ہم کپڑا ناپتے ہیں تو گز کے لئے ضروری نہیں کہ وہ سونے یا چاندی کا ہو بلکہ لوہے یا کپڑے کے بنے ہوئے گز سے بھی کام ہوجاتا ہے۔ پس اسی طرح زر کے لئے جو محض ایک پیمانہ ہے قیمتی ہونا ضروری نہیں۔

قدیم معاشیین نے اس سلسلہ میں اکثر (Intrinsic Value) اور باطنی قدر کے الفاظ استعمال کئے ہیں جو میرے خیال میں حد درجہ گمراہ کن اور غلط ہیں "قدر" کوئی ٹھوس شے نہیں جو کسی چیز میں مجتمع کی جاسکے "قدر" تو محض ایک نسبت ہے جو دو اشیاء کے درمیان پائی جاتی ہے ظاہر ہے کہ اُسے ایک واحد شے میں کس طرح محفوظ کیا جاسکتا ہے۔

اگر یہ کہنا صحیح ہو کہ زر خزینۃ القدر ہے تو یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ یونیورسٹی کی سند علم کا خزینہ ہے گز میں کپڑا مجتمع ہے اور تھرمامیٹر حرارت کا خزینہ ہے۔ زر تو صرف قدر کی پیمائش کرتا ہے اور جس طرح ایک تھرمامیٹر حرارت نہیں ہوسکتا اور ایک یونیورسٹی کی سند علم نہیں ہوسکتی اسی طرح یہ کیسے ہوسکتا ہے

کہ زر وہ قدر ہو جائے جس کی وہ تعیین کرتا ہے۔

پس جو لوگ زر کے لئے ذاتی قدر کا ہونا ضروری قرار دیتے ہیں اُن کو در اصل قدر کے صحیح مفہوم کا علم ہی نہیں۔

کیا زر کے لئے جسمانی شکل میں ہونا ضروری ہے قدیم مصنفین دو غلط فہمیوں میں مبتلا تھے، اول زر ذریعہ مبادلہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اُسے کوئی ٹھوس شے ہونا چاہئے در اصل یہی دو غلط فہمیاں ہیں جن کی بنا پر معاشیین کا خیال ہے کہ زر کی ساخت کے لئے دھات قیمتی ہونی چاہئے۔

اول کی نسبت ہم قبل ازیں دیکھ چکے ہیں کہ زر ذریعۂ مبادلہ نہیں بلکہ معیارِ قدر ہے اور معیار کے لئے کسی قیمتی شے کا ہونا ضروری نہیں۔ دوسری بات کے متعلق اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ بعض اوقات زر اپنی ٹھوس شکل میں موجود نہیں بھی ہوتا تو بھی لوگ اُسے حساب کتاب کے لئے استعمال کرتے ہیں مثلاً برطانوی ہند کے تجارتی ادارے اپنا حساب کتاب بالعموم گنّی کی شکل میں رکھتے ہیں درانحالیکہ گنّی کوئی ٹھوس شکل میں سکّہ موجود نہیں ہے۔ اسی طرح آجکل گلڈن اور کراؤن کوئی سکّے نہیں ڈھالے جاتے لیکن وہ قدر و قیمت کی پیمایش کے لئے بطور ایک ذریعہ استعمال ہوتے ہیں جنگ کے بعد جرمنی عرصہ تک اپنا کاروبار طلائی مارک کی شکل میں کرتا رہا درانحالیکہ اس سکّہ کا کوئی جسمانی وجود نہیں تھا۔[1] ازمنہ وسطیٰ میں جب زر حقیقی میں ثباتِ قدر کا جزو مفقود تھا۔ تو برِّ اعظم کے تجار اپنا حساب کتاب سکڈی میں رکھا کرتے تھے جو بصورت سکّہ موجود نہیں تھا۔[2]

ان سب حوالوں سے ثابت ہے کہ زر کے لئے ٹھوس جسمانی صورت کا ہونا ضروری نہیں۔ ہمیں صرف ایک آلہ پیمایش کی ضرورت ہے۔ جس کو قانون اور رائے عامہ کے لحاظ سے مقبولیت عام میسر ہو۔

زر کا کام حساب کتاب کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے مندرجۂ بالا خیال کو دُنیا آہستہ آہستہ عملی جامہ پہنا رہی ہے۔ مثلاً آج کل متمدن شہروں میں کاروبار بالعموم بنکوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور زر اپنی جسمانی شکل میں بہت کم استعمال کیا جاتا ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص چھ سو روپیہ ماہوار لیتا ہے۔ اب ضروری نہیں کہ یہ روپیہ ماہ بماہ اسے ٹھوس شکل میں ادا کیا جائے بلکہ اکثر مقامات پر چک بھی نہیں دیا جاتا بلکہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو وہ

---

[1] (Scuddi) ۔ [2] سالیمن اُصول معاشیات صفحہ ۱۵۴

بنک سے اپنی تنخواہ وصول کرلیتا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ شخص اپنا تمام روپیہ فوراً بنک سے نکلوا لے بلکہ جس جس شخص کو اُسے دینا ہوتا ہے اُس کو وہ مطلوبہ رقم کا چک دیدیتا ہے اسکے بعد یہ بھی ضروری نہیں کہ چک دہندگان فوراً یہ روپیہ بنک سے نکلوالیں بلکہ وہ اُسے اپنے حساب میں منتقل کرواسکتے ہیں اور اسی طرح تمام کاروبار محض حساب کتاب اور کھاتہ کے ذریعہ سے سرانجام پاتا ہے اور ٹھوس سکوں یا کاغذاتِ زر کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے۔ اب اگر اسی طریق کو وسیع بنا لیا جائے تو ٹھوس زر یا کاغذاتِ زر کی کبھی ضرورت نہ پڑے۔

موجودہ رجحان آجکل بھی جہاں کاروبار اور ادائی اکثر بنکوں وغیرہ کے ذریعہ سے ہوتی ہے اگر تمام زر سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دیا جائے یا اُسے فرشتے آسمان پر اُٹھا کر لے جائیں اور لوگوں کو اس کا قطعاً علم نہ ہو تو یقین جانیئے کہ دنیا میں اس سے کوئی تغیر واقع نہ ہوگا۔ لوگ اپنا کاروبار بدستور کرتے رہیں گے۔ تجارت اُسی طرح ہوگی۔ حساب کتاب اُس زر کی شکل میں رکھا جائے گا جو کبھی اس دنیا میں موجود تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہونا محال نہیں ہے بلکہ آجکل بھی ایسا ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کرنسی نوٹ ہر روز استعمال کرتے ہیں حالانکہ خود اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ بلکہ ہم اُسے صرف اس یقین پر قبول کر لیتے ہیں کہ اُس کے بدلہ میں گورنمنٹ کا وعدہ ہے کہ وہ ہمارے مطالبہ پر چاندی کے سکے ادا کرے گی۔ دوسرے معنوں میں ہمارا پختہ یقین ہوتا ہے کہ اس نوٹ کی پشت پر خزانہ عامرہ میں اُس کی قیمت کے سکّے موجود ہیں۔ درانحالیکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ اکثر اوقات وہ سکے موجود نہیں ہوتے بلکہ گورنمنٹ بغیر کسی ریزرو کے بھی نوٹ جاری کر سکتی ہے۔ اسی طرح میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جب ہم بنکوں کے ذریعہ سے کاروبار کرتے ہیں تو ہم ٹھوس زر استعمال نہیں کرتے۔

ان سب باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ زر کا ٹھوس ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ وہ قیاسی و فرضی بھی ہوسکتا ہے۔ ضرورت صرف اعتبار یا اعتماد کی ہے۔ اگر ہماری سوسائٹی میں اعتبار و اعتماد اسدرجہ ترقی کر جائے کہ لوگ آپس میں مبادلہ کا اندازہ کسی فرضی معیارِ قدر سے کرلیا کریں تو تمام اُس روپیہ اور اُس کے ساتھ کی مشکلات کی بچت ہوسکتی ہے جو آجکل اس دُنیا میں بے اعتباری اور بداعتمادی کی وجہ سے مروج ہے۔ مشہور ماہر مالیات (**Keynes**) کینز نے سچ کہا ہے کہ:—

Gold is a relic of barbaric times and a symbol of misfortune.

یعنی سونا محض جہالت کے زمانہ کی ایک یادگار اور بداعتمادی کا ایک نشان ہے۔

آخر ہم مبادلہ کے لئے سونے یا چاندی کی ضرورت کیوں محسوس کرتے ہیں اگر آپ غور کریں تو آپکو معلوم ہوگا کہ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ کاروبار کے وقت ہم ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے اور ہمیں خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں ہم گھاٹے میں نہ رہیں۔

پھر سونے کا استعمال محض مرکنٹائلوں[1] کے زمانہ کی یادگار ہے جو اُسے ترقی و خوشحالی کا ایک ممتاز نشان تصور کرتے تھے اور اپنی تجارت کا توازن ہمیشہ موافق رکھنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ برآمد زیادہ رہے اور اُس کے بدلہ میں بیرونی ممالک سونے کی ترسیل کریں اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ زر محض ایک آلۂ قدر ہے۔ اُسکی اپنی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ بذاتہٖ باعث خوشحالی نہیں بلکہ باعث خوشحالی وہ اموال و خدمات ہیں جو زر کے بدلہ میں خریدی جا سکتی ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ آجکل پھر زر کے لئے قیمتی دھاتوں کا استعمال کیوں ہوتا ہے تو جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یہ محض بے اعتباری اور بداعتمادی اور "زر" کے اصل کام اور اُس کی ماہیت کے نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ میں نے اوپر ایک صورت بیان کی ہے جس سے میرے خیال میں بداعتمادی اور بے اعتباری دور ہو سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس درجۂ تہذیب کو پہونچ سکتے ہیں؟

زر کی اہمیت زر کی ماہیت کا فیصلہ کرنے کے بعد ہم ایک اور اہم نتیجہ پر پہونچتے ہیں قبل از جنگ مصنفین زر کی اہمیت کو صرف "قدر اور مبادلہ" کے باب تک محدود رکھتے تھے اُن کا خیال تھا کہ زر صرف مبادلہ کی مشکلات کا حل کرنے کے لئے وجود میں لایا گیا ہے۔ مثلاً مبادلہ کی ایک دقت یہ تھی کہ بہت ممکن ہے ضروریات کی مطابقت نہ ہو سکے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص جوتا لینا چاہے اور اُس کے پاس گھی ہو لیکن اُسے کوئی ایسا آدمی نہ ملے جو گھی لینے کے لئے تیار ہو اور جوتا بھی مہیا کر سکے۔ پھر مبادلہ میں معیارِ نرخ کوئی نہیں تھا۔ بلکہ اس کا فیصلہ کرنا مبادلہ خواہوں کی قوتِ مبادلہ پر منحصر تھا۔ تیسرے مبادلہ میں اشیا کی تسہیم نہیں ہو سکتی تھی۔ مثلاً اگر کسی کے پاس بھینس ہو اور وہ چند نارنگیاں لینا چاہے تو بھینس والے کے لئے اپنی اشتے کے ٹکڑے کرنا ناممکن تھا۔ لیکن اب زر کی موجودگی میں یہ مشکل بھی دور ہو گئی ہے کیونکہ روپیہ یا پاؤنڈ کے کئی حصے ہیں اور اب کم قیمت کی

---

[1] مرکنٹلزم یا تجاریت اُنیسویں صدی کا ایک اعتقاد تھا کہ ہمیں اپنی برآمد درآمد سے زیادہ رکھنی چاہئے تاکہ زائد خارج کے لئے ادائگی سونے کی صورت میں ہو اور ملک کی خوشحالی بڑھے اسکو وہ "موافق توازنِ تجارت" کا نام دیتے تھے۔

اشیا بھی خریدی جا سکتی ہیں تو قبل از جنگ مصنفین زر کی اہمیت کو صرف مبادلہ کی پیچیدگیوں کی حد تک محدود رکھتے تھے۔ لیکن اب چونکہ زر کی ماہیت اور اُس کے مصرف کے متعلق خیالات میں ایک انقلاب عظیم واقع ہو چکا ہے اس لئے زر کی اہمیت محض "مبادلۂ قدر" کے باب سے گزر کر معاشیات کے جملہ ابواب تک پھیل چکی ہے۔ اب زر استعمال دولت کے لئے بھی اہم سمجھا جاتا ہے پیدائش دولت کے لئے بھی تقسیم دولت کے لئے بھی اور مالیات عامہ کے لئے بھی۔ "استعمال دولت" کے لئے اُس کی اہمیت یہ ہے کہ وہ انسان کو مختلف اشیا پر اپنے اخراجات کی تقسیم میں مدد دیتا ہے۔ "پیدائش دولت" یا دولت آفرینی میں اُس کے ذریعہ سے پونجی اور سرمایہ بنانا ممکن ہو گیا ہے۔ تقسیم دولت میں معاوضہ کے لئے اُس کی موجودگی اشد ضروری ہے اور مالیاتِ عامہ میں محصول بندی اور بجٹ وغیرہ کا وجود اُس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔

الغرض یہ صرف زر کی صحیح ماہیت کے سمجھنے کا نتیجہ ہے کہ اُس کی اہمیت معاشیات کے تمام حصوں میں تسلیم کی جا رہی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ زر کا حصول ہی ہمارا اصل مقصود ہونا چاہئے اور ہماری خوشحالی زر کی اُس تعداد پر مبنی ہو گی جو ہمارے پاس کسی وقت موجود ہو۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں زر صرف معیار قدر ہے۔ اُس کی اپنی قیمت کچھ نہیں۔ وہ تو صرف ایک ذریعہ ہے دیگر اموال و خدمات کی خریداری کا اور جس طرح ایک تھرمامیٹر خود حرارت نہیں ہو جاتا اسی طرح یہ زر بھی خود قدر نہیں ہے۔

شبلی (بی۔ کام)

نگار کے پُرانے پرچے

حسب تفصیل ذیل دفتر میں موجود ہیں اور علاوہ محصول اس قیمت پر مل سکتے ہیں جو انکے آگے درج ہے

(سنہ ۲۲ء) ستمبر ۴ر- (سنہ ۲۳ء) مئی ۴ر- (سنہ ۲۴ء) جنوری۔ فروری و اگست ۴ر فی پرچہ - (سنہ ۲۶ء) جنوری۔ جون، اکتوبر و نومبر ۴ر فی پرچہ - (سنہ ۲۷ء) اپریل۔ مئی و جون ۴ر فی پرچہ - (سنہ ۳۱ء) جولائی۔ اگست۔ ستمبر۔ اکتوبر۔ نومبر و دسمبر ۴ر فی پرچہ - (سنہ ۳۳ء) جنوری (غالب نمبر) ۱۲ر- فروری تا دسمبر علاوہ اپریل ۴ر فی پرچہ (سنہ ۳۴ء) فروری جولائی و اکتوبر ۶ر فی پرچہ - (سنہ ۳۵ء) جنوری (اُردو شاعری نمبر) ۱۲ر　　منیجر نگار

مکتوبات نیاز

محبّت پناہا،

گرامی نامہ ملا، میں خوش ہوا کہ آپ اس باب میں میرے ہمنوا ہیں۔ بیشک تفصیل کی ضرورت ہے، لیکن ابھی نہیں، وقت آنے دیجئے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ

ترانۂ کہ نہ گنجد بہ ساز می خواہم

یہی وہ چیز ہے جو سیاسیات میں "اشتراکیت" کہلاتی ہے اور مذہبیات میں "ترکِ رسوم" والی "وحدانیت" اگر اللہ کا وجود ہے تو لاکھ انکار کیجئے وہ موجود ہی رہیگا، انسان کچھ کرے لیکن خدا کی خدائی اس کی سمجھ میں کبھی نہ آئے گی۔ پھر خالق و مخلوق کے اس تعلق کو کہ وہ انکار سے متاثر نہیں ہوتا اور یہ اقرار پر مجبور نہیں، مٹا دیجئے تو دنیا رہنے کے قابل نہ رہے۔ اللہ، اللہ آزادی بھی کتنی بڑی نعمت ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ "تصدیقِ بالجنان" از بس ضروری ہے کہ رندی نام بدتمیزی کا نہیں بلکہ انتہائی خوش سلیقگی کا ہے۔

مذہب کی دنیا میں بداخلاق کی گنجائش ہو تو ہو، لیکن یہاں سب سے پہلے یہی سوال ہوتا ہے۔

تو بروں درچہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

کہتے ہیں کہ تصوف بھی رندی ہی کی ایک شاخ ہے لیکن میں اسے صرف شاعری کہتا ہوں اور شاعری بھی مولانا ناسخ رحمۃ اللہ علیہ کی۔ کیونکہ صوفی کہتا ہے کرتا نہیں اور خرابات میں عمل کے سوا سب حرف باطل ہے۔

غالب کا یہ شعر تو آپ کو یاد ہوگا، لیکن پھر سناتا ہوں، کہتا ہے:—

سنگ و خشت از مسجدِ ویرانہ می آرم بہ شہر
خانۂ در کوئے ترسایاں عمارت می کنم

یہ وہ شرارتیں ہیں جن پر خدا کو بھی پیار آجاتا ہے، لیکن "اہلِ تقشف" اتنی تفریح بھی جائز نہیں سمجھتے اسکے نزدیک گویا کائنات نام ہے قدرت کی "شکنِ پیشانی" کا۔

قبلہ،

دُنیا میں ہر چیز کے کچھ آداب مقرر ہیں، یہاں تک کہ دشمنی کرنے کے لئے بھی خاص تہذیب کی ضرورت ہے۔ آپ میرے دوست نہیں بن سکتے، نہ بنئے، "عداوت ہی سہی"، لیکن خدارا پہلے یہ تو سمجھ لیجئے کہ اس کے آداب کیا ہیں۔

دشمن سے انتقام لینے کا ایک عام طریقہ مقرر ہے کہ اس کے اخلاق کو مکروہ ثابت کیا جائے لیکن اگر اسی سلسلہ میں ہم خود اپنی بداخلاقیوں کو بے پردہ کردیں تو دُنیا کیا کہے گی؟

اس لئے قبلہ اس سے کہ آپ دوسرا قدم اُٹھائیں غور فرما لیجئے کہ آپ نے اپنے "خصم" کو رسوا کرنے کے لئے جو انداز اختیار کیا ہے وہ کہیں اسی قسم کا تو نہیں۔ دوسرے کو غیر سنجیدہ ثابت کرنے کے لئے اپنی سنجیدگی کھو بیٹھنا کہاں کی عقلمندی ہے۔

یہیں لکھنؤ سے ایک رسالہ حال ہی میں شایع ہوا تھا۔ اس کے موجد و مخترع کو آپ بھی جانتے ہیں، وہی "یہاہم فی وجوہہم" ۔۔ اس کی اشاعت کا مقصد صرف مجھ کو "ذلیل" کرنا تھا۔ چنانچہ پہلے ہی پرچہ میں ایک مستقل مضمون میرے متعلق تھا۔ اس میں تھا تو وہی میرے کفر و الحاد کا رونا لیکن تھوڑی سی جدت کے ساتھ یعنی یہ کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اس سے مقصود صرف "کاروبار کی رونق" ہے، گویا خدا سے انحراف کرنا بھی کوئی ایسی چیز ہے جس سے فلاح انسانی متعلق ہوسکتی ہے! بعض احباب نے اصرار کیا کہ میں جواب دوں لیکن چونکہ "خزف ریزہ" کی اوقات اتنی ہی ہے کہ انسان اس کو ٹھکراتا ہوا خاموش گزر جائے، اس لئے میں نے کوئی توجہ نہیں کی۔ میں جواب دیتا تو اس کی اہمیت بڑھ جاتی اور ہزاروں آدمیوں کے کانوں تک اس کا نام پہونچ جاتا۔ وہ مجھے چھیڑ کر یہ کاروباری فایدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پس اس صورت میں آداب دشمنی کا اقتضا یہی تھا کہ میں خاموش رہوں، چنانچہ میں خاموش رہا اور وہ دو تین نمبروں سے زیادہ چل بھی نہ سکا۔

آپ نے جو مناظرہ یا مکابرہ شروع کیا ہے اسے میں اس لحاظ سے بالکل نادرست قرار دیتا ہوں کہ آپ خواہ مخواہ "دشمن" کو اہمیت دے رہے ہیں ۔۔ نہ وہ اس قابل کہ آپ اس سے مخاطب ہوں اور نہ یہ مسئلہ ایسا ضروری کہ آپ کا قیمتی وقت اس میں ضایع ہو۔ علاوہ اس کے معاف فرمائیے جو "اندازِ گفتگو" آپ نے اختیار فرمایا ہے وہ بھی آپ کے شایانِ شان نہیں۔ خس و خاشاک کے ساتھ موتیوں کو بہہ جاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟

جانِ نیاز،

جس کے خیال سے روح "اہتزاز" میں آجائے، اس کی تحریر دیکھ کر کیا کیفیت ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ، میرے بس کی بات ہی نہیں، آپ کا کیا ذکر ہے۔

دُنیا کی اور بہت سی نعمتوں کی طرح، جن کو دینا اور فوراً چھین لینا قدرت کا معمولی مشغلہ ہے، آپ کو بھی میں ہاتھ سے کھو چکا تھا اور عرصہ ہوا آنسو خشک کر کے بیٹھ رہا تھا۔ لیکن اب کہ آپ کی تحریر نے پورے پچیس سال پہلے کی دنیا میرے سامنے پیش کر دی ہے۔ خدارا، آپ ہی بتائیے کہ زمانہ کے اس تفاوت کو کیونکر مٹا دوں۔

وہ آپ کے نرم و نازک ہاتھ اور وہ میرے دل کی مسلسل دھڑکن۔ وہ آپ کا معطر رومال اور وہ میرے گرم گرم آنسوؤں کا نہ رکنے والا سیلاب! — یہ آپ نے کیا کیا — اُف،

برقِ یمانی بجست بادِ بہاری بخاست
طاقتِ مجنوں برفت، خیمۂ لیلیٰ کجاست

خدا کے لئے آئیے یا مجھے بلائیے۔ "ہاتھوں میں اگر دم نہیں آنکھوں میں تو دم ہے"۔

کرم گسترا،

گرامی نامہ ملا۔ معاف فرمائیے جواب غیر معمولی تعویق سے جا رہا ہے۔ سبب نہ پوچھئے، یونہی کچھ بیہودہ سی اُلجھنیں تھیں۔

بیشک اُردو فارسی دونوں میں "بات کرنے" کو "پھول جھڑنے" سے تعبیر کرتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں کہ فارسی میں اس کے علاوہ کوئی اور تعبیر نظر نہیں آتی۔ سعدی کا شعر ملاحظہ ہو:-

لبت بدیدم و لعلم بیوفتاد از چشم
سخن بگفتی و قیمت برفت لولو را

علاوہ اس کے فارسی کا یہ مشہور فقرہ آپ نے سُنا ہوگا "خوش گفتی، دُرسفتی" الغرض "بات" کے لئے "گل افشانی" اور "گوہر افشانی" دونوں استعمال کئے جاتے ہیں۔ آپ اُردو میں بلاتکلف اس خیال کو ادا کر سکتے ہیں۔ اس کا تعلق محاورہ سے نہیں بلکہ استعارہ سے ہے — امسال ستمبر میں دارجلنگ جانے کا ارادہ ہے یا پھر بمقدارِ علم زیادہ سے زیادہ "شملہ"

محترم ۔

اس میں کلام نہیں کہ بغیر فارسی لٹریچر کا مطالعہ کئے ہوئے اُردو لکھنا پڑھنا نہیں آسکتا میں دبی زبان سے اس میں عربی کا بھی اضافہ کروں گا، کیونکہ فارسی ادب کے محاسن کو سمجھنا بہت کچھ موقوف ہے عربی جاننے پر۔

آپ کے اس ذوق سے میں بے خبر نہ تھا، لیکن وہ شغف کی حیثیت اختیار کرلے گا اس سے یقیناً بے خبر تھا۔ آپ کا وجدانِ صحیح خود بہتر رہنما ہے، مجھ سے یا کسی سے رائے لینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن چونکہ آپ نے دریافت کیا ہے اس لئے عرض کروں گا کہ آپ فی الحال سوائے غالب کے کسی اور طرف توجہ نہ فرمائیے۔

جس ندرت و شوخی پر آپ جان دیتے ہیں وہ سوائے غالب کے کہیں نہ ملے گی اور پھر اسی کے ساتھ "فارسیت" کا وہ عالم کہ ہر صفحہ "ایران زار" نظر آتا ہے۔ نزاکتِ خیال" اس میں شک نہیں بیدل کا حصہ ہے، لیکن اس میں یہ لطفِ زبان کہاں؟

جب تک آپ جوان ہیں "خراباتِ غالب" نہ چھوڑیئے، انحطاط عمر میں البتہ "مصحفِ بیدل" سے بہتر کوئی چیز نہیں۔

میری نہ کہئے، یہاں ہر بات اُلٹی ہے۔ جب جوان تھا تو بیدل پر جان دیتا تھا، اب زمانۂ انحطاط میں غالب پر سر دھنتا ہوں۔ اس سے یہ نتیجہ نہ نکالئے گا کہ مجھ پر بڑھاپے میں دوبارہ جوانی آئی ہے بلکہ یہ کہ میں جوانی میں بھی بوڑھا تھا۔

عزیز گرامی ۔

آپ کا یہ خیال درست نہیں کہ مجھے ان کا خیال نہیں، ہاں، یہ ضرور ہے کہ نمود و نمائش سے گھبراتا ہوں اور قصد و ارادہ کے ساتھ کسی کو یاد کرنا محبت کے منافی سمجھتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ جب میں نماز کا عادی تھا اس وقت بھی اکثر تنہا پڑھتا تھا، کیونکہ اس صورت میں "بالجہر" کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔ پھر اب کہ ان تمام مراسم ظاہری سے گزر چکا ہوں، اور "بتوں کی یاد" ہی نے "خدا کی یاد" ترک کرائی ہے، کیونکر اس اُصول کو ترک کرسکتا ہوں۔

ان سے کہہ دیجئے کہ جان لینے والے اور جان دینے والے میں بہت فرق ہے، وہ، اس کا محتاج ہے اور یہ کسی کا نہیں۔ "تقاضائے محبت" کا بار بار ذکر ممکن ہے اس لحاظ سے ضروری ہو کہ اس سے

"برشِ تیغِ جفا" کی دھاک بیٹھتی ہے۔ لیکن وہ جو اُسے "دریائے بیتابی" کی صرف ایک "موجِ خوں" سمجھتے ہیں، ان کو اس طرح مرعوب کرنا ممکن نہیں۔

اول تو میں ان سے خفا نہیں، اور ہوں بھی تو کس گھمنڈ پر؟ ۔ ایاز ہوں اور اپنی قدر پہچانتا ہوں۔ میں اگر جان دیتا ہوں تو صرف اس لئے کہ مجھے جان دینا آتا ہے، نہ اس لئے کہ واقعی کوئی جان لینے والا بھی ہے

آپ بھی کس کی باتوں میں آگئے؟ اُن سے کہئے جو کچھ کہنا چاہتے ہیں خود کہیں، آپ کو کیا خبر، میں جانتا ہوں کہ اس غم کی تہ میں کتنے قہقہے چھپے ہوئے ہیں، اور "عدم یادآوری" کی یہ شکایت صرف اسلئے ہے کہ میں اُنکے بھول جانے کی عادت کو نہ بھول جاؤں۔

گرامی عزیز۔ کل شام کو آپ کا لفافہ ملا۔ آج صبح کو دنیا جشنِ تاجپوشی کی مسرتوں میں غرق ہے میں فراق سے ہمکلام ہوں۔ اس سے زیادہ اشتراکیت پسندی اور کیا ہوگی۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے داد چاہتا ہوں، آپ سے نہیں۔

آپ کا خط پڑھکر مجھے اپنی کامیابی پر بہت مسرت ہوئی۔ کامیابی یہ نہیں کہ آپ نے انتقاد کو پسند کیا بلکہ صرف یہ کہ اسے پڑھکر آپ کی "رگِ انتقاد بھی جنبش میں آگئی۔ آپ کو معلوم نہیں کہ شاعر ہونے سے زیادہ نقاد بننے کی کتنی زبردست صلاحیت آپ میں موجود ہے، کیونکہ تخیل کی وہ "Intensity" جو آپ میں فطرتاً پائی جاتی ہے اس کی متحمل شاعری ہو ہی نہیں سکتی اور بیان کے لئے وہ کچھ اور وسعت چاہتی ہے۔ پھر شاعری کے بعد "بیان کی وسعت" کے معنے سوائے "انتقاد" کے اور کچھ نہیں ہوتے۔ آپ اگر شاعری کبھی کبھی کریں اور یہ "حرکت" اکثر تو خدا جانے آپ کیا قیامت ڈھائیں۔

آپ نے مومن میں بعض چیزوں کی کمی بتائی ہے۔ میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ پھر مطالعہ فرمایئے اس میں وہ سب کچھ ہے جو آپ کہتے ہیں نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ وہ کچھ ہے جسے "شعرِ مطلق" Absolute Poetry کہتے ہیں ۔ "حسنِ مطلق" کہیں ہے یا نہیں اس کو آپ جانتے ہوں گے مجھے علم نہیں ۔ لیکن مومن کا مطالعہ کرنے سے قبل یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس نے کن حدود کے اندر رہکر شاعری کی ہے ۔ وہ حدود جو خود اس نے متعین کئے ہیں، وہ نہیں جو ہم چاہتے ہیں ۔ یقیناً اس کی شاعری وہ نہیں ہے جسے ہم "ہم آہنگِ لانہایت" In tune with the infinite کہہ سکیں۔ لیکن اس کی عظمت اسی میں پوشیدہ ہے کہ باوصفِ شدید ہونے کے اس میں وہ چیز بھی پائی جاتی ہے جسے آپ شیو کا

رقص موت (The Death dance of Shiva) کہتے ہیں۔
میں مومن کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اس نے خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھا تھا، اور شاید اس کی یہی مبارک غلطی تھی جس نے اسے " شاعر" بنادیا، ورنہ وہ صرف " عاشق" بنکر رہجاتا اور بجائے اس کے کہ ہم اس سے دوسروں کی داستان سنتے، خود اس کی داستان دوسروں سے سننا پڑتی۔
شاعر کی خوبی اس کا " Genuine " ہونا ہے، بڑا (Great) ہونے کے بعد وہ شاعر نہیں رہتا، دیوتا ہو جاتا ہے۔ بہرحال میرے آپ کے نقطۂ نظر میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ اور یہ قایم رہنا چاہئے ۔۔۔ " من وتو" ایک ہوجانے کا جامد (Dull) فلسفہ مجھے کبھی پسند نہیں آیا۔
آپ نے اپنی تحریر میں اور بہت سی باتیں ایسی لکھی ہیں جن کو پڑھکر بے اختیار ہو ہو گیا، لیکن خط اور مضمون کے فرق کو باقی رکھنا ہے اس لئے ضبط سے کام لیتا ہوں اور آپ کی تحریر کو Stimulus کی حیثیت سے محفوظ رکھتا ہوں تاکہ آپ سے اجازت لیکر کسی وقت اس کو شایع کردوں اور اسی کے ساتھ جو کچھ مجھے کہنا ہے۔ دل کھولکر کہہ لوں۔
آپ نے جو غزلیں اس دوران میں کہی ہیں وہ مجھے بھیجد یجئے۔ یہ " کیوں بھیجوں" کا معاملہ نہیں ہے بلکہ استحقاق و مطالبہ کی بحث ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ اسوقت تک کوئی غزل کہیں بھیجئے ہی نہیں جب تک میں نہ اسے دیکھ لوں۔ یہ میرا دہ جذبۂ رقابت تو خیر ہے جسے ہمیشہ نہیں تو اکثر پورا ہی کرنا پڑے گا۔
آپ کے ایک ایک شعر پر گھنٹوں آپ سے گفتگو کرنے کو جی چاہتا ہے، سیکڑوں سوال دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ حوصلے اسی وقت نکل سکتے ہیں جب

نگاہش با من و من با نگاہش ماجرا کردم

کی فرصت میسر آئے

فی الحال چند باتیں سن لیجئے :۔

(۱) حسن کی بے رخی عام ہوجانے کے بعد " ربط نہاں" کی امید کیونکر قایم ہوسکتی ہے دوسرے مصرعہ کے لئے پہلا مصرعہ بالکل مومن کے رنگ کا ہونا چاہئے تھا خواہ اس میں " حرامزادہ رقیب" ہی کا ذکر کیوں نہ ہوتا۔

(۲) حد عدم سے کیا مراد ہے اور فسانۂ درد کا حد عدم سے بڑھجانا کس توجیہ پر مبنی ہے، وہ شاعرانہ نہ سہی، آلہانہ سہی !

(۳) اگر ہجر میں جینا حرام نہ ہوتا تو کیا "دوزخ وجنت" اور "ہستی وموت" پر آپ گفتگو کے اہل ہو جاتے حالانکہ سچ پوچھئے تو جینا حرام ہونے کے بعد ہی ان چیزوں پر اچھی گفتگو کر سکتے ہیں۔

(۴) آزادی کا مقابل لفظ جبر نہیں ہے، قید ہے لیکن فقرہ یوں ہو جائے گا "خرقِ قید وآزادی" اور دو (قاف) کے اجتماع سے "تنافر اصوات" پیدا ہوتا ہے اس لئے بجائے جبر کے (بند) کہنے میں کیا حرج ہے۔

واضح رہے کہ یہ صرف آپ کو چھیڑنے کے لئے لکھ رہا ہوں، یعنی اگر اس کے جواب میں چار صفحہ سے کم کا خط آیا تو میں خوش نہ ہوں گا۔

بہ تعمیل ارشاد مسوری پرچہ بھیجدیا گیا ہے۔ مکتوبات پر آپ جو کچھ لکھیں گے وہ میری ملکیت ہوگی نہ کہ نگار کی اس لئے جلدی کی ضرورت نہیں، جب اطمینان ہو لکھئے گا اور کبھی نہ ہو تو کبھی نہیں۔

نیاز

"قفس وآشیاں" کا موضوع

اُردو شاعری کا نہایت پسندیدہ موضوع سمجھا جاتا ہے اور بڑے سے لیکر چھوٹے تک ہر شاعر نے اپنی بساط بھر اس میں زورِ طبیعت صرف کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس موضوع پر اساتذۂ قدیم وجدید کے جتنے اچھے اشعار مل سکیں یکجا فراہم ہو جائیں، چنانچہ میں تمام قارئین "نگار" سے (خواہ وہ صرف سخن سنج ہوں یا شاعر وسخن سنج دونوں) درخواست کرتا ہوں کہ وہ جستجو کر کے بہترین اشعار میرے پاس بھیجدیں۔ میں خود اس کی ابتدا

فراق گورکھپوری

کے اس شعر سے کرتا ہوں:۔

قفس سے چھٹ کے وطن کا سراغ بھی نہ ملا　　وہ رنگ لالہ وگل تھا کہ باغ بھی نہ ملا

جو مجھے بہت پسند ہے۔

نیاز

باب المراسلۃ والمناظرہ

ادب نواز مدیر نگار ! تسلیم عرض کرتی ہوں اور ایک خط بعنوان (نفیس سحابی کا خط) بغرض اشاعت بھیجتی ہوں اپنے رسالہ میں شایع فرمائیے اور ممنون اشاعت کیجئے۔ عرصہ گزرا پردانہ کی قلمی اعانت کیا کرتی تھی۔ زمانہ کے ہاتھوں وہ جل بجھا۔ تو پیام آمید سے پیام و سلام شروع ہی ہوا تھا کہ زندگی بدل گئی وہ کوچہ جو میرے لئے خوب تھا افسوس چھوٹ گیا چند سال سے گھر کے دھندوں میں ایسی پڑی کہ قلم دوئے ادب کے طبل وعلم (قلم دوات) کو خیرباد کہہ کر اب سفرۂ طعام پر قوت ذائقہ کی خاطر تواضع ڈوئی ہانڈی سے کر رہی ہوں۔ ورنہ جب لکھتی تھی تو واقعی لکھتی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگوں کو مجھ پر ناز تھا تو مجھ کو بھی اپنے اوپر ناز تھا۔ اب نہ وہ دن رہے نہ وہ راتیں نہ ناز رہا نہ نازکی باتیں بچوں کی چل پوں سے کہاں فرصت کہ کچھ لکھوں اور کچھ کہوں۔ صحن خانہ تو دور رہا اب تو عرصۂ خیال بھی مجھ پر تنگ ہے۔ مگر فطرت کو کیا کروں جس نے ادبی ناسور پیدا کر دیا ہے ہر چند اس کا منھ میرے افکار بند کرنا چاہتے ہیں۔ مگر پھر بھی کبھی نہ کبھی کسی راہ سے تراوش ہو ہی جاتی ہے چنانچہ اسکے ثبوت میں یہ مرسلہ خط بھی ایک نئی مراسلت کی بسم اللہ ہے جس میں خیال محض سے دور لیکن واقعیت کی تاثیر و اثر ضرور ہے۔ اگر پسند خاطر ہوا اور انتخاب میں آئے تو کبھی کوئی ادبی مضمون اور کبھی کوئی خط آپ کے رسالہ کے لئے بھیجا کروں گی۔ جب سے خطبۂ نکاح نے شہر بدر کا حکم سنایا! اپنا بوریا بستر اسنبھالا۔ دلی چھوڑی۔ مشرقی دیار کی راہ لی۔ ادبی صحبتیں جاتی رہیں تعجب تو یہ ہے کہ زمرۂ شعرا سے نہیں ہوں مگر پھر بھی دلی چھوڑنی پڑی اور لکھنؤ میں موت کے خیر مقدم کے لئے مقیم ہوگئی۔ نظام قدرت تو یہ ہے کہ سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں ڈوبتا ہے مگر میرا آفتاب حیات مغرب سے طلوع ہوا اور مشرق میں غروب ہونے کی ٹھہرائی یہ قیامت کے آثار نہیں تو اور کیا ہے۔۔ ہائے کیا زمانہ تھا جب دلی میں ادبی رشد و ہدایت کی خیرات ملتی تھی علامہ راشد مرحوم جاتے ہوئے ادبی خیرات بھی ساتھ لیتے گئے۔ اب نہ وہ دلی ہے نہ وہ دل ہے

لکھنؤ میں بیاہ کر آئی۔ بیخانۂ مینا کو بزمِ جمشید سمجھی اور حضرت ریاض کے دم سے جرعہ کشی کرتی رہی شرر کی ادبی چنگاریوں نے بھی مجھے گرمایا۔ جب کبھی جالب مرحوم نظر آجاتے۔ دلی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہائے نہ اب ریاض ہی رہے کہ تشنگی دور ہو۔ نہ شرر کی ادبی علم نصیب۔ جالب بھی سدھارے تو جلبِ منفعت کہاں سے ہو۔ دل تو اُسی وقت بجھ گیا تھا جب عروسی حیلہ کے ہاتھوں بھری محفل سے نکالی گئی تھی اور اب دماغ بھی افسردہ ہے کہ یہ لوگ بھی نہیں رہے جو لکھنؤ میں مجھے بیاہ کر لائے۔ ہائے ان میں سے کوئی شاہد تھا تو کوئی وکیل۔ کوئی قاضی تھا تو کوئی ضامن۔ ایک جاتا دوجاتے۔ سب کے سب چلے گئے۔ راتوں کو روتی ہوں میں مروں گی تو مجھے کون روئے گا۔ مرنے کا غم نہیں غم اس کا ہے کہ عزاداری کے ثواب سے مرکر بھی محروم رہوں گی معاف کیجئے گا جو نہ لکھنا تھا وہ لکھ گئی اپنی ناسوری تراوش کا ثبوت دینا تھا۔ پھر کیسے نہ لکھتی۔ آپ نے سب کچھ پڑھ لیا۔ ایک بات میری اور سنئے جس نمبر میں آپ اس خط کو جگہ دیں۔ مجھے اس نمبر کو بھیجکر سرفراز کریں تاکہ اپنی اُن مقامی بہنوں میں آپ کے رسالہ کو ترویج دوں جو مجھ سے اُنس رکھتی اور مجھ ہیچداں کی قدر کرتی ہیں۔ پہلے نام لکھا کرتی تھی اب اس کا بھی پردہ کیا کروں، یگانوں کو چھوڑ بیگانوں میں آئی پردہ نہ کرتی تو اور کیا کرتی۔ حتیٰ کہ نام پر بھی رسم و رواج کا پردہ ڈالنا پڑا۔

والدہ قاضی قیصر الاسلام عرف پیارے میاں دہلوی ثم لکھنوی مقیم حال مرزاپور

(نگار) آپ کا وہ خط (جس کا عنوان "نفیس بھابھی" کا خط ہے) شایع کرنے سے معذور ہوں، لیکن جو تحریر آپ نے میرے نام بھیجی ہے اس کو شایع کئے دیتا ہوں، لیکن بہت ڈرتے ڈرتے، کیونکہ جب آپ کی قلمی اعانت سے پروانہ جل بجھا اور پیام امید ختم ہو گیا تو کیا عجب ہے کہ نگار بھی "نقش و نگار طاقِ نسیاں" بن جائے۔
آپ اس میں شک نہیں خط اچھا لکھ لیتی ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے لکھنؤ آنے کے بعد ریاض و شرر تو خیر کیا لیکن ناسخ کا رنگ آپ نے ضرور قبول کیا کہ بیجا تصنع و آورد کی جھلک آپ کے ہر ہر لفظ سے ظاہر ہے۔
آپ کا دوسرا خط جو "نفیس بھابھی" کی طرف سے آپ نے لکھا ہے اس میں تو آپ نے تکلف کی حد کردی ہے۔ نصف خط تو آپ نے اپنی مرغی کے بیان میں ختم کر دیا اور اس میں شک نہیں کہ خوب ہے لیکن چونکہ کسی پولٹری فارم کی خدمت نگار کے سپرد نہیں ہے اس لئے اس کی اشاعت کا موقعہ نہ تھا، اس کے بعد کا حصہ وہ ہے جس میں آپ نے آج کل کی گانے والیوں کے نام گنائے ہیں اور اس سے مقصود

غالباً آپ کا یہ ظاہر کرنا ہے کہ آپ کے پاس ان سب کے ریکارڈ موجود ہیں۔ سو یہ بھی کوئی بات ایسی نہیں جس کا جاننا قارئین نگار کے لئے ضروری ہو۔

تیسرے حصہ میں شوہر کی بے پروائی اور اپنی خدمت کا ذکر کرتے ہوئے جو لطیفہ "درد" اٹھنے کا آپ نے بیان کیا ہے وہ اس درجہ ذوقِ سلیم سے گرا ہوا ہے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے آپ کے قلم سے نکلا کیونکر۔ آخر میں آپ نے اپنی "اماں" کی علالت کی ناگہاں خبر سنکر جو کچھ لکھا ہے وہ اس قدر بے محل، اتنا پراز تکلف و تصنع ہے کہ غم و الم کا کوئی شائبہ اس سے ظاہر نہیں ہوتا، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی آئینہ کے سامنے بال سنوار رہا ہو اور کہہ رہا ہو کہ میں رو رہا ہوں۔

ہمیشہ یاد رکھئے کہ خط و کتابت میں اصل چیز بیساختہ پن ہے، علی الخصوص عورتوں کے خط کی تمام خوبی تو اسی میں ہے کہ جو کچھ وہ بولتی ہیں وہی لکھتی بھی ہیں

پھر اگر آپ اپنے گھر میں بھی روز اسی زبان میں باتیں کرتی ہیں جیسی ان خطوں میں پائی جاتی ہے تو یقیناً آپ کے شوہر کو آپ سے بیزار ہوجانا چاہئے، کیونکہ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ مرد ہر وقت یہ محسوس کرتا رہے کہ بیوی اسٹیج پر کھڑی ہوئی بھڑک رہی ہے اور بیوی یہ سمجھے کہ شوہر کوئی تماشائی ہے جس کو بہرحال اپنے ٹکٹ کے دام وصول کرنا ہی ہیں۔

شوق سے لکھئے، نگار کے صفحات حاضر ہیں، لیکن اگر آپ عورت ہیں تو عورت ہی رہکر لکھئے اور اگر مرد ہیں تو پہلے پوری طرح عورت بن جائیے اور پھر اس طرف توجہ فرمائیے۔

نگار کا وہ پرچہ جس میں آپ کا یہ خط شایع ہو رہا ہے ضرور آپ کی خدمت میں پہونچے گا، اب آپ کو اختیار ہے خواہ اپنی "مقامی بہنوں" میں اس کی "ترویج" کریں یا تذلیل۔

کرم فرمائے بندہ سلام مسنون۔ مجھے حسب ذیل امور میں جناب کے قیمتی اور قابل قدر مشورہ کی اشد ضرورت ہے امید کہ جناب والا اپنے زریں مشورہ اور قابل صد احترام رائے سے آگاہ فرماکر تسکین بخشیں گے، اول یہ کہ میں ایک شریف خاتون ہوں اور میری عمر اگر میری یاد غلطی پر نہیں تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ ۲۸ سال کی ہے میری شادی کو تقریباً گیارہ سال کا عرصہ گزرا لیکن میری سیہ بختی کہ باوجود اپنی تمام امکانی کوششوں کے تعلقات زن و شو کی خوشگواری میں ناکام رہی دوسرے یہ کہ مجھ غم نصیب کے ایک بیوہ ماں اور ایک یتیم بھائی ہے کوئی مربی و سرپرست نہیں رہا۔ اسلامی ہمدردی کا فقدان ہے۔ اودھ میں قانون

خلع بھی نہیں ہے جس کی رو سے کوئی شریف خاتون حق شوہری سے عہدہ برآ ہو سکے ایسی صورت میں عاجز آ کر یہ طے کیا ہے کہ تثلیث کی قایل ہو کر دین مسیحی اختیار کر لوں اور ہمیشہ کے لئے ایسے تغافل شعار و بدکردار شوہر سے نجات حاصل کر لوں جس نے تا حیات میری ساری زندگی اپنے تغافل کا شکار بنائے رکھنے کی قسم کھا رکھی ہے تیسرے یہ کہ دین مسیحی کے قبول کے بعد مجھ پر میرے شوہر کا کوئی حق شرعاً و قانوناً تو نہ رہیگا۔

چہارم یہ کہ میں نے افواہاً سنا ہے کہ اہل مسیح بھی اہل کتاب ہیں بعد تسلیم مسیحیت بھی قید نکاح سے آزادی نہ حاصل کر سکوں گی اور میرے موجودہ اور برائے نام شوہر کا حق ویسا ہی قایم رہیگا جیسا کہ اسوقت ہے آپ شناور بحر شرع ہیں اور غالباً ایک بڑی حد تک مجھ ستم زدہ کے سامنے قانون داں بھی برائے خدا میری قابل رحم حالت پر ترس کھاتے ہوئے اپنے بیش بہا مشورہ سے مطلع فرما کر میرے قلب مضطر کی طمانیت کا باعث ہوجئے۔ مکرر یہ کہ اگر دین مسیحی اختیار کرنے کے بعد پھر مسلمان ہو جاؤں تو کوئی باز پرس تو نہ ہوگی مختصر و مفصل کیفیت سے اطلاع دیجئے یا جو صورت آپ مناسب سمجھئے اپنی رائے عالی سے مطلع فرمایئے۔

(نگار) یہ خط ہے ایک خاتون کا جو ہیں اودھ کے ایک قصبہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ جواب تو جو کچھ مجھے دینا تھا، ان کو دے چکا ہوں، لیکن نگار میں اس کی اشاعت اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ لوگ عبرت حاصل کریں، اور سوچیں کہ ہمارے نظام معاشرت کی بہت سی وہ خرابیاں جو مذہب و قانون مذہب کے غلط استعمال کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں، کیونکر دور ہو سکتی ہیں۔

اسلام میں خلع کے لئے عورت بالکل ویسی ہی آزاد ہے، جیسے مرد طلاق کے لئے۔ یعنی جس طرح مرد ناگزیر اسباب کی بنا پر عورت کو چھوڑ سکتا ہے، اسی طرح عورت کو بھی اختیار حاصل ہے کہ وہ تعلقات ناخوشگوار ہو جانے پر مرد سے آزادی حاصل کرے۔ لیکن ہندوستان میں اس سے فایدہ صرف مردوں نے اٹھایا اور عورتیں محروم رہیں۔ اس کا بڑا سبب ہندو معاشرت اور ہندو رسم و رواج سے متاثر ہونا ہے جس نے نہ صرف مسئلۂ طلاق بلکہ اصل رشتۂ ازدواج کو بھی بالکل غیر اسلامی بنا دیا ہے۔

عرب میں نہ کوئی شادی بلا امتزاج طرفین ہوتی تھی اور نہ طلاق و خلع میں کوئی دشواری۔ اسلام نے بالکل نفسیاتی اصول کو سامنے رکھ کر ازدواج پر طلاق وغیرہ کے قواعد مرتب کئے تھے۔ لیکن ہندوستان کے مسلمانوں میں نکاح ہی بالکل تعلیم اسلام کے منافی ہوتا ہے، طلاق و خلع کا کیا ذکر ہے۔

ہندوستان کی عورت کی نصف تباہیوں کا باعث یہی مجبوری ہے، جس کا اثر ہماری نسل پر بہت خراب پڑ رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ قانون خلع جلد از جلد یہاں نافذ کیا جائے اور مردوں کے ان سیاہکارانہ مظالم کا سدباب کیا جائے، جن کی سزا انھیں عاقبت میں ملیگی یا نہ ملیگی لیکن یہاں تو انھوں نے عورت کو عذاب جہنم سے زیادہ سخت تکلیف و مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ عرصہ ہوا میں نے ایک فسانہ "بعد المشرقین" اسی حالت کو سامنے رکھ کر لکھا تھا جس میں ایک تعلیم یافتہ عورت نے اپنے تنگ خیال قدامت پرست مولانا قسم کے شوہر سے اسی طرح نجات حاصل کی تھی کہ وہ عیسائی ہو گئی۔ اب یہ خط دیکھ کر مجھے معلوم ہوا کہ میں نے مسلمان عورت کی موجودہ ذہنیت کا غلط اندازہ نہیں کیا تھا اور جس چیز کو میں فسانہ سمجھتا تھا وہ اب واقعہ کی صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔

آیندہ جنوری ۳۸ء کا "نگار"

دو چند ضخامت کے ساتھ صرف ایک موضوع پر شایع ہوگا

... موضوع بھی وہ جو نہایت اہم ہے ——— یعنی ——— اسلامی ہند کی تاریخ

اڈیٹر نگار کے قلم سے

تاریخ تین یا چار قسطوں میں مکمل ہو جائے گی اور اس کی پہلی قسط جنوری ۳۸ء کے نگار میں شایع ہوگی اسلامی ہند کی تاریخ بالکل جدید اصول پر نہایت کاوش و تحقیق سے لکھی گئی ہے اس میں تمام تاریخی ماخذوں کی حقیقت سے بھی بحث کی گئی ہے اور ان مقامات کی جغرافی تحقیق بھی اس میں پائی جاتی ہے جن کا نام تو تاریخوں میں نظر آتا ہے لیکن ان کی تعیین بہت کم کی گئی ہے

"اڈیٹر نگار کا بے مثل تاریخی کارنامہ

اگر دیکھنا ہو تو جنوری ۳۸ء کا "نگار" ضرور حاصل کیجئے اور اپنے حلقۂ احباب میں اسکے خریدار پیدا کیجئے۔ قیمت فی کاپی دو روپیہ۔ نگار کے سالانہ خریداروں کو اسی سالانہ چندہ میں ملے گا۔ ششماہی خریدار اس رعایت سے فایدہ نہ اٹھا سکیں گے۔

منیجر نگار - لکھنؤ

باب الاستفسار

(جناب سید عبدالغنی صاحب منشی فاضل۔ الہ آباد)

براہ کرم حسب ذیل فارسی و اُردو محاورات کی تشریح فرماکر ممنون کیجئے۔
طرفہ۔ طرفۃ العین۔ زلفِ چلیپا۔ جھک جھک بک بک۔ جلاب (بہ معنی مسہل) شُقہ (بہ معنی رقعہ) چار ابرو کا صفایا۔ غالیہ مُو۔ اور یہ بھی لکھئے کہ معما و چیستان میں کیا فرق ہے۔ اور فارسی میں بہترین معما اور چیستان کس نے لکھی ہیں۔ دو چار مثالیں بھی درج فرمائیے۔ اور فارسی کے طنزیات (Satire) پر بھی روشنی ڈالئے۔

(نگار) (۱) طُرفہ (بہ ضم طا) عربی لفظ ہے جس کے معنے ہیں:۔ دلخوش کُن قول عجیب بات۔ تحفہ۔ ہدیہ۔ فارسی والے اسے بوالعجبی کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں اور "طفل خوش آیندہ" اور بازیگر کے مفہوم میں بھی چنانچہ طُرفگی بہ معنی بازیگری اہل فارس نے بہ کثرت استعمال کیا ہے۔

(۲) طُرفۃ العین (بہ ضم طا) غلط ہے، اسے طَرفۃ العین (بہ فتح طا پڑھئے) اس کے معنے مشہور ہیں (پلک جھپکانا)

"زلفِ چلیپا" چلیپا کے معنے ہیں "کج و منحرف" اسی لئے خطِ منحنی کو بھی خط چلیپا کہتے ہیں۔ زلفِ چلیپا وہ زلف ہے جو بل کھائی ہوئی ہو، چلیپا معرب ہے صلیب کا۔

(۳) میں سمجھتا ہوں کہ اس کی اصل عربی ہے۔ عربی میں دو لفظ ہیں زقزق۔ بقبق۔ زقزق کہتے ہیں چڑیا کے چہچہانے کو اور بقبق ایسی آواز کو کہتے ہیں جیسے پرنالہ سے پانی کسی سخت چیز پر گرے۔ الغرض دونوں میں مفہوم شور و ہنگامہ کا پایا جاتا ہے۔ فارسی میں اسے جق جق کہتے ہیں۔

(۴) جلاب، عربی لفظ ہے جسے انگریزی میں julep کہتے ہیں۔ مشہور مسہل دوا ہے۔

(۵) شقہ، فارسی میں تو مستعمل نہیں اُردو میں فرمان شاہی کے معنی میں آتا ہے نیز اس رقعہ کے مفہوم میں جو بادشاہ یا کسی امیر کبیر کی طرف سے کم رتبہ امیر کو لکھا جائے۔ علَم میں جو کپڑا باندھا جاتا ہے اسے بھی شقہ کہتے ہیں۔

عربی میں شقہ (بہ کسر شین) کسی چیز کے ٹکڑے یا نصف حصہ کو کہتے ہیں۔ اس لئے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اردو والوں نے اسی کو شقہ کر لیا۔

(۶) چار ابرو سے "بھویں اور مونچھ" مراد ہے۔ فارسی میں سبزہ آغاز معشوق کو بھی چار ابرو اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کی مونچھیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ ملا طاہر غنی کا شعر ہے:-

عشق افزوں بیشود چوں حسن می گردد زیاد
تا تو چار ابرو شدی چشم ز شوقت گشت چار

صوفیہ کی ایک جماعت ہے جو ابرو اور داڑھی مونچھ سب صاف رکھتے ہیں ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ "چار ابرو کا صفایا" کرا دیتے ہیں۔

(۷) غالیہ مُو۔ غالیہ ایک خوشبودار مسالہ ہے جو بالوں میں ملا جاتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غالیہ مُو کی ترکیب میں، لفظ غالیہ "قیمتی" کے معنے میں آیا ہے۔

معما اور چیستاں فارسی کے صنایع بدایع میں داخل ہیں۔ معما میں کسی شخص یا چیز کا نام ظاہر کیا جاتا ہے، لیکن اس کے جاننے کے لئے اس سے زیادہ کاوش کی ضرورت ہے جو آجکل X Word Puzzle میں صرف کی جاتی ہے۔

میں چند مثالیں پیش کر کے بتاؤں گا کہ یہ کام کتنی دیدہ ریزی اور دماغ پاشی کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فارسی شعراء کو بڑی فرصت حاصل تھی اور ان کی غیر معمولی ذہانت نے صنایع و بدایع کے سلسلہ میں فارسی شاعری میں خدا جانے کتنی دلچسپیاں پیدا کر دی تھیں۔

شرف الدین علی یزدی، معما نگاری میں یطولیٰ رکھتا تھا، ملاحظہ فرمایئے کہ لفظ جمال کو کسقدر لطیف معما کی صورت میں ظاہر کرتا ہے:-

گر رود آبِ عرب در آبِ ہند نام یارم آں زماں پیدا شود

یعنی میرے دوست کا نام اسوقت ظاہر ہو سکتا ہے جب "آبِ عرب" "آبِ ہند" میں داخل ہو۔ بظاہر یہ بالکل مہمل سی بات معلوم ہوتی ہے اور کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ آب عرب کا آب ہند میں داخل ہونا کیا معنی اور اس سے لفظ جمال پیدا ہونا کیونکر ممکن ہے؟ لیکن اگر آپ کو یہ معلوم ہے کہ عربی زبان میں پانی کو ما کہتے ہیں اور ہندی زبان میں جل تو یہ دشواری آسان ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جل کے درمیان ما داخل کرنے سے لفظ جمال پیدا ہو جاتا ہے۔

لفظ بہمن کا معما ملاحظہ ہو:۔

دوشینہ شرف نام شریف تو بیاں کرد بہرمنِ دل سوختہ بود آنچہ عیاں کرد

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے مصرعہ کے پہلے ٹکڑے یعنی (بہرمنِ دل سوختہ) سے یہ لفظ پیدا کیا ہے۔لفظ "بہرمن" کا اول یا درمیانی حرف (رے) ہے اس کو سوخت کر دیجئے تو بہمن رہجاتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ دقیق و نازک معمہ لفظ حسین کا ہے:۔

نے سحر چوں گشت نالاں راز او گرد د نہاں وقت نازک بود درد وے سر بے حد شد عیاں

اس میں دونوں مصرعوں سے لفظ حسین پیدا ہوتا ہے۔پہلے مصرعہ میں "نے سحر چوں گشت" سے مراد یہ ہے کہ نے سحر کو اُلٹ دو اور ایسا کرنے سے "رحسین" بنجاتا ہے جس میں (رے) زاید ہے۔اب پہلے مصرعہ کے دوسرے ٹکڑے کو اس طرح پڑھئے:۔ را ۔ زاو گرد د نہاں۔یعنی (رے) کو اس سے علحدہ کر دیجئے۔

اب دوسرے مصرعہ کو لیجئے۔"وقت نازک" کو عربی میں "حین" کہتے ہیں اس میں "سر بے حد" یعنی سر کا آخری لفظ نکال کر حین میں ملا دیجئے، حسین ہو جائے گا۔

اب میں امتحاناً چند مثالیں معمے کی یہاں درج کرتا ہوں اور یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ اُن سے کیا لفظ بنانا مقصود ہے۔اگر کوئی صاحب نہ سمجھ سکیں تو مجھ سے پوچھ لیں:۔

۱۔(فرید)۔اول فصلِ بہار ست بیا کا خرِ روز خوش بود دامن باغے و رخ دلدارے

۲۔(یوسف)۔خالہا داری تو د گرد د بزیر لب عیاں از شرف خبر صورت بیدل نماند آں زماں

۳۔(ہاشم)۔دوشینہ لبم چو در تنامت می سفت چشمِ تو چہا کرد لبِ یار م گفت

۴۔(ناصر)۔سرِ صوفی ببُرد ر آتشِ انداز مبادا راز رنداں را بگوید،

۵۔(علی)۔تا عقیق یمنی دید لب لعل ترا قاف تا قاف دہد قیمتش و مشتری ست

چیستاں وہی ہے جسے ہندی میں پہیلی کہتے ہیں۔صراحت کی ضرورت نہیں۔فارسی میں اس کا بھی بڑا ذخیرہ موجود ہے اور بہت پُر لطف ہے اس کی بھی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:۔

چار حرف ست نام مطلوبے کہ تمنائے اہلِ عالم گشت
ہست چار و چناں عجب کہ ازو یک اگر بفگنی بماند ہشت

یعنی وہ چار حرفی لفظ ہے لیکن تعجب کی بات ہے کہ اس چار میں سے اگر ایک نکال لو تو آٹھ باقی رہتے ہیں۔اس کا جواب "بہشت" ہے۔کہ اگر اس کا پہلا حرف نکال دیجئے تو بھی ہشت رہجاتا ہے جسکے

معنے آٹھ ہیں) ۔

رنگش چو رنگِ زعفراں ۔ بریاں چو جانِ عاشقاں
پا دارد و پر ہم بداں ۔ جانانِ من گو چیست آں

یعنی ایک بھُنی ہوئی زرد رنگ کی چیز ہے جو پا بھی رکھتی ہے اور پر بھی۔ اس کا جواب پاپر (پاپڑ) ہے

دو مرغاں از مرغزارے کرد پرواز ۔ بقصد ہر دو شاں آہنگ کردم
یکے را پا بُریدم گشت بے سر ۔ یکے را سر بُریدم لنگ کردم

ان دونوں جانوروں کے نام ہیں۔ ببیرا اور کلنگ۔ اگر ببیرا کا پاؤں (یعنی الف) کاٹ دیں گے تو ببیر ہو جائے گا اور کلنگ کا سر (یعنی کاف) علحدہ کر دیں گے تو لنگ رہجائے گا۔

عُرفی نے شمع کی مدح میں قصیدہ کا قصیدہ چیستاں کے انداز میں لکھا ہے اور نہایت لطیف و پاکیزہ ہے، بعض اشعار ملاحظہ ہوں :۔

چیست آں جوہر ہدایت فن ۔ آسماں مولد و زمیں مسکن،
شوخ، آئینہ روئے، روشن دل ۔ رند، شوریدہ موئے، تر دامن
سوزنش در جراحت رشتہ، ۔ رشتہ اش در سیاست سوزن
گردنش تا بفرق سیمابی، ۔ سیم ساق است پائے تا گردن
چوں عروسانِ ہند در دم رقص ۔ از غم گیسوش چکد روغن،
نوزد باد لالہ حمراست ۔ بو زد ہست غنچۂ سوسن،
جامہ اش گاہ سبز و گاہ سپید ۔ چہرہ اش روز تیرہ شب روشن
گیسوش نور بافت چوں مریم ۔ ابروش چوں ہلال چشمک زن
ماہتاب ست بر درفش کیاں ۔ آفتاب ست سبز پیراہن
گاہے از دانہائے اشک نیاز ۔ سبحہ آویختہ ست در گردن

ہجو و طنزیات کے متعلق خیال ہوتا ہے کہ اس سے قبل بھی کسی وقت لکھ چکا ہوں۔ فارسی میں یہ صنف ادب بہت متنوع اور وسیع ہے جس میں خدا سے لیکر بیجان چیزوں تک کسی کو بغیر ہجو و طعن کے نہیں چھوڑا خیام کا ایک طنز دیکھئے جو بظاہر طنز نہیں معلوم ہوتا لیکن ہے فی الحقیقت یہی :۔

من مے خورم دہر کہ چو من اہلِ بود ۔ مے خوردنِ من نبز د او سہل بود

گر مے نخورم علمِ خدا جہل بود مے خوردنِ من حق بازل می دانست

اسی طرح کی ایک مشہور رباعی اور ہے جس کا آخری مصرعہ ہے:-

خالم بہ ہن نگر تو مستی ربی

سرزمین ہند کی ہجو ملاحظہ کیجئے:-

از بہشت جاودان ما را بہ ہند انداختی ہیچو ہندار داشتی دوزخ چرا ہم ساختی

مولانا شہاب الدین کسی طبیب سے برہم ہوگئے تو اس کی مٹی یوں پلید کی:-

ملک الموت از اصیل طبیب می بنالید بدرگاہ خدا ئے

کہ جہاں را از خلق خالی کرد اندریں دور گم شدہ سر و پائے

یا ازیں شغل دور کن او را یا مرا خدمتِ دگر عطا فرمائے

یعنی فرشتۂ موت نے خدا سے شکایت کی کہ اگر فلاں طبیب کو پیدا کیا تھا تو میری کیا ضرورت تھی۔

عُرفی نے گھوڑے کی ہجو میں لکھا ہے:-

درویش بے عصاش نگیرد زمن بمفت طرار مفلسش نستاند زمن بہ قرض

گر صیحۂ زند بجوانی ستائمش در نقطۂ رود کنمش نام سطح ارض

مہمیز می زنم بوئے از صبح تا بہ شام تا نیم گام میرود آنہم بپائے عرض

ہستم بر و سوار و بہ معنی پیادہ ام گامے بطول می زدم اکنوں زنم بعرض

یعنی گھوڑے کے ضعف و ناکارہ ہونے کا یہ عالم ہے کہ وہ فقیر جو عصا کا محتاج ہے وہ بھی اسے مُفت نہ لے اور مفلس چور سے اگر کہوں کہ قرض لیلو تو وہ بھی منظور نہ کرے۔ اگر عذاب بیماری کی وجہ سے کوئی کراہ یا چیخ بھی اس کے منھ سے نکلے تو میں اس کے جوش جوانی کی تعریف کروں اور اگر بمقدار ایک نقطہ کے وہ حرکت کرے تو میں یہ سمجھوں کہ گویا اس نے کرۂ زمین کا طواف کرلیا۔ صبح سے شام تک اگر مہمیز لگاتا رہوں تو مشکل سے نصف قدم اٹھائے اور وہ بھی طول میں نہیں عرض میں۔ اس پر سوار کیا ہوں، پیدل چل رہا ہوں اور وہ بھی اس شان سے کہ پہلے آگے قدم اٹھاتا تھا اور اب وہ چپ راست پڑتے ہیں

مولانا جامی نہایت لطیف انداز میں دولتمندوں کی کج خلقی و دنائت کے مقابلہ میں ایک درویش کے استغنا کا حال بیان کرتے ہیں:-

بدرویش گفت آں تونگر چرا بہ پیشم پس از دیرہا آمدی

بگفتا "چرا نامدی" پیش ما سبے خوشتر است از "چرا آمدی"

ایک دولتمند نے کسی درویش سے پوچھا کہ اتنے زمانہ تک کہاں رہے اور میرے پاس کیوں نہیں آئے، اس نے کہا کہ "کیوں نہیں آئے" سننا مجھے "کیوں آئے" سے زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے، اسی لئے حاضر نہیں ہوا،

خیام، حور و قصور کے عقیدہ پر طعن کرتا ہے :-

گوئی بہ بہشت حور عین خواہد بود — وانجا مے ناب وانگبیں خواہد بود
گر ما مے و معشوق پرستیم رواست — چوں عاقبت کار ہمیں خواہد بود

شاعروں نے بخیلوں کی طعن آمیز ہجو عجیب عجیب انداز سے کی ہے۔ کمال الدین اسماعیل لکھتا ہے :-

بدہن نانِ خواجہ چوں بُردم — خواجہ گفتا کہ آہ من مُردم
گفتمش خواہ میر و خواہ ممیر — کہ من ایں لقمہ را فرو بُردم

میں نے روٹی کا ٹکڑا منھ میں رکھا ہی تھا کہ خواجہ چلا اٹھا کہ "آہ میں مرا" میں نے کہا کہ لے میں تو یہ لقمہ نگل گیا، اب تو چاہے مرے یا جئے۔

خیام کا خطاب خدا سے ملاحظہ ہو :-

زاہد بکرم ترا چو ما نشناسد — بیگانہ ترا چو آشنا نشناسد
گفتی کہ گنہ کنی بدوزخ برمت — آنرا بکسے گو کہ ترا نشناسد

فخر الدین رازی خدا سے یوں خطاب کرتے ہیں :-

در رہگزرم ہزار جا دام نہی — گوئی کُشمت اگر دراں گام نہی
یک ذرہ زمیں ز دام تو خالی نیست — گیری و کُشی و عاصیم نام نہی،

یعنی راستے میں ہزاروں جگہ تو نے جال بچھا دیا ہے اور پھر کہتا یہ ہے کہ اس میں قدم رکھا تو مار ڈالونگا، پھر تو خود ہی جال میں گرفتار کرتا ہے اور ہلاک کرتا ہے اور مجھ سے کہتا ہے کہ تو گنہگار ہے!

مطبوعات موصولہ

خلافت و امامت تین حصے

امامیہ مشن لکھنؤ کی یہ ۳۴۳ ویں تبلیغی خدمت ہے جو تین حصوں میں پیش کی گئی ہے۔ ان میں وہ تمام مضامین یکجا کر دئے گئے ہیں جو نگار میں اسوقت تک شایع ہوئے ہیں، یعنی ہر آم کے اُس مضمون سے لیکر (جو مارچ ۳۵ء میں شایع ہوا تھا) آزاد خیال شیعہ کے مضمون تک (جو جنوری ۳۶ء میں شایع ہوا ہے) تمام مقالات ان حصوں میں پائے جاتے ہیں۔

اخیر میں مولانا سید علی نقی صاحب کا بھی ایک مضمون ہے جس میں انھوں نے میرے ان چند سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جو "آزاد خیال شیعہ" نے غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دئے تھے۔ یعنی قیام امامت کی ضرورت۔ صرف اہلبیت میں اس سلسلہ کے قایم رہنے کا سبب۔ انبیاء و ائمہ کا مستقبل کے حالات سے باخبر رہنے کا ثبوت۔ بارہ اماموں پر امامت کا حصر۔ اور امام موعود کے وجود و ظہور کی عقلی توجیہ۔

مولانا موصوف نے ان تمام مسایل کو جو بسیط گفتگو چاہتے تھے صرف دس بارہ صفحات میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے جس سے مدعا غالباً ایک سطحی تکملۂ بحث سے زیادہ نہیں ہے۔

مولانا نے ابتدائی دو صفحات میں میرے متعلق اظہار حیرت و استعجاب کیا ہے کہ وہ "شخص جو مذہب کی ضرورت کا قایل نہ ہو اور ملائکہ و جنت و نار سب کا منکر ہو وہ مسئلۂ امامت کے ساتھ اتنی دلچسپی کا اظہار کرے" اور ساتھ ہی ساتھ کنایتاً اس کو میری "شعبدہ بازی" اور "امیدکارانہ چال" ظاہر کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے ہیں۔

میرے سوالات کے جواب میں مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے اس پر اظہار خیال کے لئے تو میں اسوقت آمادہ نہیں ہوں کیونکہ اس کا تعلق اصل بحث امامت و خلافت سے ہے اور مجھے جو کچھ کہنا ہے اسی وقت کہوں گا جب میرے کہنے کا وقت آئے گا، لیکن مولانا کو زیادہ عرصہ تک حیرت و استعجاب میں مبتلا رہنے

کی زحمت سے بچانے کے لئے اسقدر ضرور عرض کروں گا کہ کیا میرا مذہب سے بے تعلق ہونا مجھے سب سے زیادہ اس کا مستحق نہیں ٹھہراتا کہ میں شخص ثالث کی حیثیت سے ایک بے لاگ تحقیق اس مسئلہ میں چاہوں اور کیا مولانا کو کبھی ان مستشرقین مغرب پر بھی تعجب ہوا ہے جنھوں نے متعدد مسایل اسلامی کی تحقیق میں اپنی عمریں صرف کردی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ میرے اس جذبۂ تحقیق کا محرک صرف یہ امر ہے کہ شیعہ سنی کی باہمی نزاع کو میں اسلام کی پیشانی کا نہایت بدنما داغ سمجھتا ہوں اور چونکہ اس کا تعلق صرف مسئلۂ امامت وخلافت سے ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس بحث میں کوئی پہلو ایسا پیدا ہوجائے جو دونوں کے لئے مشترک طور پر قابل قبول ہو اور جس پر اتفاق کرکے یہ ہمیشہ کے لئے اس نزاع کو ختم کردیں ۔ ہرچند بظاہر اس کی کوئی امید نہیں تاہم میری کوشش یہی ہے جو اگر کامیاب نہ ہوئی تو بھی کم از کم مجھے ضرور اس منزل تک پہونچا دیگی جہاں سے "نفس مطمئنہ" کے حدود شروع ہوتے ہیں۔

اب رہا مولانا کا میری اس سعی کو "شعبدہ بازی" قرار دینا، سو اس کے جواب میں سوائے اس کے اور کیا عرض کرسکتا ہوں کہ

گفتہ بودی ہمہ زرق اند و فریب اند و فسوس
سعدی آں نیست ولیکن چو تو فرمائی ہست !

زندگی مجموعہ ہے ملا رموزی کے چند ذکاہی مقالات کا جسے اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد نے چھاپا اور غالباً شایع بھی کیا ہے۔ ملا رموزی ہندوستان کے مزاحیہ نگاروں میں سے ہیں اور چونکہ ان کا مزاح، عام ذہن انسانی کی ظاہری سطح سے آگے نہیں بڑھتا اس لئے ان لوگوں میں انھوں نے کافی شہرت حاصل کرلی جو صرف اس لئے ہنسنا چاہتے ہیں کہ ہنسی فی الجملہ اچھی چیز ہے ـــ یعنی اگر پھکڑ پن ہے تو واہ واہ ! ـ

مزاح نگاری بہت کمیاب چیز ہے اور اسی کے ساتھ حد درجہ نازک۔ کمیاب اس لئے کہ فطرت خود چاہے کتنی ہی کھلنڈری ہو، لیکن انسان کو وہ کھلنڈرا دیکھنا پسند نہیں کرتی اور نازک اس لئے کہ مردی و نامردی میں تو خیر ایک قدم کا فاصلہ بتایا جاتا ہے لیکن مزاح اور پھکڑپن میں شاید ایک انچ کا بھی فاصلہ نہیں ہے

مزاحیہ لٹریچر صرف "انتقادیات" سے متعلق ہوتا ہے اور "انتقاد" کے لئے ضرورت ہے کہ انسان بہت متنوع ذوق رکھتا ہو اور اس کا مطالعہ وسیع ہو اس لئے صحیح معنے میں مزاحیہ نگاری کے مستحق وہی ہے جو کسی فن کے "مخصیصن (Specialists) میں ہو یا نہ ہو لیکن ذوق رکھتا ہو

تمام علوم فنون کا، اسی کے ساتھ دوسری خصوصیت یہ بھی ہونی چاہیئے کہ خود اس کی ذات سے کوئی تعلق نہ پیدا ہونے پائے۔ ملا رموزی کے فکاہیات اہل نظر کے نزدیک ہمیشہ تیسرے درجہ کا مزاح سمجھے گئے کیونکہ نہ ان کے یہاں وسعتِ مطالعہ کے ساتھ ذوق کا تنوع پایا جاتا ہے اور نہ وہ ذاتیات سے بلند ہو کر کچھ لکھ سکتے ہیں۔

ان کے مزاح کی ابتدا ہوئی تھی صرف اس انتقاد سے کہ مکتب کے مُلّا عربی و فارسی کتابوں کا اُردو ترجمہ کیسی نامانوس زبان میں کیا کرتے ہیں لیکن کچھ زمانہ بعد جب انھوں نے دیکھا کہ لوگ اس سے سیر ہو چکے ہیں، تو اپنے واقعات زندگی و تجربات سفر کو ایک دوسرے رنگ میں اسی طرح پیش کرنا شروع کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کا ذکر صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ خود ان کے ذکر پر منتہی ہوتا ہے اور وہ ہر ذکر میں اپنے آپ کو اس طرح اُبھار کر سامنے لانا چاہتے ہیں، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ انھیں خود بھی اس کا یقین ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو دوسرا ان کی اہمیت کو نظر انداز کر جائے گا۔ ملا رموزی کی اس ذہنیت نے ان کے مضامین میں ایک ایسا ناگوار مصنوعی مزاح (Forced Humour) پیدا کر دیا ہے جو اول تو بلند ذوق رکھنے والوں کو سرے سے اپیل ہی نہیں کر سکتا اور اگر ایسا ہو بھی تو اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ اس امر کا ثبوت کہ ملا رموزی کسقدر اپنے حدود سے آگے بڑھکر اپنے "ذوقِ ادب" کو پیش کرنا چاہتے ہیں، ان کی موجودہ غزل نگاری سے بھی ملتا ہے۔ کہ باوجود ہر طرز اغلاط ہونے کے وہ اپنی غزل کو غزل سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہیں اور محض اس لئے کہ بعض معمولی رسایل اسے شایع کر دیتے ہیں ان میں شاعر ہونے کا بھی غلط پندار پیدا ہو گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ملا رموزی ذہین آدمی ہیں اور ان میں یہ صلاحیت تھی کہ درجۂ اول کا نہ سہی تو کم از کم درجۂ دوم کا فکاہی لٹریچر پیش کر سکتے، لیکن افسوس ہے کہ ان کا بھوپالی "ماحول" ان کی اس فطری ودیعت کو صحیح راہ پر لگانے میں کامیاب نہ ہوا اور وہ اُس سطح سے آگے نہ بڑھ سکے جو عوام کے خوش کرنے کے لئے تو موزوں تھی لیکن خواص سے خراج تحسین حاصل نہ کر سکتی تھی۔

ملا رموزی نے ایک اور غلطی بھی کی، وہ یہ کہ سیاسی و اخلاقی مسایل کو بھی انھوں نے اپنی ظرافت کے حدود میں شامل کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی فطری قدامت پرستی (Conservatism) جو "ننھے کی ماں"، کے ذکر میں چھپی رہتی تھی، فاش ہو گئی اور ان کے مزاح میں ایک عجیب قسم کا روڑھا پن پیدا ہو کر رہ گیا۔

اس میں شک نہیں کہ ملا رموزی فطرتاً مزاح نگاری کے ذوق سے بیگانہ نہ تھے، لیکن افسوس ہے

کہ ان کا یہ ذوق "ناتراشیدگی" کی حالت سے آگے نہ بڑھ سکا جس کا سب سے بڑا سبب ان کی 'ضیا' الملک فاضل الٰہیات اور ام۔ آر۔ اے۔ اس (لندن) والی اوچھی ذہنیت ہے۔ حالانکہ "فکاہیات" سے انھیں کیا واسطہ؟

افسوس ہے کہ اعظم اسٹیم پرس نے ان مضامین کو اسوقت شایع کیا جب اِن کی مانگ ملک میں باقی نہیں رہی اور ملا رموزی کا مزاح ایک "بوسیدہ" چیز قرار پا چکا۔ تاہم اس لحاظ سے کہ فکاہی لٹریچر برا بھلا جو کچھ مواد اُردو میں ملسکتا ہے اسے ضایع نہ ہونا چاہئے، اس مجموعہ کی اشاعت بے محل بھی نہیں ہے۔ یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۲۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اور دو روپیہ میں اعظم اسٹیم پرس حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

آفتاب رسالت منظوم سیرت رسول ہے راؤبہادر حاجی محمد عبدالحمید خانصاحب منظر کی لکھی ہوئی نثر میں سیرۃ نبوی لکھنا تو فیشن ہو ہی گیا تھا۔ اب نظم میں بھی یہ وبا پھیلنے لگی۔ وبا میں اس کو وبا کہتا ہوں کیونکہ سب سے زیادہ مشکل کام کو سب سے زیادہ آسان سمجھ لینے کے معنی یہی ہوتے ہیں۔ دنیا کے سب سے بڑے انسان کی سیرت سب سے بڑی متانت و سنجیدگی چاہتی ہے اور اس کو منظوم کرنے کے معنے صرف یہ ہیں کہ اسے ہم ایسے زاویۂ نگاہ سے پیش کر رہے ہیں جہاں معنی سے زیادہ الفاظ کے رکھ رکھاؤ کا لحاظ کیا جاتا ہے۔

راؤبہادر صاحب نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ چونکہ سیرۃ کی کتابیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اس لئے انھیں بڑی جستجو تھی کہ کوئی صحیح کتاب اس موضوع پر مل جائے تاکہ وہ اسی کو سامنے رکھ کر واقعات نظم کریں اور آخرکار "قرعۂ فال" مولانا اشرف علی صاحب کی تصنیف "نشر الطیب" کے نام نکلا۔

"نشر الطیب" کا انتخاب انھوں نے کیوں کیا؟ اس پر رائے زنی کرنے کا حق ہمیں حاصل نہیں لیکن خود "نشر الطیب" کی حقیقت کیا ہے، اس پر غور کرنے کی دعوت ضرور راؤبہادر صاحب نے دی ہے۔

سیرۃ نبوی ہمیشہ دو حصوں پر مشتمل ہوا کرتی ہے۔ ایک وہ جس میں آپ کے واقعات زندگی محض واقعات ہونے کے لحاظ سے معرض بحث میں آتے ہیں، دوسرا وہ جو صرف خوش اعتقادی سے تعلق رکھتا ہے اور عوام کی طرح راؤبہادر صاحب نے بھی شاید یہی سمجھا کہ سیرۃ کی سب سے بہتر کتاب وہی ہے جس میں سب سے زیادہ خوش اعتقادی سے کام لیا گیا ہو۔ ہر چند اس قسم کی روایات سے اور کتابیں بھی بھری پڑی ہیں لیکن ان کی صحت کی حجت کے لئے وہ کوئی بڑا آدمی ڈھونڈھنا چاہتے تھے اور آخرکار

مولانا اشرف علی صاحب کی ذات میں وہ بڑا آدمی انھیں مل ہی گیا۔
اگر یہ صحیح ہے کہ راؤ بہادر صاحب نے تمام واقعات نشر الطیب سے لئے ہیں تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ جس حد تک صرف سیرۃ نگاری کا تعلق ہے اس کتاب پر نقد کرنا گویا نشر الطیب پر نقد کرنا ہے اور مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ "نشر الطیب" حد درجہ معیار سے گری ہوئی چیز ہے۔
مجھے کس قدر حیرت ہوئی یہ دیکھ کر کہ اس میں بھی تخلیق نور محمدی کی وہی روایت پائی جاتی ہے جو عام طور سے معمولی میلاد ناموں میں نظر آتی ہے اور شق صدر کو بھی واقعی عمل جراحی قرار دیکر سینہ چاک کرکے دل نکالنے اور اسے پاک صاف کرکے پھر سینہ کے اندر رکھدینے کے مفہوم میں لیا گیا ہے۔
اسی طرح آپ کی پشت پر مُہر نبوت کا پایا جانا، آپ کے جسم کا بے سایہ ہونا، چاند کے دو ٹکڑے کردینا آپ کی بد دعا سے سراقہ کے گھوڑے کا زمین میں دھنس جانا، ایک چھوٹے ظرف آب سے لشکر کو سیراب کرنا، لعاب دہن لگاکر قلیل شوربہ اور آٹے سے ہزاروں آدمیوں کی گرسنگی رفع کردینا، مسجد نبوی کے ستون کا گریہ وزاری کرنا وغیرہ وغیرہ تمام وہی واقعات اس میں بھی پائے جاتے ہیں جو صرف خوش اعتقادی وصنم پرستانہ ذہنیت کا نتیجہ ہیں۔
کاش راؤ بہادر صاحب ان باتوں کو نثر ہی میں رہنے دیتے اور منظوم کرکے ان کی مزید اشاعت کا باعث نہ بنتے۔
نظم ہونے کے لحاظ سے بھی یہ کتاب اغلاط و اسقام سے پاک نہیں ہے۔ کتابت وطباعت بیشک اچھی ہے اور کاغذ بھی نفیس استعمال کیا گیا ہے۔ جو صاحب اس کا مطالعہ کرنا چاہیں وہ سکرٹری صاحب بزم ادب باغپت (میرٹھ) سے ۸/ علاوہ محصول بھیجکر طلب کرلیں۔

داستان پیر لوئی کی مشہور عام کتاب افروڈائٹ کا اُردو ترجمہ ہے۔ فرانسیسی ادب لطیف میں اس کتاب کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو یونانی مجسموں میں زہرہ کے مجسّمہ کو، کیونکہ پیر لوئی سے زیادہ آزاد و بیباک ہوکر نہ کسی نے جذبات جنسی کا اظہار کیا اور نہ اس سے زیادہ نازک ولطیف تخئیل کسی نے صرف کی۔
اس کتاب میں لوئی نے قدیم اسکندریہ کی شہوانی تصویر کھینچی ہے اور ایک کسی کا کیرکٹر اسقدر عریانی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ شاید ہی اس سے زیادہ ٹانک دوا کوئی اور میسر آسکے، لیکن افسوس ہے کہ ترجمہ اس مرتبہ کا نہیں ہے اور علاوہ غیر شگفتہ ہونے کے غیر متوازن بھی ہے۔
اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کا ترجمہ کرنا معمولی کام نہ تھا اور فاضل مترجم کو جن کا نام ظاہر

نہیں کیا گیا یقیناً بڑی دقتوں سے واسطہ پڑا ہوگا، اسی کے ساتھ ہمیں اس کا بھی اعتراف ہے کہ بعض بعض جگہ وہ غیر معمولی طور پر کامیاب نظر آتے ہیں، لیکن بہ حیثیت مجموعی اس میں نہ صرف نظر ثانی بلکہ یکسر تغیر و تبدل کی ضرورت ہے۔

یہ درست ہے کہ پیر لوئی کی اس کتاب میں اور یہ کتاب کیا ہر زبان کی ادب عالی میں انداز بیان بہت نازک و پیچیدہ ہوا کرتا ہے۔ لیکن ایک مترجم کا فرض ہے کہ وہ اپنی زبان کی خصوصیات قایم رکھتے ہوئے ان کا ترجمہ کرے اور اس کی تدبیر صرف یہ ہے کہ طویل جملوں کو چھوٹے چھوٹے فقروں میں تبدیل کر دے لیکن فاضل مترجم نے اصل کتاب کی ترکیبات نحوی کو علی حالہا قایم رکھنے کی کوشش میں سادگی و شگفتگی کو بالکل نظر انداز کر دیا اور ترجمہ اُلجھ کر رہ گیا۔

میں یہاں چند مثالیں دیکر اپنے مدعا کو واضح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں ۔ کتاب کا پہلا جملہ ملاحظہ ہو:-

> "سینے کے بل لیٹ کر، کہنیاں بڑھائے، رانیں کشادہ کئے، رخسار پر ہاتھ رکھے وہ ایک لمبے سُنہری پن سے کتانِ سبز کے تکیہ پر چھوٹے چھوٹے سوراخوں کی حاشیہ کاری کر رہی تھی ۔ دوپہر کے دو گھنٹہ بعد جب وہ جاگی ہے تو کثرت خواب کی وجہ سے جسم میں ایک گرانی سی محسوس کر رہی تھی اور اس لمحہ سے لیکر اسوقت تک وہ تنہا اپنے بے ترتیب بستر پر لیٹی رہی تھی، اس طرح کہ اسکے جسم کا ایک حصہ لہراتے ہوئے لمبے بالوں سے ڈھنپا تھا"

جن الفاظ کے نیچے خط کھینچ دیا گیا ہے انکا استعمال صحیح نہیں کیا گیا اور علاوہ اس کے پورا جملہ الجھا ہوا ہے اس کو یوں لکھنا چاہئے تھا:-

> "کہنیاں بڑھائے، رانیں کشادہ کئے، رخسار پر ہاتھ رکھے، سینے کے بل لیٹی ہوئی وہ ایک لمبی سنہری پن سے کتانِ سبز کے غلاف پر چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے حاشیہ بنا رہی تھی ۔
> دوپہر کے دو گھنٹہ بعد جب وہ جاگی تو دیر تک سوتے رہنے کی وجہ سے جسم میں گرانی سی محسوس کر رہی تھی اس لئے اپنے بے ترتیب بستر پر اسی طرح تنہا لیٹی رہی، اس حال میں کہ اس کے جسم کا ایک حصہ لہراتے ہوئے لمبے بالوں سے چھپا ہوا تھا"

اس کے بعد کا جملہ ملاحظہ ہو:-

> "اس کے بال گھنے، تاباں، سمور کی طرح نرم، پر پروانسے طویل تر ملایم اور بے حصر تھے"

اس جملہ میں "پر پروانسے طویل تر" کا کوئی مفہوم ظاہر نہیں ہوتا۔ لفظ ملایم حذف کر دینا چاہئے تھا کیونکہ نرمی کا بیان پہلے ہو چکا ہے، اسی طرح بے حصر غلط بھی ہے اور غیر فصیح بھی ۔ ترجمہ یوں ہونا چاہئے تھا:-

بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے پیچیدہ ترکیبوں اور غیر مانوس و مشکل الفاظ کو اپنے کلام میں قطعاً آنے نہیں دیا دور از فہم تشبیہوں اور مبالغہ آمیز استعاروں سے اپنے اشعار کو بالکل پاک رکھا۔
اُن کی زبان میں فصاحت اور بیان میں سادگی کے ساتھ شوخی بھی پائی جاتی ہے۔ زبان کی اسی خوبی کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ مشہور ہوئے ورنہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کے کلام میں حقیقت و متانت بہت کم ہے نہ اُس میں میر جیسا درد و اثر ہے نہ غالب جیسی معنی آفرینی اور نازک خیالی مگر زبان کی جو خدمت انھوں نے کی ہے وہ بڑی حد تک قابل قدر ہے روزمرہ اور محاورات کا برمحل استعمال، لفظوں کی نشست و ترتیب اور خیالات کی دلنشینی یہ وہ چیزیں ہیں جو داغ کا خاص طرز کہلاتی ہیں۔ اس تصنیف میں داغ کی انھیں تمام خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور ان کے واقعات زندگی بھی حصر کر لئے گئے ہیں۔
ضخامت ۲۰۸ صفحات، تقطیع چھوٹی، جلد خوبصورت، قیمت عہ، ملنے کا پتہ:۔ غلام دستگیر تاجر کتب چار کمان حیدر آباد، دکن۔

تاجدار کعبہ یہ امامیہ مشن کا بیالیسواں تبلیغی رسالہ ہے اس میں حضرت علیؑ کے متعلق چند دلچسپ مضامین جمع کر دئے گئے ہیں جن کا تعلق محض خوش اعتقادی سے ہے۔
قیمت ا/، ملنے کا پتہ امامیہ مشن لکھنؤ۔

افسانہ جناب مجنوں گورکھپوری کے دو مقالے ہیں جو ایوان اشاعت گورکھپور نے اس نام سے شایع کئے ہیں۔ پہلے مقالہ کا عنوان "افسانہ اور اس کی غایت" ہے۔ دوسرے کا "اُردو فسانہ" چونکہ حضرت مجنوں خود نہایت اچھے افسانہ نگار ہیں اور اسی کے ساتھ بہت ذہین بھی ہیں اور وسیع المطالعہ بھی، اس لئے ان کے یہ دونوں مقالے "کار آگہانہ" حیثیت رکھتے ہیں اور کافی معلومات کے حامل ہیں۔
پہلے مقالہ میں فسانہ کی حقیقت، اس کے اجزا ترکیبی اور خصوصیات خاصہ کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے مغربی فسانہ نگاری پر نہایت دلچسپ انتقاد کیا ہے اور دوسرے مقالہ میں اُردو کی منظوم و منثور فسانہ نویسی پر شروع سے اسوقت تک تبصرہ کرکے بہت مفید معلومات یکجا کر دی ہیں۔ علاوہ محصول اسکی قیمت عہ ہے جو حجم کے لحاظ سے ممکن ہے زیادہ ہو لیکن مغز کے لحاظ سے نامناسب نہیں ہے۔

ظل ہما ترجمہ ہے طہران کے مشہور مصنف و افسانہ نویس میر محمد حجازی کے ایک ناول "ہما" کا جسے مولوی سید اطہر حسین صاحب جعفری نے اُردو میں منتقل کیا ہے۔
چونکہ فاضل مترجم عرصہ تک طہران میں رہ چکے ہیں اور وہیں ان کے فارسی ذوق کی تکمیل ہوئی ہے

اس لئے یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان سے بہتر اس ناول کا سمجھنے والا کون ہو سکتا تھا۔ موصوف نے پوری کوشش کی ہے کہ ترجمہ لفظی ہونے کے ساتھ ہی بامحاورہ بھی ہو اور وہ اس میں بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ اس فسانہ میں مصنف نے فطرت انسانی کے بعض نہایت نازک و لطیف پہلوؤں سے بحث کی ہے اور معاملات حسن و عشق کو ایک بلند آئیڈیل کی صورت دیکر نہایت مرتفع معیار ناول نویسی کا پیش کیا ہے۔

ضرورت ہے کہ غیر زبانوں سے اسی قسم کے پاکیزہ و لطیف افسانے انتخاب کرکے اُردو میں منتقل کئے جائیں، ہمیں امید ہے کہ جناب سید اطہر حسین صاحب آیندہ بھی فارسی ادب کے ایسے ہی منتخبات اہل ملک کے سامنے پیش کرتے رہیں گے۔ جو حضرات ایرانی لٹریچر اور وہاں کے طرز انشاء و انداز جذبات نگاری سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی و افادہ سے خالی نہیں۔

اس فسانۂ جمیل کی قیمت صرف دس آنہ ہے اور مکتبۂ علیہ لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

لیونارد و گرٹروڈ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں پستالوزی بڑا زبردست ماہر تعلیم گزرا ہے جس نے اپنی ساری عمر اسی عملی تجربہ میں صرف کردی کہ گھریلو زندگی کو کیونکر مفید و خوشگوار بنایا جا سکتا ہے۔ وہ بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت، امور خانہ داری اور گھریلو مشاغل کی اصلاح کا بڑا ماہر تھا اور اس نے ایک نہایت ضخیم کتاب اس موضوع پر لکھی تھی، لیکن چونکہ وہ بہت خشک تھی اس لئے ایک شخص ابواکینگ نے اس سے اخذ و استفادہ کرکے ایک کتاب فسانہ کے طرز پر لکھی تاکہ لوگ اس سے دلچسپی لے سکیں۔

اسی کتاب کا ترجمہ جناب غلام حسن صاحب بی۔ اس۔ سی استاذ ٹریننگ اسکول گلبرگہ (دکن) نے اُردو میں کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انھوں نے اس خدمت کو انجام دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ یہ کتاب ملک کی ہر خاتون کے مطالعہ میں آئے اور لڑکیوں کو بھی پڑھائی جائے تاکہ ابتدا ہی سے ان میں فرض شناسی کی عادت مرتسم ہو جائے۔ اس کی طباعت و کتابت میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے، فاضل مترجم سے خط و کتابت کرکے معلوم کی جائے۔

مشہد اعظم اخبار سرفراز لکھنؤ ہر سال عشرۂ محرم میں ایک خاص نمبر واقعۂ کربلا اور اسوۂ حسینی کے متعلق شایع کرتا ہے۔ امسال منجملہ دیگر مضامین کے ایک مضمون مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر کا بھی تھا اور دوسرا مولانا شاہ علی صاحب حیدر آبادی کا۔ امامیہ مشن لکھنؤ نے ان دونوں مقالوں کو علیحدہ ایک رسالہ کی صورت میں شایع کیا ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے شیعی نقطۂ نظر کی پوری ترجمانی کرتے ہیں۔
اس کی قیمت علاوہ محصول ۱/ مقرر کی گئی ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک انگریزی مقالہ Husain in the plain of Karbala
سید خورشید حسین صاحب نقوی کا شایع کیا گیا ہے اور دوسرا ہندی میں۔ ان کی قیمت علی الترتیب ۱ر
اور ۸ر ہیں۔

سلاطین و قائدین اسلام مولانا یوسف احمد بغدادی نے ایک رسالہ عربی زبان میں اس موضوع پر لکھا تھا، اسی کو اب اُردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ اس میں تمام موجودہ اسلامی حکومتوں کے جغرافی و تاریخی حالات، معہ رقبہ و مردم شماری اور نظام حکومت کے یکجا کردئے گئے ہیں اور امراء و سلاطین کی عکسی تصاویر بھی شامل ہیں۔

اس رسالہ میں تمام حالات مستند ذرایع سے حاصل کرکے درج کئے گئے ہیں اور زبان و بیان دونوں بہت سلیس و شگفتہ ہیں۔ کتابت و طباعت بھی نہایت پاکیزہ ہے۔ جو حضرات موجودہ اسلامی دنیا کے حالات سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ ازبس مفید ہے۔ قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ:- جناب یوسف احمد بغدادی۔ کشمیر مینشن۔ ۴۵ ویلسلی اسٹریٹ کلکتہ ہے۔

آیات وجدانی مجموعہ ہے جناب یگانہ چنگیزی کے اُردو فارسی کلام کا جو دوبارہ "باضافۂ افکار جدید" شایع کیا گیا ہے، ابتداء میں یگانہ صاحب نے خود اپنے حالات بھی قلمبند کردئے ہیں جن کی انتہا اسی ذہنیت پر ہوتی ہے جس کا نام انھوں نے "غالب شکنی" رکھا ہے۔

اس مجموعہ کا انتساب انھوں نے اپنے جد اعلیٰ (انھیں کے الفاظ میں) "حضرت چنگیز خاں اعظم قہر اللہ" سے کیا ہے۔ جناب یگانہ نہایت خوش گو و خوش فکر شاعر ہیں اور اگر ان کا جذبۂ خود پرستی جایز حدود سے آگے بڑھکر غیر معمولی خشونت میں تبدیل نہ ہوجاتا تو شاید وہ زبان کی بہتر خدمت انجام دے سکتے۔ اس کی قیمت ۱۲ر ہے اور ملنے کا پتہ:- میرزا آغا جان چنگیزی لکھنوی، جھوائی ٹولہ۔ لکھنؤ۔

منتخب دیوان غالب مع شرح دیوان غالب کا انتخاب جامعۂ عثمانیہ کے انٹرمیڈیٹ کورس میں شامل ہے اور یہ شرح اسی انتخاب سے متعلق ہے۔
شرح بُری نہیں ہے اور تمام ان شرحوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے جو اسوقت بازار میں پائی جاتی ہیں جا بجا تقابلاً دوسرے شعراء کا کلام بھی پیش کیا گیا ہے اور مولانا طباطبائی و ڈاکٹر بجنوری مرحوم کی تشریحات کو بھی نقل کردیا ہے۔ اس کے مولف جناب نور اللہ محمد نوری ہیں اور ناشر غلام دستگیر تاجر کتب چار کمان حیدرآباد دکن۔ قیمت درج نہیں۔

سیر کشمیر مولوی محمد عبدالمجید صاحب بی۔ اے گورکھپوری نے اپنی سیاحت کشمیر کے حالات اس